سراجاً منیرا

رہبرِ انسانیت



مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

دار الرشید
لکھنؤ - الہند

سراجاً منیراً

رہبرِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

دار الرشید، لکھنؤ

بار چہارم

۱۴۳۳ھ - ۲۰۱۲ء

نام کتاب	:	رہبر انسانیت
نام مصنف	:	مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
صفحات	:	۴۶۶
طباعت	:	کاکوری آفسیٹ پریس لکھنؤ
تعداد اشاعت	:	۱۱۰۰
باراول	:	دسمبر ۲۰۰۸ء (تعداد: ۲۰۰۰)
قیمت	:	250 روپے

ملنے کے پتے

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، فون: 0522-2741539

مکتبہ اسلام، گوئن روڈ، امین آباد، لکھنؤ، فون: 9415912042

مکتبہ ندویہ، احاطہ ندوۃ العلماء، لکھنؤ، فون: 9335070285

مکتبہ احسان، مکارم نگر، لکھنؤ، فون: 9793118234

مکتبہ ابوالحسن علی، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی، فون: 09810926346

الفرقان بکڈپو، نظیر آباد، لکھنؤ: (0522)2610443. 6535664

ناشر

دارالرشید، لکھنؤ

E- mail: daralrashid@gmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع سوم

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء وخاتم المرسلين محمد بن عبد الله الأمين وعلى آله وصحبه أجمعين۔

انسانی زندگی کے حالات میں کبھی کبھی یہ دلچسپ بات بھی پیش آجاتی ہے کہ شر سے خیر نکل آتی ہے، اور شر کرنے والوں کے شر کا نتیجہ الٹا ہو جاتا ہے، کچھ اس طرح کی بات اس معاملہ میں بھی سامنے آئی کہ ادھر دو سال قبل حضور اکرم رحمۃ للعالمین خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں یورپ کے بعض اہل فکر نے گستاخی اور شر انگیزی کا جو رویہ اختیار کیا، اس نے حضور اکرم سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشقوں اور وفاداروں کو ایسا ہوشیار کر دیا کہ وہ اپنی تمام صلاحیتوں کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، جگہ جگہ سیمنار ہوئے، اور آپ کی سیرت طیبہ جو انسانی زندگی کے لئے خیر وفلاح کا بہترین نمونہ اور انسانی زندگی کی عزت وبرتری کے حصول کے لئے رہبر اعظم ہے، اس کو پیش کرنے کے لئے جگہ جگہ خیر پسند اہل قلم متحرک ہو گئے اور کتابیں تصنیف کی گئیں، اور نبی اعظم رہبر انسانیت اور رحمت عالم کی حیات طیبہ کے شاندار پہلو کو پیش کرنے لگے اور یہ کام ہر زبان میں کیا گیا اور کیا جارہا ہے۔

اس کی ایک کڑی میری بھی ایک کوشش ''رہبر انسانیت'' کے نام سے لائق اشاعت پذیر ہوئی جو کہ الحمدللہ پسند بھی کی گئی، اور کم مدت ہی میں اس کے دو ایڈیشن شائع ہوئے، اور اب تیسرا ایڈیشن شائع ہونے جارہا ہے، اس میں کتاب کی خوبی نہیں ہے، جو واقعات کتابوں میں ہیں ان ہی کو پیش کیا گیا، اس میں دراصل صاحب سیرت کی شان عظمت اور اثر انگیزی ہے جو کسی کی طرف سے بھی پیش ہوا اثر انداز ہوتی ہے، اور صاحب کتاب کے لئے باعث سعادت ہوتی ہے، کہ اس نے اس عظیم الشان مینارۂ نور کو سامنے لانے کی کوشش کی، یہ میرے لئے بھی خوشی اور خوش بختی کا ذریعہ ہے، امید ہے کہ یہ تیسرا ایڈیشن بھی اپنا فریضہ انجام دے گا، اور سابقہ ایڈیشنوں سے بہتر ثابت ہوگا، میں کتاب کی اشاعت کی فکر کرنے والے اپنے رفقاء کی فکر وتوجہ پر بھی اظہار قدر دانی کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اس کار خیر میں رب العالمین کی طرف سے ان کو بھی اجر جزیل حاصل ہوگا۔

وصلی اللہ علی سیدنا وحبیبنا محمد وسلم تسلیماً کثیراً کثیراً

محمد رابع حسنی ندوی
ندوۃ العلماء لکھنؤ

یکم محرم/۱۴۳۲ھ
۸/دسمبر/۲۰۱۰ء

فہرست

باب اول

باب دوم

باب سوم

نسبت، ولادت اور نشو ونما کا زمانہ

باب چہارم

وحی کا آغاز، بعثت اور دعوت وتبلیغ

باب پنجم

باب ششم

باب ہفتم

باب ہشتم

باب نہم

باب دہم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

سید محمد واضح رشید حسنی ندوی

قومی ومذہبی عصبیت سے بالاتر ہوکر صاف اور کھلے ذہن سے سیرت نبوی کا مطالعہ کرنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم معلم اخلاق اور رہبر انسانیت ہیں اور آپ ﷺ کی نمایاں وممتاز صفت رحمت للعالمینی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی عفو ودرگزر، رحمت ومودت، شفقت ودلداری، انسانیت نوازی اور حسن اخلاق کی آئینہ دار رہی ہے، آپ ﷺ کی تعلیم وتربیت اور صحابہ کرام کے ساتھ آپ کے سلوک کا بنیادی جوہر ہمدردی اور کرم گستری رہا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف مسلمانوں ہی کے لئے رحمت نہیں، بلکہ آپ سارے جہاں کے لئے رحمت تھے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ اے محمد ہم نے تم کو تمام جہاں کے لئے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔ (الانبیاء: ۱۰۷)۔

سیرت کے مطالعہ سے آپ ﷺ کی صفت رحمت وکرم گستری آپ کی حیات طیبہ کے تمام اقدامات اور کارروائیوں میں نمایاں اور غالب نظر آتی ہے، آپ ﷺ کی زندگی میں کتنے ہی نازک مرحلے آئے، کیسی ہی سختیوں، مصائب اور آزمائشوں سے آپ کو گذرنا پڑا، لیکن کسی بھی حال میں شفقت ومودت، رحمت وکرم گستری، انسانیت نوازی اور خیر پسندی میں کمی نہیں آئی، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت

شروع کی تو اپنے ہی قبیلہ کے لوگوں نے سخت سے سخت تکلیفیں اور اذیتیں پہنچائیں، آپ کا بائیکاٹ کیا گیا، راہ حق میں روڑے اٹکائے گئے، لیکن ہر حال میں آپ کا جذبۂ رحمت غالب رہا، آپ کی یہ صفات آپ ہی کی ذات تک محدود نہ تھیں، بلکہ آپ کی تعلیم وتربیت کے اثر سے صحابہ کرام میں بھی جلوہ گر تھیں، قرآن کریم کہتا ہے:

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْناً وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَاماً وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّداً وَّقِيَاماً، وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَاماً ٥ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرّاً وَّمُقَاماً ٥ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَاماً ٥ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهاً آخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ، وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَاماً ٥﴾

(سورۃ الفرقان: ۶۳-۶۸)

اور خدا کے بندے تو وہ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے (جاہلانہ) گفتگو کرتے ہیں تو سلام کہتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کے آگے سجدہ کر کے اور (عجز وادب سے) کھڑے رہ کر راتیں بسر کرتے ہیں اور وہ جو دعا مانگتے ہیں کہ اے پروردگار دوزخ کے عذاب کو ہم سے دور رکھیو کہ اس کا عذاب بڑی تکلیف کی چیز ہے اور دوزخ ٹھہرنے اور رہنے کی بہت بُری جگہ ہے اور وہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ بیجا اُڑاتے ہیں اور نہ وہ تنگی کو کام میں لاتے ہیں بلکہ اعتدال کے ساتھ ضرورت سے زیادہ نہ کم اور وہ جو خدا کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اور جس جاندار کا مارڈالنا خدا نے حرام کیا ہے اس کو قتل نہیں کرتے مگر جائز طریقہ پر (یعنی حکم شریعت کے مطابق) اور بدکاری نہیں کرتے اور جو یہ کام کرے گا سخت گناہ میں مبتلا ہوگا۔

ایک دوسرے موقع پر قرآن کہتا ہے:

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ، الَّذِينَ هُمْ فِي صَلٰوتِهِمْ خٰشِعُونَ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ، وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُونَ، وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حٰفِظُونَ

إِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَاءَ ذٰلِكَ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ، وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ، وَالَّذِينَ هُمْ عَلٰى صَلٰوتِهِمْ يُحَافِظُونَ، أُولٰئِكَ هم الْوَارِثُونَ، الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾

یقیناً وہ مومنین فلاح پاگئے جو اپنی نماز میں خشوع رکھنے والے ہیں، اور جو لغویات سے برکنار رہنے والے ہیں، اور جو اپنا تزکیہ کرنے والے ہیں، اور جو اپنی شرم گاہوں کی نگہداشت رکھنے والے ہیں ،

ہاں البتہ اپنی بیویوں اور باندیوں سے نہیں کہ ان پر کوئی الزام نہیں، ہاں جو کوئی اس کے علاوہ کا طلب گار ہوگا سو ایسے ہی لوگ تو حد سے نکل جانے والے ہیں، اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا لحاظ رکھنے والے ہیں، اور جو اپنی نمازوں کی پابندی رکھنے والے ہیں، بس یہی لوگ وارث ہونے والے ہیں، جو فردوس کے وارث ہوں گے اور اس میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔

(المومنون: ۱-۱۱)

مندرجہ بالا آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رحمت و مودت، شفقت و ملاطفت، دلداری، خیر پسندی و دلنوازی اور عفو و درگزر اسلام کی بنیادی اور نمایاں صفات ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف انسانوں ہی کے ساتھ شفقت و رحمت کی تعلیم نہیں دی، بلکہ حیوانات اور حشرات الارض کے ساتھ بھی رحمت و شفقت اور نرمی و ہمدردی کی تعلیم دی، احادیث اور سیرت نبوی کی کتابوں میں اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔

حضور ﷺ مکارم اخلاق، نوازش و کرم گستری اور تواضع میں ساری انسانیت کے امام و مقتدا و پیشوا تھے، حضور ﷺ نے خود ارشاد فرمایا ہے: "أدبني ربي فأحسن تأديبي" "میری تربیت اللہ تعالی نے فرمائی ہے اور بہترین فرمائی ہے، حضرت جابر

رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: إن اللـه بعثني لتمام مكارم الأخلاق و كمال محاسن الأفعال ''اللہ تعالی نے مجھے مکارم اخلاق اور محاسن اعمال کی تکمیل کے لئے مبعوث فرمایا ہے، جب حضرت عائشہؓ سے آپ ﷺ کے اخلاق کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: ''كان خلقه القرآن'' آپ (ﷺ) اخلاق میں قرآن کا مجسم نمونہ تھے، عفوودرگذر، تحمل و بردباری، کشادہ قلبی اور قوت برداشت میں آپ ﷺ کا جو مقام تھا وہاں تک اہل ذہانت کی ذہانت، اور شعراء کے خیال وتصور کی بھی رسائی نہیں ہوسکتی۔

بنی نوع انساں میں محاسن اخلاق کا سب سے بڑا مظہر پیغمبروں کی ذات ہے، اور پیغمبروں میں سب سے اعلی وافضل ہستی رسول ﷺ کی ہے، اسی وجہ سے اللہ تعالی نے آپ ﷺ کو اس وصف سے نمایاں طور پر متصف فرمایا تھا:

﴿لقد جاء كم رسول من أنفسكم عزيز عليه ما عنتم، حريص عليكم، بالمؤمنين رءوف رحيم﴾ [سورہ توبہ، آیت نمبر ۱۲۸]

تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہارے جنس سے ہیں، جن کو تمہارے نقصان کی بات گراں گذرتی ہے، جو تمہاری منفعت کے بڑے خواہش مند رہتے ہیں، اور ایمان والوں کے حق میں تو بڑے ہی شفیق اور مہربان ہیں۔

بعض انصاف پسند مغربی مصنفین نے اس پہلو کو اپنی تصنیفات میں نمایاں کیا ہے۔ مسلمانوں کی فطرت جوانمردی ، بہادری، کرم فرمائی اور کشادہ قلبی ہے اور کمزوروں کے ساتھ عفوودرگزر، عدل گستری، دلداری ورواداری سے پیش آنا ہے تاریخ اسلام میں اس کی بکثرت مثالیں موجود ہیں۔

عیسائی مورخ فلپ واچ اور یوسف کرباج " المسيحيون في التاريخ الإسلامي العربي و التركي" میں لکھتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے

زمانہ میں مصر میں عیسائیوں کی تعداد ڈھائی لاکھ کے قریب تھی، لیکن نصف صدی کے بعد عباسی خلیفہ ہارون رشید کے زمانہ میں ان کی نصف تعداد نے اسلامی تعلیمات خصوصاً اسلامی عدل ومساوات اور دلداری اور رواداری سے متاثر ہوکر اسلام قبول کرلیا۔

مشہور مستشرق سر ٹوماس آرنلڈ T. W. Arnold نے اپنی کتاب ''دعوت اسلامی'' The Preaching of Islam میں دلائل کے ساتھ لکھا ہے کہ اسلام کے عہد اقتدار وحکمرانی میں غیر مسلموں کے ساتھ عدل ومساوات، عفوودرگذر، تسامح، اور کشادہ قلبی وفراخ دلی کا جو معاملہ کیا گیا یورپ کی پوری تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

مشہور جرمن مستشرقہ مسز ہونکہ جو ''مغرب پر اسلام کا سورج طلوع ہورہا ہے'' اور ''أرحم الفاتحين'' کی مصنفہ ہیں، کہتی ہیں کہ مسلم فاتحین نے کبھی بھی اسلام قبول کرنے پر کسی کو مجبور نہیں کیا، اس کے برعکس عیسائیوں نے نصرانیت قبول نہ کرنے پر قتل وغارتگری کا بازار گرم کیا، خصوصاً اندلس میں مسلمانوں پر ظلم وبربریت کے پہاڑ توڑے گئے۔

پوپ یوحنا نقیوسی نے اپنی کتاب ''تاريخ مصر: رؤية قطبية'' میں لکھا ہے کہ جب تک حضرت عمرو بن العاص مصر کے والی رہے کبھی بھی کلیسا سے ٹیکس نہیں لیا اور نہ ہی کسی ناروا امر کے مرتکب ہوئے، بلکہ جب تک مصر کے والی رہے کلیساؤں کی حفاظت کی۔

ایک دوسرا پوپ میخائیل سریانی کہتا ہے کہ بیزنطینی شہنشاہوں نے ہمارے مقدس کلیساؤں اور گرجا گھروں کو انتہائی بے دردی، سفاکی، اور ظلم ودہشت گردی سے لوٹ لیا، لیکن جب مسلمانوں کا عہد اقتدار آیا تو مسلم حکمرانوں نے ہم کو رومیوں کے ظلم سے نجات دلائی، اور ہم کو مکمل آزادی دی کہ ہم عیسائی جس طرح چاہیں اپنے

مذہب پر عمل کریں، مسلمانوں کے عہد حکومت میں ہم کو امن سکون نصیب ہوا۔(بحوالہ:تاریخ مصر في العصر البيزنطي ،از ڈاکٹر صبری ابوالخیر سلیم ،ص:۶۲،طبع قاہرہ،دارعین،۲۰۰۱م)۔

''تاريخ الأمة القبطية'' کے مصنف یعقوب نخلہ روفیلہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرو بن العاص کے زمانہ میں قبطیوں کو جو امن سکون اور راحت وچین نصیب ہوا وہ ان کو کسی اور زمانہ میں نصیب نہیں ہوا۔

لیکن یہ عجیب تضاد ہے کہ غیر مسلم مصنفین خصوصاً مستشرقین نے سیرت نبوی کے اس پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا اور پوری زندگی کو چھوڑ کر آخری عہد کے چند واقعات کو جو انتظامی یا تادیبی یا سماج کی اصلاح وتربیت کے تھے سیرت کا بنیادی حصہ قرار دیا اوران تادیبی، دفاعی اور انتظامی کارروائیوں سے استدلال کر کے بڑی دیدہ دلیری اور دیدہ ودانستہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم (نعوذ باللہ) تشدد اور طاقت کے استعمال کے داعی تھے اور اسلام تشدد اور جبر کی تعلیم دیتا ہے۔

اس جاہلانہ اور غیر منصفانہ تصور کو جو صلیبی جنگوں کے عہد میں بعض اہل قلم نے جان بوجھ کر اختیار کیا ابتک قائم رکھا گیا، اور سیرت نگاروں نے اسی گوشہ سے سیرت کو پیش کیا اور مغازی کے پہلو کو زیادہ لکھا، اور جو مظلومیت کا عہد تھا جس میں ظلم وبربریت کا صبر کیساتھ مقابلہ کیا گیا، اور جارحیت کا معاملہ آپ کے ساتھ کیا گیا، جس کا سلسلہ فتح مکہ تک جاری رہا، اس کو اتنی تفصیل سے نہیں لکھا گیا، سوائے چند کتابوں کے جن میں حضور ﷺ کے اسوہ حسنہ کے چند پہلوؤں کو بیان کیا گیا، اہل مغرب نے آخری عہد کو اپنی بحث وتحقیق کا موضوع بنایا اور صبر وتحمل اور ظلم کو برداشت کرنے والے عہد اور دنیائے انسانیت پر آپ ﷺ کے عظیم احسانات اور زندگی کے سارے میدانوں میں آپ ﷺ کے دوررس اور دیرپا نقوش واثرات کو نظر انداز کر دیا۔

مستشرقین نے آپ کی رحمت للعالمینی اورعفو ودر گزری کی صفت کو جو پوری زندگی پر محیط ہے، سنگ دلی سے تبدیل کر دیا، آج مغرب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق سے جو تصور قائم ہے اور جس کی ترویج کی جارہی ہے، وہ بدنیت مستشرقین کا دیا ہوا ہے جو ان کے ذہنوں اور دلوں میں ایسا راسخ ہو گیا ہے کہ زمانہ کی ترقیوں اور بحث وتحقیق کے میدان میں نئی نئی تحقیقات وانکشافات کے باوجود آج تک تبدیل نہیں ہو سکا جب کہ بہت سے تصورات جو مسلمات کی حیثیت رکھتے تھے اور عرصہ تک یورپ کے ذہن پر غالب رہے بدل گئے، لیکن مغرب کا تعلیم یافتہ طبقہ اس بات کی زحمت گوارہ نہیں کرتا کہ وہ صاف اور کھلے ذہن سے سیرت نبوی کا مطالعہ کرے اور حقیقت حال کا پتہ لگائے، حالانکہ جو لوگ سیرت نبوی کا حقیقت پسندانہ مطالعہ کرتے ہیں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت للعالمینی اورعفو ودر گزر کی صفت کا اعتراف کرتے ہیں، بہت سے حقیقت پسند اور انصاف پسند یورپین دانشوروں نے اسلام کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا، تو وہ اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہو کر حلقۂ بگوش اسلام ہو گئے اور اس کا بھی اعتراف کیا کہ ان کی سابقہ معلومات ناواقفیت پر مبنی تھیں۔

بعض بدنیت مغربی مورخین اور مستشرقین نے تو اس کا اظہار کیا کہ سیرت نبوی کے موضوع پر ان کے لکھنے کا مقصد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں کے تعلق کو ختم کرنا اور ان کے دلوں سے آپ کی محبت، والہانہ شیفتگی، اور آپ کے تقدس کے نقش کو مٹانا ہے، ان خطرناک مستشرقین میں سرفہرست مندرجہ ذیل ہیں، ولیم میور، واشنگٹن آرونگ، آربری (A.J. Arberry)، الفرڈ گیوم (A. Geom)، گولڈزیہر (Goldizher)، زویمر (S.M. Zweimer)، گرون بام (G. Vom Grunbaum)، فیلیب ہٹی (P.H. Hitti)، وینسنک (A.J. Wensink) لوی ماسینون (L. Massignon)، مارگولیوتھ (D.S.

(Margoliouth)۔

زہریلے مواد پر مشتمل ان کتابوں کو مسلمانوں کے غلبہ کے زمانہ میں اور قرون وسطی میں یورپ کی ظلمت اور پسماندگی کے عہد میں یورپ کے عیسائیوں میں جو مرعوبیت یا احساس کمتری پایا جاتا ہے اور اسلام سے موروثی عداوت اور پھر صلیبی جنگوں کے اثر سے عوام میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، اس جانبدارانہ، حاقدانہ تصور کو تاریخ، قصہ اور ناول کے ذریعہ عام کیا گیا، اس کے مطابق فلمیں بنائی گئیں، اور عالم اسلام کے سماجی، سیاسی واقعات کو اسلام کی تعلیم اور خود ذات رسول کریم سے جوڑنے کی کوشش کی گئی، اور نصاب تعلیم میں داخل کی گئیں۔

یورپ کی نشأۃ ثانیہ اور مسلمانوں سے رابطہ کے دور میں اس کی ضرورت تھی کہ اس کا علمی جائزہ لیا جاتا، مگر سامراجی مصلحت سے یہ کام نہ ہوسکا، سامراجی دور میں مسلم ملکوں کی دانشگاہوں میں وہی زہریلا لٹریچر داخل نصاب کیا گیا، اور سیرت نبوی پر کام کرنے والے مصنفوں نے اور خود مسلم سیرت نگاروں اور مورخین نے ان کتابوں کو تحقیقی تصنیف سمجھ کر قابل اعتبار سمجھا، حالانکہ ضرورت تھی کہ ان کا تنقیدی جائزہ لیا جاتا، جس کی وجہ سے یورپ کے ساتھ ساتھ خود عالم اسلام میں سیرت نبوی کے تعلق سے غلط حقائق و معلومات عام ہوگئیں اور مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ اس سے متاثر ہوا۔

مستشرقین نے یہ کتابیں ایسے وقت میں تصنیف کیں جب کہ پوری دنیا پر مسلمانوں کو سیاسی غلبہ حاصل تھا اور دوسری طرف یورپ جہالت و گمراہی سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا اور مسلم فاتحین کا رعب و دبدبہ اس پر چھایا ہوا تھا، اسی کے ساتھ ساتھ یورپ خانہ جنگی سے بھی دوچار تھا، سوسالہ، تیس سالہ، دس سالہ اور تین سالہ جنگیں یورپین خانہ جنگی کی واضح مثالیں ہیں جن میں لاکھوں لوگوں کا قتل عام ہوا اور ان خون آشام خانہ جنگیوں کی وجہ سے زندگی سے مایوسی عام ہوگئی اور اسی کیساتھ ساتھ مسلم

فاتحین کی کامیابیوں اور اسلامی تہذیب وتمدن کے عروج کو دیکھ کر یورپ احساس کہتری کا شکار ہو گیا تھا اور جس کے نتیجہ میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کینہ وحسد، بغض وعناد پیدا ہو گیا۔

یورپ نے مسلمانوں کے عہد اقتدار وغلبہ میں دو بدو جنگ کرنے کے بجائے مکر وفریب، عیاری ومکاری، چالبازی، بہتان تراشی وافترا پردازی اور کذب بیانی کا راستہ اختیار کیا اور مسلمانوں کے خلاف فکری وتہذیبی جنگ چھیڑ دی۔

یورپ کی علمی بیداری کے اوائل میں اسلام کے تعلق سے ایک کتب خانہ وجود میں آیا جس کا بیشتر حصہ سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق تھا، لیکن یورپ نے اسلامی موضوعات پر تحقیق وریسرچ میں اس حقیقت پسندی اور غیر جانبداری کا ثبوت نہیں دیا جو دوسرے علوم وفنون کے میدان میں نظر آتی ہے، بلکہ اسلام کے تعلق سے اسی روش اور نہج پر قائم رہا جو صلیبی جنگوں کے زمانہ میں رائج تھا اور صلیبی عہد کے تصورات وخیالات کو یورپین اہل قلم جوں کا توں نقل کرتے رہے، حالانکہ بحث وتحقیق کی رو سے ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ یورپ دوسرے میدانوں کی طرح اس میدان میں بھی حقیقت پسندی اور غیر جانبداری کا ثبوت دیتا۔

دنیا میں غیر جانبدار اور انصاف پسند اہل قلم بھی ہیں جنھوں نے عام نہج سے ہٹ کر صداقت وسچائی کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے تعلق سے یورپ میں رائج غلط اور گمراہ کن تصورات کو بے بنیاد ٹھہرایا ہے، لیکن یہ کتابیں یورپ میں رواج نہ پاسکیں، کیوں آج بھی اسلام کے تعلق سے اہل یورپ کے ذہن ودماغ مسموم ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے انصاف پسند مورخین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضل وکمال اور انسانیت پر آپ ﷺ کے احسان کے معترف ہیں مثال کے طور پر ''لامرٹائن'' ''ڈیورانٹ'' ٹوماس کارلائل'' ''جاک ریسلر''

''ہوبرٹ جارج ویلس'' اور ''ہنری'' جیسے اہل علم اور دانشوروں نے اپنی کتابوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انسانیت نوازی کا صاف لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔

لیکن ناکام صلیبی جنگوں کے عہد سے اسلام سے بغض وعناد اور نفرت وعداوت کا جو ماحول چلا آ رہا ہے اس کی وجہ سے وہی کتابیں مقبول عام ہوئی ہیں جن میں اسلام کے تئیں زہریلا مواد ہوتا ہے، اس سب کی بنیاد وہی قدیم تصور ہے جو یورپی قوموں کے ذہنوں میں رچ بس گیا ہے اور یورپ کے نصاب تعلیم میں وہی کتابیں داخل ہیں جو اسلام مخالف اور گمراہ کن حقائق ومعلومات پر مشتمل ہیں، جس کی وجہ سے بچپن ہی سے ذہنوں میں اسلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلط تصویر قائم ہو جاتی ہے۔

مسلم اہل قلم اور مفکرین کو چاہئے تو یہ تھا کہ وہ یورپ کی اس علمی وفکری یلغار کا مقابلہ کرتے، لیکن افسوس کہ وہ اپنی تمام تر توجہات یورپ کے عسکری حملے کے دفاع میں صرف کرنے کی وجہ سے اس بھیانک فکری وعلمی یورش پر توجہ نہ دے سکے، حالانکہ یورپ عالم اسلام پر اپنے استعماری حملے سے قبل ہی اس خاموش سنگین علمی وفکری جنگ کی ابتدا کر چکا تھا

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں نے سیرت نبوی پر ایک قیمتی ذخیرہ تیار کیا، اور سیرت نبوی کا موضوع مسلم مصنفین کا پسندیدہ اور محبوب موضوع رہا ہے، اسی حب رسول اور ذات نبوی سے والہانہ تعلق وشیفتگی کے نتیجہ میں ان کے قلم سے ایسی نادر اور بیش قیمت کتابیں وجود میں آئیں جن سے اہل ایمان کے قلوب عشق رسول کی روشنی سے منور وفروزاں ہوتے ہیں، اور ان کے دلوں میں حب رسول کی خاطر سب کچھ قربان کر دینے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، لیکن مسلم مصنفین کی کتابیں مسلمانوں ہی کی زبانوں میں ہیں اور یقیناً ان کتابوں نے حب رسول اور اتباع سنت کے جذبہ کو خوب فروغ دیا، اسی طرح نعتیہ قصائد نے بھی مسلمانوں میں عقیدت کے جذبات کو اور جلا بخشی ہے، لیکن غیر مسلموں کے نظریہ کو ان کتابوں کے ذریعہ نہیں بدلا جا سکتا، بلکہ ان کے تصورات کو ان

کی زبانوں میں سیرت پر لٹریچر پیش کر کے بدلا جا سکتا ہے۔

اسلام اور سیرت نبوی کو علمی وفکری انداز میں پیش کرنا وقت کا اہم فریضہ اور مسلمانوں کی اولین ذمہ داری ہے جو کسی طرح بھی دعوتی فریضہ سے کم اہمیت کی حامل نہیں، بلکہ تقریباً دونوں کی حیثیت یکساں ہی ہے، حالات کا تقاضا ہے کہ اسلامی نظام زندگی کی اہمیت وافادیت اور محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی تابناک حقیقی زندگی کو غیر مسلموں کے سامنے علمی وعصری انداز میں پیش کیا جائے، چنانچہ اسلامی اداروں کی اولین ذمہ داری ہے کہ تاریخ اسلام اور سیرت نبوی کے موضوع پر علمی انداز میں ایسی کتابیں تصنیف کریں جن میں ذات رسول ﷺ کے متعلق کئے جانے والے تمام اعتراضات کا تشفی بخش اور قابل اطمینان جواب ہو، اسی کے ساتھ حالات اور قارئین کے مزاج ومذاق کا بھی بھرپور خیال رکھا گیا ہو، اس لئے کہ اس قسم کے شکوک وشبہات صرف غیر مسلموں کے ذہنوں ہی میں نہیں پائے جاتے بلکہ مغربی تعلیم یافتہ مسلم طبقہ کے ذہنوں میں بھی غیر مسلموں کے گمراہ کن باطل نظریات کی وجہ سے نت نئے شکوک وشبہات نے جگہ بنالی ہے۔

سیرت نبوی پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں غزوات کو بہت نمایاں کیا گیا، جس کا تعلق حیات مبارکہ کے اس عہد سے ہے جس میں ظلم اپنی انتہا کو پہونچ گیا تھا اور ہر طرف سے مسلمانوں پر یلغار تھی، ایسی صورت میں مسلمان اپنے دفاع پر مجبور تھے، قرآن کریم خود اس کی طرف اشارہ کررہا ہے ﴿أذن للذين يقاتلون بأنهم ظُلِمُوا و إن الله على نصرهم لقدير﴾ [سورہ حج:۳۹]۔ حالانکہ کچھ عرصہ پہلے صلح حدیبیہ کو قبول کرنا پڑا، جس کے بارے میں اکثر صحابہ کرام کو اشکال تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ وہ دشمن سے مقابلہ کرسکتے ہیں، اس کا انہوں نے اظہار بھی کیا کہ ہم کو یہ ذلت کیوں برداشت کرنی پڑ رہی ہے، اکثریت کی رائے اس کے خلاف تھی، مگر حضور ﷺ پر دعوتی

اور مصالحانہ جذبہ غالب تھا، اس لئے آپ ﷺ نے اس صلح کو قبول فرمالیا اور دو صحابی جو کفار کے قبضہ میں تھے، اس وقت فریاد لے کر آئے تو آپ نے ان کو واپس جانے پر مجبور کیا، مورخین کا خیال ہے کہ اس صلح سے جو فائدہ ہوا وہ جنگوں سے نہیں ہوا اور اس صلح کے نتیجہ میں فتح مکہ کا واقعہ پیش آیا۔

فتح مکہ کا واقعہ خود رحم وکرم کے معاملہ کی ایک نمایاں دلیل ہے، سیرت نبوی کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ حضور ﷺ کس انداز سے مکہ میں داخل ہوئے، جہاں ان کے اکثر دشمن موجود تھے، حضور ﷺ نے سب کو معاف فرمادیا اور ایک صحابی کے منہ سے طبعی طور پر جو جملہ نکلا کہ آج انتقام کا دن ہے، آپ نے بدلوا کر اعلان فرمایا کہ آج رحم کا دن ہے اور ان کے ہاتھ سے علم لے لیا۔

اس عہد میں پھر بہت زور وشور سے اس کا پروپیگنڈا کیا جارہا ہے اور میڈیا کے سارے وسائل استعمال کے جارہے ہیں، حتی کہ قرآن کریم کو تشدد کی کتاب اور اللہ جل شانہ کو ''جنگ کا خدا'' کے نام سے موسوم کیا جارہا ہے، اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ مکمل سیرت کو پیش کیا جائے اور اس کو مختلف عالمی زبانوں میں نقل کیا جائے تا کہ غیر مسلموں اور مغرب زدہ مسلم دانشوروں کو پوری سیرت سے واقفیت حاصل ہو اور وہ پہلو جو حیات مبارکہ کا غالب پہلو تھا، سب کے سامنے آئے۔

سیرت پر مختلف زاویوں سے کتابیں لکھی گئیں، کسی میں آپ ﷺ کو ایک قائد کی حیثیت سے پیش کیا گیا، کسی میں ایک معلم اور مربی کی حیثیت سے پیش کیا گیا، کسی میں ایک سیاسی لیڈر یا انقلابی رہنما کی حیثیت سے پیش کیا گیا، کسی میں عربوں کا نجات دہندہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا، لیکن حضور ﷺ کی اصل خصوصیت معلم اخلاق اور معلم انسانیت اور رحمۃ للعالمین ہے، اور اسی کو حضور ﷺ نے خود اپنی بعثت کا مقصد قرار دیا۔

برادر گرامی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے اپنی

اس سیرت کی کتاب میں آپ کی جامع تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اس کتاب سے یہ اندازہ ہوگا کہ کتنی غلط تصویر پیش کی جاتی رہی ہے، اور یورپ کے مصنفین نے کتنی بہتان تراشی اور کذب بیانی سے کام لیا ہے، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے عرصہ تک سیرت کا درس دیا، تاریخ عرب اور جغرافیہ ان کا خاص موضوع رہا ہے، اور جغرافیہ اور تاریخ ادب عربی پر ان کی تصنیفات علمی حلقوں میں مقبول ہوئیں، اس لحاظ سے یہ موضوع ۵۲ سال سے زائد مدت تک ان کے زیر مطالعہ اور درس میں رہا ہے، کیونکہ سیرت پر لکھنے کے لئے عربوں کے مزاج، قومی خصوصیات اور ماحول سے گہری واقفیت بہت ضروری ہے، یہ صرف تاریخ کا موضوع نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے اس ماحول سے گہری واقفیت بھی ضروری ہے جس ماحول میں اس ذات کریم کی نشو ونما اور پرورش ہوئی اور داعی اور مدعو دونوں سے گہری واقفیت بھی بہت ضروری ہے۔

اس کتاب کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ کتاب کی زبان سلیس، عام فہم اور استدلال بھی علمی اور تحقیقی ہونے کے ساتھ عام فہم ہے، اس میں معاندین اور مخالفین کے ذہن کو سامنے رکھا گیا ہے، اور مجادلانہ اسلوب کے بجائے حکیمانہ اور نفسیاتی اسلوب اختیار کیا گیا ہے، یہ کتاب سیرت کے کتب خانہ میں ایک اضافہ ہے اور ضرورت ہے کہ ان زبانوں میں نقل کی جائے جو غیر مسلم استعمال کرتے ہیں، اس سے امید ہے کہ حضور ﷺ کے بارے میں جو غلط تصورات ذہنوں میں ہیں، وہ دور ہوں گے، اللہ تعالیٰ مصنف گرامی کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ انہوں نے اس کام کے لئے سیرت نبوی کے ذخیرہ کا گہرا مطالعہ کیا اور اس کا صحیح نچوڑ اس کتاب میں پیش فرما دیا۔

محمد واضح رشید حسنی ندوی
ندوۃ العلماء لکھنؤ

۲۱ر شوال ۱۴۲۹/ھ
۲۲ر اکتوبر ۲۰۰۸/ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

الحمد لله رب العالمين، و الصلاة و السلام على سيد المرسلين و خاتم النبيين محمد بن عبد الله الأمين ، و على آله و صحبه أجمعين، أما بعد ۔

اس کائنات ارضی وسماوی اور اس کی لامحدود وسعتوں میں اصل ذات ان سب کو بنانے اوران میں جاندار و بے جان ہر چیز کو پیدا کرنے والی واحد ذات اللہ تعالی کی ہے جس نے یہ سب زمین وآسمان بنائے اور اس میں طرح طرح کی مخلوقات پیدا کیں اوران میں سے انسانوں کو مخلوق کی زیادہ امتیازی خصوصیات عطا کیں، جن میں خاص طور پر علم سے فائدہ اٹھانے کی خصوصی صلاحیت عطا کی، اور اس صلاحیت کے ساتھ اس زمین پر اس کو آباد کرتے ہوئے اس کو ذمہ داریاں عطا کیں، اوران ذمہ داریوں کی انجام دہی کی تاکید کی اور اس کے لئے دنیا میں رہکر زندگی گزارنے کے تعلق سے جو جو ضرورتیں پیش آسکتی ہیں ان کے حصول کے لئے ان کے سب ضروری وسائل واسباب بھی مہیا کردئے۔

مذکورہ بالا خصوصیات کے تعلق سے انسان کو یہ دیکھنا اور سمجھنا ہے کہ اس زمین پر اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں اور ان کے سلسلہ میں اس کے خالق و مالک کا حکم کیا ہے؟ چنانچہ اس کو بتانے اور توجہ دلانے کے لئے جب جب اور جیسے جیسے ضرورت ہوتی رہی سب کا خالق و مالک اللہ رب العزت انہی انسانوں میں سے ممتاز صفات

کے کسی فرد کو نبی مقرر کرتا رہا اور اس کے ذریعہ انسانوں کو ان کے خالق و مالک ہونے کے تعلق سے پیغام ہدایت پہونچاتا رہا تاکہ اس کے ذریعہ انسان اپنی زندگی کو سنوارے اور اس زمین پر اپنی ذمہ داری انجام دینے کا فرض انجام دے، یہ نبی ورسول اپنی قوم پر نظر رکھتا اور یہ دیکھتا کہ وہ لوگ غلط کام تو نہیں کرنے لگے ہیں اور عیش وعشرت میں پڑ کر اپنے مالک کے احسان کو بھول تو نہیں گئے، چنانچہ یہ نبی برابر آتے رہے اور اپنی قوموں کو غلط باتوں سے بچنے اور اپنے رب کے حکموں ہی پر چلنے کی دعوت دیتے رہے اور اس بات سے ڈراتے رہے کہ سب کے خالق و مالک کے جو احکام ہیں ان پر عمل نہ کرنے پر وہ تم سے ناراض ہوگا اور پھر گناہوں پر سزا دیگا۔

غرض انبیاء اپنی اپنی قوم کو غلط باتوں سے منع کرتے اور اپنے خالق و مالک کی فرمانبرداری کی طرف توجہ دلاتے اور اچھے برے کا فرق بتاتے تھے اور کہتے کہ تمہارے خالق اور رب نے جب سب نعمتیں دیں تو وہ کیسے یہ بات پسند کرے گا کہ اس کے احسانات کو انسان نظر انداز کرے اور اس کے مالک و خالق ہونے کا جو حق اس پر عائد ہوتا ہے اس کو نہ سمجھے اور سب سے بڑا جرم یہ کرے کہ محض اپنی خیالی رائے پر مخلوقات یا جمادات میں سے کسی دوسرے کو اپنا رب اور خدا بنا بیٹھے، یہ تو اتنا بڑا جرم ہے کہ اس پر تو وہ انسان کو فوراً سزا دے سکتا تھا اور زندگی کے سب سامان اور نعمتوں سے اس کو محروم کر سکتا تھا، لیکن وہ رحیم و کریم ہے، پہلے نبی بھیج کر توجہ دلاتا اور برے انجام سے ڈراتا اور ایک مدت تک رعایت فرماتا ہے، اس کے بعد بھی نبی کی بات نہ مانی جائے اور اپنے کو درست نہ کیا جائے تو پھر سزا دیتا ہے، اس طرح مختلف زمانوں اور مختلف قوموں میں اسی کام کے لئے بے شمار نبی اپنے اپنے زمانوں میں آئے اور ان میں سے ہر ایک نے لمبی لمبی مدت تک سمجھانے اور بتانے کا کام انجام دیا۔

اللہ تعالی نے اس کا ذکر اپنے کلام میں اس طرح کیا ہے:

﴿كان الناس أمة واحدة، فبعث اللّه النبيين مبشرين ومنذرين، وأنزل معهم الكتاب بالحق ليحكم بين الناس فيما اختلفوا فيه، وما اختلف فيه إلا الذين أوتوه من بعد ما جاء تهم البينات بغياً بينهم، فهدى الله الذين آمنوا لما اختلفوا فيه من الحق بإذنه، والله يهدي من يشاء إلى صراط مستقيم﴾

[سورہ بقرہ:۲۱۳]

پہلے تو سب لوگ ایک ہی طریقہ کار پر تھے، (جب وہ حق باتوں سے ہٹنے لگے) تو خدا نے (ان کی طرف) بشارت دینے والے اور ڈرسنانے والے نبی بھیجے اور ان پر سچائی رکھنے والی کتابیں نازل کیں، تاکہ جن امور میں لوگ اختلاف کرتے تھے ان کے معاملہ میں فیصلہ کردے اور ان کے بارے میں اختلاف بھی انہی لوگوں نے کیا جن کو کتاب دی گئی تھی، باوجود یہ کہ ان کے پاس کھلے ہوئے احکامات آچکے تھے (اور یہ اختلاف انہوں نے صرف) آپس کی ضد سے کیا، تو جس امر حق میں وہ اختلاف کرتے تھے خدا نے اپنی مہربانی سے مومنوں کو اپنے حکم سے حق کی راہ دکھادی اور خدا جس کو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھادیتا ہے۔

اللہ تعالی گزشتہ امتوں میں جب جب گمراہیاں بہت بڑھ جاتیں تو ان کی ہدایت کے لئے نبی مقرر کرتا جو وحی الٰہی کے تحت اس میں ہدایت کا کام کرتا، نبی مقرر کرنے میں ایسے شخص کا انتخاب کرتا جو اپنی انسانی صلاحیتوں اور خصوصیات کے لحاظ سے بھی دوسرے لوگوں سے بہت بہتر اور مکمل ہوتا، چنانچہ ان خصوصیات کے ساتھ حسب ضرورت مختلف زمانوں میں نبی مقرر کئے جاتے رہے، آخری زمانہ کے لئے جو چھٹی صدی عیسوی سے شروع ہوا، اللہ تعالی کی طرف سے قبیلہ قریش سے جو اللہ تعالی کے بڑے برگزیدہ نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے برگزیدہ فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل میں ممتاز خصوصیات کا قبیلہ تھا، مگر اپنے رب کی اطاعت

وعبادت چھوڑ کر اپنی خواہش اور پسند کے لحاظ سے طرح طرح کی نافرمانی کی باتوں میں مبتلا ہو گیا تھا، اسی کے ایک نیک سیرت واچھے کردار کے فرد حضرت محمد ﷺ کو آخری نبی مقرر کیا گیا اور ان کی ذمہ داری کے کام میں عقیدہ توحید کی صحت اور اپنے رب واحد کی عبادت اور اس کے حکموں پر چلنے کے ساتھ اس کے دئے ہوئے علم سے صحیح فائدہ اٹھانے اور اجتماعی نظام کو انسانی اور شریفانہ نظام بنانے کی ذمہ داری رکھی گئی اور وحی کے ذریعہ آپ ﷺ کی رہنمائی کی جاتی رہی، اور آپ کو سیرت و کردار اور اخلاق وصفات کے لحاظ سے اعلیٰ صفت انسانوں کا نمونہ بنادیا گیا، اور اس طرح آپ میں انسانی زندگی کے تمام اعلیٰ اور مفید پہلو جمع ہو گئے اور آپ انسانی زندگی کی اعلیٰ صفات میں تمام انسانوں کے لئے ایسا نمونہ بن گئے کہ تمام انسانوں کو زندگی کے جس پہلو میں اعلیٰ نمونہ جاننے کی ضرورت ہو تو وہ آپ ﷺ کی زندگی میں اس نمونہ کو دیکھ سکیں اور اپنا سکیں اور نمونہ کا انسان معلوم کرنا ہو تو اس کے لئے آپ ﷺ کی حیات طیبہ سے یہ مطلوبہ نمونہ حاصل کر سکیں اور اس کا حکم بھی باقاعدہ اللہ تعالیٰ کی مقدس کتاب قرآن مجید میں دیا گیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لقد كان لكم في رسول الله أسوة حسنة لمن كان يرجو الله واليوم الآخر وذكر الله كثيراً﴾

یقیناً تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ میں عمدہ نمونہ ہے ہر اس شخص کے لئے جو اللہ تعالیٰ کی اور قیامت کے دن کی توقع رکھتا ہے اور بکثرت اللہ تعالیٰ کی یاد کرتا ہے۔

[سورہ احزاب:۲۱]

اس طرح حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو تمام انسانوں کے لئے ایک نمونۂ کامل کی حیثیت حاصل ہوگئی اور آپ ﷺ کا قول وعمل اور خدا تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ تعلیمات واحکام قیامت تک آنے والے انسانوں کو درست اور خدا کی بندگی کے طور طریق اختیار کرنے کے لئے رہبر اور رہنما بن گئے، اور وحی کے ذریعہ آپ ﷺ کا

ہر قول وفعل اللہ تعالی کی طرف سے تائید شدہ ہوگیا، اسی کے لئے اللہ تعالی نے قرآن مجید میں فرمایا:

﴿من يطع الرسول فقد أطاع الله﴾[سورۃ النساء:۸۰]

جو شخص رسول کی فرماں برداری کرے گا تو بیشک اس نے خدا کی فرماں برداری کی۔

اور فرمایا:

﴿وما ينطق عن الهوىٰ إن هو إلا وحي يوحى﴾

[سورہ نجم:۳-۴]

اور نہ خواہش نفس سے منہ سے بات نکالتے ہیں، یہ (قرآن) تو حکم خدا ہے جو ان کی طرف بھیجا جاتا ہے۔

اس طرح آپ ﷺ کے قول وفعل کی تابعداری تا قیامت دائمی ہوگئی جس سے ہر سمجھدار شخص کے لئے فائدہ اٹھانا ضروری ہوگیا۔

آپ ﷺ سے قبل کی قوموں میں اور زمانوں میں حسب ضرورت برابر انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے عہد کے خراب حالات کی اصلاح کے لئے اور اسی عہد کے مطابق ہدایت کے لئے پیغام لیکر آتے رہے، ان سب کے اخیر میں آپ ﷺ بطور خاتم النبیین مبعوث کئے گئے، حضور ﷺ کو جو تعلیمات پروردگار عالم کی طرف سے دی گئی تھیں، وہ صرف مقامی لوگوں یا کسی خاص طبقہ کے لئے ہی نہیں دی گئیں، بلکہ وہ تمام انسانوں اور آئندہ آنے والے زمانوں کے لحاظ سے صحیح عقائد وعبادات کی تلقین کے لئے دی گئیں، چنانچہ فرمایا گیا:

﴿وما أرسلناك إلا كافة للناس بشيراً ونذيراً ولكن أكثر الناس لا يعلمون﴾

[سورہ سبا، آیت نمبر:۲۸]

اور (اے محمد) ہم نے تم کو تمام لوگوں کے لئے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

چنانچہ آپ ﷺ نے دنیا کے تمام انسانوں کو مخاطب کیا، پھر آپ ﷺ کے حکم

سے علم اور پڑھانے کا دور شروع ہوا، اس کیلئے تحریر اور حفاظت علم کا جو اہتمام ہوا اس کے ذریعہ آپ ﷺ کی سب باتیں بھی ضبط تحریر میں لے آئی گئیں، جو فوری طور پر آپ ﷺ کے صحابۂ کرام کے سینوں میں محفوظ ہوگئی تھیں، پھر جلد ہی ضبط تحریر میں لے آئی گئیں، ان میں آپ ﷺ کے سب اقوال و احکام اور آپ ﷺ کی حیات طیبہ کے تمام حالات بھی ضبط تحریر میں آگئے۔

حضور ﷺ اس دنیا میں قمری تاریخ کے لحاظ سے ۶۳ سال رہے، آپ ﷺ کی اس ۶۳ سالہ حیات طیبہ کے تین دور ہوئے، پہلا دور پیدائش سے لیکر ۴۰ سال کی عمر تک، دوسرا دور ۴۱ سے ۵۳ سال کی عمر تک اور تیسرا دور ۵۴ سے ۶۳ سال کی عمر تک، پہلا دور آپ کو نبوت کی ذمہ داری ملنے سے پہلے کا ہوا، جو آپ ﷺ نے اپنے خاندان میں صاف ستھرے اخلاق وصفات اور اعلی سیرت وکردار کے ساتھ گزارا اور اسی صاف ستھرے اور اعلی کردار کی بنا پر آپ ﷺ اپنے قبیلہ وخاندان میں بہت محبوب اور مقبول رہے، اسی دور میں آپ ﷺ ۲۵ سال کی عمر کو پہونچنے پر رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے اور اس وقت سے آپ گھریلو زندگی کی ذمہ داریاں انجام دینے لگے، آپ ﷺ کو بہت اچھی رفیقۂ حیات ملی تھیں، جن کی طبیعت ومزاج آپ کی طبیعت ومزاج سے مل گیا تھا، چنانچہ ان کے ساتھ آپ ﷺ کی زندگی بڑے انس وتعلق کی رہی اور ان سے اولادیں ہوئیں اور ان کی اچھی تربیت بھی ہوئی۔

۴۰ سال کی عمر ہونے پر آپ ﷺ کے پاس اللہ تعالی کی طرف سے پہلا پیغام آیا اور پھر وہ وقتاً فوقتاً برابر آتا رہا اور آپ ﷺ کو انسانوں کی ہدایت کے لئے ضروری بات کہنے اور کرنے کی آسمانی وحی کے ذریعہ بتائی جاتی رہی اور اس کے ذریعہ آپ ﷺ پر قوم کو سمجھانے اور حق بات اختیار کرنے کی تلقین کرنے کی ذمہ داری ڈالی جاتی رہی، یہ ۵۳ سال کی عمر پہونچنے تک آپ ﷺ کی حیات طیبہ کا دوسرا دور تھا، اس

میں آپ ﷺ کو اپنی قوم کو اللہ تعالی کی نافرمانیوں اور گناہوں اور ظلم وزیادتی چھوڑنے کی نصیحت کرنے کا کام سپرد ہوا، جس کو آپ انجام دیتے رہے، اس کام کے شروع کرنے پر قوم ناراض ہونے لگی کہ ہم جو کچھ اپنے باپ دادا کو کرتے دیکھتے رہے ہم اس کو نہیں چھوڑیں گے اور اسی پر قوم کے اکثر و بیشتر لوگ آپ ﷺ کی مخالفت کرنے لگے حتی کہ آپ ﷺ کو اس کام سے روکنے کے لئے آپ کو اور آپ کے ماننے والوں کو طرح طرح کی تکلیفیں دینے لگے، مگر آپ ﷺ کو حکم صبر کرنے کا تھا، کہ تکلیفیں برداشت کرو اور دعوت واصلاح کے لئے کہتے رہو، چنانچہ آپ ﷺ سب برداشت کرتے رہے اور نصیحت کرتے رہے حتی کہ آپ ﷺ کو جان سے مار دینے کا غور ہونے لگا، مگر پھر بھی آپ صبر وتحمل کے ساتھ کام کرتے رہے، جب حالات ایسے ہوگئے کہ کام کرنا ناممکن ہوگیا اور آپ کو جان سے مار دینے کی سازش تیار ہوگئی اور دوسری طرف مدینہ منورہ کے بعض قبائل کی طرف سے آپ کی مدد ونصرت کا وعدہ بھی ہوگیا کہ آپ وہاں منتقل ہوجائیں اور وہاں سے کام کریں، تو آپ ﷺ مکہ شہر چھوڑ کر مدینہ آگئے جہاں کے اہم لوگوں نے آپ ﷺ کی باتیں مکہ آکر سنی اور مان لی تھیں اور مدد کا وعدہ کیا تھا، اور اپنے یہاں آجانے کی پیشکش کی تھی، مدینہ والوں نے پھر اس پیشکش کو پوری طرح نبایا اور آپ ﷺ کو مدینہ میں اپنے شہر کے سردار کی حیثیت سے ٹھہرایا، یہ آپ ﷺ کی حیات طیبہ کا تیسرا دور تھا۔

اور چونکہ اکثر اہل مدینہ آپ ﷺ کی تعلیمات مان کر خدا اور اس کے رسول کے حکموں کے تابعدار ہوگئے تھے، لہذا وہ مسلمان جو مکہ کے ۱۳ سالہ دور میں تھوڑی تعداد میں تھے اور بکھرے ہوئے تھے اور اپنے ہم وطن کافروں کا ظلم جھیل رہے تھے یہاں مدینہ میں آکر مسلمانوں کے ساتھ ملکر ایک طرح سے محفوظ ہوگئے اور دونوں جگہوں کے مسلمانوں نے مل کر باقاعدہ ایک قوم کی حیثیت اختیار کرلی اور نبی ﷺ کی

سرکردگی میں ان کا باقاعدہ دینی اور سماجی نظام قائم ہوگیا، جس کے احکامات اللہ تعالی کی طرف سے وحی کے ذریعہ حضور ﷺ کے پاس آتے تھے، اور آپ ﷺ ان احکامات کے مطابق خود بھی عمل کرتے تھے اور اپنے اصحاب اہل مدینہ کو بھی عمل کراتے تھے، یہ اہل مدینہ آپ ﷺ کے اور مسلمانان مکہ کے آنے سے قبل مکہ کے قبیلہ سے الگ قبیلہ کے تھے اور ان کے درمیان کشمکش بھی تھی، لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد مکہ کے اور مدینہ کے مسلمان آپس میں بھائی بھائی کی طرح ایک قوم بن گئے، مکہ کے مسلمان مہاجر کہلائے اور مدینہ کے مسلمان انصار، مدینہ کے مسلمانوں نے مکہ سے آنے والے اپنے بھائیوں کی پوری نصرت کی اور ہر چیز میں ان کو شریک کیا، ان دونوں کے علاوہ ایک تیسری قسم یہودی قبائل کی بھی تھی جو مدینہ میں آباد تھے لیکن وہ مسلمانوں سے الگ رہے۔ البتہ حضور ﷺ نے ان سے پرامن ساتھ رہنے کا معاہدہ کرلیا۔

مدینہ کی بڑی آبادی کے مسلمان ہوجانے کی وجہ سے وہاں باقاعدہ اسلامی معاشرہ قائم ہوگیا، جس میں ایمانی وحدت کے اثر سے اصل باشندے اور مکہ سے آئے ہوئے مہاجر مسلمان سب ایک وحدت بن گئے، اس سے یہ حضور ﷺ کی سرپرستی میں اسلامی اقدار کا حامل معاشرہ بن گیا، اس کا ہر عمل اپنے نبی کی ہدایات کے مطابق ہوتا تھا اور آپ ﷺ ان کی پوری تربیت کرتے تھے اور وہ پوری تابعداری کے ساتھ آپ ﷺ کی تربیت کے مطابق اپنی زندگی کو اعلی کردار کے مطابق ڈھالتے تھے اور آپ ﷺ کی ہدایت پر چلتے تھے، ادھر دوسری طرف مکہ کے مشرکوں نے جب یہ دیکھا کہ ان کے قبیلہ کے مسلمان ان کے قبضہ سے نکل گئے اور وہ مدینہ پہونچ کر مدینہ کے مسلمانوں کے ساتھ ملکر ایک بڑی طاقت بن گئے اور اب ان پر روک لگانا ان کے اختیار میں نہیں رہا تو وہ باقاعدہ فوجی طاقت کے ذریعہ مسلمانوں کو کچلنے کی تدابیر کرنے لگے، حضور ﷺ نے اس خطرہ کو محسوس کر کے اپنے اصحاب کو بھی تیار رہنے کا حکم دیا اور

معلوم کرتے رہے کہ مکہ والے کیا سازشیں کررہے ہیں، تاکہ انہیں دفع کیا جاسکے۔

اس طرح مدینہ کے ان دس سالوں میں مسلمانوں کو کئی قسم کی ذمہ داریوں اور آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑنے لگا، ایک تو پیغام الٰہی کو دوسروں تک پہنچانا جو کہ اسلام کا اصل مشن تھا اور اس کو نصیحت اور انسانی خیر خواہی کے ہی جذبہ سے انجام دینا تھا، صرف مقامی ہی نہیں، بلکہ دوسرے شہروں اور قبیلوں کے لوگوں کو بھی اپنی زندگیوں کو اپنے پروردگار کے حکموں کے مطابق سنوارنے کی تلقین کرنا تھا، کیونکہ آپ ﷺ پورے عالم کے لئے نبی بنا کر بھیجے گئے تھے، دوسرے مدینہ کے اپنے اصحاب کی دینی وعلمی اور اخلاقی تربیت کرنا تاکہ صفات واخلاق کے لحاظ سے بہتر سے بہتر خوبیوں کا معاشرہ وجود میں آئے، کیونکہ اسلام اسی بات کی پوری تلقین کرتا ہے کہ انسان صرف اپنی خواہشات پر عمل کرنے والا انسان نہ ہو، بلکہ اپنے رب کی نعمتوں کا شکر گزار اور نیک صفات اور صالح انسانی کردار کا انسان بنے، تیسرے مدینہ کے اپنے رفقاء واصحاب کی جماعت کا اجتماعی نظام قائم کرنا، تاکہ اجتماعی زندگی نظم وضبط اور آپس کی ہمدردی اور خیر طلبی کی بنے اور دشمنوں کے خطرات کے مقابلہ کے لئے جو ضروری دفاعی تدابیر ہوں ان کا نظم کیا جاسکے۔ چنانچہ اسی نظم وضبط اور حسن تدبیر کی بنا پر مکہ والوں کے متعدد فوجی حملوں کا مقابلہ کیا اور دشمن کو اس کی سازشوں میں ناکام بنا دیا۔

آپ ﷺ کو اپنے اس پورے کام میں رہنمائی کے لئے اللہ تعالی نے کلام مقدس پر مشتمل کتاب قرآن مجید عطا کی، آپ ﷺ اس سے روشنی حاصل کرتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ وحی کے ذریعہ جو حکم الٰہی آتا تھا اس پر عمل کرتے اور کراتے تھے، ان تمام معاملات میں آپ ﷺ کا طریقہ محض حکم دینا نہیں تھا، بلکہ اپنے اصحاب کے ساتھ عملی شرکت اور محبت واخلاق کے ساتھ بات کرنے کا تھا، انہیں بھلائی کی فکر کرنے اور بھلائی کو عام کرنے کے لئے اپنی ذاتی زندگی سے نمونہ پیش کرتے تھے،

آپ ﷺ کے اصحاب پر اس کا اچھا اثر پڑتا تھا، کہ وہ دل وجان سے آپ ﷺ کی تابعداری کرتے اور آپ ﷺ کے اشاروں پر چلتے پھر آپ ﷺ کی سب باتوں کو اپنی یاداشت میں محفوظ بھی کر لیتے تھے، پھر اس سب کو انہوں نے اپنے بعد میں آنے والوں تک پہونچایا، اس طرح حضور ﷺ کی پوری زندگی اپنے مختلف پہلوؤں کے ساتھ آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ بھی ہوگئی اور اللہ تعالی کی دی ہوئی کتاب قرآن مجید جو بنیادی رہنمائی کے لئے پہلے سے حاصل ہوگئی تھی، تحریری طور پر کتابوں میں آجانے پر آنے والے زمانوں کے لوگوں کے لئے سہل الحصول ہوگئی۔

اس طرح اللہ تعالی کے اس حکم کے مطابق جو اس کے کلام الہی میں آیا ہے:

﴿ولكم في رسول الله أسوة حسنة لمن كان يرجو الله واليوم الآخر وذكر الله كثيراً﴾ (احزاب:۲۱)

کہ تمہارے لئے اللہ کے رسول میں اچھا نمونہ ہے، یہ ہر اس شخص کے لئے جو اللہ سے فضل وکرم کی امید قائم کرے اور آخرت اور حساب کے دن کا خیال کرے اور اللہ کو خوب یاد کرے۔

قیامت تک تمام اہل ایمان کے لئے دستور حیات بن گئی جس کو جاننے اور اور اس کے مطابق عمل کرنے کی ذمہ داری ان سب انسانوں کے لئے ضروری ہوگئی جو خدا کو مانتے ہوں اور مرنے کے بعد کی زندگی میں نجات چاہتے ہوں اور اپنے خدا کی یاد اپنی زندگی میں بسانا چاہتے ہوں۔

اسی لئے مسلمان اہل علم حضرات نے حضور ﷺ کے اقوال اور آپ کی سیرت کے احوال کی جو تفصیل سے قلم بند ہوگئے تھے زیادہ سے زیادہ اشاعت کی کوشش کی تاکہ قیامت تک آنے والے فائدہ اٹھاسکیں۔

آپ ﷺ کے اقوال وحالات جن سے امت مسلمہ کو تا قیامت استفادہ کرنا ہے دو پہلوؤں پر مشتمل ہیں، ایک آپ ﷺ کی تعلیمات وہدایات جو آپ ﷺ نے

اپنے صحابہ کومختلف موقعوں پر دیں، اس کو حدیث نبوی کہتے ہیں، دوسرے وہ حالات جوخود آپ ﷺ عمل میں لائے ان کو سیرت نبوی کہتے ہیں، آپ ﷺ کے ان دونوں پہلوؤں کی باتوں کوحضور ﷺ کے صحابہ نے اپنے بعد کی نسل کے اہل ایمان کو پہونچایا، انہوں نے ان کو اپنے بعد کے لوگوں کو پہونچایا اور کتابوں میں سب قلم بند کرلیا گیا، آپ ﷺ کے ان حالات میں جو آپ ﷺ کی سیرت میں ملتے ہیں ان میں ایسے حالات بھی پیش آئے جن میں آپ ﷺ کو اپنے دشمنوں سے مقابلہ کرنا پڑا، جنکو تعداد اور طاقت اور پوزیشن میں مسلمانوں پر برتری حاصل تھی اور وہ اپنے وسائل کو اس مختصر جماعت کو ختم کرنے کے لئے استعمال کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہے، اس طرح جنگ کے بادل مسلمانوں کے سر پر ہمیشہ منڈلاتے رہے، اپنے دفاع میں مسلمانوں کو تلواروں اور دیگر اسلحہ کو جو بمشکل میسر آئے استعمال کرنا پڑا، آپ ﷺ کے ان مسلح مقابلوں کو جو اپنے دفاع میں تھے بعد میں ان تاریخ نویسوں نے جو اسلام کو قبول کرنے کے لئے راضی نہ ہوسکے، بلکہ اس کی مخالفت کا طریقہ اختیار کیا، حضور ﷺ پر ظلم اور جنگ پسندی کا الزام دیا، حالانکہ آپ ﷺ کی کوئی جنگ ایسی نہیں ہوئی جو آپ ﷺ نے دشمن کی کارروائی کا خطرہ محسوس کئے بغیر محض ملک گیری کے لئے اختیار کی ہو، جب بھی آپ ﷺ نے جنگ کی، کسی خطرۂ جنگ کو روکنے کے لئے کی اور جنگ کے بعد قیدیوں اور دشمنوں کے ساتھ جو آپ ﷺ کے اختیار میں آئے آپ ﷺ نے معافی اور رحم کا برتاؤ کیا۔

حق کی حفاظت کی کوشش میں جو محنت وکوشش ہو اور اس سلسلہ میں اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈالا جائے اس کو جہاد قرار دیا گیا، جہاد کے معنی اصل میں جدوجہد کرنے کے ہیں، اس طرح حق کی حمایت اور حق کے نفاذ کیلئے اور بلندی اخلاق کے لئے کوششوں کی مخالفت کرنے والوں سے مسلمانوں کو جو مقابلہ کرنا پڑا اس کے لئے

بھی جہاد کے لفظ کو استعمال کیا گیا، لیکن اس کے معنی یہ رکھے گئے کہ یہ جدوجہد حق اور اپنے پروردگار کی رضا حاصل کرنے کے لئے ہو، اپنے ذاتی فائدہ اور غرض مندی کے لئے نہ ہو اور اس راہ میں جو مشقت اور قربانی ہو اس کو برداشت کیا جائے، خواہ امن کی حالت میں ایسی کوشش ہو خواہ جنگ کی حالت میں ہو، لیکن اسلام کے مخالف لوگوں نے جہاد کے معنی ملک گیری اور دنیا طلبی کے لئے طاقت استعمال کرنے کو قرار دیدیا جو کہ بالکل غلط ہے، مسلمانوں کے مخالفوں نے اسی حوالہ سے اسلام کے خلاف اپنی کتابوں میں بہت سخت تبصرہ کیا، حالانکہ جہاد کے سلسلہ میں صاف صاف یہ ہدایت ہے کہ تم صرف اس سے لڑو جو تم سے لڑے اور اس لڑائی میں خدا کو راضی رکھنے کی نیت رکھو اور کسی بے گناہ کو نقصان نہ پہونچاؤ اور محض خواہشِ اقتدار کی بنا پر جنگ نہ کرو، صرف حق کی نصرت اور حفاظت کی ضرورت پڑنے پر جنگ کرو اور بصورت دیگر امن وامان اور صلح پسندی کے طریقے اختیار کرو، چنانچہ حضور ﷺ اور آپ کے سب صحابہ نے اسی طرح عمل کیا اور پھر اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ ﷺ کی ساری جنگوں میں اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے مقابلہ میں اعلی انسانی کردار اختیار کیا گیا، چنانچہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے دشمنوں کے مقابلہ میں انتہائی کم تعداد میں دشمنوں کی جانیں گئیں۔

البتہ بعد کے زمانوں میں بعض مسلم حکمرانوں سے ان کی اپنی ذاتی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر اسلام کے مقرر کردہ اصولوں کی پابندی کرنے میں کوتاہیاں بھی ہوئیں، لیکن ان کی جنگوں میں بھی مسلمانوں نے اپنے دشمنوں کی بہت کم جانیں لیں اور ان کے برعکس ان کے دشمنوں نے مسلمانوں کو بڑی تعداد میں مارا اور شہید کیا، اس کے برعکس مسلمانوں کے ہاتھوں جو دشمن مارے گئے ان کی تعداد بہت کم ہے جیسا کہ خود دشمن کے قلم سے لکھی گئی کتابوں میں درج ہوئی ہے، بہر حال کسی حکمراں نے اگر کچھ زیادتی کی ہو تو یہ اس کا ذاتی عمل قرار دیا جائے گا، اس کا الزام اسلام اور رسولِ

اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیا جاسکتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے طریقہ پر عمل کرنے والوں کے اس سلسلہ کے بھی بلند اخلاق اور اعلیٰ کردار کو سیرت و کردار کے غیر جانب دارانہ مطالعہ سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے، اس سلسلہ میں متعدد اسلام مخالف مؤرخین نے جو غلط فہمی پیدا کی اور سیرت نبوی علیہ السلام اور تاریخِ اسلام کو مخالفانہ انداز میں پیش کیا اس سے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے درمیان ایک خلیج حائل ہوگئی، اسلام کی صحیح تصویر پیش کر کے غلط فہمیاں دور کی جاسکتی ہیں جس کی اس زمانہ میں خاص طور پر بڑی ضرورت ہے۔

اس طرح کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے ضروری ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال واحوال کو ان کی صحیح شکل میں لوگوں کے سامنے لایا جائے ، یہ ایک بڑی انسانی ضرورت ہے، تاکہ اسلام اور رسول اسلام علیہ السلام کا صحیح حال اور کردار سامنے آئے اور اس سے غلط فہمی میں مبتلا لوگوں کی غلط فہمی دور ہو اور وہ اسلام کی حقانیت کو سمجھ سکیں اور حق کو جان سکیں، اسی مقصد سے مختلف اصحاب علم نے اس کی ضرورت کے مطابق کتابیں تیار کرنے کا اہتمام کیا۔

اور اس کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو حکومت ملی تو انہوں نے تاریخ میں ایک کتاب مدون کرنے کا عزم کیا اور اس مقصد سے ''عبیدہ بن شریۃ جرھمی'' کو صنعاء سے بلایا، جنہوں نے قدیم زمانہ کے بادشاہوں اور گزشتہ لوگوں کے حالات جمع کئے، اس کو دیکھ کر اہل علم نے عام تاریخ کے بجائے زیادہ تر سیرت نبویہ کو موضوع بنانا شروع کر دیا، یہ کام بالکل حضور علیہ السلام کے عہد میں شروع نہیں کیا گیا تھا، کیونکہ قرآن مجید کو ضبط تحریر میں لایا جارہا تھا اور حضور علیہ السلام کی احادیث بھی محفوظ کی جارہی تھیں، تو اس احتیاط میں کہ سیرت اور احادیث کے اجزاء قرآن مجید سے خلط ملط نہ ہوجائیں، شروع میں احتیاط کی گئی تھی،

لیکن ایک صدی ہجری گزر جانے پر جبکہ قرآن مجید کے حدیث وسیرت سے مخلوط ہو جانے کا خطرہ باقی نہیں رہا تھا، سیرت نویسی کا کام انجام دیا جانے لگا، چنانچہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے یہ دیکھ کر کہ اب قرآن مجید اور احادیث نبویہ کے الفاظ میں اختلاط پیدا ہونے کا خطرہ نہیں رہا کیونکہ سیکڑوں سینوں میں قرآن مجید محفوظ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی توجہ وکوشش سے صحیفہ میں منضبط کیا جا چکا ہے، حدیث وسیرت کو مرتب ومدون کرنے کی ہدایت دی (۱)۔

چنانچہ صحابۂ کرام میں جن حضرات نے سیرت نبوی سے متعلق احادیث کو اپنے اپنے طور پر جمع کر رکھا تھا ان کے ذریعہ ان کو ضبط تحریر میں لانے کا کام شروع کر دیا گیا، ان میں حضرت عبد اللہ بن عباس، البراء بن عازب، عبد اللہ بن عمرو بن العاص، انس بن مالک اور جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنھم نمایاں ہیں، اور تابعین میں جن حضرات نے سیرت نبوی پر خاص توجہ دی اور جن کی روایات تحریری شکل میں موجود ہیں، ان میں درج ذیل حضرات قابل ذکر ہیں:۔

(۱) عروۃ بن زبیر (م۹۴ھ)، (۲) ابان بن عثمان (م۱۰۵ھ)، (۳) وہب بن منبہ (م۱۱۰ھ)، (۴) عاصم بن قتادہ (م۱۱۹ھ) (۵) شرحبیل بن سعد (م۱۲۳ھ) (۶) محمد بن مسلم بن شہاب زہری (م۱۲۴ھ) (۷) عبد اللہ بن ابی بکر بن حزم (م۱۳۵ھ) اخیر کے چار حضرات نے مغازی پر خاص توجہ دی۔

اس کے بعد موسی بن عقبہ (م۱۴۱ھ) معمر بن راشد (م۱۵۰ھ) محمد بن اسحاق (م۱۵۲ھ) زیاد البکائی (م۱۸۳ھ) محمد بن عمر واقدی صاحب المغازی (م۲۰۷ھ) ابو محمد عبد الملک بن ہشام (م۲۱۳ھ) محمد بن سعد صاحب الطبقات الکبری (م۲۳۰ھ) اور ابن حزم (م۴۵۶ھ) صاحب ''جوامع السیرۃ'' نے سیرت نبوی کے

(۱) مقدمہ سیرت ابن ہشام، ص: ۵، طبعۂ دوم، ۱۹۵۵ء، دار الوفاق، بیروت لبنان، تحقیق: مصطفیٰ سقا، ابراہیم ابیاری، عبد الحفیظ شلبی۔

مختلف پہلوؤں کوشرح وبسط کے ساتھ بیان کیا۔

امام بخاری نے سیرت نبوی سے متعلق اکثر اور اہم روایتیں جمع کردی ہیں، جو ان کے شرائط صحیح کے مطابق ہیں، حافظ ابن حجر عسقلانی نے کتاب المغازی کی شرح ایک مستقل کتاب کی شکل میں مرتب کردی ہے، صحیح مسلم میں مستقل باب ''الجہاد والسیر'' کے نام سے موجود ہے۔

شروع میں سیرت کے سلسلہ میں صرف مغازی یعنی جہاد کے واقعات کو مدون کرنے پر عموماً انحصار کیا گیا تھا، لیکن ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں سیرت نبوی کے تمام پہلوؤں پر مشتمل معاملات کی تدوین وترتیب کا کام پوری طرح شروع ہوگیا، اس میں ابن اسحاق، ابن ہشام اور سہیلی کا نام نمایاں ہے، ابن اسحاق کو تدوینی دور کا اولین عالم قرار دیا گیا ہے، اور بعد میں آنے والے سیرت نگاروں نے ان کا اعتراف کیا اور زیادہ تر انہی کی روایات کو نقل کیا ہے، ابن ہشام نے ابن اسحاق کی کتاب کا اختصار پیش کیا ہے اور سہیلی نے ابن ہشام کی شرح کی ہے، مشہور ترین تصنیفات میں چند کے نام حسب ذیل ہیں:۔

جوامع السیرۃ النبویۃ، از: علامہ علی بن احمد بن حزم اندلسی (م۴۵۶ھ)

الدرر فی اختصار المغازی والسیر : از: امام یوسف بن عبد اللہ بن عبد البر قرطبی (م۴۶۳ھ)

الروض الأنف: عبد الرحمٰن سہیلی (م۵۸۱ھ)

عیون الأثر في فنون المغازی والشمائل والسیر :ابن سید الناس بصری شافعی (م۷۳۴ھ)

زاد المعاد في ھدی خیر العباد: علامہ ابن قیم جوزی (م۷۵۱ھ)

السیرۃ النبویۃ: امام ذہبی

الفصول فی سیرۃ الرسول ﷺ: حافظ ابن کثیر (م۷۷۴ھ)

انسان العیون في سیرۃ الأمین المأمون (سیرت حلبیہ): علی بن برہان الدین (م۹۷۵ھ)

المواہب اللدنیہ بالمنح المحمدیہ: احمد بن محمد بن ابی بکر خطیب قسطلانی

ابن جریر طبری اور حافظ ابوشجاع شیرویہ نے بھی اپنی اپنی تاریخی کتابوں میں سیرت رسول اکرم ﷺ پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔

۱۴۱۸ھ میں ڈاکٹر شیخ صالح بن عبداللہ بن حمید امام وخطیب حرم مکی نے اکتیس ماہرین علوم تاریخ وانساب وسیرت کے ساتھ مل کر "نضرۃ النعیم في مکارم أخلاق الرسول الکریم ﷺ" کتاب مرتب کی، جو سیرت کے موضوع پر ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔

سیرت نبی کا گرانقدر ذخیرہ اردو زبان میں بھی موجود ہے اور اس میں اضافہ دراضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے، اردو زبان میں مندرجہ ذیل مصنفینِ سیرت کی کتابیں قابل ذکر ہیں:۔

نشر الطیب في ذکر النبی الحبیب، از: حضرت مولانا اشرف علی تھانوی (م ۱۳۶۲ھ) پہلی دفعہ لکھنؤ سے ۱۳۳۳ھ میں شائع ہوئی۔

رحمۃ للعالمین، از: قاضی محمد سلیمان منصور پوری، اس کی پہلی جلد ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی۔

سیرت النبی، اس کی پہلی جلد علامہ شبلی نعمانی (م۱۳۳۲ھ) نے تیار کی اور بقیہ جلدیں ان کے شاگرد رشید علامہ سید سلیمان ندوی (م۱۳۷۳ھ) نے مکمل کیں۔

اصح السیر، از: مولانا حکیم ابوالبرکات عبدالرؤف داناپوری، ۱۳۵۱ھ میں پہلی بار شائع ہوئی۔

سیرت مصطفیٰ، از: مولانا محمد ادریس کاندھلوی (م ۱۳۹۴ھ)
النبی الخاتم، از: مولانا سید مناظر حسن گیلانی (م ۱۳۷۵ھ)
پیغمبر عالم، از: مولانا عبد الصمد رحمانی (م ۱۳۹۳ھ)
محمد رسول اللہ، از: مولانا سید محمد میاں (م ۱۳۹۵ھ)
محسن انسانیت، از: نعیم صدیقی
نبی رحمت، از: حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی (م ۱۴۲۰ھ)
سیرت سرور عالم، از: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (م ۱۳۹۹ھ)
ہادیٔ عالم، از: مولانا محمد ولی رازی، موصوف مولانا محمد تقی عثمانی (پاکستان) کے بھائی ہیں۔

سیرت کے ہر مصنف نے اپنے اپنے زمانہ کی ضرورت اور حالات کو سامنے رکھتے ہوئے کتاب مرتب کی، اس طرح ہر کتاب کی افادیت اور خصوصیات اپنی اپنی جگہ خوب ہیں اور بڑی حد تک وہ سب ضرورت کو پورا کرتی ہیں اور مقصد کے مطابق ہیں۔

مجھ ناچیز کو بھی میری علمی بے بضاعتی کے باوجود میرے بعض مخلص دوستوں نے اس اہم مقصد کے لئے ایک معتدل ضخامت کی کتاب تیار کرنے کا مشورہ دیا، جس میں سیرت طیبہ کو آسان اسلوب اور عملی شکل میں پیش کیا جا سکے، اس موضوع کی اہمیت اور عظمت کو دیکھتے ہوئے میں اس کام سے ڈرا، لیکن پھر یہ خیال آیا کہ اس پاکیزہ اور محبوبیت رکھنے والے موضوع کی خدمت میں اپنا کچھ وقت صرف کرنا اور قلم چلانا خواہ بے ہنری کے ساتھ ہو بابرکت اور سعادت کا کام ہے، ہمت کرلی، اور اس کام کی انجام دہی میں اپنے بعض رفقاء اور احباب کے مشوروں سے بھی فائدہ اٹھاتا رہا، جن کا میں شکر گزار ہوں، کہ انہوں نے پورا تعاون کیا، رفقاء میں عزیز بھائی مولوی محمد واضح رشید حسنی صاحب ندوی

(معتمد تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ) مولوی بلال عبدالحی حسنی ندوی صاحب کا مشورہ شامل رہا اور معاونین میں مولوی محمود حسنی ندوی (رفیق دار عرفات رائے بریلی) اور عزیزی مولوی محمد وثیق ندوی (استاد کلیۃ اللغۃ العربیۃ وآدابہا دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) کا وسیع اور متنوع تعاون حاصل رہا، جس کو میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں، خاص طور پر عزیزی مولوی محمد وثیق ندوی کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے اس تعاون میں کدوکاوش کا بھی ثبوت دیا اور حوالوں کو جمع کرنے میں مدد دی، اس طرح ان کا علمی و عملی پہلوؤں میں خاصا تعاون رہا، ان سب معاونوں کی وجہ سے کام میرے لئے آسان ہوسکا، اللہ تعالیٰ ان سب کے تعاون کو قبول فرمائے اور بہت جزائے خیر عطاء فرمائے۔

محمد رابع حسنی ندوی
ندوۃ العلماء لکھنؤ

جمعہ ۱۸ / ربیع الثانی / ۱۴۲۹ھ
۲۵ / اپریل / ۲۰۰۸ء

باب اول

تمہید

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين وخاتم النبيين محمد بن عبد الله الأمين وعلىٰ آله وصحبه أجمعين ومن اهتدىٰ بهديهم إلى يوم الدين أما بعد!

انسان کے مورث اعلیٰ حضرت آدم علیہ السلام

اس زمین وآسمان اور پوری کائنات کے بنانے والی ذات اللہ تعالیٰ نے یہ زمین وآسمان بنا کر اس میں رہنے اور اس سے فائدہ اٹھانے والی مخلوقات پیدا کیں، ان میں سب سے اہم اور بڑی مخلوق انسان کو بنایا، انسانی مخلوق کے لئے سب سے پہلے ایک آدمی کو مٹی سے بنایا، پھر ان کے ساتھ رہنے اور ایک دوسرے سے مل کر خاندان بنانے کے لئے ان ہی سے ان کی بیوی کو پیدا کیا، پھر ان دونوں سے نسل انسانی بتدریج ساری دنیا میں پھیلی اور اس نسل انسانی کو اس زمین کے معاملات کو انجام دینے کو سپرد کیا اور زمین میں انسان کی ضرورت کا سارا سامان پیدا کیا، کہ انسان اپنی عقل سے جو اس کے خالق ومالک اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی ہے، اپنی ضرورت کے مطابق سامان نکالے اور پھر اسکو اپنی ضرورت کی چیزیں بنانے کا طریقہ بتایا اور حکم دیا کہ یہ سب چیزیں اور زندگی تم کو دی گئی ہے تا کہ تم اس سے فائدہ اٹھاؤ، لیکن زمین پر تم کو اچھا بن کر رہنا ہے اور اپنے پروردگار کے حکم کے مطابق زندگی

گذارنا ہے، اگر غلط کام کروگے تو پھر تو تم کو سزا دی جائے گی۔

انسانوں کے مورث اور انسان اول حضرت آدم کو جب پیدا کیا تو ان کو شروع میں آسمان پر سب سے راحت کی جگہ جنت میں رکھا (۱)، ان سے پہلے اللہ تعالی ایک دوسری مخلوق جنات کو پیدا کر چکا تھا (۲) اور ان میں کے ایک فرد ابلیس کو جو ظاہر میں بہت عبادت گذار بندہ ہو گیا تھا، اللہ تعالی نے اس کی نیکی کے صلہ میں اس کو پہلے سے جنت میں ٹھہرا رکھا تھا، لیکن اس نے یہ حماقت کی کہ جب آدم علیہ السلام کو پیدا کر کے اللہ تعالی نے بڑی عزت دی اور جنت میں رکھا تو ان سے ابلیس کو حسد ہوا کہ اس کے ہوتے ہوئے اس نئی نسل کے شخص کو اتنا اعزاز کیوں دیا گیا؟ اور جب پروردگار نے سب کو حکم دیا کہ سب آدم کی تعظیم میں آدم کے سامنے جھک جائیں، تو فرشتے جیسی آسمانی مخلوق نے اپنے رب کے حکم کی فوراً تعمیل کی، لیکن ابلیس نے ماننے سے انکار کیا اور متکبرانہ انداز اختیار کیا، اس نافرمانی اور تکبر پر اسکو پروردگار نے جنت سے نکال کر نیچے زمین پر اتار دیا، اور اس پر لعنت عائد کر دی، ابلیس نے اپنی اس ذلت کا بدلہ آدم سے لینے کے لئے آدم اور انکی بیوی حضرت حوا کو جنت کے ایک ممنوعہ درخت میں سے جسکو کھانے سے حضرت آدم وحوا کو اللہ تعالی نے شروع ہی میں منع کر دیا تھا کہ جنت کے ہر درخت اور پودے سے فائدہ اٹھاؤ لیکن اس درخت کو نہ کھانا، شیطان نے سمجھا بجھا کر کچھ توڑ کر کھانے کی رغبت دلائی اور اس کا بڑا فائدہ بتایا اور کسی طرح یقین دلا کر کہ اس درخت سے کھانے میں کوئی خاص غلط بات نہیں ہے اور فائدہ بہت ہے، اس طرح ان سے نافرمانی کرا دی، اللہ تعالی حضرت آدم سے ناراض ہوا کہ ہمارے منع کرنے کے بعد بھی تم نے یہ حرکت کی اور سزا کے طور پر ان کو بھی جنت کی فضاؤں سے نکال کر آسمان سے نیچے بھیج دیا، ابلیس اپنی نافرمانی پر قائم رہا اور معافی تک نہیں مانگی،

---

(۱) تاریخ الامم والملوک (تاریخ طبری)/محمد بن جریر طبری: ۱/ ۸۹، تحقیق: محمد ابوالفضل ابراہیم
(۲) البدایہ والنھایہ/ ابن کثیر: ۱/ ۵۵

چنانچہ اس کو اور اس کی ذریت کو ہمیشہ کے لئے نالائق اور مردود قرار دے دیا گیا (۱)۔

لیکن آدم علیہ السلام نے اپنی نافرمانی کی معافی بہت آہ وزاری کیساتھ طلب کی، چنانچہ اللہ نے ان کو معاف کر دیا، لیکن ان کی طبیعت میں نافرمانی کا جو پہلو ظاہر ہوا تھا اس کی بنا پر انکو اور انکی اولاد کو زمین پر رہنے کے ساتھ ان کی فرمابرداری کا امتحان لینے کا ارادہ فرمایا، تاکہ وہ اب اپنے رب کی نافرمانی سے بچنے کا ثبوت اپنے عمل سے دیکر ثابت کریں کہ وہ جنت میں واپس آنے کے لائق ہیں، اور یہی حکم جنات کے لئے بھی رکھا گیا (۲)، جس کا سلسلہ اس دنیا کے ختم ہونے اور قیامت آنے تک جاری رکھا گیا تاکہ آدم علیہ السلام کی اولاد اور جنات میں وہ افراد جو ابلیس کی اولاد اور اس کی پیروی کرنے والے نہیں ہیں ان کی جانچ ہو سکے کہ وہ اللہ تعالی کے نیک بندے بنیں گے یا نافرمان۔

دینی رہنمائی بصورت نبوت

دنیا میں انسانی زندگی کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد یکے بعد دیگرے انسانی نسلوں نے دنیا کو آباد کیا اور حکم الہی کی پیروی اختیار کی، لیکن بتدریج اپنی زمینی خواہشات اور لطف ولذت کو اپنی دینی واخلاقی درستگی پر ترجیح دینا شروع کر دیا اور اپنے خالق و مالک اور پروردگار عالم کی شکرگزاری وعبادت سے غفلت برتنے لگے اور اپنے جی چاہنے پر اپنے مالک و خالق اللہ تعالی کے حکموں کی خلاف ورزی کرنے لگے، چنانچہ ان کو سمجھانے کے لئے بار بار اللہ تعالی ان ہی میں سے کسی نیک اور سمجھدار شخص کو اپنا پیغام رساں بنا کر ان کو سمجھانے کے لئے مقرر کرتا رہا، جو نبی کہلاتا تھا، چنانچہ یہ نبی حسب ضرورت قوموں میں آتے رہے، ہر قوم میں جب جب بری باتیں عام ہوئیں

---

(۱) تاریخ طبری: ۱/ ۹۴-۹۶، والکامل فی التاریخ / ابن الأثیر: ۱/ ۲۳-۲۶

(۲) الکامل فی التاریخ / ابن الأثیر: ۱/ ۳۸

نبی آیا، دنیا میں جہاں جہاں آبادی ہوئی اور اللہ تعالی کی نافرمانی بڑھی تو نبی آیا، اس طرح ہر جگہ نبی آیا اور یہ انبیاء اپنی اپنی قوم کو خیر خواہانہ طریقے سے بتاتے رہے اور ان کو سمجھانے میں دل وجان لگاتے رہے۔

ان انبیاء علیہم السلام میں پہلے شخص خود انسانوں ہی کے مورث اول حضرت آدم علیہ السلام نبی کی حیثیت سے اپنی اولاد کو راہ راست پر اور خدا کی بندگی پر قائم رکھنے کی فکر وکوشش کے لئے مقرر ہوئے، چنانچہ ان کی اولاد نسل در نسل اپنے مورث حضرت آدم علیہ السلام کے بتائے ہوئے راستہ پر چلتی رہی، لیکن جب وقت اور نسلوں کے گذرنے کے ساتھ ان میں بگاڑ آتا گیا تو حسب ضرورت ان میں نبی مبعوث کئے جاتے رہے(۱) فرمایا:

﴿وإن من أمة إلا خلا فيها نذير﴾ [سورہ فاطر:۲۴] کوئی قوم ایسی نہیں جن میں ڈرانے والا نہ آیا ہو۔

اللہ تعالی نے اپنے ان نبیوں میں سے چند کا تذکرہ قرآن مجید میں بطور مثال کیا ہے اور باقی کے متعلق صرف یہ بتایا کہ ہر قوم میں نبی آئے، جن نبیوں کا تذکرہ اللہ تعالی نے اپنی کتاب میں کیا ان میں سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کا تذکرہ کیا یہ انسانوں کے مورث حضرت آدم علیہ السلام کے بعد ان کی نسلوں میں صدیوں کے بعد نبی مقرر کئے گئے، ان کی قوم آہستہ آہستہ اپنے نیک اور بڑے لوگوں کی تعظیم میں ان کی یادگار بنا کر تعظیم کرتے کرتے عبادت کرنے لگی تھی اور اپنے خالق ومالک کو جو ایک ہی ہے چھوڑ کر گذری ہوئی اپنی نامور شخصیتوں کو خدا کا درجہ دیکر ان کی عبادت میں لگ گئی تھی اور اسی کے ساتھ دوسری طرف ہر طرح کے گناہوں اور ظالمانہ حرکتوں میں بھی مبتلا تھی (۲) حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نوسو سال ان میں رہکر

---

(۱) الکامل فی التاریخ / ابن الأثیر:۱/ ۳۸

(۲) البدایہ والنہایہ:۱/۱۰۱

نبوت کا مصلحانہ وداعیانہ فریضہ انجام دیا، اتنی لمبی مدت تک سمجھانے اور اصلاح کا کام انجام دینے کے بعد بھی صرف چند افراد ہی خدائے واحد کی بندگی اور اخلاقی وانسانی حالت کی درستگی پر آسکے اور جب اکثر وبیشتر لوگوں کے راہ راست پر آنے کی امید ختم ہوگئی تو ان کے نبی نے ان کو سزا دئے جانے کی درخواست کی، چنانچہ اللہ تعالی کی طرف سے ان کیلئے طوفان میں ہلاک کردیئے جانے کا فیصلہ ہوا اور سزا دئے جانے سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کو ایک کشتی بنانے کا حکم ہوا تا کہ اس کے ذریعہ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے چند ماننے والے بچا دئے جائیں کیونکہ قوم کے نافرمانوں کو زبردست طوفانی سیلاب سے سزا دئے جانے کا فیصلہ ہوا:

﴿و لقد أرسلنا نوحاً إلى قومه فلبث فيهم ألف سنة إلا خمسين عاماً فأخذهم الطوفان و هم ظالمون فأنجيناه و أصحاب السفينة و جعلناها آية للعالمين﴾ [العنکبوت: ۱۴-۱۵]

اور ہم نے نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی طرف بھیجا وہ ان میں ساڑھے نوسو سال تک رہے، پھر تو انہیں طوفان نے دھر پکڑا اور وہ تھے بھی ظالم، پھر ہم نے انہیں اور کشتی والوں کو نجات دی اور اس واقعہ کو ہم نے تمام جہان کے لئے عبرت کا نشان بنا دیا (۱)۔

بعد میں ان نجات پانے والے انسانوں کی اولاد اس دنیا میں چلی (۲)، اللہ تعالی نے ان کا تذکرہ اپنی کتاب قرآن مجید میں کیا، ان کے بعد کے نبیوں میں سے چند دیگر نبیوں کی قوموں کا حال بھی قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے (۳)، جو عربی علاقہ اور اس کے اردگرد کی قوموں میں جب وہ اپنے رب کی نافرمانی اور گناہوں پر اصرار کرنے لگیں مبعوث کئے گئے، اور وہ جب جب اپنے نبیوں کی نافرمانی میں بہت آگے بڑھ گئیں اور نبی کی بات نہیں مانی تو ان پر عذاب آیا، ان میں حضرت نوح علیہ السلام کی

---

(۱) الکامل فی التاریخ / ابن الأثیر: ۱/ ۶۷-۷۳، والبدایہ والنهایہ: ۱/ ۱۰۰-۱۲۰۔

(۲) الکامل فی التاریخ ۱/ ۷۹۔ (۳) أیضاً، ۱/ ۱۰۴۔

قوم کے بعدان ہی کی بعد کی نسلوں میں قوم عاد کا ذکر کیا گیا، یہ یمن کے مشرقی خطہ میں آباد تھی، ان میں بھی اپنے اصل مالک وخالق کو چھوڑ کر اپنی پسند کے بتوں اور مورتیوں کی پوجا عام ہوگئی اور اسی کے ساتھ کمزوروں اور غریبوں پر ظلم وزیادتی، تکبر وغرور اور بدعملی کی باتیں رواج پاگئی تھیں، ان میں حضرت ہود علیہ السلام کو اللہ تعالی نے نبی مقرر کیا، ان کی قوم کے لوگ بھی شرک اور اپنے بگاڑ پر قائم رہے اور اپنے نبی حضرت ہود علیہ السلام کا مذاق اڑاتے رہے، بالآخران پر اللہ کا غضب نازل ہوا(۱)۔

اس قوم کے تذکرہ کے بعد قوم ثمود کا تذکرہ آیا ہے، یہ حجاز کے شمالی خطہ کے پہاڑی علاقہ میں آباد تھے، ان میں حضرت صالح علیہ السلام نبی بنائے گئے، یہ قوم بھی طرح طرح کے خدا بنا کے ان کی پوجا کرتی اور کمزوروں پر ظلم اور فحش باتوں میں مبتلا تھی، ان نبی کے ساتھ بھی قوم نے بڑی زیادتی کی اور کسی طرح اپنے کو درست نہیں کیا، ان کے لئے ایک اونٹنی حضرت صالح علیہ السلام کی نبوت کی تصدیق کے لئے اللہ نے پیدا کی اور اس کی حفاظت کا حکم دیا، لیکن انہوں نے اس کو مار ڈالا اور سرکشی پر قائم رہے(۲) چنانچہ وہ لوگ بھی تباہ کردئے گئے، صرف نیک لوگ بچے، اور وہ اور ان کی اولاد نیکی کے ساتھ زندگی گذارنے لگے، لیکن نسل بدلنے اور وقت گذرنے کے ساتھ ان میں بھی برائیاں اور شرک پیدا ہونے لگا۔ ان کی اصلاح کے لئے ان ہی میں سے نبی آئے، قرآن مجید میں قوم ثمود کے بعد قوم لوط اور قوم مدین کا ذکر آیا، ان سب قوموں نے اپنے اپنے نبی کو پریشان کیا، اور اپنا اپنا مکروہ اور بری باتوں کا طریقہ نہیں بدلا۔

قوم لوط فلسطین کے ایک حصہ میں آباد تھی، اور ان کی بڑی خرابی شرک کے ساتھ ہم جنسی کی لعنت تھی جو ان میں عام ہوگئی تھی، اور اس میں بھی وہ زبردستی اور سخت بے حیائی دکھانے لگے تھے، اسی کے ساتھ دوسرے گناہوں پر بھی اڑے ہوئے تھے،

---

(۱) الکامل فی التاریخ ۱/ ۸۵-۹۳، والبدایۃ والنھایۃ: ۱/ ۱۲۱-۱۳۰

(۲) الکامل فی التاریخ: ۱/ ۸۹، والبدایۃ والنھایۃ: ۱/ ۱۳۰-۱۳۸

ان میں حضرت لوط علیہ السلام جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے، مبعوث کئے گئے، انہوں نے بہت کوشش کی، لیکن ان کی بات نہیں مانی گئی، چنانچہ ان پر سخت آتش فشاں زلزلہ آیا اور وہ تباہ کردئے گئے (۱)۔

قوم مدین حجاز کے شمالی علاقہ میں آباد تھی، شرک کے ساتھ کاروبار میں خیانت اور بددیانتی کرتی تھی اور دوسرے گناہوں میں بھی مبتلا تھی، ان میں حضرت شعیب علیہ السلام مبعوث کئے گئے (۲) انہوں نے سمجھانے کی بہت کوشش کی، جب آخر آخر تک وہ اپنی بدعملیوں پر قائم رہے تو ان پر عذاب آیا۔

قرآن مجید میں قوم مدین کے بعد مصری قوم کی حالت کا تذکرہ کیا گیا، وہاں ان کے بادشاہ فرعون اور اس کی قوم نے بہت ادھم مچایا تھا، وہاں بنی اسرائیل اقلیت میں تھے، ان میں جب کوئی بچہ پیدا ہوتا تو اس کو ماردیا جاتا اور لڑکی پیدا ہوتی تو اس کو باقی رکھا جاتا تاکہ فرعون کی قوم کے گھروں میں ان سے خدمت لی جایا کرے اور ملک کی کمزور نسل کے لوگوں کے ساتھ بڑا ظلم کیا جاتا تھا، پھر اسی کے ساتھ ساتھ فرعون خود اپنے کو خدا قرار دیکر اپنی پوجا کراتا تھا، اور صاف صاف کہتا تھا کہ میرے علاوہ کوئی دوسرا تمہارا خدا نہیں، بنی اسرائیل کے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے بہت سمجھایا، اور سمجھاتے سمجھاتے جب ایک عرصۂ دراز گذر گیا، اور فرعون کی زیادتی اور ظلم نہیں رکا تو اللہ کا غضب آیا اور فرعون اور اس کے حواری موالی سمندر میں ڈبودیئے گئے (۳) پھر خود یہ بنی اسرائیل ایک عرصہ گزر جانے پر اپنے نبیوں کی رہنمائی سے روگردانی کرنے لگے حتی کہ شرک کی باتوں تک میں مبتلا ہوئے اور اپنی اخلاقی برائیوں پر اڑے اور دھاندلی اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو غیروں کے ذریعہ مصیبتوں میں مبتلا کیا، لیکن انہوں نے اپنی بدعملیوں اور زیادتیوں کو ترک نہیں کیا اور حد یہ کہ نبیوں کو

---

(۱) الکامل فی التاریخ: ۱/ ۱۱۸-۱۲۲، والبدایۃ والنھایۃ: ۱/ ۱۷۹-۱۸۳

(۲) ایضاً ص: ۱/ ۱۵۷-۱۵۹، والبدایۃ والنھایۃ: ۱/ ۱۸۳-۱۹۰۔ (۳) الکامل فی التاریخ: ۱/ ۱۶۹-۱۹۴

ستایا اور کسی کو قتل بھی کر دیا اور آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی قتل کروانے کا پورا انتظام کر دیا تھا (۱) جس کو اللہ تعالیٰ نے ناکام بنادیا۔

یہ چند مثالیں ہیں جن کا صراحت کے ساتھ قرآن مجید میں بھی تذکرہ آیا ہے، ورنہ ہزاروں قومیں ہوئیں اور ان میں نبی آئے اور نافرمانیوں اور بدعملیوں کے انتہائی درجہ پہ پہونچ جانے پر اللہ رب العزت کی طرف سے ان پر تباہی آئی۔

بنی اسرائیل مصر اور شام میں آباد تھے، ان کے بگاڑ کے حالات ایک طرف یہ تھے، دوسری طرف دنیا کے مختلف حصوں میں جو قومیں آباد تھیں وہاں بھی اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر یا اس کے ساتھ دیگر بہت سے معبود بنا لئے گئے تھے اور ان میں بھی مختلف قسم کی برائیاں عام ہو گئیں تھیں اور یہ سب قومیں شرک وکفر وظلم واخلاقی بگاڑ میں ڈوب گئیں تو اللہ تعالیٰ کو بہت ناخوشی ہوئی اور اس نے کچھ عرصہ کے لئے نبیوں کو مقرر کرنے کا سلسلہ روک دیا، اور شاید یہ دیکھنا چاہا کہ انسان اپنے کو نفس پرستی اور جانوروں جیسی زندگی کو من مانے طریقہ سے اختیار کرنے میں کہاں تک جاتا ہے، چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد چھ سو سال تک اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا اور قوموں کو گراوٹ میں جانے دیا، ان چھ سو سالوں میں پوری انسانیت بہت بری عادتوں تک پہونچ گئی اور بڑی قابل نفرت بن گئی، قریب تھا کہ رب العالمین اس کی سزا میں انسانوں کی نسل ہی ختم کردے، جیسا کہ بخاری کی ایک حدیث سے ظاہر ہوتا ہے:

"إن اللّٰه نظر إلی أهل الأرض فمقتهم عربهم و عجمهم إلا بقايا بعض أهل الكتاب" (۲) کہ اللہ تعالیٰ نے زمین والوں پر نظر دوڑائی تو اس کو ان سے نفرت ہوئی عربوں سے بھی اور غیر عربوں سے بھی، سوا چند بچے کھچے اہل کتاب کے۔

لیکن رب العالمین کا رحم اس کے غضب پر غالب رہا اور اس نے ان کو

---

(۱) الکامل فی التاریخ: ۱/ ۳۱۸

(۲) مسند احمد

سمجھانے کا ایک موقع پھر عطا فرمایا اور اس کے لئے مزید اعلی خصوصیات اور اعلی ترین صلاحیتوں کا حامل نبی مبعوث کیا، یہ ہمارے نبی محمد بن عبد اللہ ﷺ تھے، ان کے مبعوث کئے جانے کا اشارہ سابق نبیوں پر اتاری جانے والی آسمانی کتابوں یعنی توریت اور انجیل میں بھی پہلے سے ہی کر دیا گیا تھا، کہ سب نبیوں کی امتوں کے بعد ساری دنیا میں جب برائیاں بہت بڑھ جائیں گی اور انسانوں کی اخلاقی و دینی سطح انتہائی پست اور خدا کی شدید نافرمانی کی ہو جائیگی تو انسانوں کی اصلاح کے لئے آخری بار اور مزید مکمل صفات کا نبی بھیجے جائیگا، اور اس کی خبر حضرت محمد ﷺ کے احمد کے نام سے بھی دیدی گئی تھی، پھر اس کے مطابق اس عظیم المرتبت نبی کو اللہ رب العالمین نے حضرت عیسی علیہ السلام سے چھ سو سال بعد مشرق وسطی کی ان پڑھ اور غیر متمدن قوم عرب کی سب سے بہتر نسل سے اٹھایا، یہ قوم جزیرۃ العرب کی سخت دشوار گزار سرزمین میں محدود اور اس طرح دوسری قوموں کے اثرات اور ان کی تمدنی خرابیوں سے محفوظ تھی، وہ غیر متمدن تھے، لیکن فطری حالت پر تھے (۱) اور ان کے دل و دماغ دوسری قوموں کے اثرات سے خالی تھے اور عظیم ترین ذمہ داریوں کے اٹھانے کے لئے پوری طرح اہل تھے، ان کو صرف عربوں کا ہی نہیں، بلکہ ساری دنیا کی ہدایت کی ذمہ داری سپرد کرنے کا فیصلہ فرمایا گیا، آپ ﷺ نے اس ذمہ داری کو فکر و توجہ اور محنت سے انجام دیا جس سے حالات میں زبردست سدھار آیا، اور اس طرح پوری انسانیت جو ساری کی ساری اپنے خالق و مالک اللہ تعالی کے ناراض ہونے پر عذاب الہی کا شکار ہو سکتی تھی بچ گئی، اور انسانیت کی تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوا، اور ایک ایسا انسانی معاشرہ قائم ہوا جو نمونہ کا اور انسانوں کی رہبری کی خدمت انجام دینے کی صلاحیت رکھنے والا بنا اور دنیا تباہ ہونے سے بچ گئی، حضور محمد ﷺ کو ایسی

(۱) البدایۃ والنہایۃ: ۲/۱۹۰

خصوصیات، صلاحیت اور صفات عطا کی گئیں کہ وہ سارے جہانوں کے لئے رحمت ثابت ہوئے۔ آپ ﷺ نے اپنے پروردگار کے حکم سے غیر معمولی حکمت، فکر مندی، اور حسن تدبیر سے کام لیا اور اللہ تعالیٰ نے خصوصی مدد فرماتے ہوئے ان کے کام میں غیر معمولی تاثیر پیدا فرمائی جس کا غیر معمولی اثر پڑا اور حالات میں نہایت بڑا اور تاریخی انقلاب آ گیا، جو کہ عرب سے شروع ہو کر ساری دنیا میں پہونچا، اس سے انسانوں کی زندگی اس حالت سے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نفرت کا اظہار فرمایا تھا، تبدیل ہو کر ایسی اچھی ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا اور خوشنودی کا اظہار فرمایا، اور ایسے اصحاب کے لئے جنہوں نے خدائے واحد کی بندگی میں رکارڈ قائم کر دیا یہ فرمایا "رضی اللّٰہ عنھم و رضوا عنہ" اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔

نبی کا کام اور پیغام

حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے نبی آئے سب نے شرک کو ترک کرنے اور توحید اختیار کرنے کی تاکید کی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ جو اس پوری کائنات کو پیدا کرنے والا اور کائنات میں ہر طرح کی ضرورت کا سامان رکھنے والا اور اس سامان کو انسان کے استعمال کے قابل اور سہل الحصول بنانے والا ہے جس سے ہر انسان زندگی میں بھرپور فائدہ اٹھاتا اور اپنی ضرورت پوری کرتا بلکہ اپنی زندگی قائم رکھتا ہے اس کے احسان کو انسان فراموش کر دے اور اس کو چھوڑ کر ادھر ادھر کی چیزوں کو جن سے اس کو فائدہ یا نقصان کا خطرہ محسوس ہوتا ہے، اختیار کر لے اور یہ کہنے لگے کہ ہماری مدد تو فلاں کرتا ہے، اور ہماری ضرورت تو فلاں پوری کرتا ہے اور فلاں چیز ہم پر احسان کرتی ہے اور جو احسان خالص اس کے خالق و مالک اللہ تعالیٰ کا ہے وہ اس کو دوسروں کا بتاتا اور اس سے اپنی ضرورت مانگتا ہے اور اصل محسن جو سب سے بڑا اور سب طرح کا احسان کرنے والا ہے، اس کو چھوڑ کر اس کے ساتھ دوسری چھوٹی چیزوں کو

اپنا محسن و مالک کہتا ہے تو ظاہر ہے کہ اللہ جس نے سب کچھ بنایا اور سب کچھ دیا اور برابر دیتا ہے کیسے وہ اس بات کی اجازت دیگا اور ناراض نہ ہوگا، اس لئے اللہ تعالی کو سب سے زیادہ ناراضی شرک سے ہوتی ہے، اور یہ بات بالکل برحق ہے۔

لہٰذا سارے انبیاء اور مصلحین نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ شرک سے منع کیا، پھر اس کے ساتھ انسانی کردار و اخلاق میں جہاں جہاں اور جو جو بگاڑ پیدا ہوتا اس کی اصلاح کی دعوت دیتے رہے، مثلاً کسی آبادی میں شرک کے ساتھ جنسی بداخلاقی یا دوسری اقسام کی برائیاں عام ہوگئی تھیں، جیسے قوم لوط میں ہوا، ان کے نبی نے ان برائیوں سے منع کیا، کسی آبادی میں شرک کے ساتھ ناپ تول میں گڑبڑ کرنے کی عادت عام ہوگئی تھی جیسے قوم مدین میں، ان کے نبی نے اس برائی سے منع کیا، کسی آبادی میں شرک کے ساتھ تکبر اور کمزوروں پر ظلم کرنے کی عادت عام ہوگئی تھی جیسا کہ قوم فرعون مصر میں، وہاں حضرت موسی علیہ السلام کو نبی مقرر کیا گیا، انہوں نے فرعون کو بہت سمجھانے اور اللہ تعالی کے عذاب سے ڈرانے کی کوشش کی اور اس شرک وظلم سے روکا، کسی آبادی میں شرک کے ساتھ کمزوروں کو ستانے اور دوسروں کا حق مارنے کا شوق ہوگیا تھا وہاں کے نبی نے اس کو اس سے بھی روکا، اور اسی طرح شرک کیساتھ دوسرے جو جو عیوب ہوتے انبیاء توحید خالص یعنی تنہا اللہ تعالی پوری کائنات اور مخلوقات کا واحد پروردگار ہے صرف اسی کی عبادت کی دعوت کے ساتھ اس کی دیگر خرابیوں سے بھی روکتے تھے۔

☆☆☆

باب دوم

چھٹی صدی عیسوی میں دنیا کی حالت

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چھ سو سال قبل بنی اسرائیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبی پیدا ہوئے تھے، ان کو رب العالمین نے معجزہ کے طور پر حضرت آدم علیہ السلام کی طرح بغیر باپ کے پیدا کیا تھا تا کہ ان کی اہمیت معلوم ہو اور پھر ان کو اللہ تعالی نے نبی بنایا تا کہ وہ بنی اسرائیل کے بہت بڑھے ہوئے بگاڑ کو درست کریں، لیکن بنی اسرائیل نے ان کی مخالفت کی اور ان کے کام کو روکا اور نافرمانی کرتے رہے، ان کے چھ سو سال بعد آپ ﷺ نبی بنائے گئے، یہ درمیانی مدت کا زمانہ جو نبیوں سے خالی گزرا، مذہبی و اخلاقی لحاظ سے بڑے بگاڑ اور خرابیوں تک پہونچ گیا تھا اور برائیاں آخری حد تک بڑھ گئیں اور انسانوں نے متمدن طبقات کی سرپرستی میں اپنے پروردگار کے احکام کی سخت نافرمانی کا طریقہ اختیار کر لیا تھا، خود بنی اسرائیل کے لوگوں کا حال بہت خرابی تک پہونچ گیا تھا حالانکہ یہ لوگ انبیاء کی اولاد تھے اور ان کے اسلاف پر اللہ تعالی کے بیحد انعامات ہو چکے تھے، انہوں نے اللہ تعالی کی نازل کی ہوئی کتاب تک میں تحریف کر ڈالی اور اپنی خواہشات کے مطابق اسکے احکام میں تبدیلیاں کیں اور اپنی خواہشات کا طریقہ اختیار کیا۔

ان ہی کے پڑوس میں دنیا کے مغربی حصہ میں رومی مشرکوں کا دور دورہ تھا، ان میں تو اور بھی اخلاقی خرابیاں، نفس پرستی، فحاشی وعیاشی خودغرضی اور ظلم و تعدی

تک پہونچی ہوئی تھیں، اور متمدن دنیا کا مشرقی حصہ جو ایران اور مشرق میں واقع علاقوں پر مشتمل تھا وہاں کے لوگ بھی شرک کے ساتھ ظالمانہ شہنشائیت، ظلم و جور اور سخت سماجی زیادتیوں اور خرابیوں میں پوری طرح مبتلا تھے(۱)۔

اس طرح یہ صدیاں خرابی کی انتہا تک پہونچ گئی تھیں اور یہ دور انسانیت کے نام پر ایک دھبّہ بن گیا تھا، اس کی قدرے تفصیل حسب ذیل ہے۔

یورپ کے ملکوں کا حال

ان ملکوں میں شروع میں شرک و بت پرستی عام تھی اور پہلے اخلاقی لحاظ سے بہت زیادتی اور خرابی بھی تھی، پھر یہاں کے لوگوں نے عیسائیت قبول کر لی، لیکن یہ برائیاں بڑھتی ہی گئیں، ان کا حال Robert Briffault لکھتا ہے کہ:

''پانچویں صدی سے لے کر دسویں صدی تک یورپ اور شمالی مغربی ایشیا کے علاقوں میں مشرکانہ طور طریق اور اخلاقی و دینی لحاظ سے بڑی برائیاں اور ظلم و زیادتیاں عام ہوگئی تھیں، اور یہ خرابیاں تدریجاً زیادہ سخت اور بھیانک ہوتی جارہی تھیں، اس دور کی وحشت و بربریت اور ظالمانہ طرز عمل زمانہ قدیم کی وحشت و بربریت سے کئی درجہ زیادہ بڑھی چڑھی ہوئی تھی حتی کہ اس کی مثال ایک بڑے تمدن کی لاش کی طرح ہوگئی تھی جو سڑ گئی ہو، چنانچہ اس تمدن کے نشانات مٹ رہے تھے اور اس پر زوال کی مہر لگ چکی تھی، وہ ممالک جہاں یہ تمدن برگ و بار لایا اور گذشتہ زمانہ میں اپنی انتہائی ترقی کو پہونچ گیا تھا، جیسے اٹلی، فرانس وہاں تباہی، طوائف الملوکی اور من مانی زندگی کا دور دورہ تھا'' (۲)۔

ان ملکوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد دینی لحاظ سے عیسائیت کے

---

(۱) ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین، ص:۳۹، از: مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، دار الغد الجدید، مصر، ۲۰۰۵ء۔
(۲) The Making of Humanity. P: 1164، ماخوذ از: نبی رحمت، ص:۵۶، جزوی ترمیم کے ساتھ

قبول کر لئے جانے پر اپنے دور اول ہی میں انتہا پسندوں کی تحریف، جاہلوں کی تاویل اور رومی نصرانیوں کی بت پرستی کا شکار ہوگئی تھی، حضرت مسیح علیہ السلام کی سادہ و پاکیزہ تعلیمات اس تمام ملبہ کے نیچے دفن ہوگئی تھیں، توحید اور اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کا نور گہرے بادلوں کے اندر چھپ چکا تھا۔

چوتھی صدی کے آخر میں عیسائی سوسائٹی میں تثلیث کا عقیدہ کس طرح سرایت کر گیا تھا اس کے متعلق ایک عیسائی فاضل لکھتا ہے:

''یہ عقیدہ کہ خدائے واحد تین اقانیم سے مرکب ہے، عیسائی دنیا کی پوری زندگی اور افکار میں چوتھی صدی کے آخر ہی میں سرایت کر چکا تھا، اور طویل عرصہ تک سرکاری اور تسلیم شدہ عقیدہ کی حیثیت سے جس کو پوری مسیحی دنیا مانتی تھی باقی رہا، یہاں تک کہ انیسویں صدی عیسوی کے نصف ثانی میں اس عقیدہ کے تغیر اور اس شکل تک پہونچنے کا راز فاش ہوا''(۱)۔

جنوبی ایشیا کا حال

مجوس

''ایران میں نہایت قدیم زمانہ سے سلطنت قائم تھی، انہوں نے تقریباً ایک ثلث کرۂ ارض پر جو اس وقت آباد تھا، حکومت کی، حکومت سے امن، امن سے عیش وعشرت کا وجود ہوا، عیاشی نے دل ودماغ کو کمزور کر دیا اور ایوان سلطنت کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا۔

مانی کے مذہب نے آئین قدیم کو نیست ونابود کر دیا، مرد وزن کے طبائع میں شوریدگی وآوارگی پیدا کر دی، مزدک کے زن وزر وزمین پر سے ملکیت اٹھا دینے

(۱) نبی رحمت، ص: ۳۷، ماخوذ از New Catholic Encyclopedia۔

سے فحش وظلم اور طغیانی وعصیان کا طوفان بپا ہو گیا، مائیں اپنے بیٹوں کے عشق کا شکار بنیں، اور صاحب تخت وتاج شہزادیاں اپنے افسران فوج کے جذبات حیوانی سے تختہ ہائے موت پر لٹائی گئیں۔

محرمات ابدیہ کو محصنات اولیہ بنائے جانے کے دلائل پسند کیے گئے، عصمت وپاک دامنی کو ہر دو جنس کے لیے ناپاک قرار دیا گیا، فرہاد جیسے نمک حرام ملازم اپنے بادشاہ کے رقیب بن گئے، اور شیرویہ جیسے ناخلف پسر نے جوش بہیمیت میں باپ کا شکم چاک کر کے شیریں پر قبضہ کیا، سپاہ بد بہرام چوبیں ملکہ پوران دخت کی آتش کدہ عشق کا ایندھن بنا'' (۱)۔

ایران کی ساسانی حکومت کے مشرق میں ہندوستان کا تمدن اور حکمرانی کا اپنا نظام تھا، وہاں بھی شرک شدید اور انسانیت سوز حالات کا دور دورہ تھا۔

بدھ مذہب

''حضرت مسیح علیہ السلام سے چھ صدی پیشتر بدھ مذہب نے ظہور کیا، بدھ نے پالی زبان کو اختیار کر لیا تھا اور سنسکرت پڑھنے پڑھانے کی ممانعت کر دی تھی، ویدمت کی جگہ بدھ مت قائم ہو جانے سے قدیم مذہب کی کتابیں نیست ونابود ہو گئیں اور ان کا جاننے والا بھی کوئی باقی نہ رہا۔

شنکراچاریہ نے ان لوگوں سے کچھ مناظرے کیے اور اپنی علمیت کا رنگ جمایا، مگر وہ ۳۳-۳۴ سال کی عمر میں مر گیا، اس کی مساعی کا نتیجہ صرف اتنا ہوا کہ سنسکرت کو پھر دربار میں جگہ مل گئی، مگر اس کے ساتھ ساتھ شاعرانہ غلو اور استغراق نے بھی قدم جما لیے اور حقائق وواقعات پر استعارات کا پردہ پڑ گیا۔

---

(۱) رحمۃ للعالمین از: قاضی سلیمان منصور پوری، ج ۳/ ۷۰-۷۱، تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں: ایران بعہد ساسان، از: آرتھر کرسٹن سین۔

قدیم کتابوں میں سے ایک کتاب مہابھارت پائی جاتی ہے، مگر وہ بھی یارلوگوں کے تصرفات سے محفوظ نہ رہی، بیس ہزار شلوک اس کتاب میں جعلی طور پر شامل کر لیے گئے۔

بدھ مذہب کا زور راجہ اشوک کے عہد تک رہا، اس کے بعد بدھ ازم رو بہ زوال ہو گیا، بدھ ازم کے اصول متمدن دنیا کے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے تھے، بھکشوؤں (گداگروں) کی لاتعداد جماعت جو بدھ مت نے تیار کر دی تھی وہی زیادہ تر اس کے زوال اور حدود ملک سے انتقال کا باعث بھی ہوئی، گو پران مت نے بھی اس کو نکالنے میں بہت بڑی جدوجہد کی تھی۔

بدھ مت کے بعد ملک کی حالت بد سے بدتر ہو گئی، فسق و فجور اور فواحش کا دور دورہ ہو گیا، چکرانت دام مارگی، سہسر بھگ درشنان ملتی، شاکت، نوارک آوک، رام ایا سک ڈنڈی وغیرہ بیسیوں ایسے فرقے پیدا ہو گئے، جنہوں نے اخلاق وتہذیب کو جلا کر راکھ کر دیا۔

یہ فرقے تمام ہندوستان میں چھائے ہوئے تھے، انہوں نے شراب، جوا، بدکاری کو مذہب کا لباس پہنا کر پوتر قرار دیا تھا۔

ہندوستان کی یہی بدترین حالت تھی، جب سندھ اور شمال مغربی حدود اور جنوبی ہند سے مبلغین اسلام پہنچے انھوں نے ملک کو حقائق و معارف سے روشناس کیا، تب دیدہ وروں کو اپنی برہنگی نظر آئی، اکثر نے خلعت اسلام زیب تن کیا، اور اکثر نے اپنی دھوتی کو خود ہی سنبھال لیا" (۱)۔

مورخین لکھتے ہیں:۔

---

(۱) رحمۃ للعالمین از: قاضی سلیمان منصور پوری، ج ۳/ ۷۰-۷۱، ہندوستانی تمدن از ایشوراٹوپا، بودھ مذہب پر مقالہ "انسائیکلوپیڈیا برنانیکا" آرسی دت کی Ancient Indian اور CV Vaidya کی کتاب "ہسٹری آف میڈیول انڈیا" اس موضوع پر قابل ذکر ہیں۔

''بدھ مذہب جو ہندوستان اور وسط ایشیا میں پھیلا ہوا تھا وہ بھی ایک ایسے بت پرستانہ مذہب میں تبدیل ہو چکا تھا کہ بت اس کے جلوس میں چلتے تھے، جہاں اس کے قافلہ کا پڑاؤ ہوتا وہاں گوتم بدھ کی مورتی نصب کی جاتی اور دیکھتے دیکھتے ایک معبد تیار ہو جاتا، اہل علم اور اصحاب نظر کو اس مذہب اور اس کے بانی کے بارے میں ابھی تک یہ شبہ ہے کہ آسمان وزمین اور خود انسان کے خالق خدا کے وجود پر بھی ان کا عقیدہ وایمان تھا یا نہیں، ان کو حیرت ہے کہ ایمان وعقیدہ کے بغیر یہ عظیم مذہب کیسے قائم رہ سکا۔

ہندو مذہب

جہاں تک ہندو مذہب کا تعلق ہے وہ دیوی دیوتاؤں کی کثرت کی وجہ سے دوسرے مذاہب سے بہت آگے رہا، چھٹی صدی میں بت پرستی اپنے پورے شباب پر تھی، معبودوں کی تعداد اب اس صدی میں تینتس کروڑ تک بتائی جاتی ہے، ہر عظیم یا ہیبت ناک یا نفع پہونچانے والی شی معبود تھی، بت تراشی یا مجسمہ سازی کا فن بھی نقطہ عروج پر تھا اور اس میں طرح طرح کی جدت طرازیاں کی جاتی تھیں'' (۱)۔

رومی اور ایرانی علاقوں کی سلطنتیں

حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (م۱۱۷۶ھ) جو اپنے علمی وفکری کام اور مقام کے لحاظ سے اپنے زمانہ کے مجدد وامام قرار پائے ہیں، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے زمانہ یعنی چھٹی صدی عیسوی کے حالات پر نظر ڈالتے ہوئے ایرانی اور رومی حکومتوں کے بارے میں جن میں سے ایک ہندوستان کے مغربی کنارے سے شروع ہو کر غرب کے مشرقی حصہ تک اور دوسری شام کے

---

(۱) نبی رحمت، ص:۴۱

علاقہ سے شروع ہوکر اسپین کے ملک تک پھیلی ہوئیں تھیں اور اس زمانہ کی سب سے بڑی طاقتیں اور عظیم تمدن کی آماجگاہ سمجھی جاتی تھیں، لکھا ہے کہ:

''اس وقت ایران اور روم یعنی ساسانی اور بیزنطینی حکومتیں جو دنیا کی عظیم ترین شہنشاہیتوں کے اعتبار سے اس کرۂ ارض پر غالب تھیں، ان کو اس زمین پر حکومت کرنے کا موقع متعدد صدیوں سے ملتا رہا تھا اور وہ دنیا کی لذت میں مست ہو رہے تھے، اور آخرت کی زندگی سب بھول چکے تھے، اور ان پر شیطان کا اثر وغلبہ چھا چکا تھا، زندگی کے لطف وراحت کے وسائل میں بہت گہرائی تک چلے گئے تھے، اور اس میں ایک دوسرے پر فخر کر رہے تھے، اور دنیا میں ہر طرف سے اہل دانش اور اہل ہنر ان کے پاس جمع ہو گئے تھے، اور وہ ان کے لیے زندگی کے باریک پہلوؤں اور تقاضوں کے لیے راستے نکال رہے تھے، جن پر وہ برابر عمل پیرا ہو رہے تھے، اور اس پہ ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتے تھے اور ایک دوسرے سے مقابلہ کر رہے تھے، یہاں تک کہ یہ کہا گیا کہ ان کی بڑی شخصیتوں میں سے کوئی اپنے اظہار عظمت کے لیے کمر میں پٹکا، یا سر پر ٹوپی اگر ایک لاکھ درہم سے کم کی لگاتا تو اس کو لوگ عار دلاتے، اسی طرح اگر اس کا اونچا محل نہ ہوتا جس میں فوارہ لگا ہوتا اور شاندار حمام اور باغیچے اور اس کے پاس سواری کے لیے شاندار جانور نہ ہوتے اور خوبصورت ودلکش خدام نہ ہوتے اور کھانے کے اقسام میں توسع نہ ہوتا اور لباس میں جمال اور وقار کا انداز نہ ہوتا، اسی طرح اور چیزیں جس کے تذکرہ سے طوالت ہوگی اگر نہ ہوتیں تو اس کو اہم آدمی نہ سمجھا جاتا، اور یہ چیزیں ان کی زندگی کی بنیادوں میں سرایت کر گئیں تھیں جو ان کے دلوں سے نکل نہیں سکتی تھیں سوائے اسکے کہ وہ دل چیر دیئے جائیں یا کاٹ ڈالے جائیں۔

چنانچہ اس کے نتیجہ میں یہ لاعلاج مرض پیدا ہو گیا تھا جو ان کی شہری زندگی

کے سارے پہلوؤں میں پھیل گیا تھا اور ایک عظیم مصیبت کھڑی ہوگئی تھی، جس سے نہ ان کے امراء محفوظ تھے نہ ان کے عوام، نہ ان کے خوش حال محفوظ تھے نہ ان کے غریب، یہ مصیبت ان کے اوپر چھا گئی تھی اور اس نے ان کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا، اور ان کو اس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں رکھی تھی، اس نے ان پر ایسی پریشانیاں اور فکریں غالب کردی تھیں کہ جن کا کوئی سرا نظر نہیں آتا تھا، اس لیے کہ ان کے سارے تقاضے بغیر اس کے حاصل نہیں ہوسکتے تھے کہ زبردست مال و دولت خرچ کیا جائے اور یہ مال و دولت حاصل نہیں ہوسکتا تھا مگر ٹیکس پر ٹیکس لگانے سے، جو کاشتکاروں اور تاجروں اور انہی جیسے افراد پر لگایا جاتا تھا اور اس کا دائرہ ان پر برابر تنگ کیا جارہا تھا، اور وہ اگر ان کے دینے سے معذور رہتے تو ان پر زبردستی کی جاتی تھی اور ان پر مصیبت ڈھائی جاتی تھی اور وہ اگر تسلیم کرتے اور قبول کر لیتے تھے تو ان کو وہ گائے بیل کی طرح اپنے استعمال میں لاتے تھے کہ جن کو پانی ڈھونے اور کھلیان میں کام کرنے یا کھیتیاں کاٹنے کے لیے استعمال کیا جاتا اور جن کو اسی لیے رکھا جاتا ہے کہ مختلف انسانی ضروریات میں ان سے کام لیا جائے، اور پھر ان کو محنت کے کام سے ایک گھڑی بھی نہیں چھوڑا جاتا تھا، یہاں تک کہ وہ سب افراد اس حالت میں نہیں رہ گئے تھے کہ آخرت کی راحت اور کامیابی کے مسئلہ کو سر اٹھا کر بھی دیکھیں، اور اس کی ان میں استطاعت نہیں ہوتی تھی، چنانچہ پورا پورا وسیع ملک ایسے افراد سے خالی ہوگیا تھا کہ جن کو اپنے دین کا کچھ خیال ہو، اور یہ چیز حاصل بھی نہیں ہوسکتی تھی، سوائے ان لوگوں کے کہ جن کے معاش کا سارا دارومدار اسی کھانے پہننے اور تعمیرات وغیرہ کا کام کرنے پر ہی تھا جو ان پیشوں میں نہیں لگ پا رہے تھے کہ جن پر نظام عالم کی عمارت قائم ہے، اس پر مزید یہ بات تھی کہ جو لوگ ان کے پاس آتے جاتے تھے، وہ ان بڑوں کے طور و طریق کی نقل کرتے تھے، اور اگر ایسا نہ کرتے تو ان کے یہاں کوئی

پذیرائی نہ ہوتی اور ان کا کوئی خیال بھی نہ کیا جاتا۔

بہر حال عام انسان اپنے حاکم کے دست نگر ہو کے رہ گئے تھے، ان کے سامنے ہر وقت ہاتھ پھیلائے رہتے تھے، کبھی اس تعلق سے کہ وہ لڑائی اور جنگ کے کارندے ہیں اور شہری معاملات کے نظم وضبط کے ذمہ دار ہیں اور وہ انہی کے طریقوں کی نقل کرتے تھے، اور اس کا مقصد ضرورت پوری کرنا نہ تھا، بلکہ اپنے بڑوں کے طور وطریق کو اختیار کرنا تھا، اور کبھی اس تعلق سے ان سے جڑے ہوتے تھے کہ شاعر ہیں اور بادشاہوں کا طریقہ ان کو انعام واکرام دینے کا ہے، اور کبھی اس تعلق سے کہ وہ تارک الدنیا قسم کے لوگ ہیں کہ ان کے حالِ زار کی فکر بادشاہ کے لیے کرنا مناسب سمجھا جاتا تھا، اور ان میں سے بعض بعض کو پریشان بھی کرتے تھے اور ان کی آمدنی کا ذریعہ بادشاہوں کی صحبت اختیار کرنے میں اور انکے ساتھ تعلق قائم کرنے میں اور ان کے ساتھ اچھی باتیں کرنے میں اور چاپلوسی میں ہوتا تھا، اور یہ سب چیزیں زندگی کا ایک فن بن گئی تھیں کہ جس میں ان کی عقل اور غور وفکر طرح طرح کی صورتیں اختیار کرتی تھیں اور اس سلسلہ میں ان کے سارے اوقات ضائع ہوتے تھے، ان سب کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ اس طرح کی مشغولیتیں لوگوں کے دلوں میں بہت گھٹیا قسم کی کیفیات پیدا کرنے والی بن گئی تھیں اور اچھے اخلاق وکردار سے صرف ذہن کرلیا گیا تھا'' (۱)۔

جزیرۃ العرب

اِدھر عربوں کا حال شرک، کفر وگمراہی میں کسی سے کم نہ تھا۔ وہ اپنے کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر کہتے تھے، لیکن اس کے خلاف شرک اور سخت لادینی میں مبتلا تھے، البتہ جاہل تھے اور علم سے دور تھے، اس کی بنا پر تمدن سے آنے

---

(۱) حجۃ اللہ البالغۃ، جلد اول، باب إقامۃ الارتفاقات وإصلاح الرسوم۔

والی خرابیاں ان میں نہیں تھیں، اس پہلو سے وہ فطری مزاج رکھتے تھے، اور صرف اپنے اپنے خاندان کی روایات کے پابند تھے، اپنے اسلاف کے طریقے کو اصل طریقہ سمجھتے تھے اور خود ان کا ذہن جس کو قبول کر لیتا اس پر قائم ہو جاتے تھے، اور اپنی عزت اور بات پر اڑ جاتے تھے، جان لے لیتے اور جان دے دیتے تھے، وہ مشرک تھے، بت پرست تھے اور ظلم وحیاسوزی کے جو طریقے ان میں عام ہو گئے تھے ان کو اختیار کئے ہوئے تھے۔

''اس میں شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ بت پرستی اس زمانہ میں ساری دنیا میں پھیلی ہوئی تھی، بحر اوقیانوس سے بحر الکاہل تک دنیا بت پرستی میں غرق تھی، عیسائیت، سامی مذاہب، بدھ مت، گویا بتوں کی تعظیم وتکریم میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش میں مصروف تھے'' (۱)۔

عالمگیر سطح پر انسانوں کی پستی اور بگاڑ

الغرض انسانی تاریخ میں یہ مرحلہ ایسا آ گیا تھا کہ پوری انسانیت خودکشی کے راستہ پر تیزی کے ساتھ گامزن تھی، انسان اپنے خالق ومالک کو بھول چکا تھا اور خود اپنے آپ کو اور اپنے مستقبل اور انجام کو فراموش کر چکا تھا، اس کے اندر بھلائی اور برائی اور زشت وخوب میں تمیز کرنے کی بھی صلاحیت باقی نہیں تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انسانوں کے دماغ ودل کسی چیز میں کھو چکے ہیں، ان کو دین وآخرت کی طرف سر اٹھا کر دیکھنے کی بھی فرصت نہیں اور روح وقلب کی غذا، اخروی فلاح، انسانیت کی خدمت اور اصلاح حال کے لئے ان کے پاس ایک لمحہ خالی نہیں، بسا اوقات پورے پورے ملک میں ایک شخص ایسا نظر نہ آتا جس کو اپنے دین کی فکر ہو، جو خدائے واحد کی

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھیں: نبی رحمت، ص:۴۲، از: مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، والبدایۃ والنھایۃ: ۱۹۳-۱۹۰/۲

پرستش کرتا ہواور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراتا ہو، جس کے جگر میں انسانیت کا درد ہواور اس کے تاریک وہولناک انجام پر کچھ بے چینی ہو، یہ صورت حال اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی ہو بہو تصویر تھی کہ:

﴿ظهر الفساد فی البر والبحر بما کسبت أیدی الناس لیذیقهم بعض الذی عملوا لعلهم یرجعون﴾
(سورہ روم آیت:۴۱)

خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب فساد پھیل گیا ہے، تاکہ خدا ان کو ان کے بعض عملوں کا مزہ چکھائے، عجب نہیں کہ وہ باز آجائیں(۱)۔

شاہ ولی اللہ دہلوی بعثت نبوی سے پہلے دنیا کے مذہبی، تمدنی اور سماجی حالات کا جائزہ لینے کے بعد عالمی نبی کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''چنانچہ یہ مصیبت جب بہت بڑھ گئی، اور یہ مرض سخت ہوتا چلا گیا، تو اللہ تعالیٰ کی ان پر بہت ناراضگی ہوئی اور اللہ کے مقرب فرشتے بھی ان سے ناراض ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی مرضی اس مرض کے علاج کے سلسلہ میں اس مرض کی جڑ ہی کاٹ دینے کی ہوئی اور اسی لیے ایسے نبی کو مبعوث کیا جس کا نشو ونما تعلیمی راستہ سے نہیں ہوا تھا اور وہ امی تھا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور نہ وہ ایرانی شخصیتوں سے ملا تھا اور نہ وہ رومی شخصیتوں سے ملا تھا اور نہ اس نے ان لوگوں کے طور وطریق کو اختیار کیا تھا، اور اللہ تعالیٰ نے اس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ترازو کا انداز عطا فرما دیا تھا، کہ جس سے وہ اچھے طور وطریق کو جو اللہ کو پسند ہے، برے طور وطریق سے جو اللہ کو ناپسند ہے جدا کرتا تھا، اور اللہ تعالیٰ نے اس کی زبان کو اس بات کی گویائی عطا فرمائی کہ ان غیر عرب لوگوں کی عادتیں، اور اسی طرح دنیا کی زندگی میں اس طرح غرق ہو جانا کہ اسی پر مطمئن ہو جایا جائے اس کی مذمت کرتا تھا، اور اس کے سلسلہ میں ان کے دل میں اللہ نے یہ بات ڈالی کہ غیر عربوں نے جو طریقے اختیار کر لئے ہیں

(۱) نبی رحمت، ص:۵۸

اور ایک دوسرے پر فخر کرتے ہیں، جیسے ریشم وغیرہ کا لباس پہننا، سونے چاندی کا برتن استعمال کرنا، اور تصویریں اور گھروں کو پھول بوٹوں سے مزین کرنا اور نقش ونگار بنانا اور اسی طرح کی چیزوں کی مذمت بیان کی اور اپنے عمل سے ان سب کی حکومت کو ختم کر کے اپنی اللہ والی حکومت قائم کی اور ان لوگوں کی بڑائی کو ختم کر کے اپنے خدا کی بڑائی قائم کی اور یہ بات طے کردی کہ اب کسریٰ کے خاتمہ کے بعد مزید کسری نہیں پیدا ہوگا، اور قیصر کے ختم ہونے سے نیا قیصر نہیں پیدا ہوگا'' (۱)۔

عظیم ترین نبی کی ضرورت

اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں عالم انسانیت اب جس مرحلہ میں داخل ہونے جارہا تھا وہ مرحلہ دنیا کے اطراف واکناف کے ایک دوسرے سے قریب آجانے اور علمی وعملی تجربات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا مرحلہ تھا، لہذا اس آخری نبی کو ان حالات وکیفیات کے حل کے ساتھ مبعوث فرمایا اور اس کو جو آسمانی کتاب عطا کی وہ ان پہلوؤں کی جامع رہنما بنی اور اس کتاب کی حفاظت کی ذمہ داری خود لی تاکہ انسانوں کے بدطینت لوگ اس میں تصرف نہ کرسکیں اور نبی کی نبوت کا سلسلہ جس طرح تاقیامت ہو اسی طرح اس کتاب کی سچی رہنمائی بھی تاقیامت ہو اور ان دونوں کی سرپرستی میں امت مسلمہ کے سامنے راہ ہدایت بلا کسی تغیر وتبدیلی کے روشن رہے اور جو واقعی ہدایت کا طالب ہو وہ واقعی ہدایت پاسکے اور جو گمراہی ہی کو اپنائے وہ واقعی گمراہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کے طے کردہ نظام اور اس کے علم میں دنیا کا جو نیا دور شروع ہونے والا تھا اس کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہوا کہ اس آخری اور عالمی اور تاقیامت قائم رہنے والی نبوت کے حامل نبی کے ذریعہ شروع ہو اور اس کی امت اس کو دنیا میں جاری کرے، چنانچہ اس نبی کو دی ہوئی کتاب کے ذریعہ اور اس نبی کی ہدایات اور خود اس

---

(۱) حجۃ اللہ البالغۃ، جلد اول، باب إقامۃ الارتفاقات وإصلاح الرسوم۔

کے عملی طریقہ کار کے ذریعہ دنیا کا وہ رخ بنا جس کی بناپر دنیا کی زندگی میں علم کا رواج ہوااور اس کا نظام عالمی بنا، یہ نظام عالمی وہ نظام نہیں جس کو دنیا کی خود غرض اور نفس پرست طاقتوں نے اپنے اقتدار کو پھیلانے کے لئے عالمی نظام کا نام دیا ہے، بلکہ یہ نظام عالمی اسلامی اور نبوی نظامِ عالمی تھا جس میں خیر کو عام کرنے اور ہر چھوٹے بڑے ،غریب وامیر، طاقتور وکمزور اور صاحب اقتدار و بے سہارا کو یکساں سہولت، یکساں حق، یکساں وسائل زندگی عطا کرنے اور سب کو یکساں طریقے سے ایک ہی خدا کی تابعداری میں لانے کا عالمی نظام ہے جو اللہ رب العالمین کی طرف سے تمام بندگان خدا کے لئے اپنے آخری نبی کے ذریعہ عطا کردہ ہے اور اس آیت قرآنی کی تفسیر ہے کہ ﴿وما أرسلناك إلا رحمة للعالمين﴾ اور ﴿وإن هـذه أمتكم أمة واحدة وأنا ربكم فاعبدون﴾ کہ ہم نے تم کو سارے جہانوں کے لئے رحمت ہی بنا کر بھیجا اور یہ تمہاری امت ایک امت ہے اور میں تم سب کا رب ہوں لہذا میری ہی عبادت کرو۔

☆☆☆

جزیرۃ العرب کا حال بعثت محمدی کے وقت

بعثت محمدی کے وقت دنیا کے مختلف خطوں کے مذکورہ بالا حالات اور پھر جزیرۃ العرب کے باشندوں کی غیر تعلیم یافتہ اور غیر متمدن آبادی کو جس سنگلاخ اور نیم بنجر سرزمین میں زندگی گذارنا پڑ رہا تھا ان میں اس نئے مبعوث ہونے والے نبی کو کیسی اہم ذمہ داری انجام دینی تھی، یہ ایک بہت اولوالعزمی اور اعلیٰ انسانی وروحانی صلاحیت کے حامل انسان کا کام تھا، ایک طرف عرب قوم کو جوان پڑھ اور غیر متمدن ہونے کی بنا پر اپنی بات پر اڑنے والے اور سختی سے جمنے والے مزاج کے تھے ان کی زندگی میں پیوست عادتوں سے ان کو ہٹانا اور ان کی اصلاح کر کے ان کو معیاری اور قائدانہ صفات کی حامل قوم کی سطح تک پہونچانا پھر ان کے توسط سے دنیا کی دیگر قوموں کو بھی راہ راست پر لانا جن میں کئی متمدن ترین قومیں تھیں، جو عربوں کو دیہاتی اور پس ماندہ سمجھ کر حقیر اور نا قابل التفات سمجھتی تھیں، اور ان کی بات کو کسی خاطر میں نہیں لاتی تھیں، اسی رسول خدا ﷺ کو یہ مہم انجام دینی تھی، جو کہ نا قابل تصور اور عظیم ترین کام تھا۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتخاب فرمایا، پھر ان کے کام کے ہر مرحلہ میں اپنی ہدایات اور رہنمائی وحی کے ذریعہ برابر فرمائی، اللہ رب العالمین تنہا تمام کائنات کا بنانے والا اور تمام مخلوقات اور انسانوں کا خالق ہے، لہذا وہی جانتا ہے کہ اس کا کون بندہ کیا اور کس حد تک مفوضہ کام کر سکے گا، اللہ تعالی کے یہ انتخاب کردہ نبی عرب قوم کے ہی کے ایک فرد تھے، لیکن اللہ تعالی کے بنائے ہوئے اور اس کے انتخاب کئے ہوئے تھے، اللہ تعالی فرماتا ہے ﴿و اللہ یعلم حیث

یجعل رسالتہ﴾ کہ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ کہاں وہ اپنی پیغمبری کے کام کو رکھے، بہر حال اس عظیم نبی کے کارنامے جاننے سے پہلے اس کی قوم کو اور جس خطۂ زمین میں وہ بسی ہوئی تھی اس کو سمجھ لیا جائے، تاکہ اس کے کام کی اہمیت ظاہر ہو سکے۔

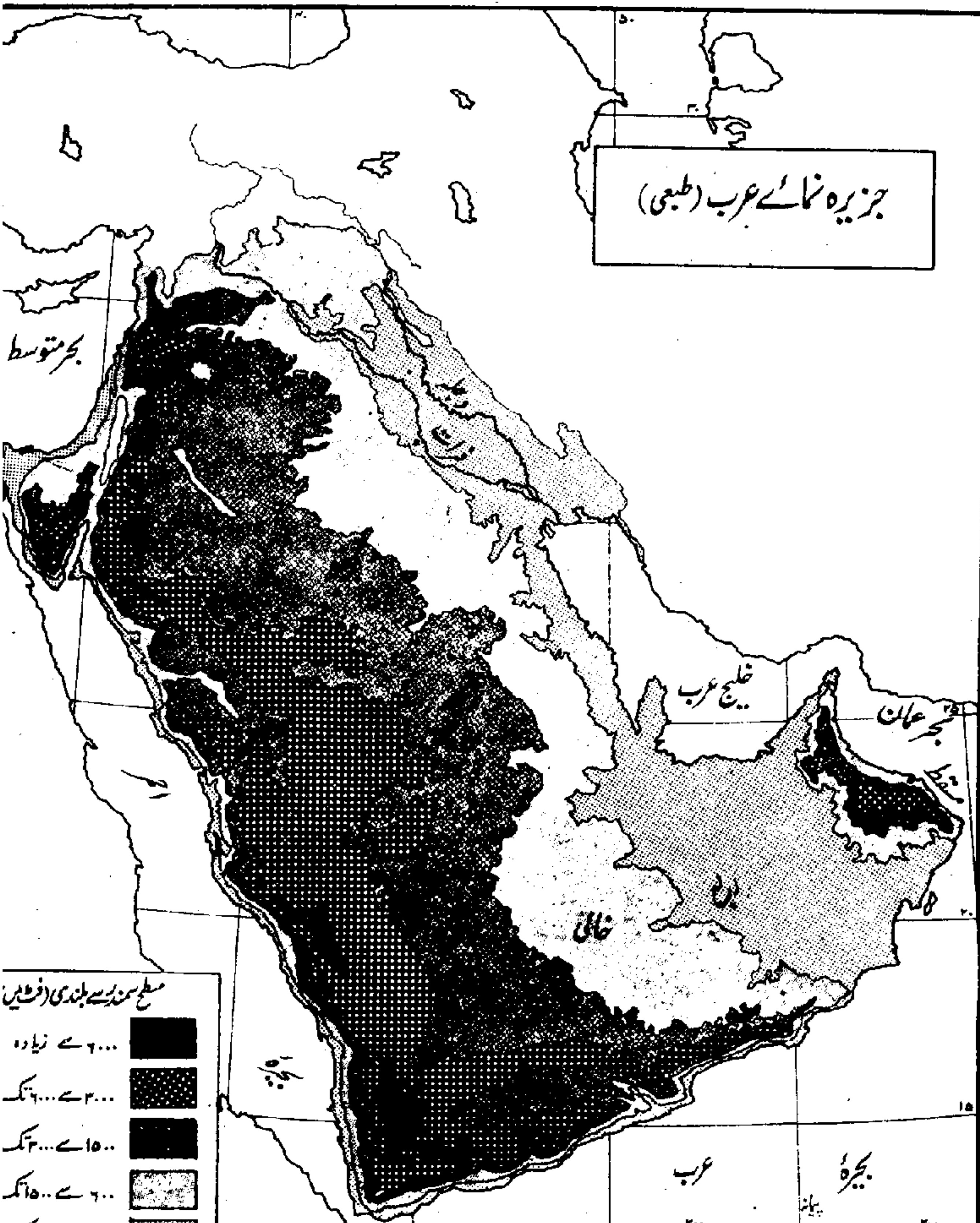
جزیرۃ العرب میں انسانی آبادی

عرب حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر آئے ہوئے عذاب سے بچے ہوئے افراد کی اولاد در اولاد میں سے تھے اور حضرت نوح علیہ السلام کے بعد دنیا میں انسانی آبادی صرف ان کی اسی عذاب سے محفوظ رہنے والی اولاد سے ہی بنی تھی، تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ انکے بظاہر تین بیٹے ایسے تھے جو آئندہ انسانوں کے مورث ہوئے، ان میں ایک سام تھے، ان کی اولاد عموماً اس علاقہ میں جس کو مشرق وسطیٰ کہا جاتا ہے جس میں عراق اور جزیرۃ العرب اور مصر ہے پھیلی، دوسرے حام تھے، ان کی اولاد افریقہ و دیگر جنوبی علاقوں میں بسی، تیسرے یافث تھے، ان کی اولاد دنیا کے شمالی و مشرقی علاقوں میں بسی، سام کی اولاد میں آرام ہوئے، ان کے قبیلے عرب کے مختلف علاقوں میں پھیلے اور مختصر یہ کہ وہ سب گمراہیوں میں مبتلا ہو کر اپنے نبیوں کی بات نہ ماننے پر بتدریج عذابوں کے آنے سے تباہ ہوئے، ان کے علاوہ دیگر قبائل میں ایک قبیلہ قحطان تھا جو جنوبی جزیرۃ العرب یمن وغیرہ میں بسا، اور اس کی ایک شاخ عراق میں رہی، قحطان کی ہی اولاد میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خاندان ہوا اور وہ عراق ہی میں رہا، اور ان میں ان کی اصلاح کی غرض سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نبی مقرر کئے گئے (۱)۔

حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد

حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے سام کی اولاد میں ارفخشذ کی نسل سے تھے (۲)، وہ عراق میں کلدانی خاندان کے ایک بڑی شخصیت

(۱) الکامل فی التاریخ: ۱/۷۸۔ (۲) البدایۃ والنہایۃ: ۱/۱۳۹، المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، جزء اول، از: ڈاکٹر جواد علی۔



(کارٹوگرافی از محمود اختر)

کے بیٹے تھے، یہ خاندان ستارہ پرست مشرک خاندان تھا(۱) بچپنے میں اپنے خاندان اور اہل وطن کی بت پرستی اور شرک عجیب سا معلوم ہوا، کہ یہ لوگ ستاروں کو خدا سمجھ کر ان کی علامتیں بتوں کی صورت میں بنا کر عبادت کرتے ہیں، یہ ستارے اوپر سہی لیکن یہ خدا کیسے ہوسکتے ہیں، انہوں نے پہلے ستاروں پر غور کیا، پھر چاند پر، پھر سورج پر اور ان کا دل نہیں مانا، انہوں نے خدا کو اس سے بلند محسوس کیا، اور اس کا خیال کر کے اپنی براءت کی دعا کی اور دعا قبول ہوئی، اور اللہ کی بڑائی پھر وحدانیت ان کے دل میں بیٹھ گئی (۲) پھر وہ بھی خدا کی طرف سے نبی منتخب ہوئے اور انہوں نے بتوں کو توڑ ڈالا اور اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی (۳) اس پر قوم بہت ناراض ہوئی اور ان کو آگ میں ڈالا، لیکن اللہ نے ان کو آگ میں جلنے سے محفوظ رکھا، پھر وہ وطن چھوڑ کر شام کے علاقہ میں آگئے اور فلسطین میں قیام کیا، ان کے ساتھ ان کے بھتیجے لوط علیہ السلام بھی آئے، اور انہوں نے اپنے اپنے علاقہ میں اصلاح ودعوت کا کام کیا (۴)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک بیٹے اسحاق ہوئے (۵)، ان کے ایک بیٹے یعقوب علیہ السلام ہوئے (۶) جن کا نام اسرائیل بھی تھا، ان کی جو نسل ہوئی وہ اولاً شام میں پھر مصر میں بسی، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے بیٹے اسمٰعیل ہوئے جن کو ان کے والد حضرت ابراہیم نے جزیرۃ العرب کے وسطی علاقہ کے مکہ مکرمہ کے بے آب وگیاہ اور بنجر علاقہ میں ان کی ماں کے ساتھ بلکہ بچپنے کی حالت میں اپنے رب کے حکم پر لیجا کر ٹھہرا دیا (۷) وہاں بعد میں یمن کے قبیلہ قحطان کی شاخ قبیلہ جرہم بھی آکر بس گئی اور بعد میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا ان سے رشتہ ہونے پر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا خاندان بنا، اس خاندان کی شاخیں نجد وحجاز وغیرہ

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ: ۱/۱۴۰۔ (۲) الکامل فی التاریخ: ۱/ ۹۵-۹۶
(۳) أیضاً۔ (۴) أیضاً۔ (۵) البدایہ والنہایہ، ج ۱/ ۱۶۰
(۶) الکامل فی التاریخ: ۱/۱۰۲۔ (۷) ایضاً۔

میں بسیں، ان میں حجاز میں مقیم ہونے والوں کے مورث مضر نامی شخص تھے اور ان ہی کی اولاد میں آگے چل کر قریش ہوئے۔

مکہ مکرمہ کی آبادی حضرت اسمٰعیل سے شروع ہوئی تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو بچپنے ہی میں مکہ کے بے آب وگیاہ میدان میں ان کی ماں کے ساتھ لے جا کر اللہ کے حکم سے ٹھہرادیا تھا جو کہ حضرت ابراہیمؑ کی عظیم قربانی تھی کہ اپنے شیر خوار بچے اور ان کی ماں کو زندگی کے کسی قابل اعتبار سہارے کے بغیر مکہ جیسی بنجر اور بے آب وگیاہ اور آبادی سے خالی جگہ ٹھہرایا اور اپنے پروردگار کے حکم کی تعمیل بے چوں چرا کی، یہ جگہ وہ تھی کہ حضرت آدمؑ بھی یہاں آچکے تھے اور یہاں مسجد کی بنیاد رکھی تھی جو بعد میں مٹ گئی تھی، قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کے اسی عمل کا تذکرہ اس طرح آیا ہے:

﴿ ربنا إني أسكنت من ذريتي بواد غير ذي زرع عند بيتك المحرم ربنا ليقيموا الصلاة فاجعل أفئدة من الناس تهوي إليهم و ارزقهم من الثمرات لعلهم يشكرون﴾

[ابراهيم: ۳۷]

اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی کچھ اولاد اس بے کھیتی کی وادی میں تیرے حرمت والے گھر کے پاس بسائی ہے، اے ہمارے پروردگار! یہ اس لئے کہ وہ نماز قائم رکھیں، پس تو کچھ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کردے، اور انہیں پھلوں کی روزیاں عنایت فرما تا کہ یہ شکر گذاری کریں۔

اس بنجر علاقہ میں اللہ تعالی کے خصوصی فضل سے ماں اور ان کا شیر خوار بچہ زندہ رہے، پھر جب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کچھ بڑے ہوئے اور صحت مند اور اپنے باپ وماں کے اطاعت شعار ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ کو حکم ہوا کہ حضرت اسمٰعیل کو اللہ کی راہ میں قربان کردیں اس قربانی پر بھی عمل حضرت ابراہیمؑ نے اپنی طرف سے کردیا اپنی آنکھ پر پٹی باندھ کر چھری چلادی، لیکن اللہ کو صرف امتحان لینا تھا، اس لئے حضرت ابراہیمؑ کی چھری ان کو نہیں لگی، بلکہ ایک مینڈھے کو اللہ تعالی نے بھیج دیا، ور ابراہیم کی

چھری اس کی گردن پر لگی اور وہ ذبح ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو حضرت اسمٰعیل کی ہی قربانی مان لیا اور حضرت ابراہیمؑ کو اپنا سب سے برگزیدہ اور مخلص ترین بندہ کے طور پر قبول کرلیا اور ان کو اپنا دوست قرار دیا(۱) اور پھر ان کو اور ان کے بیٹے اسمٰعیل کو حضرت آدم کی شروع کردہ مسجد کی جگہ میں کعبہ کی تعمیر کا حکم دیا اور اس طرح وہ دنیا میں اللہ کے پہلے گھر کے طور پر قائم ہوا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت کا اولین اور اصل مرکز بنا اور اس کو قیامت تک کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے توحید کا گھر اور دین حق کا مرکز قرار دے دیا گیا، حضرت اسمٰعیل کی اولاد بڑھتی اور پھیلتی رہی اور ان میں سے مکہ مکرمہ میں آباد رہنے والے اللہ کے اس گھر کی حفاظت کو اپنا فریضہ سمجھتے رہے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں کئی نسلوں کے بعد عدنان نامی شخص ہوئے، ان کی اولاد میں معد، نزار پھر آگے چل کر مضر اور ربیعہ ہوئے، ربیعہ مشرقی علاقہ نجد میں جا کر بس گئے، اور مضر مکہ ہی میں رہے، ان میں آگے چل کر قریش ہوئے، اور بیت اللہ کی تولیت ان کے پاس آئی، اللہ کا گھر مقدس گھر سمجھا جاتا رہا، اور سارے عرب اطراف واکناف سے اس کا حج کرنے آتے اور قریش ان کے قیام وغیرہ کا انتظام کرتے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس گھر کی اور اس کے تعلق سے پورے شہر کی حفاظت ہوتی رہی (۲)۔

شہر مکہ مکرمہ

مکہ مکرمہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے وہاں ٹھہرائے جانے سے پہلے بالکل ایک غیر آباد اور بنجر زمین کا حصہ تھا(۳) دو خشک پہاڑی سلسلوں کے درمیان

---

(۱) الکامل فی التاریخ: ۱/۱۱۲

(۲) الروض الأنف: ۱/ ۷-۸، البدایہ والنھایۃ: ۲/ ۱۹۸-۲۱۰، المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، جزء اول

(۳) البدایۃ والنھایۃ: ۱/۱۵۴۔

وادی اردگرد بارش کے بعد بہنے والے پانی کی وقتی گذرگاہ بنتی تھی، پھر خشک اور بغیر پانی کی بن جاتی تھی، مگر اس کا جائے وقوع خدا کے خصوصی کرم کا حامل تھا، جس کی بنا پر اللہ تعالی کی طرف سے زمین پر انسانی آبادی کے آغاز ہی سے اس کا انتخاب ہو چکا، اور وہاں انسان اول حضرت آدم علیہ السلام نے خدا کی عبادت کی جگہ بنادی تھی، اور بعض معلوماتی پہلوؤں سے حضرت آدم کی اس کرۂ ارضی پر آمد کے وقت ان کا اور ان کی اہلیہ حضرت حوا علیہما السلام کا قیام انہی اطراف میں ہوا تھا، نیز اس پورے کرۂ ارضی پر انسانی آبادی کے علاقوں کو اگر جائے وقوع کی بنیاد پر دیکھا جائے تو مکہ کی جگہ انسانی آبادی کے علاقوں کے بالکل وسط میں نظر آتی ہے، غالبًا یہی وجہ ہے کہ انسان کے جسم میں ناف کو جو مقام حاصل ہے وہی مقام کرۂ ارضی پر انسانی آبادی کے بالکل وسط میں مکہ کو حاصل ہے، اس طرح یہ دنیائے انسان کا مرکز ہے، اور اس کو اللہ تعالی نے اپنی عبادت گذاری کا مرکز بھی بنادیا، چاروں طرف سے نماز پڑھنے والے اسی رخ پر نماز پڑھتے ہیں، اور اس کے مرکز میں اللہ کا وہ گھر ہے جو اس کی زمین پر اس کی عبادت کا پہلا مقام ہے، اور وہاں پہونچ کر اس کے اردگرد عبادت کے طور پر طواف کیا جاتا ہے(۱)۔

چنانچہ اللہ تعالی کے آخری نبی کو بھی جس کی شریعت وتعلیمات کو دنیا کے اختتام تک جاری رہنا ہے، وہیں پیدا کیا گیا، اور ایسے خاندان میں پیدا کیا گیا جو پورے عرب علاقوں کے باشندوں کی نظر میں سب سے محترم خاندان اور خاندان کے اندر بھی سب سے محترم شاخ میں آپ کو پیدا کیا گیا، مکہ کی آبادی جو آخر میں صرف قریش کے قبیلہ پر مشتمل تھی آپ کے جد اکبر قصی بن کلاب کی زیر سرکردگی ایک مضبوط جمہوری نظام پر مشتمل مانی جاتی تھی، اور وہاں کے دینی اور دنیاوی دونوں معاملات کی انجام دہی کے لئے ایک اچھا نظام مقرر تھا، جس کی انتظامی ذمہ داریاں خاندان کی

---

(۱) مکہ مکرمہ کی تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں: تاریخ مکہ للازرقی: ۱/ ۳۸، المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام

مختلف شاخوں پر تقسیم کی گئی تھیں، اور اس طریقہ سے شورائی اور جمہوری نظام بن گیا تھا جو اپنے زمانہ کے رائج الوقت دنیا کے نظاموں کے درمیان ایک منفرد نظام تھا، جب کہ اس وقت دنیا کے تعلیم یافتہ اور متمدن قوموں میں شہنشاہیت اور ڈکٹیٹر شپ کا رواج تھا، ایسے ہی زمانہ میں انہوں نے ایک جمہوری اور شورائی نظام قائم کیا جو ایک چھوٹے علاقہ میں تھا، لیکن اپنے طریقہ کے لحاظ سے اہم تھا، اس نظام کو ان کی اولاد میں قائم رکھا گیا، اور قصی کا گھر اس شورائی نظام کا مرکز قرار پایا، جس کی حیثیت ایک طرح سے جمہوری پارلیمنٹ کی سی تھی، اس نظام کے مختلف کاموں میں اللہ کے اس گھر کی زیارت کرنے والوں، اور آنے والوں کی راحت اور ضیافت کی ذمہ داری بھی تھی جو حضور ﷺ کے اجداد کو ملی تھی، اور اس کو ان حضرات نے ایسی خوبی کے ساتھ انجام دیا کہ پورے جزیرۃ العرب میں ان کی عظمت اور احترام کو سب کے دلوں میں جاگزیں کر دیا (۱) حضور ﷺ کے دادا عبد المطلب کو اس سلسلہ میں بڑا امتیاز حاصل رہا، اور انہوں نے اپنی ذمہ داری کو بہت اچھے ڈھنگ سے انجام دیا (۲)۔

بئر زمزم کی بازیافت

حضور ﷺ کے دادا عبد المطلب نے جہاں اور چیزوں کی فکر کی وہاں اس بات کی بھی فکر کی جس کا اشارہ ان کو خواب کے ذریعہ ملا تھا، کہ وہ اس مبارک چشمہ زمزم کو جو بتدریج متروک ہو کر اوپر سے بند ہو گیا تھا، دوبارہ زمین کے اندر سے باہر لائیں (۳)، وہ جب اس میں کامیاب ہوئے تو اس مبارک کام کا سہرا ان کے سر بندھنے دیکھ کر خاندان کی دوسری شاخوں نے اس کو سب کا مشترکہ قرار دیکر اپنا حق جمایا، ان کے جھگڑا کرنے پر وہ سب لوگ اور آپ اس کے لئے شام کے علاقہ کی

---

(۱) أنساب الأشراف، از: بلاذری، ص: ۱۲-۶۴

(۲) الکامل فی التاریخ: ۲/ ۱۲-۳۳۔ (۳) أیضاً، الروض الأنف: ۱/ ۹۸

طرف کسی کاہن کے پاس جا کر فیصلہ کرانے کے لئے تیار ہوئے، لیکن سفر کے دوران عبدالمطلب کیساتھ اللہ تعالی کی طرف سے ایسی مدد ہوتی نظر آئی کہ عبدالمطلب کی امتیازی حیثیت سب کے سامنے واضح ہوئی، جن کو اپنی عمر کے آخری دور میں اس نبی آخرالزماں کے بچپنے کی سرپرستی کرنے کی سعادت ملی، اور پھر اس نبی آخرالزماں کے ذریعہ مکہ اور اس میں روز اول سے معین کردہ عبادت خانہ کو بین الاقوامی اور تاقیامت عبادت کا مرکزی مقام دینے کا فرض انجام دینے کی سعادت حاصل ہوئی، اللہ تعالی فرماتا ہے:

﴿إن أول بيت وضع للناس للذي ببكة مباركاً و هدى للعالمين﴾ [آل عمران:۹۶]

پہلا گھر جو لوگوں کے عبادت کرنے کے لئے مقرر کیا تھا وہی ہے جو مکہ میں ہے بابرکت اور جہان کے لئے موجب ہدایت۔

پھر اللہ کے اس آخری نبی کو جو انہی عبدالمطلب کے یتیم پوتے تھے پروردگار عالم کے ذریعہ نبی آخرالزماں کا بلند مقام عطا ہوا، اور اس کو پروردگار عالم کی عبادت اور اطاعت کا پورا نظام واضح اور نافذ کرنے کا کام سپرد کیا گیا، کہ جس کی بنا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے محبوب شیر خوار فرزند اور ان کی ماں کو بے یار و مددگار وہاں ٹھہرا کر رکھی، اور جس کو ان کی اولاد نے اپنی خواہشات اور اپنے دنیاوی مصالح کے پیش نظر تقریباً ان کی خواہشات و رجحانات کو دبا دیا تھا، اور اپنے ایک رب کی پاسداری کو بے شمار خداؤں کی پوجا کرنے کے پیچھے چھپا دبا دیا تھا۔

مکہ کا جائے وقوع اور طبعی حال

مکہ مکرمہ جہاں سے دعوت حق کے آغاز کا اعلان ہوا اور جو نبی آخرالزماں کا پیدائشی وطن تھا دو پہاڑی سلسلوں کے درمیان کی وادی میں واقع ہے، سطح سمندر سے اس کی بلندی تقریباً ساڑھے تین سو فٹ بتائی جاتی ہے، اس کا عرض البلد 21 درجہ

شمالی اورطول البلد 39.5 درجہ مشرقی ہے، ساحل سمندر سے تقریباً ۷۵ کیلومیٹر مشرق میں واقع ہے، بکۃ، مکہ، ام القریٰ اور البلد الأمین اس کے نام ہیں، یہ جس وادی میں آباد ہے، وہ پتھریلی اور تنگ وادی ہے، اس میں شہر مکہ مکرمہ مشرق سے مغرب تک تقریباً کئی میل میں پھیلا ہوا ہے، شہر کا عرض بھی دو میل کا ہے، اس کی وادی ابطح اور بطحاء بھی کہی جاتی ہے، مکہ کی یہ وادی دو پہاڑی سلسلوں سے گھری ہوئی ہے، جو مغرب سے شروع ہو کر مشرق تک چلے گئے ہیں، ان میں ایک سلسلہ شمالی ہے، اور ایک جنوبی، ان دونوں سلسلوں کو اخشبان کہتے ہیں (۱)۔

شہر میں پانی کا ایک ہی چشمہ ہے، جس کو زمزم کہتے ہیں اس کے علاوہ یہاں پانی کا کوئی خاص کنواں نہیں ہے، پانی کی کمی کی وجہ سے یہاں کی زمین میں کچھ کاشت نہیں ہوسکتی تھی، اب دو ایک نہریں شہر میں دوسری جگہ سے لے آئی گئی ہیں، ان کی وجہ سے پانی کی سہولت ہوگئی ہے، اس کی مدد سے کچھ گھانس اور پودے بھی لگائے دیے گئے ہیں، عہد عباسی ہی میں طائف کے قریب سے یہاں ایک نہر لے آئی گئی ہے، یہ نہر، نہر زبیدہ کہلاتی ہے یہ عباسی خلیفہ امین کی والدہ زبیدہ نے بنوائی تھی، اور بعد میں اس کو ترقی دی جاتی رہی، اب پانی پہنچانے کے دوسرے ذرائع بھی اختیار کیے گئے ہیں، جن کی وجہ سے اب پانی کی بالکل قلت نہیں رہی، مکہ چونکہ ایک وادی میں ہے، اس لیے ایام گزشتہ میں بڑے سیلابوں سے اس میں پانی بھر جایا کرتا تھا، اور حرم شریف میں بہت پانی جمع ہو جاتا تھا، اب حکومت نے معلاۃ سے پہلے ایک بندھ بنادیا ہے، اور اس کے علاوہ حرم اور حرم کے آگے ایک زمین دوز بڑا نالہ بھی بنادیا ہے جس میں شہر کا گندا اور سیلاب کا پانی بہہ کر مکہ کے نشیبی حصہ ''مسفلہ'' کی طرف سے نکل جاتا ہے۔

پہاڑوں کے درمیان خصوصی طور پر گھرے ہونے کی وجہ سے مکہ مکرمہ میں

---

(۱) تاریخ العرب قبل الاسلام: ۴/۷

گرمی زیادہ اور سردی کم ہوتی ہے، شہر کا موسم گرمیوں میں سخت ہوتا ہے، اور بارش صرف جاڑوں میں ہوتی ہے، اس کی سالانہ مقدار چار پانچ انچ سے زیادہ نہیں، لہٰذا گرمی کا موسم مارچ میں شروع ہوکر آخر اکتوبر تک رہتا ہے، پہاڑوں سے گھرے ہونے کی وجہ سے موسم سرما میں سردی کم ہوتی ہے، ہواؤں میں سب سے بہتر ہوا مغربی ہوا ہوتی ہے، یہ سمندر کی طرف سے آتی ہے، اس کے بعد شمالی ہَوا، یہ بھی سمندر کی طرف سے آتی ہے اور سب سے گرم مشرقی ہوا ہوتی ہے۔

اس کے پہاڑوں کو توریت میں جبال فاران بتایا گیا ہے، یہ نام غالبًا فاران بن عمرو ابن عملیق بادشاہ کی نسبت سے ہوا۔

مکہ میں آبادی شروع شروع میں صرف خیموں میں رہتی تھی، ہجرت سے صرف دوصدی پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جد قصی بن کلاب جب شام سے آئے تو ان کے مشورہ سے مکانات بننا شروع ہوئے، اور مکہ کے معاشرہ کو اور اس کی اجتماعی اور مذہبی ذمہ داریوں کو منظّم کیا گیا، اور ان کو اصلاً قصی بن کلاب ہی نے سنبھالا، اس سے قریش کی اہمیت بڑھی اور یہ ذمہ داریاں ان میں مخصوص ہوگئیں، اسلام کے آنے کے بعد شہر کو برابر ترقی ہوئی، اب یہ اپنے قرب وجوار میں دور دور تک سب سے بڑا اور پورے عالم اسلامی کا سب سے اہم اور مرکزی شہر ہو چکا ہے(۱)۔

عربوں کی بت پرستی

مکہ کے لوگ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا شروع میں بت پرست نہ تھے، ان کے اصلی لوگ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد تھے، اور اپنے کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ماننے والے سمجھتے تھے، اور ان کے دین کو اپنا دین سمجھتے تھے، ان کے ساتھ

---

(۱) جزیرۃ العرب، از: مؤلف، ص: ۲۲۲-۲۲۵۔ (عربوں کی دینی ومذہبی حالت کے لیے ملاحظہ فرمائیں: المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، از ڈاکٹر جواد علی، ج ٦)۔

یمنی قبیلہ جرہم پھر خزاعہ کے لوگ آ کر بس گئے تھے، وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے مختلف دین رکھتے تھے، اسماعیلی لوگوں میں بت پرستی بعد میں آئی، اس طرح کہ مکہ کے ایک شخص عمرو بن لحی جو جرہم قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا، اسکے ذریعہ آئی تھی جس نے اپنے شام وعراق کے ایک سفر کے دوران وہاں بت پرستی دیکھی اور وہ اس کو اچھی لگی اور وہاں سے بت لا کر مکہ مکرمہ میں اس کا تعارف کرایا اور کعبہ کے دروازہ پر اس کو نصب کیا، اس کا ہبل نام تھا، اور وہ انسان کی شکل میں تھا، اس کو بتدریج اہل مکہ سب سے بڑا اور اہم بت سمجھنے لگے، اور اس کے ساتھ مختلف جگہوں پر دوسرے بت نصب ہوتے چلے گئے، بالآخر اس طرح بتوں کی کثرت ہوگئی، عرب ان بتوں کو خدا کے برگزیدہ بندے اور اس کے تحت کام کرنے والے قرار دیکر ان کی تعظیم عبادت کی شکل میں کرنے لگے، وہ ان سے مرادیں مانگتے اور سمجھتے کہ وہ ان کی مدد خدا کی طرح کر سکتے ہیں، پھر بت پرستی ایسی عام ہوئی کہ گھر گھر میں بت حتی کہ کعبہ کے اندر بت رکھ لئے گئے، وہ یہ کہتے کہ ان کو ہم اصل خدا نہیں مانتے، ان کو ہم چھوٹے چھوٹے خدا مانتے ہیں جیسا کہ بادشاہ کے تحت مختلف شعبوں اور کاموں کے لئے حاکم ہوتے ہیں اسی طرح یہ ہماری زندگی کے مختلف کاموں کے لئے چھوٹے پیمانہ کے خدا ہیں، ان کو خوش کر کے ہم بڑے خدا کو خوش کر سکتے ہیں، یہ خدا کے یہاں ہماری سفارش کریں گے، اور ہمارا کام اس طرح آسانی سے ہو جائیگا، اور ہم کو بڑے خدا سے کہنے کی ضرورت نہیں پڑے گی، وہ بت کو کسی قدیم بڑی شخصیت کی نشانی قرار دیتے تھے اور ان کی عبادت کو کافی سمجھتے تھے، حالانکہ اللہ رب العالمین کو چھوڑ کر یا اس کی ذات پاک کے ساتھ کسی دوسرے کو اس کے کسی کام میں کسی طرح سے بھی خدائی کام میں شریک سمجھنا یہی شرک ہے، کیونکہ اس نے سب کو پیدا کر کے باقی کام کسی دوسرے کو سپرد نہیں کر دیا ہے، وہ کائنات اور مخلوقات کا نظام خود ہی چلا رہا ہے، کسی کا اس کے کام

میں دخل نہیں ہے، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور اپنی مخلوق کی دعا کو سنتا ہے، اس کے ساتھ کسی کو شریک کرنا اس کو بہت ہی زیادہ ناپسند ہے، اور اس سے سخت ممانعت کی گئی ہے، اور اس کے خلاف حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر نبی نے آواز بلند کی اور اپنی اپنی قوم سے جھگڑا مول لیا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تو اسی شرک کی مخالفت میں اپنے والد کو، اپنے گھر بار کو اور اپنی عزت و راحت کو خیر باد کہا، اب یہ دعوت عربوں میں مبعوث ہونے والے نئے نبی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اولاً اپنی قوم کو پھر دوسری قوموں کو دینا تھا۔

قریش یوں تو متعدد بتوں کی عبادت کرتے تھے، لیکن ہبل کو خدا کا نمائندہ اور باا ثر سمجھ کر اپنی بڑی ضرورتوں کے لئے اسی سے کہتے تھے، اور اس کو اپنا خاص اور اہم معبود مانتے تھے، اسکے علاوہ اساف اور نائلہ نام کے بت بنائے تھے، جو قریب ہی تھے، مکہ کے باہر بھی کئی اہم بت رکھ لئے گئے تھے جن کو قریش بھی مانتے تھے، ان میں ایک عزیٰ تھا جو مکہ سے کچھ دور نخلہ کے مقام میں رکھا گیا تھا، ایک دوسرا بت منات تھا، یہ مکہ سے کچھ فاصلہ پر مقام قدید میں رکھا گیا تھا، یہ بت خاص طور پر اہل مدینہ کا بت سمجھا جاتا تھا، تیسرا بت لات تھا جو طائف میں تھا، اور اہل طائف کا خاص بت سمجھا جاتا تھا، ان کے علاوہ ہر ہر قبیلہ نے اپنے اپنے علیحدہ بھی بت رکھ لئے تھے، کعبہ کے اندر ہر قبیلہ نے اپنی پسند کے بت اپنی نمائندگی کے طور پر رکھ دیئے تھے، اس طرح کعبہ میں کثرت سے بت جمع ہو گئے تھے جس کی تعداد آہستہ آہستہ تین سو ساٹھ تک پہونچ گئی تھی، ہر قبیلہ اور ہر خاندان نے اپنے بت کے نمائندہ کے طور پر کعبہ میں بت رکھوادیا تھا، اسی کے ساتھ سب عرب خانہ کعبہ کو اپنا دینی مرکز و معبد جانتے تھے، اور حج کرتے اور اس کا طواف کرتے تھے اور بتوں سے بھی منتیں مانگتے تھے(۱)۔

---

(۱) المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام: ۶/ ۲۲۷-۲۸۹

اس طرح عربوں کی عبادت کا مزاج توحید سے ہٹ کر بت پرستی کی طرف ہوگیا اور وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ سے دور ہوگئے، پھر اپنی زندگی کے دیگر پہلوؤں میں بھی غیر اللہ کی عقیدت وعبادت داخل کرلی، جانوروں کے سلسلہ میں بھی طرح طرح کے عقیدے گھڑ لئے، ان میں بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حامی نام سے جانوروں کو مخصوص کردیتے اور ان کو استعمال نہ کرتے اور ان کے سلسلہ میں مختلف قسم کے عقیدے بنالئے تھے، جس کی سخت مذمت قرآن مجید میں آئی ہے:

﴿ما جعل اللّٰه من بحيرة ولا سائبة ولا وصيلة ولا حام، ولكن الذين كفروا يفترون على اللّٰه الكذب، وأكثرهم لا يعقلون﴾ [سورہ مائدہ:۱۰۳]	خدا نے نہ تو بحیرہ کچھ چیز بنایا ہے اور نہ سائبہ، اور نہ وصیلہ، اور نہ حام، بلکہ کافر خدا پر جھوٹ افتراء کرتے ہیں اور یہ اکثر عقل نہیں رکھتے۔(۱)

اس میں شبہ نہیں کہ حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے فیض الٰہی کی خفیف شعاعیں عرب میں پھیلنی شروع ہوگئیں تھیں، چنانچہ قس بن ساعدہ، ورقہ بن نوفل، عبید اللہ بن جحش، عثمان بن الحویرث اور زید بن عمرو بن نفیل نے بت پرستی سے انکار کردیا تھا، ان میں ورقہ بن نوفل اور عثمان بن الحویرث نے نصرانیت اختیار کرلی اور زید بن عمرو نے نصرانیت اختیار نہیں کی اور اپنے آباواجداد کی بت پرستی کا طریقہ چھوڑ دیا (۲)۔

اخلاقی حالت اور مزاج وطبیعت

''عرب بدکاری وزناکاری سے نادم نہیں ہوتے تھے اور اپنے افعال قبیحہ پر فخر کرتے ہوئے ان کو اپنے اشعار کے ذریعہ مشتہر کیا کرتے تھے۔

شراب اور سخت نشیلی عرقیات کا استعمال عام تھا، مدہوشی میں جو معیوب اور خراب باتیں سرزد ہوتیں ان پر شرمندہ نہ ہوتے تھے۔

---

(۱) سیرت ابن ہشام:۱/۸۹-۹۰۔ (۲) سیرت ابن ہشام، ۱/۲۲۲-۲۳۲۔

لونڈیوں کو جو قینات کہلاتی تھیں، گانے بجانے کے لیے پالا کرتے تھے، ان کی زنا کاری کی آمدنی کو ان کے آقا اچھی آمدنی سمجھا کرتے تھے، جو عورتیں لڑائی میں گرفتار ہو کر آتیں ان کو قینات میں داخل کیا جاتا تھا، عورت کسی جانور کا دودھ نہیں دوہ سکتی تھی، اگر کسی گھرانے کی عورت ایسا کر بیٹھتی تو سارا خاندان مقید سمجھا جاتا تھا۔

مال وراثت کا حصہ صرف بالغ مرد پاتے تھے، تمام عورتیں اور بچے اپنے والدین اور عزیز و اقارب کے ترکہ سے قطعاً محروم رکھے جاتے تھے، بیوہ عورت پر متوفی شوہر کا قریبی رشتہ دار اپنی چادر ڈال دیتا تھا، عورت خوش ہو یا ناخوش، وہ چادر والے کی بیوی بن جاتی تھی، سوتیلے بیٹے بھی اپنی سوتیلی ماؤں پر اسی طرح قابض ہو جایا کرتے تھے۔

عورتیں بے حجاب مجمع عام میں نکلا کرتی تھیں اور اپنے جسم کا مخفی سے مخفی حصہ عوام الناس کو دکھانے میں عار نہ سمجھتی تھیں، مرد و زن جسم کو نیل سے گودا کرتے تھے، عورتیں مصنوعی بال لگاتیں، دانتوں کو درانتی سے تیز بناتی اور ان مصنوعی طریقوں سے خود کو نوجوان بنا کر جوانوں کو جُل دیا کرتی تھیں، جو خاندان زیادہ شریف سمجھے جاتے تھے، وہ زندہ لڑکیوں کو زیر زمین دفن کر دیتے، یا چاہ عمیق میں دھکیل کر ہلاک کر دیتے تھے، اس فعل پر فخر کیا کرتے اور اس کو اعلیٰ شرافت کا نشان سمجھا کرتے تھے، ازدواج کے متعلق کوئی قاعدہ موجود نہیں تھا، اور محرم و غیر محرم عورتوں کی تمیز کے لیے کوئی صاف آئین منضبط نہ تھا۔

قمار بازی نہایت دل پسند شغل تھا اور مشہور لوگوں کے گھر ''قمار خانۂ عام'' سمجھے جاتے تھے، ارواح خبیثہ کا اعتقاد عام تھا اور انسان پر ایسی ارواح کے تصرف تام کو تسلیم کرتے تھے، خیالی و وہمی دیوتا اور دیویاں مانی جاتی تھیں، ان کی شکلیں اور صورتیں عجیب عجیب بناتے اور اسی کے موافق ان کے بت گھڑے جاتے تھے، پھر

مندروں میں استاپن کیے جاتے اور پوجے جاتے تھے، عموماً ہر ایک قبیلہ اپنا اپنا بت الگ تجویز کیا کرتا تھا اور اپنی قسمت اسی بت کے قبضہ میں سمجھا کرتا تھا، اگر ایک قبیلہ کی عداوت دوسرے قبیلہ سے ہو جاتی تو اس کے بتوں سے بھی عداوت ونفرت کی جاتی تھی، گھوڑ دوڑ پر بازی لگانے کا بہت رواج تھا، اسے رہان کہتے تھے، گھوڑ دوڑ میں تین یا سات گھوڑے شامل کیے جاتے تھے۔

گھوڑوں کے نمبر لگانے میں کبھی اتنا اختلاف بڑھ جاتا کہ لڑائی چھڑ جاتی اور برسوں تک جاری رہتی تھی، اگرچہ غلاموں کا آزاد کرنا موجب فخر ومباہات سمجھا جاتا تھا، مگر آزاد شدہ غلاموں پر مالک کا حق ملکیت قائم رہتا تھا، اس حق کو آقا دوسرے کے پاس فروخت یا ہبہ بھی کرسکتا تھا۔

زراعت میں زمین کا بہترین حصہ بتوں کے نام پر خاص ہوتا، اگر اس حصہ کی پیداوار کسی ارضی وسماوی حادثہ سے ماری جاتی تو زمین کے دوسرے حصہ کی پیداوار سے اس کی کمی کو پورا کیا جاتا، بھوک اور قحط کے وقت مویشی کا خون پی جاتے تھے، زندہ جانور کے جسم سے گوشت کاٹ کر کھا جاتے تھے، جانوروں کی حرکات سے یا آوازوں سے شگون لیا کرتے، ٹوٹکے، منتر مانے جاتے تھے، ان کی عقل وفکر پر توہمات کی پوری حکومت تھی۔

انتقام اور کینہ جوئی کو اچھا سمجھا جاتا، ایک ایک، دو دو نسل اوپر کے واقعات کا انتقام لیا جاتا اور اسے بہادری کا لازمہ سمجھا جاتا۔

عرب سے متصل ممالک میں جو جو فواحش اور قبائح موجود تھے، ان کو جلد اخذ کرلیا جاتا، حسب نسب پر غلو کے ساتھ فخر کیا کرتے، ہر ایک قبیلہ دوسرے قبائل کو ذلیل وحقیر سمجھا کرتا اور یہی بات بسا اوقات عداوت، منافرت اور جنگ کا موجب بن جاتی۔

خاندانی رسوم کی حکومت دل ودماغ پر قانون اور مذہب سے بڑھ کر حکمراں

تھی، رسوم کے مقابلہ میں حریت رائے کا وجود کم تھا۔

اپنے دشمنوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے قبائل اپنے ملحق الحدود اقوام غیر سے ساز باز رکھا کرتے، فارس، روما، حبش کو اپنے ہی ملک پر چڑھالانے پر ہوشیاری سے کام لیتے (۱)۔

محمد ﷺ جزیرۃ العرب کے مرکز مکہ مکرمہ میں کیوں مبعوث ہوئے؟

عرب اپنی عام زندگی میں عقل وفہم اور تجربہ کے لحاظ سے کسی سے کم نہ تھے، لیکن تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے ان باتوں سے ناواقف تھے جو علم وتعلیم کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں، وہ اپنے وسیع اور عموماً بنجر علاقہ میں ہی محصور رہتے ہوئے اپنے تجربہ ومشاہدہ سے حاصل کردہ معلومات سے کام چلاتے، ان پر کسی تمدن یا نظریہ کی چھاپ نہیں تھی، بہر حال اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکمت کا فیصلہ تھا کہ انسانیت کی ہدایت ونجات کا یہ آفتاب جس سے ساری کائنات میں روشنی پھیلی جزیرۃ العرب کے افق سے طلوع ہو جو تمدن اور علم کے لحاظ سے دنیا کا سب سے تاریک خطہ اور جس کو صالح اور روشن ترین پیغام زندگی کی سب سے زیادہ ضرورت تھی، اور وہ اپنے سیدھے اور فطری مزاج اور توانا عزم وصحت کے باعث خدا کی طرف سے ہدایت ملنے پر قوموں کی قیادت کے منصب پر فائز کردیئے گئے۔

اللہ تعالیٰ نے اس عظیم کام کے لئے عربوں کا انتخاب اس لئے کیا اور ان کو ساری دنیا میں اس کی تبلیغ واشاعت کا ذمہ دار بنایا کہ ان کے دلوں کی تختی بالکل صاف تھی اس میں پہلے سے خود ساختہ اور اپنے اپنے ذہن کے ایجاد کردہ نظریات اور اپنی

---

(۱) رحمۃ للعالمین، از: قاضی سلیمان منصور پوری، ۶۳/۳، مزید تفصیل کے ملاحظہ کریں: المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، جزء چہارم، فصل "المجتمع العربی" وفصل "الحیاۃ الیومیۃ"۔

اپنی پسند کے تمدنی طریقوں کے نقش ونگار موجود نہ تھے جن کو مٹا کر صاف ستھرے اور انسانیت کے اعلی افکار وکردار کو ان میں بٹھانا دیر طلب اور موثر نہ ہوتا، مزید یہ کہ ان سادہ طبیعت عربوں کے برخلاف رومیوں، ایرانیوں یا ہندوستانیوں کا معاملہ تھا جن کو اپنی ترقی، علوم وفنون اور اپنے تہذیب وتمدن اور فلسفہ پر بڑا ناز اور غرور تھا اور اس کی وجہ ان کے اندر کچھ ایسی نفسیاتی گرہیں اور فکری وذہنی پیچیدگیاں پیدا ہوگئی تھیں جن کا دور ہونا آسان نہ تھا، لیکن عربوں کے دل ودماغ کی تختیاں سادہ اور انسان کے صاف اور فطری احساسات وتجربات کے اثرات ہی کی حامل تھیں جو انہوں نے سادہ اور غیر تعلیم یافتہ اور بدوی زندگی سے فطری طور پر اخذ کئے تھے جن پر نئے نقوش قائم کرنا بہت آسان تھا، موجودہ علمی اصطلاح میں وہ جہل بسیط یا جہل سادہ کا شکار تھے، جس کا مداوا ہوسکتا ہے، ان کے برعکس ان کے زمانہ کی دیگر قومیں مختلف النوع اثرات اور تمدن کے مصنوعی اور پیچ در پیچ اثرات کی وجہ سے جہل مرکب میں مبتلا تھیں جن کا علاج اور تدارک اور اس کو دھو کر کے نئے حروف لکھنے کا کام ہمیشہ بے حد دشوار ہوتا ہے۔

عربوں کو کسی فلسفہ وتمدن یا علمی کوشش سے سابقہ نہیں پڑا تھا وہ اپنی پیدائشی فطرت پر تھے، مضبوط اور آہنی ارادے کے مالک تھے اگر حق بات ان کی سمجھ میں نہ آتی تو وہ اس کے خلاف شمشیر تک اٹھانے میں کوئی تکلف نہ کرتے اور اگر حق کھل کر ان کے سامنے آجاتا تو وہ اس سے دل وجان سے زیادہ محبت کرتے، اس کو گلے سے لگاتے اور اس کے لئے جان تک دینے میں پس وپیش نہ کرتے (۱)۔

عرب تہذیب وتمدن اور تعیش وآرام طلبی کی پیدا کی ہوئی ان تمام بیماریوں اور خرابیوں سے محفوظ تھے جن کا علاج بڑا دشوار ہوتا ہے، اور جو کسی ایمان وعقیدہ کے لئے گرم جوشی وجان فروشی میں ہمیشہ حائل ہوتی ہیں اور اکثر آدمی کے پیروں میں

---

(۱) نبی رحمت، ص:۵۹، ۶۰

بیڑیاں ڈال دیتی ہیں۔

ان کے اندر صداقت بھی تھی اور دیانت بھی اور شجاعت بھی، منافقت اور سازش ان کے مزاج سے مناسبت نہ رکھتی، بے جگری سے لڑنے والے گھوڑوں کی پیٹھ پر زیادہ وقت گذارنے والے سخت قوت مدافعت اور قوت برداشت کے مالک، سادہ زندگی کے عادی، شہ سواری اور فنون جنگ کے عاشق ایک ایسی قوم کے لئے ضروری شرط ہے جس کو دنیا میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دینا ہو خصوصاً اس دور میں جب معرکہ آرائیوں اور مہم جوئیوں کا سلسلہ ہو اور بہادری وشجاعت کا عام چلن ہو۔

دوسری بات یہ کہ ان کی فکری وعملی قوتیں اور فطری صلاحیتیں محفوظ تھیں اور خیالی بے فائدہ منطقی بحثوں اور موشگافیوں، علم کلام کے دقیق اور نازک مضامین، یا مقامی وعلاقائی خانہ جنگیوں میں ضائع نہیں ہوئی تھیں، یہ ایک نوخیز اور اس لحاظ سے محفوظ قوم تھی اور زندگی وحرارت، جوش ونشاط اور عزم اور آہنی ارادہ سے بھرپور تھی۔

عزم وارادہ کی یہ پختگی وسچائی عمل کی سنجیدگی اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کردینے کا مزاج اور طبیعت اس جملہ سے بھی عیاں ہے جو اسلامی افواج کے مشہور قائد وسپہ سالار عقبہ بن نافع سے منسوب ہے، جب ان کی فتوحات اور پیش قدمیوں کی راہ میں بحر اوقیانوس (اٹلانٹک) حائل ہوا تو اس موقع پر انہوں نے کہا کہ خدایا یہ بحر زخار حائل ہے ورنہ جی چاہتا ہے کہ برابر آگے بڑھتا جاؤں اور بحر وبر میں تیرے نام کی منادی کرادوں (۱)۔

☆☆☆

(۱) نبی رحمت، ص:۶۲، ۶۳



(کارٹوگرافی از محمود ا

باب سوم

نسب، ولادت اور نشو ونما کا زمانہ

قبائل عرب کا نسب

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے طوفان نوح کے بعد زمین پر صرف حضرت نوح علیہ السلام کی نسل باقی رہی، جزیرۃ العرب کی آبادی ان کے ''سام'' نامی بیٹے کی اولاد میں بتائی جاتی ہے، سام کے کئی بیٹے تھے، لیکن مورخین کے یہاں ان کے صرف دو بیٹوں کی نسلوں کا سراغ ملتا ہے، ان میں سے ایک کا نام آرام یا ارم اور دوسرے کا ارفخشذ تھا(۱) جزیرۃ العرب میں جن کی نسلیں بارآور ہوئیں یا جن کا عمل دخل رہا، ان کا تعلق انہیں دو فرزندوں سے ہے، ان میں سے ارم کی کئی نسلیں جزیرۃ العرب میں عرصہ تک زندہ رہیں، اور ترقی کرتی رہیں، اور ان کا بڑا رعب دبدبہ رہا، لیکن وہ متعدد برائیوں میں مبتلا ہوتی رہیں، اور پھر تکبر اور زور دستی اور شرک کے ذریعہ اپنے پروردگار کی سخت ناراضی کی مستحق بنیں، ان میں نبی آئے اور انہوں نے سمجھایا اور جب نافرمانی حد تک پہونچی تو عذاب میں مبتلا ہوئیں، اور یکے بعد دیگرے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی وجہ سے تباہ ہوتی رہیں، اور اخیر میں جزیرۃ العرب سے بالکل مٹ گئیں، ان کو عربی میں ''امم بائدۃ'' کہا جاتا ہے، ان میں سے قابل ذکر نسلیں عاد، ثمود، جرہم،

---

(۱) مروج الذہب، دار المعرفۃ، لبنان، بیروت، ۱۴۲۶ھ-۲۰۰۵ء۔

طسم، جدیس، عبد ضخم اور عمالقہ ہیں، عمالقہ کے سلسلہ میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فراعنہ مصر بھی اسی کی ایک شاخ تھے، جو شمالی جزیرۃ العرب سے مصر منتقل ہوگئی تھی۔

ارفخشذ کی نسل میں بھی کئی شاخیں ہوئیں، ان میں قحطانی نامی نسل جزیرۃ العرب کے جنوبی علاقوں میں آباد ہوئی، دوسری نسل میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ اور ان دونوں کے خاندان ہوئے، حضرت ابراہیمؑ والی شاخ عراق کے جنوبی علاقوں میں آباد ہوئی، اس میں شرک کی ستارہ پرستی کی قسموں کا رواج ہوا، جس کے خلاف حضرت ابرہیم علیہ السلام نے آواز اٹھائی اور توحید کی دعوت دی، وہیں ان کے ایک بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد بنی اسرائیل کہلائی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے دوسرے بیٹے کو جو پہلے سے تھے اللہ کے حکم سے ان کی ماں کے ساتھ لیجا کر مکہ میں ٹھہرایا، تیسرے بیٹے مدین ہوئے، ان کی اولاد شام کے جنوب میں واقع علاقہ میں آباد ہوئی، ان کا علاقہ مدین کہلایا۔

اس طرح جزیرۃ العرب میں سب سے قدیم باشندے آرامی نسل کے ہوئے ان کے بعد قحطانی آئے، اور ان کے بعد وہ نسلیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے تعلق رکھتی ہیں، ان میں حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد وسطی جزیرۃ العرب میں مکہ اور اس کے اردگرد علاقے میں آباد ہوئی، مدین کی اولاد ان کے شمالی علاقہ حجاز کے شمالی کنارے پر آباد ہوئی، حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں کئی پشتوں کے بعد عدنان نامی ایک شخص ہوئے وہی بعد میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی تقریباً تمام نسلوں کے مورث ہوئے (۱)۔

جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے کہ آرامی نسلیں جزیرۃ العرب کی پہلی بسنے والی نسلیں تھیں جو کچھ عرصہ آباد رہ کر اپنی ہٹ دھرمی، ظلم وزیادتی اور اپنے رب کی نافرمانی کے نتیجہ میں آسمانی سزا کی مستحق ہوئیں اور جزیرۃ العرب سے یکسر مٹ گئیں، ان کے

---

(۱) تفصیل کے ملاحظہ کریں "سبائک الذہب فی معرفۃ قبائل العرب للسویدی البغدادی ونہایۃ العرب بانساب العرب للقلقشندی والکامل فی التاریخ لابن الاثیر۔

بعد جزیرۃ العرب کے نمبر ۲ کے قدیم باشندے قحطانی نسل کے لوگ ہوئے، اسی لیے قحطان کی اولاد کو عرب عاربہ یعنی اصلی عرب کہا جاتا ہے، جزیرۃ العرب میں ابراہیمی خاندان کی اسماعیلی شاخ جو جزیرۃ العرب میں پہونچی، قحطانیوں کے مقابلہ میں ذرا بعد میں عرب ہونے کے باعث عرب عاربہ کے بجائے عرب مستعربہ کہی گئی۔

قبیلۂ قریش

مکہ مکرمہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ٹھہرا کر ان کے بڑے ہونے پر بیت اللہ شریف کی تعمیر کی جو کرۂ زمین پر اللہ تعالی کا پہلا گھر کہلایا، حضرت ابراہیم نے اپنے پروردگار سے دعا کی کہ اے اللہ اس گھر کو آباد رکھ اور ہماری اولاد کو اس گھر کی حفاظت کی توفیق دے اور توحید کا اس کو مرکز بنا، اور ہماری اولاد کو اس غیر آباد خطہ میں روزی پہونچا اور تمام مومن بندوں کو اس گھر میں آکر عبادت کرنے کی توفیق دے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی مقبولیت کا اثر تھا کہ بیت اللہ شریف کی عظمت وتقدس پر جزیرۃ العرب کے سب باشندوں کا اتفاق ہوگیا اور وہاں حسب استطاعت حاضری دینے لگے اور یہ عمل حج کہلایا، اسی طرح مکہ مکرمہ کا احترام سب کے دل میں قائم رہا اور وہاں کے مقیم قبیلہ قریش کو بیت اللہ کی تولیت حاصل ہوئی، اس کی بنا پر یہ قبیلہ سب کی نظر میں متفقہ طور پر قابل احترام بن گیا، چنانچہ اس قبیلہ کو اپنی اس خصوصیت کی بنا پر جزیرۃ العرب کے مختلف علاقوں میں جانے اور سفر کرنے میں خطرہ نہیں محسوس ہوتا تھا اور سب عربوں کے لحاظ سے اسی مرکزی حیثیت کی وجہ سے قریش کا رابطہ مختلف قبائل سے بھی ہوتا تھا اور وہ تجارت کی خاطر شمال وجنوب کا سفر بھی کرتے اور ان کو وہاں کے باشندوں سے رابطہ بھی پڑتا۔

لہٰذا وہ زندگی کے ضروری تقاضوں کو سمجھنے میں زیادہ بہتر معیار کے ہوگئے

تھے اور وہ باوجود امی یعنی غیر تعلیم یافتہ ہونے کے متمدن علاقوں میں آنے جانے اور ملنے جلنے کی بنیاد پر دیگر عربوں کے مقابلے ترقی یافتہ و تجربہ کار تھے اور اسی حیثیت سے وہ دیکھے جاتے تھے، قریش کی ایک ممتاز شخصیت قصی بن کلاب نے اپنی سمجھ اور صلاحیتوں کی بنا پر مکہ مکرمہ میں حاکم شہر کی (جو ایک طریقہ سے آج کل کے جمہوری حساب سے میئر کی حیثیت کہی جاسکتی ہے) حیثیت بنالی تھی ان کے انتقال پر ان کی مختلف انتظامی ذمہ داریاں ان کی اولاد میں تقسیم ہوگئی تھیں، ان ذمہ داریوں میں حجاج کی ضیافت اور خاطر داری کا شعبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا ہاشم بن عبد مناف کے حصہ میں آیا تھا جو ان کی اولاد میں منتقل ہوتا ہوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مربی چچا ابوطالب تک آیا تھا، حجاج مکہ کی ضیافت کا یہ شعبہ ایسا شعبہ تھا جس کے ذریعہ پورا جزیرۃ العرب اس شاخ کے لوگوں کو پہچانتا اور وقار کی نظر سے دیکھتا تھا کیونکہ سارے عرب سے حاجی آتے اور سب ان کی ضیافت سے واسطہ پڑنے کی وجہ سے اس شاخ سے واقف ہوگئے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے قریش کو عطا کردہ اپنی اس نعمت و سرفرازی کا ذکر اپنے کلام الٰہی میں قریش کو مخاطب کرتے ہوئے اپنا احسان بتاتے ہوئے فرمایا:

﴿لإيلف قريش إيلافهم رحلة الشتاء والصيف فليعبدوا رب هذا البيت الذى أطعمهم من جوع وآمنهم من خوف﴾ [قریش:۱-۴]	قریش کے مانوس کرنے کے سبب، یعنی انہیں جاڑے اور گرمی کے سفر سے مانوس کرنے کے سبب، لوگوں کو چاہیے کہ (اس نعمت کے شکر میں) اس گھر کے مالک کی عبادت کریں، جس نے ان کو بھوک میں کھانا کھلایا اور خوف سے امن بخشا۔

اور واقعی اس عظیم مرکز عبادت الٰہی کے خادم و متولی ہونے کے ناطے قریش کو سارے عرب میں اعزاز و برتری حاصل ہوئی اور قریش میں سے بنو ہاشم کو حجاج

کے میزبان ہونے کی وجہ سے مزید عزت ملی، اس عزت دنیاوی وجاہت اور مقبولیت کے ساتھ یہ سعادت بھی ملی کہ اللہ تعالی نے ان کو دوسرے عربوں کے مقابلہ میں اچھی صفات کا حصہ زیادہ عطا فرمایا، حضور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسی قریشی شاخ کے عظیم سپوت ہوئے (۱)۔

نسب مبارک

آپ کا نسب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے بیٹے سے شروع ہوتا ہے، اللہ تعالی نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیگر سابقہ انبیاء کے معاملہ میں زیادہ پسندیدہ نبی قرار دیا، اس سلسلہ میں ان کی قربانیوں کو وہ مقام عطا فرمایا جو دوسرے انبیاء کی قربانیوں کے مقابلہ میں زیادہ بالا اور برتر تھیں جن کی بنا پر اللہ تعالی نے ان کو تمغۂ خلیلی عطا فرمایا، جس کا ذکر قرآن مجید میں فرمایا: ﴿و اتخذ الله إبراهيم خليلا﴾ [النساء:۱۲۵] (اور ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالی نے اپنا دوست بنالیا ہے)، اور اللہ تعالی نے اپنی اس پسندیدگی کو ان کی اولاد تک منتقل فرمایا، جس کی دعاء خود ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی، لیکن اللہ تعالی نے ان کی یہ دعاء قبول کرتے ہوئے یہ بھی فرمادیا کہ یہ پسندیدگی صرف ان کی ان ہی اولاد تک محدود رہے گی جو صحیح راستے پر رہیں گے اور اپنے کو اس کا اہل بنائیں گے:

﴿و إذا ابتلى إبراهيم ربه بكلمات فأتمهن، قال إني جاعلك للناس إماما، قال و من ذريتي، قال لا ينال عهدي الظالمين﴾

[البقرة:۱۲۴]

جب ابراہیم علیہ السلام کو ان کے رب نے کئی کئی باتوں سے آزمایا اور انہوں نے سب کو پورا کردیا تو اللہ نے فرمایا کہ میں تمہیں لوگوں کا امام بنادونگا، عرض کرنے لگے: اور میری اولاد کو، فرمایا میرا وعدہ ظالموں سے نہیں۔

---

(۱) قبیلۂ قریش کی تفصیل کے لئے دیکھیں: البدایۃ والنھایۃ: ۲/۲۰۰-۲۰۵

﴿و إذ قال إبراهيم ربّ اجعل هذا البلد آمناً ، و اجنبني و بنيّ أن نعبد الأصنام ، ربّ إنهن أضللن كثيراً من الناس ، فمن تبعني فإنه مني، و من عصاني فإنك غفور رحيم، ربنا إني أسكنت من ذريتي بواد غير ذي زرع عند بيتك المحرم ، ربنا ليقيموا الصلاة، فاجعل أفئدة من الناس تهوي إليهم و ارزقهم من الثمرات لعلهم يشكرون﴾

[ابراہیم:۳۵۔۳۷]

اور جب ابراہیم نے اپنے پروردگار سے یہ دعا کی کہ اے میرے پروردگار اس شہر کو امن والا بنا دے، اور مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے پناہ دے، اے میرے پالنے والے معبود! انہوں نے بہت سے لوگوں کو راہ سے بھٹکا دیا ہے، پس میری تابعداری کرنے والا میرا ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو تو بہت ہی معاف اور کرم کرنے والا ہے، اے میرے پروردگار! میں نے اپنی اولاد کو اس بے کھیتی کی وادی میں تیرے حرمت والے گھر کے پاس لا بسایا ہے، اے ہمارے پروردگار! یہ اس لئے کہ وہ نماز قائم رکھیں، تو لوگوں کے دلوں کو ایسا کردے کہ ان کی طرف جھکے رہیں، اور ان کو میووں سے روزی دے تاکہ تیرا شکر کریں (۱)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب کی رضا کی طلب میں اس کے نہایت مشکل ترین حکم کو بھی پوری وفاداری کے ساتھ انجام دیا تھا اور اس کی بنا پر آپ کو آپ کے رب کی طرف سے خلیل اللہ کا خطاب ملا اور آپ اپنے پروردگار کے بہت محبوب نبی ہوئے، آپ کی ایک قربانی تو یہ ہوئی کہ اپنے پروردگار کا حکم پا کر اپنے شیر خوار بچے کو ماں کے ساتھ ایسی غیر آباد اور خشک جگہ میں ٹھہرا دیا جہاں کوئی مددگار اور ہمدرد نہ تھا، اور نہ پانی، کھانے کا ذریعہ تھا، پھر اس بیٹے کے جوان ہونے پر اس کو ذبح کر دینے کا حکم ہوا، انہوں نے اس کی تکمیل کی کوشش کر ڈالی، لیکن اللہ تعالی نے حضرت اسماعیل کو بچا دیا اور پھر ان کی

(۱) بناء کعبہ کی تفصیل کے لئے بخاری شریف کی حدیث نمبر ۳۳۶۴ دیکھیں، الکامل فی التاریخ: ۱/۱۰۶، والبدایہ والنھایہ: ۱/۱۵۴

نسل سے ہی آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو پیدا کیا۔

چنانچہ ابراہیم علیہ السلام کے دونوں فرزند اسماعیل اور اسحاق پھر اسحاق کے بیٹے یعقوب اور ان کے بیٹے حضرت یوسف (علیہم السلام)، یہ سب نبی ہوئے، اور خاص طور پر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں اللہ تعالی نے عظیم تر اور آخری نبی بنانا طے فرمایا، جس کو ان حالات میں ہدایت اور رہنمائی کا کام سپرد کرنا تھا جب کہ دنیا اپنے بگاڑ اور گراوٹ کی بہت نچلی سطح تک پہونچنے والی تھی۔

یہ آخری نبی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل میں پیدا ہوئے، اور ان کا سلسلۂ نسب اپنے خاندان ونسل میں سب سے بہتر شاخ کے ذریعہ حضرت اسماعیل تک پہونچا تھا، آپ کا نسب مبارک اس طرح ہے:

محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرۃ بن کعب بن لوئی بن غالب بن فہر بن مالک بن النضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان (۱)۔

عدنان

عدنان کا نسب سیدنا اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام تک پہونچتا ہے، عدنان سے اوپر کے سلسلہ نسب کے مقابلے میں عدنان سے نیچے کا سلسلہ تاریخی لحاظ سے زیادہ مستند روایت سے منقول ہے، عدنان کی اولاد میں مضر اور ربیعہ زیادہ معروف ہوئے، مضر جزیرۃ العرب کے مغربی حصہ یعنی حجاز میں آباد رہے، اور ربیعہ مشرقی حصہ یعنی نجد میں منتقل ہو گئے، مضر کی اولاد میں الیاس اور قیس مشہور ہوئے، الیاس کی اولاد میں کنانہ کو شہرت ہوئی، اور ان کے نام سے ان کی اولاد معروف ہوئی، کنانہ کی اولاد میں نضر اور ان کی اولاد میں فہر ہوئے، ان کے لئے قریش کا لفظ بھی استعمال ہوا،

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ: ۲/۲۵۲-۲۵۹، أنساب الأشراف، از: بلاذری، تحقیق: ڈاکٹر حمید اللہ۔

جو بعد میں معروف ہوئے، اوران کی اولاد مکہ ہی مین مقیم ہوئی، ان کی اولاد میں قصی اہم شخص ہوئے، ان کے وقت تک مکہ کی انتظامی تولیت قبیلہ خزاعہ کے پاس تھی، قصی نے وہ حاصل کی، اور مکہ کا انتظامی ڈھانچہ بہت اچھا بنایا، جس کی ذمہ داری شہر میں مقیم قریشی شاخوں میں تقسیم ہوئی، قیس کی اولاد حجاز کے دیگر حصوں میں مثلاً طائف اور مکہ کے دیگر اطراف میں جا کر بسی، ان میں ثقیف طائف میں اور ہوازن مکہ وطائف کے درمیانی علاقوں میں آباد ہوئی، قریش کی اولاد میں قصی کے بیٹے عبد مناف ہوئے، عبد مناف کے چار بیٹے مطلب، نوفل، عبد شمس اور ہاشم ہوئے، ان چاروں میں ہاشم کو ان کے اخلاق اور نظم وضبط کے لحاظ سے بڑی عزت ومقبولیت حاصل ہوئی، ہاشم کی اولاد میں عبد المطلب ہوئے، جو بڑے ہو کر اپنے والد کی خصوصیات اور ذمہ داریوں کے وارث ہوئے، اور مکہ میں ان کو عزت کا خاص مقام حاصل ہوا، آپ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا تھے، ان کے دس بیٹے ہوئے جن میں حضور ﷺ کے والد ماجد عبد اللہ ہوئے، دیگر بیٹوں کے نام ابو طالب (عبد مناف)، زبیر، حمزہ، عباس، ابولہب (عبد العزی) الحارث، حجل، مقوم، ضرار ہیں، ابو طالب کو اپنے اہل خاندان میں زیادہ خصوصیت اور شہرت حاصل ہوئی، اور حضور ﷺ کو دنیاوی لحاظ سے خاص حمایت اور تقویت ملی، دیگر بیٹوں میں حضرت عباس اور حضرت حمزہ اسلام بھی لائے، اور حضور ﷺ کا خصوصی طور پر ساتھ دیا، ابولہب نے نبوت سے قبل تو ہمدردی کی، لیکن اسلام کی دعوت کا دشمنی کے ساتھ مقابلہ کیا اور عداوت دکھائی (۱)۔

عبد اللہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والد محترم عبد اللہ نے بہت کم عمر پائی، لیکن ان کو

---

(۱) الروض الأنف: ۱/ ۸، الکامل فی التاریخ: ۲/ ۳۳، البدایہ والنھایۃ: ۲/ ۱۹۳-۱۹۸، السیرۃ النبویۃ، از: ابن حجر: ۱/ ۲۰۲۔

شرافت اور عزت کا مقام حاصل ہونے کے ساتھ یہ خصوصیت بھی حاصل ہوئی کہ ان کے والد عبد المطلب نے یہ دعاء کی تھی کہ اگر ان کے دس بیٹے ہوئے تو بطور شکر گزاری ان میں سے ایک کو ذبح کرینگے، چنانچہ دس کی گنتی پوری ہونے پر ان میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا، ان کو اس سلسلہ میں حضرت عبد اللہ کو ذبح کرنے کا اشارہ ملا، چنانچہ وہ ان کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہوئے، لیکن ان کو مشورہ دیا گیا کہ ان کو ذبح کرنے کے بجائے ذبح کرنے کا بدل ان کی دیت دیکر ان کو محفوظ رکھیں، دیت کو طے کرنے کے لئے انہوں نے فال لی تو بڑی اونچی اور گراں دیت بہت اونٹوں کو ذبح کرنے کی آئی اور انہوں نے اس کو انجام دیا(۱) اور اس طرح ان کو ذبح کرنے سے جو قربانی ان کی طرف سے ہوئی وہ اس طرح انجام پائی اور عبد اللہ کی اس شکل میں گویا قربانی ہوئی، اور ان کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نقل حاصل ہوئی کہ حضرت اسماعیل کو ان کے والد حضرت ابراہیم نے اللہ کے لئے اپنے ارادہ کے مطابق ذبح کر دیا تھا، اور اللہ نے بروقت ایک مینڈھا بھیج کر چھری کو اس پر چلوادیا، اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کی قربانی کی پیشکش کی لیکن اللہ تعالی نے اس کو بدل دیا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بچادیا۔

حضرت عبد اللہ کا نسب ان کے تمام ہمسر قریشیوں کے مقابلہ میں زیادہ ممتاز خصوصیات اور بلند کردار کی شخصیتوں پر مشتمل تھا، کچھ تو اس طرح کہ ان کے نسب کی اوپر سے آنے والی کڑیاں دیگر خاندانی کڑیوں میں بلند حیثیت کی تھیں، عربوں میں نسب کی بلندی اوپر کے افراد کے کردار اور ان کی سیرت کی بلندی کے لحاظ سے دیکھی جاتی تھی کہ کتنے افراد کتنے بلند کردار اور بلند سیرت و اخلاق گزرے ہیں، حضرت عبد اللہ اس بلندی کے ساتھ خود اپنی شخصی خصوصیات کے لحاظ سے بھی نیک

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/ ۱۵۵

طبیعت اور سنجیدہ اور انسانی اوصاف کے لحاظ سے بھی اپنے ہمسروں میں فائق تھے، ان کی شادی بھی بنوزہرہ میں حضرت آمنہ بنت وہب سے ہوئی تھی (۱) جو اپنے حسب ونسب میں بہت صاف اور بلند کردار کی قریشی شاخ سے تھیں، وہب قبیلہ بنوزہرہ کے سردار تھے، ان کا سلسلۂ نسب فہر الملقب بہ قریش کے ساتھ جاملتا ہے، اس طرح دادہیال اور نانہیال دونوں طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نسبی درجہ بہت ہی بلند رہا، اور نسب وکردار دونوں لحاظ سے آپ کے مقام بلند پر ہونے کی تصدیق اللہ تعالی کی طرف سے بھی کی گئی، ایک تو یہ کہ دوسروں کے مقابلہ میں اللہ تعالی نے نبوت اور رسالت کے لئے منتخب فرمایا، نیز قرآن مجید میں فرمایا ﴿إنك لعلى خلق عظيم﴾ کہ تم اونچی سیرت وکردار کے ہو اور فرمایا کہ ﴿ الله يعلم حيث يجعل رسالته﴾ کہ اللہ تعالی خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت کا شرف کہاں رکھے۔

ولادت

پھر اللہ تعالی کو یہ منظور ہوا کہ آپ اپنے والد کا سایہ نہ پائیں اور اللہ تعالی کی طرف سے خصوصی نگہبانی ہو، لہذا اللہ تعالی نے یہ مقدر کیا کہ آپ کے والد ماجد حضرت عبداللہ آپ کے پیدا ہونے سے کچھ ماہ قبل جب کہ آپ بطن مادر ہی میں تھے مدینہ کے ایک سفر کے درمیان انتقال کیا، اور وہیں تدفین عمل میں آئی، اس طرح ان کی وفات کے بعد حضور ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی، ۹ر ربیع الاول دوشنبہ کا دن تھا (۱۷ر اپریل ۵۷۰ء) (۲) چنانچہ آپ کی پیدائش ہونے پر آپ کے دادا عبدالمطلب کو اپنے اس پوتے کی طرف خاص شفقت وتوجہ کا معاملہ رکھنے کی ذمہ داری ملی، انہوں نے محمد (ﷺ) نام رکھا (۳) اور ایسی شفقت اور فکر کی والد کے نہ ہونے کی حتی الوسع تلافی کی۔

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/ ۱۵۷۔ (۲) السیرۃ النبویۃ فی فتح الباری، از: ابن حجر عسقلانی، ص: ۱/ ۲۱۲۔
(۳) البدایۃ والنہایۃ: ۳/ ۲۶۶۔

رضاعت

مکہ مکرمہ میں پیدا ہونے والے بچوں کی پیدائش کے موقع پر بچوں کی رضاعت اور ابتدائی پرورش کے لئے شہروں سے زیادہ دیہاتوں کو پسند کیا جاتا تھا، اس لئے کہ وہاں کی آب وہوا زیادہ صاف ستھری اور سادہ، اور وہاں کے رہنے والوں کے اخلاق میں اعتدال اور سلامتی طبع زیادہ نمایاں تھی، شہری زندگی کے شہری اور کاروباری طور طریق سے جو بعض خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں، بچوں کی ابتدائی عمر کی سادہ دلی ان خرابیوں سے محفوظ رہتی، مزید یہ بات تھی کہ وہاں اور اس کے قرب کے دیہات کی زبان بھی شہری زبان کے مقابلہ میں زیادہ صحیح اور فصیح مانی جاتی تھی۔

قبیلۂ ہوازن کی آبادی جو مکہ اور طائف کے درمیان واقع علاقہ میں جو کہ مکہ کے شمال کے رُخ پر تھوڑے ہی فاصلہ پر تھا، وہیں اس کی شاخ بنی سعد کا گھرانہ تھا، اس کی خواتین سال میں ایک مرتبہ مکہ آ کر وہاں کے نومولود بچوں کو ان کے رضاعت کے زمانہ میں لے جایا کرتی تھیں اور دو تین سال کی مدت تک اپنے بچوں کے ساتھ رکھتی تھیں، ان کو اس کی اجرت و معاوضہ بچوں کے والدین کی طرف سے ملتا تھا اور یہ ان کی روزی کا ذریعہ بن جاتا تھا، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے سال بھی یہ خواتین آئیں، اور بچوں کو جن کے والدین ذی حیثیت دیکھے ان کو لے گئیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو لینے میں ان سب کو تکلف ہوا، کہ آپ ﷺ یتیم تھے، والد نہ تھے کہ خدمت رضاعت پر معاوضہ ملنے کی بہترین توقع ہوتی، بچوں کو لینے کے لئے آنے والی خواتین میں حلیمہ بنت ابی ذویب السعدیہ کو سواری کی کچھ دشواری کی بنا پر لوگوں کے گھروں میں پہونچنے میں تاخیر ہوئی، اور خوش حال گھرانوں کے نومولود بچے دیگر خواتین نے حاصل کر لئے اور حلیمہ کو آپ کو چھوڑ کر دیگر کوئی بچہ نہ مل سکا اور ان کو مجبوراً آپ ہی کو لینا پڑا، انہوں نے آپ کو لیا تو معاوضہ کی اچھی توقع نہ ہونے کی بنا پر

مایوسی کی سی کیفیت محسوس ہورہی تھی، لیکن آپ کو لے جانے پر انہوں نے خصوصی معاملہ دیکھا، کہ ہر بات میں برکت محسوس ہوئی، ایسی برکت کہ دوسری دودھ پلانے والیوں کو رشک ہوا کہ حضرت حلیمہ کو ہر چیز میں فائدہ محسوس ہوا، چنانچہ حضرت حلیمہ نے رضاعت کے لئے باہر رہنے کی جو مدت ہوتی ہے اس سے زیادہ مدت کے لئے آپ کواپنے پاس رکھا، حضرت حلیمہ اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتی ہیں کہ:۔

''وہ اپنی بستی سے اپنے شوہر کے ساتھ اور اپنے ایک چھوٹے بچہ کے ساتھ جو خود بھی شیر خوار تھا قبیلہ بنو سعد بن بکر کی خواتین کی معیت میں شیر خوار بچوں کی تلاش میں نکلیں، وہ کہتی ہیں کہ یہ واقعہ اس سال کا تھا جس میں بڑی خشک سالی تھی اور غربت تھی، جس کی وجہ سے ہمارے پاس کچھ نہیں رہ گیا تھا، کہتی ہیں کہ میں اپنی ایک گدھی کی سواری (جو خاکی رنگ کی تھی) پر نکلی، ہمارے ساتھ ایک بوڑھی اونٹنی بھی تھی، جو بڑی مشکل سے تھوڑا دودھ بھی نہیں دے پاتی تھی، چنانچہ ہم ساری رات اپنے اس بچہ کے ساتھ جو ہمارے ساتھ تھا، سو نہیں پاتے تھے جو کہ بھوک سے رویا کرتا تھا، خود میری چھاتیوں میں اتنا دودھ نہ تھا جو اس کی ضرورت کو پورا کرے، اور نہ ہماری بوڑھی اونٹنی میں دودھ تھا جس سے اس کو غذا ملے، لیکن ہم اُمید کرتے تھے کہ مدد اور کشادگی حاصل ہوگی، چنانچہ میں اپنی اسی گدھی کی سواری پر نکلی اور میں نے قافلہ والوں کو بھی راستہ میں سواری کی سست رفتاری کی وجہ سے جگہ جگہ انتظار کرایا یہاں تک کہ قافلہ والوں کو ہماری سواری کی کمزوری اور دبلے پن سے پریشانی ہوئی، چنانچہ ہم مکہ پہونچے اور دودھ پینے والے بچوں کو تلاش کرنے لگے، ہم میں سے ہر عورت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں جانے کا موقع ملا اور ان کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کیا گیا، لیکن وہ قبول نہیں کرتی تھیں جب یہ بتایا جاتا تھا کہ وہ یتیم ہیں، اور بات یہ تھی کہ ہم کچھ خیر حاصل کرنے کی امید میں ہوتے تھے کہ جو ہم کو بچہ کے باپ سے ملتا،

چنانچہ ہم آپ کو دیکھ کر کہتے کہ یہ تو یتیم ہیں، ان کی والدہ اوران کے دادا سے کہاں تک امید کی جاسکتی ہے، چنانچہ ہم آپ کو اسی وجہ سے پسند نہیں کرتے تھے، ہوتے ہوتے کوئی عورت ایسی نہیں بچی جو میرے ساتھ آئی مگر کوئی بچہ اس نے حاصل نہ کرلیا سوائے میرے، پھر جب ہم سب نے واپس ہونے کا فیصلہ کیا تو میں نے اپنے شوہر سے کہا بخدا مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میں لوٹوں اور میرے ساتھ کی سب عورتیں لوٹیں اور صرف میں کوئی بچہ نہ حاصل کرسکی ہوں، میں ضرور جاؤنگی اوراس یتیم بچہ ہی کو لے آتی ہوں، انہوں نے کہا کوئی حرج نہیں، کہ تم ایسا کرلو، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لیے اسی میں برکت رکھ دے، کہنے لگیں چنانچہ میں وہاں گئی اور میں نے ان کو لے لیا، مجھے ان کے لینے پر صرف اس بات نے آمادہ کیا کہ مجھے ان کے علاوہ اور کوئی بچہ مل نہ سکا تھا۔

کہتی ہیں جب میں نے ان کو لے لیا، اور لے کر اپنی جگہ واپس آئی اور میں نے ان کو اپنی گود میں رکھا میری چھاتیوں میں بچہ کو جتنا چاہیئے تھا دودھ آگیا، اورانہوں نے پیا اور وہ سیر ہوگئے، اوران کے ساتھ ساتھ پھر میرے بچے نے جوان کے رضاعی بھائی ہوئے پیا اور وہ بھی سیر ہوگئے، اور دونوں سو گئے، حالانکہ ہم اس سے پہلے اپنے بچہ کے ساتھ سو نہیں پاتے تھے، اور میرا شوہر اس دُبلی اونٹنی کی طرف گیا، اس کے بھی دودھ بھرا ہوا تھا اس کا دودھ انہوں نے دوہا اتنا کہ انہوں نے خود پیا اوران کے ساتھ میں نے بھی پیا، اور ہم دونوں پوری طرح سیر ہوگئے، اور ہم نے بہت اچھی رات گزاری، کہتی ہیں: صبح ہونے پر میرے شوہر کہنے لگے: خدا کی قسم اے حلیمہ تم ایک مبارک بچہ لے کر آئی ہو، کہتی ہیں کہ میں نے کہا خدا کی قسم مجھے اسی کی اُمید ہے، کہتی ہیں کہ اب ہم نکلے اور میں اپنی اسی گدھی کی سواری پر بیٹھی اوران کو بھی اپنے ساتھ اسی پر بٹھایا، خدا کی قسم قافلہ میں ہم نے اس طرح راستہ طے کرنا شروع کیا، کہ ہمارے ساتھ کی عورتوں کی سواریاں اس تیزی سے نہیں طے کر پا رہی تھیں، یہاں تک کہ میری

ساتھ کی عورتیں کہنے لگیں کہ ''اے ابوذویب کی بیٹی تیرا بھلا ہو، ذرا ہمارے خاطر رُک کر چلو، کیا یہ تمہاری وہی گدھی نہیں ہے جس پر بیٹھ کر تم آئی تھیں، اس پر میں ان سے کہنے لگی کیوں نہیں بخدا یہ وہی سواری ہے، وہ کہنے لگیں: خدا کی قسم اس کی تو نئی بات معلوم ہوتی ہے۔

کہتی ہیں کہ پھر ہم اپنے گھروں میں آگئے جو قبیلۂ بنوسعد کے علاقہ میں واقع تھے وہاں کی زمین ایسی زمین تھی کہ میں نہیں جانتی کہ کوئی اور دوسری زمین اس سے زیادہ خشک رہی ہوگی، اب یہ حال ہوا کہ میری بکریاں شام کو میرے پاس چر کر واپس آتیں جب کہ ہم اس مبارک بچہ کو اپنے ساتھ لے آئے تھے بہت پیٹ بھری اور دودھ دینے والی ہوکر، چنانچہ ہم دودھ دوہتے تھے اور پیتے تھے جب کہ وہیں یہ حال تھا کہ کوئی دوسرا ایک قطرہ دودھ نہیں دوہ پاتا تھا بکریوں کے تھنوں سے، یہاں تک کہ ہمارے خاندان کے لوگ اپنے اپنے چرواہوں سے کہنے لگے ارے تمہاری خرابی ہو وہاں لے جاکے چراؤ جہاں ابوذویب کا چرواہا چرانے لے جاتا ہے لیکن (اس پر بھی) ان کی بکریاں بھوکی واپس آتی تھیں، اور ایک قطرہ دودھ بھی نہیں دے پاتی تھیں اور جب کہ میری بکریاں پیٹ بھر اور دودھ والی بن کر واپس آتی تھیں، اسی طرح سلسلہ رہا اور ہم برابر اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر کی مزید بات دیکھتے رہے، یہاں تک کہ دودھ پلانے کے دونوں سال گزر گئے اور ان کا میں نے دودھ چھڑا دیا، اور ان کی صحت کی ترقی اس طرح ہو رہی تھی کہ ایسی دوسرے بچوں کی نہیں ہوا کرتی، کہ وہ ابھی دو سال ہی کو پہنچے تھے کہ ایک مضبوط بچے کی طرح ہوگئے، کہتی ہیں کہ چنانچہ میں ان کو لے کر ان کی ماں کے پاس آئی، حالانکہ ہمیں بہت زیادہ خواہش تھی کہ وہ ابھی ہمارے درمیان اور رہیں، کیونکہ ہم ان کی برکت کو دیکھ رہے تھے، چنانچہ ہم نے ان کی ماں سے بات کی اور میں نے ان سے کہا کہ میرے اس بچہ کو میرے پاس ابھی

اور چھوڑے رکھیں تا کہ اور مضبوط ہو جائے مجھے یہ ڈر لگتا ہے کہ مکہ کی بیماری کا ان پر اثر نہ پڑ جائے، کہتی ہیں کہ میں ان سے برابر اصرار کرتی رہی حتی کہ انہوں نے ہمارے ساتھ واپس جانے کی اجازت دے دی۔

کہتی ہیں چنانچہ ہم ان کو اپنے ساتھ لے کر واپس آئے، لیکن خدا کی قسم ہوا یہ کہ ہمارے ان کو واپس لانے کے چند مہینے کے بعد وہ اپنے بھائی یعنی میرے بچہ کے ساتھ بکریوں میں تھے، جو ہمارے گھروں کے پیچھے تھیں اتنے میں ان کا بھائی یعنی میرا بچہ دوڑتا ہوا آیا اور مجھ سے اور اپنے باپ سے کہا کہ میرے اس قریشی بھائی کو دو آدمیوں نے جو دو سفید کپڑے پہنے ہوئے ہیں پکڑ لیا اور چت لٹا کر ان کا پیٹ چاک کر دیا، اور جیسے کہ ان کو نچوڑ رہے ہیں، کہتی ہیں کہ میں فوراً نکلی اور ان کے باپ نکلے ان کی طرف لپکے تو ہم نے ان کو پایا کہ وہ کھڑے ہیں اور چہرہ پر پریشانی کا اثر ہے، کہتی ہیں کہ میں نے ان کو لپٹا لیا اور ان کے باپ نے بھی لپٹا لیا، اور ہم نے ان سے کہا کہ تم کو کیا ہوا اے میرے بیٹے! انہوں نے کہا کہ میرے پاس دو آدمی آئے جو سفید کپڑوں میں تھے انہوں نے مجھے لٹا دیا اور میرا پیٹ چاک کر ڈالا، وہ اس میں کوئی چیز ڈھونڈ رہے تھے میں نہیں جانتا کیا ہے وہ کہتی ہیں ہم ان کو لے کر لوٹے اور اپنے خیمہ میں لائے۔

کہتی ہیں کہ مجھ سے ان کے باپ نے کہا کہ اے حلیمہ مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے کہ اس بچہ کو کہیں آسیب تو نہیں ہو گیا لہٰذا ان کو ان کے گھر والوں کے پاس لوٹا دو، قبل اس کے کہ ان کی یہ چیز ظاہر ہونے لگے، کہتی ہیں کہ ہم ان کو لے کر ان کی ماں کے پاس آئے، تو ماں نے کہا ان کو تم کیوں لائیں اے دائی! حالانکہ تم تو بہت اصرار کرتی تھیں ان کو لے جانے کے لیے اور اپنے پاس رکھنے کے لیے، کہتی ہیں کہ میں نے ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے ان بیٹے کو اچھے حال تک پہنچا دیا ہے، اور مجھ

پر جو ذمہ داری تھی وہ میں نے پوری کردی ہے مجھے واقعات سے ڈر معلوم ہوتا ہے، لہٰذا آپ تک ان کو ایسا پہونچانا مناسب سمجھتی ہوں جیسا آپ پسند کرتی ہیں، انہوں نے کہا کہ یہ تمہاری بات سمجھ میں آنے والی نہیں ہے، سچ سچ بتاؤ کہ ماجرا کیا ہے؟ کہتی ہیں انہوں نے مجھ کو چھوڑا نہیں یہاں تک کہ میں نے سچ سچ بتادیا، کہتی ہیں انہوں نے کہا تم کو جن وشیطان کا خوف ہوا کہتی ہیں کہ میں نے کہا ہاں۔

کہتی ہیں انہوں نے کہا ہرگز نہیں خدا کی قسم شیطان کے ان تک پہونچنے کی کوئی سبیل نہیں، میرے اس بیٹے کی بات ہی کچھ اور ہے، اور کہا میں ان کی بات تم کو نہ بتاؤں میں نے کہا ضرور بتایئے۔

انہوں نے کہا جب ان کا حمل میرے ہوا تو میں نے دیکھا کہ میرے اندر سے ایک نور نکلا جس سے شام کے علاقہ کے شہر بصری کے محل روشن ہوگئے پھر یہ کہ جب ان کا حمل میرے ہوا تو اتنا ہلکا اور آسان حمل کبھی دیکھنے میں نہیں آیا، اسی طرح جب میں نے ان کو جنا تو یہ اپنے ہاتھوں کو زمین کی طرف کئے ہوئے تھے، اور ان کا سر اوپر آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا، تم چھوڑ و ان کو اور خوشی خوشی واپس جاؤ" (۱)۔

مذکورہ بالا بیان کے مطابق حضرت حلیمہ کے یہاں آپ صحت کے ساتھ رہے، وہاں آپ نے اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ بکریوں کے چرانے میں شرکت کی، آپ کا یہ بکری چرانا بعد میں آپ کے کام میں بھی آیا، جبکہ آپ کچھ بڑے ہوئے اور ضرورت محسوس کی، کہ آپ مکہ کے بعض لوگوں کی بکریاں اجرت پر چرائیں، اس وقت آپ کی عمر ۱۰ سال کی بتائی گئی ہے، وہاں کے ماحول میں کم عمروں کے لئے بکریاں چرانا معاشرہ میں برا بھی نہیں سمجھا جاتا تھا اور خاص طور پر جب کہ اس سے اقتصادی ضرورت پوری ہوتی ہو، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس طرح اپنی اقتصادی

---

(۱) سیرت ابن ہشام، جلد اول، ص: ۱۶۴-۱۶۵۔

ضرورت پوری کی، آپ کے چچا ابو طالب جو آپ کے دادا کے بعد آپ کے سرپرست ہوئے تھے، اقتصادی لحاظ سے کوئی خوش حالی نہیں رکھتے تھے اور یہ بکریاں چرانا ایسا عمل بھی نہ تھا جو صرف آپ ہی کی حیات طیبہ میں ملتا ہو، بلکہ متعدد سابقہ نبیوں میں بھی یہ سلسلہ رہا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اجرت پر بکریاں چرائی تھیں، اور شاید یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک حکمت کے طور پر کرایا جاتا ہوگا، کیونکہ بکریاں ایسی جانور ہیں جو مل جل کر کم رہتی ہیں، ادھر ادھر بھاگتی ہیں، ان کو اکٹھا رکھنا اور ایک طرف چلانا یہ انسانی افراد کی قیادت کرنے اور انکو ایک رخ پر چلنے کی مشق کرانے کا بھی مزاج بنا سکتا ہے، جس کی ضرورت نبیوں کو پیش آتی ہے۔

والدہ کی وفات اور دادا کی توجہ اور سرپرستی

آپ ﷺ کی والدہ جو اپنے یتیم بچہ کو اپنی حد درجہ قیمتی متاع سمجھتی تھیں اور بچہ بھی باپ کے نہ ہونے پر ماں سے مانوس رہتا تھا، بچہ کو لیکر مدینہ بچہ کے دادا کی نانہیال گئیں، شاید وہاں سے بچہ کو دیکھنے کے لئے بلا گیا ہوگا، کئی مہینے رہکر واپس ہو رہی تھیں، کہ مکہ مدینہ کی درمیانی بستی ابواء میں بیمار پڑیں اور انتقال کر گئیں، ان کے ساتھ ایک خاتون ام ایمن تھیں جو ایک طرح بچہ کی کھلائی بھی تھیں، بچہ کی دیکھ بھال میں معاون تھیں، آپ کی والدہ ماجدہ کی تدفین وہیں ہوئی، اور اب آپ ام ایمن کے ساتھ مکہ واپس آئے، آپ کی عمر اس وقت چھ سال کی تھی، اور اب والد اور والدہ دونوں کی سرپرستی نہیں رہی (۱)۔

دادا کی وفات

اب مردوں میں آپ کے دادا تھے جنہوں نے شفقت بڑھا دی اور توجہ رکھی،

---

(۱) ابن الاثیر فی اسد الغابۃ: ۱/۱۵، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان۔

وہ مکہ کے بڑے سردار تھے، لیکن دوسال کے بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا، اور پھر ان کی قائم مقامی چچا ابوطالب کے پاس آ گئی، آپ اس وقت آٹھ سال کے ہوئے تھے۔

اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش اور نشو ونما مکہ کے اس معزز خاندان کے ایسے فرد کی حیثیت سے ہوا جو پیدائش سے قبل ہی اپنے والد سے محروم ہو گیا تھا اور ٦ سال کی عمر کو پہونچنے پر والدہ کے سایہ سے بھی محروم ہو گیا اور ۸ برس کے تھے کہ مہربان وشفیق دادا نے بھی داغ مفارقت دیا، آغاز عمر میں ان دونقصانوں کا ہونا کم عمری کے زمانہ میں بڑا چیلنج رکھتے تھے (۱)۔

چچا ابوطالب کی توجہ اور ذمہ داری

دادا کے انتقال کے بعد آپ اپنے ان چچا کی سرپرستی میں رہے، چچا کو قریش کے تجارتی مشغلہ کے مطابق تجارتی مقصد سے دسرے وطن جانا ہوا کرتا تھا، اور مکہ کے باشندوں کا اقتصادی مشغلہ بھی یہی تھا، آپ کی عمر بارہ سال کی رہی ہوگی کہ چچا تجارت کے لئے شام جانے لگے تو آپ نے ان کے چلے جانے سے تنہائی کے احساس سے اپنے لئے بھی اصرار کیا، کہ ساتھ چلیں گے، آپ کے اصرار پر آپ کو باوجود کم عمر ہونے کے ساتھ لے لیا، چنانچہ آپ نے اس طرح شام کا تجارتی سفر بھی کیا، اور تجارت کے انداز وطریقہ کو بھی دیکھا اور اس کو سمجھا بھی ہوگا، جیسا کہ بعد میں حضرت خدیجہ کے کہنے پر آپ نے تجارتی سفر کو قبول کر کے اپنی واقفیت دکھادی (۲)

اس دور کے حالات پر نظر ڈالنے سے یہ خاص بات سامنے آتی ہے کہ ابتدائی نشو ونما کی عمر میں ماں اور باپ دونوں کی سرپرستی نہ ہونے پر اور اقتصادی حالات کے ناسازگار ہونے پر آپ کا ذہنی طور پر منتشر الخیال نہ ہونا اور بے سہارا جیسی کیفیت سے گذرنے کے باوجود مضطرب الحال نہ ہونا بلکہ اس کے برعکس صبر و برداشت،

---

(۱) أیضاً، وطبقات ابن سعد: ۱/ ۱۱۸-۱۱۹۔ (۲) اسد الغابۃ: ۱/ ۱۵

خوداعتمادی، ہمت وحوصلہ، صداقت ودیانت اور بلند حوصلگی جیسی خوبیوں کا پیدا ہونا ایک عجیب اور شاندار بات ظاہر ہوتی ہے جو آپ کو حاصل ہوئی، اور آپ حالات کی ناسازگاری کے باوجود ایسے کردار اور شخصیت کے مالک بنے جن کو دیکھ کر لوگ آپ کے متعلق شروع ہی سے اعلیٰ تصور رکھنے لگے۔

چنانچہ آپ نبوت کا منصب ملنے سے قبل ۴۰ سال کی عمر تک مکہ کے باشندوں میں ایک نہایت شریفانہ اور با اخلاق اعلیٰ انسانی قدروں کے حامل شخص دیکھے گئے اور ان کے ہم وطن اور عزیز ان سے ان ہی اعلیٰ صفات کی وجہ سے محبت کرتے اور ان کو صادق وامین کے خطابات سے نوازتے تھے، کہ سچا انسان، دیانت دار انسان، آپ اپنے ہم وطنوں اور خاندان کے افراد کے ساتھ ہر اچھے کام میں شریک اور معاون اور غلط کاموں میں اپنے کو الگ رکھنے والے تھے۔

آپ کی نشو ونما اور کردار کی تشکیل

سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم کی بعثت بیشمار انبیاء کی بیشمار قوموں میں بعثت اور کارِ نبوت انجام دینے کے بعد واقع ہوئی تھی، ان قوموں نے انبیاء کی کوششوں کے باوجود بہت کم ان کی بات مانی اور اپنی اپنی خواہشات کی زندگی کو بہت کم بدلا اور آخر میں اللہ تعالی نے چھ سو سال کی مدت نبیوں کو بھیجنے سے خالی رکھی اور انسانوں کے عقلاء اور مفکرین پر معاملہ کو چھوڑا اور انسان خود سے اپنے کو صحیح دینی واخلاقی راستے پر لائیں، لیکن انسانوں کی حالت اور زیادہ خراب ہوگئی اور قابل نفرت حد تک پہونچ گئی، جیسا کہ حدیث شریف میں اس کا ذکر آیا ہے، لیکن اللہ تعالی کو پھر بھی رحم آیا اور اس نے ایسا نبی بھیجنے کا فیصلہ فرمایا جو کہ زیادہ موثر اور زیادہ ہمہ گیر طریقہ سے انسانوں کی اصلاح کا کام کرے اور صرف زندگی کے دینی شعبہ تک کام کو محدود نہ رکھے، بلکہ زندگی کے تمام پہلوؤں میں رب العالمین کی مرضی کی تابعداری کا مزاج

بنائے اور تربیت دے، آپ سے پہلے مختلف علاقوں میں مختلف قوموں میں انبیاء بھیجے جاتے رہے، انہوں نے اپنے علاقوں تک اپنے کام کو انجام دیا تھا، ان کی کوششوں کے بعد بھی جب جب اصلاح کی امید منقطع ہو جاتی اور نبی کو اس کی قوم بالکل عاجز کر دیتی بلکہ اس کو مار کر ختم کر دینے کے درپے ہو جاتی تو پھر اللہ تعالی اپنا غضب عذاب کی شکل میں نازل کرتا، اور ان کے بگاڑ کو ختم کرنے کے لئے دنیا کو ان سے پاک کر دیتا۔

اصلاح ودعوت کے طویل سلسلہ کے بعد اب چھٹی صدی عیسوی سے جو دور شروع ہو رہا تھا، وہ انسانوں کی زندگیوں میں نہایت برے حالات پیدا ہو جانے کا دور محسوس کیا جا رہا تھا، دوسری طرف انسانی تمدن عملی تجربوں اور ان کی شکست وریخت سے گزر کر ایک متنوع اور عالمی سطح کے نظام زندگی اور تعلیم کی عمومیت کے دور میں داخل ہونے جا رہا تھا، ایک طرف اس کی زندگی اخلاقی اور دینی حالات کے لحاظ سے بہت زیادہ بگاڑ کی حد تک بھی پہونچ گئی تھی، جو اللہ تعالی کے بہت غضب اور نفرت کو کھینچنے کا سبب بن رہی تھی، اور اس سے یہ صورت بن رہی تھی کہ یا تو اس بگاڑ کو ختم کرنے کے لئے رب العزت اس دنیا ہی کو ختم کر دے، یا پھر غیر معمولی رعایت کو اختیار کر کے اصلاح کا مزید موقع دیدے۔

اس کے لئے ایسے ہی نبی کی ضرورت تھی جو متنوع حالات میں متنوع ذمہ داریوں کو سنبھال سکے، اس کی انسانی خصوصیات کی تشکیل بھی بہتر سے بہتر ہوئی ہو اور اس کے دل ودماغ کی تختی پر انسانوں کی نفس پرستانہ اور خود غرضانہ علم وتمدن کی چھاپ نہ آئی ہو، تاکہ اس کے دل ودماغ کی تختی انسانوں کی تعلیم سے سادہ ہو اور آسمانی تعلیمات کے ذریعہ تربیتی عمل انجام پائے تاکہ زیادہ سے زیادہ موثر اور جامع نبوت کا بار اٹھانے کی ذمہ داری کی مضبوط بنیاد رکھی جائے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے محمد ﷺ کا انتخاب کیا اوران کو بچپنے ہی سے ایسے حالات سے گزارا جن سے ان میں اس مجوزہ منصب کو سنبھالنے کی صلاحیت بحسن وخوبی پیدا ہو سکے اوراس طرح حضرت محمد ﷺ کو ایک جامع اور متنوع اور کامل خصوصیات کا حامل نبی بنا کر مبعوث فرمایا اور آپ میں اسی کے مطابق خصوصیات پیدا فرمائی ، اسی کے مطابق آپ کا نشو ونما ہوا اور جامع اور عظیم شخصیت کی تشکیل کا انتظام ہوا، جس کو ہم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں نمایاں طریقہ سے دیکھتے ہیں، کہ انسانی زندگی کے انفرادی، اجتماعی، فطری اور تمدنی ہر طرح کے پہلوؤں کے لحاظ سے نمونہ اور اور رہبر بننے کی صلاحیت کے حامل بنے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جو ذمہ داری رکھی گئی اس میں ایک طرف تو انفرادی سطح کی اعلیٰ خصوصیات رکھی گئیں، دوسری طرف زندگی کے وسیع دائرہ بلکہ عالمی سطح کی صلاحیتیں رکھی گئیں، اس میں انفرادی سطح پر مثالی کردار ، انسانی زندگی کے اجتماعی تقاضے، تدبیر حکومت، آپس کے تعلقات، سیاسیات ومعاشیات ، علم ودانش کے معاملات اور دیگر امور سب تھے اور اس سب کو پروردگار عالم کی مرضی کا تابع بنانے کی تدبیر ونظام کی صلاحیت بھی، اوراس طرح دین وشریعت کا جو آسمانی نظام مقرر کیا گیا تھا اس کو تکمیل کی سطح تک لیجانا تھا، اس میں دین کو آپ پر مکمل کردئے جانے کی وجہ سے ایسی شریعت کا اعلان کرنا تھا جس میں قیامت تک پیدا ہونے والے مسائل ومعاملات اور دنیا کے مختلف حصوں میں بسنے کی صورت میں اخلاقیات وتمدنی ضرورتوں کو سمجھنے اور اختیار کرنے کی صورتیں، نیز علمی کاوشوں سے پیدا ہونے والے حالات اور ان سے متعلق لوگوں اور مزاجوں کی رعایت رکھی گئی، اس طرح بہت دوررس اور انسانی زندگی کے تنوع کا لحاظ رکھنے کی جامع ومفید شریعت بنی۔

قرآن مجید میں سابقہ قوموں کا جو تذکرہ آیا ہے، اس میں ان قوموں کی

شریعت میں ان کے محدود حالات کے دائرہ کے امور تک معاملہ ملتا ہے لیکن اب جو عہد شروع ہو رہا تھا اس میں اگرچہ دنیا اور زندگی کے اپنے علاقائی اور نسلی فرق واختلاف کے ساتھ علاقوں میں بسنے والے لوگ ہو سکتے تھے جو یکساں موسم اور یکساں جغرافیائی حالات کا بھی فرق تھا، سردی اور گرمی کا فرق اور دن ورات کی مدت میں کمی وبیشی کے لحاظ سے فرق اور تنوع پایا جاتا ہے، لیکن تمدنی اور علمی ترقیات سے ان میں آپسی قربت بھی بڑھنے لگی تھی، اور انسانوں کے خود اپنے علاقائی اور سماجی حالات کا جو تنوع ہو سکتا ہے، ان سب کا لحاظ اس عہد کے نبی کی شریعت میں رکھا گیا، اسی کے ساتھ ساتھ اعلیٰ انسانی اقدار اور رب العالمین کے احکام کی پابندی والی زندگی کے نظام کو قائم کرنے کے لئے طاقت کے استعمال کی ضرورت پڑنے پر معاندانہ اور مخالفانہ طاقتوں سے مقابلہ کرنے کا انداز اختیار کرنے کا نظام بھی رکھا گیا، نیز نیا شروع ہونے والا عہد علم کے عام ہونے کا اور وہ ہر انسان کی ضرورت بن جانے کا تھا، شاید اسی وجہ سے اس دور کے شروع ہونے کے لحاظ میں پہلی وحی الٰہی کے ذریعہ آپ کو جو ہدایت دی گئی وہ اقرأ کے لفظ سے فرمائی گئی اور اس میں قلم کے کردار کی بھی اہمیت ظاہر فرمائی گئی جس سے صاف طریقہ سے نئے دور کو علمی دور کا مقام عطا کیا گیا، فرمایا:

﴿اقرأ باسم ربك الذي خلق ، خلق الإنسان من علق، اقرأ و ربك الأكرم الذي علم بالقلم، علم الإنسان ما لم يعلم﴾ [سورہ اقرأ:۱۔۸]	پڑھ اس خدا کے نام سے جس نے کائنات کو پیدا کیا، جس نے آدمی کو گوشت کے لوتھڑے سے پیدا کیا، پڑھ تیرا خدا کریم ہے، وہ جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ علم سکھایا، وہ جس نے انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو اسے معلوم نہ تھیں۔

انسان کے لئے علم کی اہمیت ظاہر کی گئی اور علم کا اہم ذریعہ قلم ہے، اس کا حوالہ خصوصیت کے ساتھ دیا گیا اور تاکید کی گئی کہ علم کو خدا کے نام سے جوڑا جائے اور ظاہر

ہے کہ علم کو اب تک جوڑنے کے بجائے آزاد چھوڑ دیا گیا تھا، اس سے انسانوں میں اخلاقی بگاڑ پیدا ہو گیا تھا، ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتایا گیا کہ انسان کو طاقت وصلاحیت حاصل ہونے پر اس میں سرکشی اور ظلم وزیادتی کا مزاج بن جاتا ہے، لہذا اس کو بتایا کہ وہ احتیاط کرے، آخرت میں اپنے رب کے سامنے جواب دہ ہونا ہے، فرمایا:

﴿كَلَّا إِنَّ الْإِنسَانَ لَيَطْغَىٰ أَن رَّآهُ اسْتَغْنَىٰ إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَىٰ﴾ [سورہ علق: ۶-۸]۔

مگر انسان سرکش ہو جاتا ہے جب کہ اپنے تئیں غنی دیکھتا ہے، کچھ شک نہیں کہ اس کو تمہارے پروردگار ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

مابعد کی تاریخ یہ بتاتی بھی ہے کہ علم عام ہو جانے کا جو دور اسلام کی سرپرستی سے شروع ہوا، اس میں اسلام کے ماننے والوں نے ایک طرف تو علم کی سربراہی بین الاقوامی سطح پر کی، اور علم کو وسعت اور ترقی دی اور اس کے لئے نئے نئے میدان تلاش کر کے ان میں بھی کام کرنے کا سلسلہ قائم کیا، اور اپنی علمی ترقیات سے انسانوں کو فائدہ پہونچایا، اور دوسری طرف علم کو خدا کے نام سے جوڑا اور اس کو انسانی زندگی کی ہلاکت اور ضیاع کے بجائے رشد وصلاح کا ذریعہ بنایا، اسلام نے علم میں مسلسل تدبر اور تحقیق کے ذریعہ اور غور فکر کے عنصر کو اہمیت دیکر اضافہ اور نفع کے قابل بنانے کی دعوت دی اور اس کو سرکشی وظلم اور غلط استعمال سے محفوظ رکھا، برخلاف دوسری قوموں کے کہ انہوں نے علم سے نقصان ہی پہونچایا، علم کو ناخدا شناسی بلکہ انکار خدا اور سرکشی کا ذریعہ بنا کر ایٹم بم اور مہلک اسلحے بنائے اور ذہنوں کے بگاڑ کا کام کیا اور اس کا غلط استعمال کیا۔

بہر حال اس نبی کی شریعت علم سے تعلق رکھنے والی اور علم کے وسیلہ یعنی عقل انسانی کے تقاضوں کی پوری رعایت کرنے والی ہوئی اور علم خدا شناسی اور خدمت خلق کا ذریعہ بنا، علم کے ساتھ دولت اور ثروت کے بارے میں نیا انداز اختیار کیا، انسان

کی سرشت کی طرف اشارہ کیا گیا کہ وہ سرکشی کرنے لگتا ہے، خاص طور پر جب دولت آتی ہے اور اس کا ذہن دین بیزار اور خدا کی تابعداری سے ہٹ کر چلتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ یہ اس کی اپنی محنت اور علم کے ذریعہ حاصل ہوا ہے اور وہ جس طرح چاہے اسے استعمال کرسکتا ہے، اس طرح دین اسلام کی جو شکل حضور فداہ أبی وأمی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زیر سرکردگی شروع ہوئی اس میں انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کی رہنمائی رکھی گئی، جو بہت جامع رہنمائی تھی اور انسان کی سلامتی اور دنیا وآخرت دونوں میں کامیابی رکھی گئی اور اس کا بھرپور آغاز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خود حیات طیبہ سے ہوا اور آپ کی طرف سے ان تمام پہلوؤں کے سلسلے میں ضروری رہنمائی ہوئی۔

اعلیٰ ترین صفات کی حامل شخصیت

اللہ رب العالمین کو اپنے اس آخری مقرر کردہ نبی حضرت محمد ﷺ پر ایسا عظیم بوجھ ڈالنا تھا جو عام انسان کے بس میں نہیں ہوسکتا، لہذا آپ کے ظاہر و باطن کو اللہ تعالیٰ نے سب انسانوں کے معاملہ میں زیادہ مضبوط اور بلند صفات کا پیدائش کے ہی وقت سے بنایا تھا، پھر اس کے لئے خاص طور پر آپ کو زندگی کے متنوع اور سخت ترین نشیب و فراز سے گذارا جو انسان میں مختلف حالات کو جھیلنے اور عزم و ہمت سے مناسب راہ نکالنے کے لئے معاون ہوسکے، اولاً آپ کا سابقہ یتیمی کی بے چارگی سے کرایا گیا، پیدا ہونے کے بعد آپ جب ابتدائی شعور کی عمر میں داخل ہوئے تو آپ نے دیکھا کہ آپ کو سایہ پدری حاصل نہیں، آپ چھ سال کی عمر کو پہونچے تھے کہ سایہ مادری بھی اٹھ گیا، جب کہ آپ کے اردگرد سیکڑوں آپ کے ہم سنوں کو ماں باپ کا سایہ حاصل تھا، یہ بات ایک معصوم اور صغیر السن بچہ کے قلب وذہن کے لئے عموماً ایک سخت ذہنی بے چارگی اور شکستہ دلی کا باعث ہوا کرتی ہے، چھ سال کی عمر میں سایہ مادری بھی اٹھ جانے کے بعد شفقت کرنے کے لئے دادا تھے وہ بھی آٹھ سال کی عمر میں

داغ مفارقت دے گئے، ان محرومیوں کو کوئی بچہ عموماً بحسن وخوبی نہیں جھیل پاتا، اور اس کی زندگی کی راہ پیچیدہ ہو جاتی ہے، اور زندگی میں اس کی کامیابی مبہم ہو کر رہ جاتی ہے، لیکن اگر اس بوجھ کو خداداد ہمت سے وہ جھیل لے، تو اس کی شخصیت میں مشکل حالات کو جھیلنے اور اس میں ضرورت اور پسند کی راہ نکالنے کی خاصی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، اللہ تعالی نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہمت خصوصی طور پر عطا فرمائی، جس کی بنا پر آپ میں حالات اور واقعات کے تقاضوں کو مناسب ڈھنگ سے محسوس کرنے اور زندگی کے چیلنجوں کا مناسب ڈھنگ سے مقابلہ کرنے کی سمجھ اور ہمت پیدا ہوئی، اور جلد ہی آپ نے باعزت زندگی کی باغیرت وسیر چشمی کی راہ اختیار کی، اور زندگی کو مشکل حالات کے باوجود عزت نفس اور عالی ہمتی سے آراستہ فرمایا۔

چنانچہ آپ فکر وشعور کی عمر میں داخل ہونے کے وقت ہی سے اپنے اردگرد کے ماحول کی بے راہ روی کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھنے لگے تھے، آپ نے اس بات کو بہت محسوس کیا کہ لوگوں میں ایک طرف تو باعزت زندگی کا شوق اور جرأت وہمت اور متعدد انسانیت نواز خوبیاں ہیں، لیکن دوسری طرف مذہبی جذبہ کی تسکین کے لئے خودساختہ انسانی اور حیوانی پتلے بنا کر ان کو پوجتے اور ان سے اپنی حاجت روائی چاہتے ہیں اور یہ ایسا کرتے ہیں جیسے کسی زندہ انسان، بلکہ انسان سے بھی برتر طاقت سے اپنی حاجت کا سوال کیا جاتا ہے، حضور صلی اللہ وسلم کو دونوں باتوں میں کوئی جوڑ نظر نہیں آتا تھا، اور ایک تضاد معلوم ہوتا تھا، کہ ایک طرف تو انسانی برتری اور عظمت کا احساس بلکہ احساس برتری اور دوسری طرف اتنا نیچے اتر آنا کہ بے جان اور مٹی اور پتھر جیسی چیزوں کے سامنے اپنے کو گرانا اور بے عزت کرنا، آپ اس خیال سے اور ایسی گری پڑی باتوں سے اپنے کو الگ رکھتے اور شاید یہ بھی ایک وجہ تھی کہ آپ کو آسمانی وحی کے آنے اور اس کے ذریعہ رہنمائی ملنے سے قبل کے دور میں اپنے اردگرد کے حالات

سے غیر مطمئن ہونے پر تنہائی اختیار کر کے آپ میں زندگی اور کائنات کے سربستہ راز کو سوچنے کا خیال پیدا ہوا اور اس کے لئے آپ شہر سے باہر پہاڑ کے غار میں جا کر کچھ کچھ وقت گزارنے لگے تھے۔

حلف الفضول

ایک غریب اور باہری (قبیلۂ زبید کا) شخص کے حق کی ادائیگی میں ایک معزز شخص (عاص بن وائل) کی طرف سے زیادتی ہو رہی تھی تو خاندان کے چند معزز حضرات نے حقداروں کے حق دلانے کے لئے ایک کمیٹی کی تشکیل کی، آپ اس میں بھی شریک ہوئے اور جب بھی خاندان یا شہر کے جائز معاملات میں کچھ کرنے کی ضرورت پڑتی آپ اس میں شریک ہوتے، آپ کی دیانت وامانت کو دیکھتے ہوئے لوگوں کو اتنا اعتبار ہو گیا تھا کہ لوگ آپ کے پاس اپنی امانتیں رکھاتے اور اعتماد کرتے (۱)۔

حضرت خدیجہ کے ساتھ تجارت میں شرکت اور نکاح

خاندان کی ایک معزز اور دولتمند خاتون نے جو تجارتی مال باہر سے منگواتی اور بھجواتی تھیں، اور بیوہ ہو جانے پر اپنے مال تجارت کو باہر بھیجنے کے سلسلے میں کسی دیانت دار اور سمجھدار مرد کی معاونت کی ضرورت محسوس کرنے لگی تھیں جو ان کے غلام کے ساتھ سفر کرے اور غلام کی سرپرستی و نگرانی رکھے، انہوں نے آپ کی صفات سے واقف ہونے کی بنیاد پر آپ ﷺ سے بھی معاونت کرنے کی فرمائش کی اور اپنے غلام کے ساتھ ذمہ دار بنا کر باہر بھیجا اور گویا اس طرح آپ کی کارکردگی اور عملی صلاحیت کو آزمایا، آپ نے اپنے اس سفر سے ان خاتون کا معاملہ بہت نفع کے ساتھ انجام دیا، مزید یہ ہوا کہ آپ کے ساتھ گئے ہوئے غلام نے بھی آ کر آپ کی کارکردگی اور دیانت

---

(۱) الکامل فی التاریخ: ۲/۴۱-۴۲

کی بہت تعریف کی۔

چنانچہ ان خاتون نے جبکہ دوسرے کئی معزز لوگوں کے پیغامات ان سے رشتہ کے آئے تھے اور ان سے معذرت کر دی تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خود رشتہ کی پیشکش کی، یہ حضرت خدیجہ بنت خویلد تھیں (۱) یہ عمر میں آپ سے پندرہ سال بڑی تھیں، لیکن آپ کی جو خوبیاں انہوں نے دیکھیں ان کی بنا پر آپ سے رشتہ ازدواج قائم کرنے کا فیصلہ کیا، آپ کی عمر ۲۵ سال اور حضرت خدیجہ کی عمر ۴۰ سال تھی، لیکن آپ بھی ان کو رفیقۂ حیات بنانے پر تیار ہو گئے، اور عمر کے اس فرق کو نظر انداز کیا اور ان کے سمجھدار خاندان میں ان کی جو عزت تھی اس کو قابل ترجیح سمجھا، آپ ﷺ کا یہ نکاح پہلا نکاح تھا، جو عام انسان اپنے سے بڑی عمر کی خاتون سے نہیں کرتا، لیکن آپ ﷺ صفات اور خوبیوں کو پیش نظر رکھنے والے مزاج کے تھے، آپ ﷺ نے اس کو خوشی سے قبول کر لیا (۲) نکاح کر لینے سے آپ ﷺ اب باقاعدہ طور پر گھر والے ہو گئے، دوسری طرف تجارتی معاملہ میں بھی ایک دوسرے کی کمی کو پورا کرنے کے لائق ہو گئے، دونوں نے بہت محبت اور تعلق کے ساتھ رشتہ نبھایا اور شہر میں بھی نیک نامی کیساتھ زندگی کے فرائض انجام دیتے رہے۔

اس نکاح کے نتیجہ میں حضرت خدیجہ کے جو آپ کی اب اہلیہ ہو گئیں تھیں، کاروبار میں آپ کو مزید اختیارات حاصل ہوئے اور اس کے اثر سے آپ کو معاشی لحاظ سے جو فکرمندی تھی وہ تقریباً جاتی رہی اور آپ کو مکہ کے ماحول میں دین کے سلسلہ میں جو گمراہی نظر آتی تھی اس سے گریز رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی یاد اور عبادت کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے، یہ زیادہ تر تنہا جگہ جا کر اپنے رب کا دھیان کرنے اور یاد کرنے کی صورت میں ہوتا تھا، آپ ﷺ کی اہلیہ حضرت خدیجہ کی طرف سے ایک

---

(۱) أیضاً، ص: ۴۰۔ (۲) أسد الغابة: ۱/ ۱۶

غلام بھی جو حضرت زید بن حارثہ تھے آپ کو حاصل ہوئے، وہ آپ ﷺ کے بڑے اچھے معاون بن گئے تھے۔ ان کو آپ ﷺ نے انسانی جذبہ کے تحت غلامی سے آزاد کر کے اپنا رفیق بنالیا، جو اس زمانہ میں متبنیٰ بنانے کے طریقہ سے بھی کیا جاتا تھا۔

ابوطالب کے بیٹے حضرت علی کو اپنی کفالت میں لینا

دوسری طرف آپ ﷺ کو معاشی طور پر سہولت ملنے پر اپنے مشفق اور انتہائی ہمدرد چچا ابوطالب کی تنگ حالی کا احساس بڑھ گیا، اسی احساس کے پیش نظر آپ نے اپنے دوسرے چچا حضرت عباس کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ ابوطالب کے چونکہ کئی لڑکے ہیں، ان کا معاشی باران کے لئے زیادہ ہے، لہذا ان میں سے کم از کم دو کو ہم دونوں اپنی اپنی کفالت میں لیکر ان کے لئے آسانی کی صورت مہیا کر دیں، چنانچہ اس تجویز کے مطابق ایک کو حضرت عباس نے اپنے ساتھ کرلیا اور دوسرے کو آپ ﷺ نے اپنے ساتھ کرلیا، حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے عقیل کی ذمہ داری لی اور آپ نے حضرت علی کو لیا، حضرت علی کی عمر بھی آپ ﷺ کی عمر سے ۳۰ سال کم تھی، یہ فرق عام طور پر باپ کا بیٹے سے ہوتا ہے، ان کو اپنی کفالت میں لیتے وقت ان کی عمر تقریباً پانچ سال کی رہی ہوگی، اور آپ کی عمر ۳۵ سال ہوگی، یوں وہ تا حیات آپ ﷺ کے ساتھ بیٹے کی طرح رہے، آپ نے چچازاد بھائی ہونے کا بھی خیال رکھا۔

کعبہ کی تعمیر

آپ اپنے دینی جذبہ کے تحت یوں تو بیت اللہ شریف میں اپنے رب کی عبادت کی غرض سے جایا کرتے تھے اور بیت اللہ شریف تعمیر کرنے والے اپنے اجداد کرام حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام سے منقول طریقہ کو جس قدر جان سکے تھے اس طریقہ سے عبادت کرتے تھے، بتوں کی عبادت کی جو رسم

ملتی تھی اس کو ان کا ذہن قبول نہیں کرتا تھا، لہذا ان سے ۔ بے تعلق رہتے ہوئے اپنے انداز سے اپنے رب کی عبادت کر لیتے تھے، اسی درمیان کعبہ کی مرمت کی ضرورت محسوس کی گئی، اس کی چھت نہیں تھی دیواریں بھی صرف قد آدم تھیں اور مکہ چونکہ نشیب میں ہے اس لئے سیلاب آنے پر سب خراب ہو جاتا تھا، لہٰذا قریش کو فکر ہوئی کہ اس کو ٹھیک کریں، اسی درمیان ان کو یہ واقعہ معلوم ہوا کہ جدہ میں ایک جہاز ٹوٹ کر بیکار ہو گیا ہے، قریش کے ایک سردار نے وہاں جا کر قریش کی طرف سے اس کی لکڑی کے تختے حاصل کئے، اور ان کے ذریعہ کعبہ کی تعمیر جدید شروع کی، اور چونکہ یہ مقدس عبادت گاہ کا کام تھا اس لئے اس میں قریش کے سب خاندانوں کے نمائندے شریک ہوئے، آپ کی عمر اس وقت ۳۵ سال کی ہو چکی تھی، آپ بھی شریک ہوئے، آپ اپنے کاندھے پر پتھر رکھ کر لاتے اور جگہ تک پہونچاتے تھے جس سے آپ کے شانے چھل بھی گئے، پھر جب حجر اسود کو اس کی مخصوص جگہ پر رکھنے کا وقت آیا تو قریش میں جھگڑا ہو گیا، کہ ہر ایک اس کو رکھنے کی برکت حاصل کرنا چاہتا تھا، قریب تھا کہ اس پر آپس میں لڑائی کی نوبت آجائے۔

بالآخر فیصلہ یہ ہوا کہ اگلے دن صبح سویرے جو بیت اللہ شریف میں سب سے پہلے پہونچے اس سے اس سلسلہ میں فیصلہ کرایا جائے، اور وہ سب کو قبول ہو، اگلی صبح یہ خصوصیت حضور ﷺ کو حاصل ہوئی، آپ سب سے پہلے وہاں پہونچے تھے، آپ کو دیکھ کر سب خوش ہوئے، اور کہا کہ یہ تو ''الصادق الأمین'' ہیں، یہ بالکل مناسب ہیں، چنانچہ آپ کے ذریعہ فیصلہ لیا گیا، آپ نے فیصلہ یہ دیا کہ حجر اسود کو ایک چادر میں رکھ کر سب مل کر اٹھائیں، ہر ایک اپنی طرف کا کنارہ پکڑے، چنانچہ سب نے چاروں طرف سے چادر پکڑ کر اٹھایا اور جب اس کی مقررہ جگہ تک پہونچا دیا تو آپ نے سہارا دیکر اس کی جگہ پر روک دیا(۱)۔

---

(۱) أسد الغابۃ: ۱/ ۱۷، الکامل فی التاریخ: ۲/ ۴۵، تاریخ طبری: ۲/ ۲۹۰، سیرت ابن ہشام: ۱/ ۱۹۷۔

اس طرح آپ نے اپنے حکیمانہ فیصلہ کے ذریعہ قریش کے لوگوں کو مطمئن کر دیا، اور قریش کے لوگوں کو اس کشمکش سے بچالیا کہ حجر اسود کی برکت نہ ملنے پر آپس میں تلواریں چل جاتیں، جیسا کہ عربوں میں عزت کی خاطر ہو جایا کرتا تھا، آپ کے اس عمل سے سب کی نظر میں آپ کی وقعت میں مزید اضافہ ہوا، خاندان کے سب افراد آپ کی نیک نفسی اور خوبیوں کی پہلے سے قدر کرتے تھے، اس سے مزید قدر بڑھی، اور اہم موقعوں پر آپ پر مزید اعتماد کرنے لگے۔

خدائی عنایت و تربیت

آپ میں یہ اعلیٰ انسانی صفات کچھ تو فطری طور پر اور طبیعت کی سلامتی اور اعلی ظرفی سے پیدا ہوئیں تھیں، جن میں اعلی خاندانی خصوصیات کا بھی اثر تھا، پھر ان میں ترقی اور مضبوطی زندگی کے دشوار گزار حالات سے گزرنے اور برداشت کرنے کی مشق سے پیدا ہوئی تھیں جن سے آپ کو بالکل کم عمری ہی کے وقت سے سابقہ پڑنے لگا تھا۔

بہر حال سخت حالات اور زندگی کی دشواریاں اور قریب ترین محبت کرنے والوں کی کمی آپ میں ہمت و عزیمت اور کردار کی مضبوطی پیدا کرنے میں معاون بنیں، اعلیٰ انسانی خصوصیات کو آپ نے اپنایا اور ان بری باتوں سے اپنے کو الگ رکھا جو عام آزادانہ طبیعت کے نوعمروں اور نوجوانوں میں پیدا ہو جاتی ہیں اور یہ دراصل اللہ رب العالمین کی عنایت سے تھا جس کی توفیق خاص سے آپ اچھے اور خوبیوں والے طریقہ پر چلے اور اللہ رب العزت کو اسی آزادانہ ماحول سے ایک سچے اور اعلیٰ انسانی صفات و اخلاق کے فرد کو اپنا ایسا نبی بنانا تھا جس کو قیامت تک دین حق کا پیغامبر اور رہبر ہونا تھا، قرآن مجید میں رب العالمین نے اس کی طرف اشارہ بھی کیا، یہ اس موقع پر کیا جب نبی بنائے جانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی رہنے والی وحی میں ایک موقعہ پر دیر ہوئی اور آپ کو خوف ہوا کہ کہیں اللہ تعالیٰ کی نظر عنایت آپ سے ہٹ تو نہیں گئی، تو سورہ نازل ہوئی:

﴿والضحىٰ والليل إذا سجىٰ، ما ودعك ربك وما قلىٰ،وللآخرة خيرلك من الأولىٰ ،ولسوف يعطيك ربك فترضىٰ، ألم يجدك يتيماً فآوىٰ ،ووجدك ضالا فهدىٰ،ووجدك عائلاً فأغنىٰ،فأما اليتيم فلاتقهر،وأما السائل فلاتنهر، وأما بنعمة ربك فحدث﴾

آفتاب کی روشنی کی قسم اور رات کی تاریکی کی جب چھا جائے کہ اے (محمد) تمہارے پروردگار نے نہ تم کو چھوڑا اور نہ تم سے ناراض ہوا اور آخرت تمہارے لیے پہلی (حالت یعنی دنیا) سے کہیں بہتر ہے اور تمہیں پروردگار عنقریب وہ کچھ عطا فرمائے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے، بھلا اس نے تمہیں یتیم پا کر جگہ نہیں دی؟ (بیشک دی) اور راستے سے ناواقف دیکھا تو راستہ دکھایا اور تنگ دست پایا تو غنی کر دیا، تو تم بھی یتیم پر ستم نہ کرنا اور مانگنے والے کو جھڑکی نہ دینا اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کا بیان کرتے رہنا(۱)۔

حضرت ابو بکر کی رفاقت

قریش میں آپ کے تقریباً ہم عمر لوگوں میں حضرت ابو بکر سے آپ کو زیادہ انس اور ربط ہو گیا تھا، وہ بھی محتاط اور صاف طور طریق کے فرد تھے،اس کی بنا پر دونوں ایک دوسرے کی خوبیوں کو پسند کر کے آپس میں بہت مانوس ہو گئے تھے اور قریبی ربط و تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ یہ تعلق بعد میں مثالی تعلق بن گیا اور نبوت ملنے پر انہوں نے آپ پر یقین اور آپ کی ماتحتی کو دل و دماغ کی پوری ہم آہنگی کے ساتھ قبول کر لیا جو تا حیات مثالی انداز میں جاری رہا(۲)۔

غار حرا میں اعتکاف کے لئے وقت گزارنا

آپ نبوت ملنے سے قبل ہی سے دینی و اخلاقی حالات کی خرابی کو محسوس

---

(۱) سیرت ابن ہشام، ج ۱/۲۴۱۔

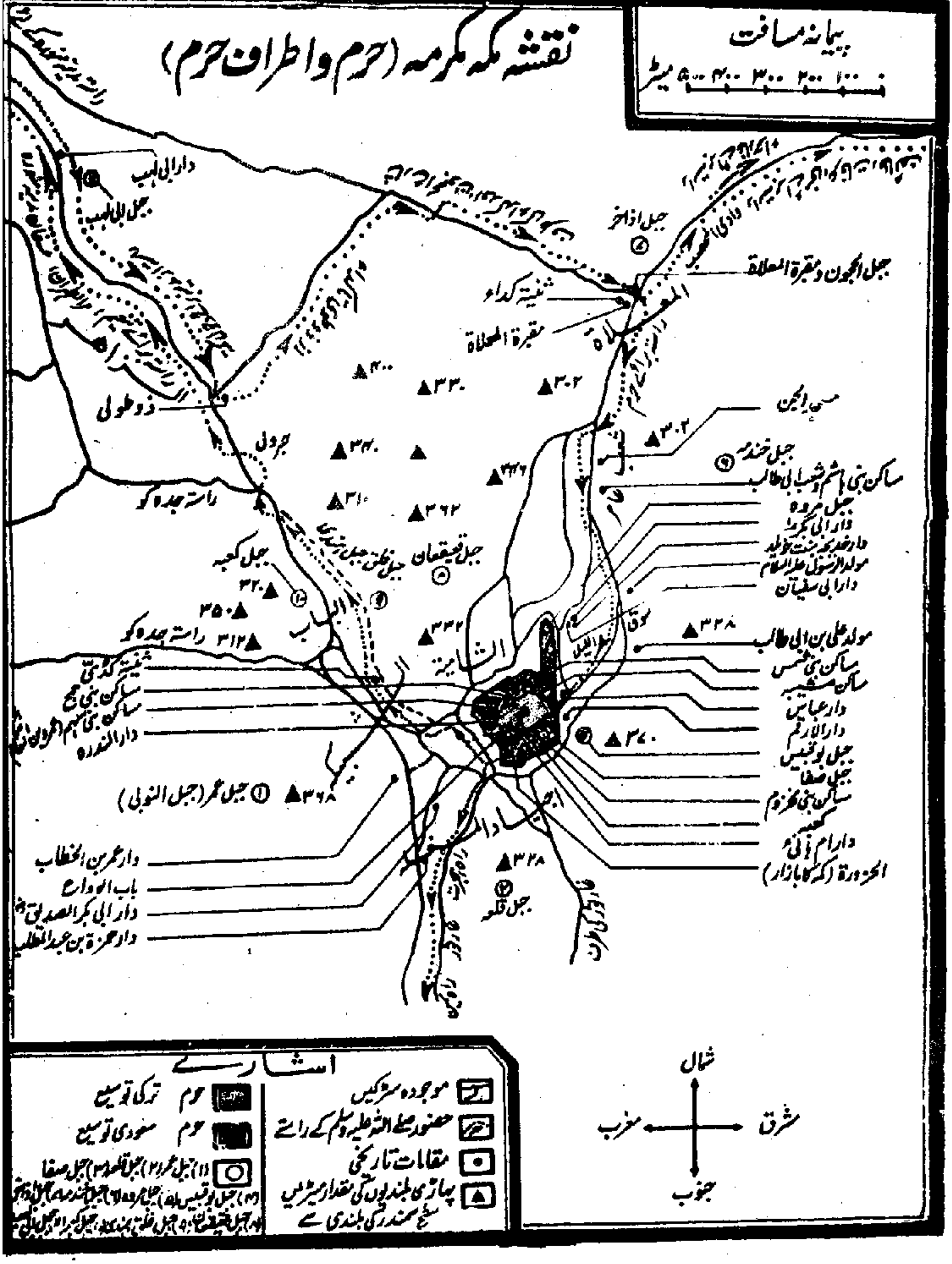
(۲) المواھب اللدنیہ، از: قسطلانی، ص: ۳۸

کر کے سوچنے لگے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور انسان اپنی انسانیت سے دور ہوتا چلا جارہا ہے، ان احساسات کی بنا پر آپ وقتاً وقتاً شہر کی آبادی سے دور نکل جاتے، اور آبادی سے الگ تھلگ ایک غار میں کچھ وقت گذارتے، ظاہر ہے آپ میں تنہائی اور تخلیہ میں کچھ وقت گذارنے کا جذبہ وتقاضہ اصل حقیقت کی طلب اور اس کے سلسلہ میں غور وفکر کے لئے رہا ہوگا، جو آپ کے گہرے احساسات کا نتیجہ رہا ہوگا، پھر چونکہ پروردگار عالم نے عرب اور غیر عرب انسانوں میں بہت زیادہ خرابیوں اور برائیوں کے پیدا ہو جانے پر ان کی نصیحت اور اصلاح کے لئے نبی مبعوث کرنا طے فرمایا اور اس کے لئے آپ کا انتخاب فرمایا، اس لئے جیسے جیسے نبوت ملنے کا وقت قریب آتا گیا آپ کو پردۂ غیب سے اس کے اشارے بھی ملنے لگے، چنانچہ نبوت ملنے سے قبل ہی حجر وشجر سے اللہ کے نبی کے عنوان سے مخاطب کرنے کی آوازیں بھی آنے لگیں، جن کو سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تعجب سے متوجہ ہو جایا کرتے، لیکن کوئی قائل نظر نہ آتا (۱)، چنانچہ چالیس سال کی عمر کو پہونچنے پر جو کہ جسمانی اور اخلاقی دونوں لحاظ سے مکمل اور معیاری سطح ہے، آپ کو نبوت کا مقام عطا ہوا۔

☆☆☆

---

(۱) السیرۃ النبویۃ لابن اسحاق، ۱/۱۹۱، سیرت ابن ہشام: ۱/۲۳۴۔



نقشہ مکہ مکرمہ (حرم واطراف حرم)
پیمانہ مسافت
۱۰۰ ۲۰۰ ۳۰۰ ۴۰۰ ۵۰۰ میٹر
دار ابی لہب
جبل ابی لہب
ذو طوی
جرول
راستہ جدہ کو
جبل اذاخر
جبل الحجون ومقبرۃ المعلاۃ
ثنیۃ کداء
مقبرۃ المعلاۃ
مسجد الجن
جبل خندمہ
مساکن بنی ہاشم وشعب ابی طالب
جبل مروہ
دار ابی بکر
دار خدیجہ بنت خویلد
مولد الرسول علیہ السلام
دار ابی سفیان
مولد علی بن ابی طالب
دار عباس
دار الارقم
جبل ابو قبیس
جبل صفا
مساکن بنی مخزوم
کعبہ
دار ام ہانی
الحزورۃ (مکہ کا بازار)
جبل کعبہ
جبل قیقعان
ثنیۃ کدی
مساکن بنی جمح
مساکن بنی سہم
دار الندوہ
جبل عمر (جبل النوبی)
دار عمر بن الخطاب
باب الوداع
دار ابی بکر الصدیق
دار حمزہ بن عبد المطلب
جبل قلعہ
۴۰۰
۳۳۰
۳۰۲
۳۴۰
۳۱۰
۳۶۲
۳۲۰
۳۵۰
۳۱۲
۳۳۲
۳۲۸
۳۷۰
۳۶۸
اشارے
موجودہ سڑکیں
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے
مقامات تاریخی
پہاڑی بلندیوں کی مقدار میٹر میں سطح سمندر کی بلندی سے
حرم ترکی توسیع
حرم سعودی توسیع
شمال
مشرق
مغرب
جنوب

باب چہارم

وحی کا آغاز، بعثت اور دعوت وتبلیغ

پہلی وحی

وحی الٰہی کا آغاز اس طرح ہوا کہ جب نبوت کے آغاز کی عمر چالیس سال پر آپ پہونچے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے فرشتہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو آپ کے پاس بھیجا گیا، اس وقت آپ اپنی تنہائی کے لئے قریبی پہاڑ جبل نور کے اوپر ''غار حراء'' میں تھے، حضرت جبرئیل غار حراء میں پہونچے اور آپ کو پہلا آسمانی پیغام پہونچایا اور اس کے ذریعہ نبوت کے منصب کا آغاز ہوا، اور یہ پہلا آسمانی پیغام علم کے تذکرہ سے شروع ہوا جو ایک امی کو جو تعلیم کے رائج طریقہ سے نہیں گزرا تھا علم کو اللہ تعالیٰ کے نام سے جوڑنے کی تاکید کے ساتھ تھا، جس سے اس وقت تک اپنے کو علیحدہ رکھے ہوئے تھا، جب آپ پر وحی اتری تو ابتداءً آپ کو خوف محسوس ہوا کیونکہ وہ آسمانی بلندی وعظمت کی بنا پر اپنا خصوصی وزن رکھتی تھی، آپ کو اس کی عظمت کا بوجھ اتنا محسوس ہوا کہ خیال ہونے لگا کہ اس کو کس طرح سنبھالیں گے اور کیسے نباہ سکیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ نے جس نے اس عظیم ذمہ داری کا بوجھ ڈالا تھا جانتا تھا کہ ان کی شخصیت میں برداشت اور ہمت کی صلاحیت ایسی عطا کی جا چکی ہے کہ یہ اس بوجھ کو صرف یہی نہیں کہ اٹھا سکیں گے، بلکہ اس کا پورا حق ادا کر سکیں گے۔

رمضان میں وحی کا نزول

یہ پہلی وحی ۲۷ رمضان کو اتری جو کہ اللہ تعالی کے الفاظ میں تھی اور قرآن مجید کی سورتوں میں سے سورہ اقرأ کی پہلی آیت قرار پائی، اس وحی میں پڑھنے کا حکم تھا، اس کے ذریعہ آپ کو جبکہ آپ اس وقت تک امی تھے، یعنی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، کہا گیا کہ پڑھیئے، لیکن پڑھنے کے حکم کے ساتھ پڑھنے کو پروردگار عالم کے نام سے جوڑنے اور اس پر یقین کرنے کا بھی حکم ہوا کہ تمہارا رب بہت بہت کریم ہے، یہ بجنسہ اللہ تعالی کے الفاظ میں آنے والی پہلی وحی تھی جو بعد میں مسلسل آتی رہی، حتی کہ قرآن مجید کی پوری کتاب بن گئی، اس میں اسلام اور مسلمانوں کے حالات اور ضروریات کی باتیں اور ہدایات ہوتی تھیں، جن کے ذریعہ اسلام کی شریعت بنی، اس قرآنی وحی کے علاوہ اور طریقوں سے بھی وحی آنے لگی جو کبھی خواب کے ذریعہ (۱)، اور کبھی برگزیدہ فرشتہ حضرت جبرئیل اپنے الفاظ میں اللہ تعالی کا پیغام پہونچاتے، اور اس طرح وحی الہی کا سلسلہ جاری ہوگیا اور نبوت کے کام کی ہدایات آپ کے پاس آنے لگیں۔

حضور ﷺ کی زوجۂ مطہرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کے پاس پہلی وحی آنے کا حال اس طرح بیان کرتی ہیں کہ جب غار حراء میں عبادت اور غور وخوض میں ایک مدت گذارنے کے بعد وحی آنے کا وقت مقررہ آگیا تو آپ ﷺ کے پاس فرشتہ آیا اور اس نے کہا: پڑھیے، آپ نے کہا: میں پڑھنے کا کام نہیں جانتا، فرماتے ہیں: اس فرشتہ نے مجھکو پکڑلیا، اور زور سے بھینچا (دبایا) پھر مجھ کو چھوڑ دیا، اور کہا پڑھیے، اس پر میں نے یہی کہا کہ میں پڑھنے کا جاننے والا نہیں ہوں، فرمایا: اس نے پھر مجھ کو پکڑا اور زور سے دبایا، کہ میں بہت تھک گیا، پھر مجھ کو چھوڑا اور کہا پڑھیے

---

(۱) صحیح مسلم بشرح امام نووی، ۱۵/۳۶، کتاب الفضائل۔

میں نے کہا کہ میں پڑھنے کا جاننے والا نہیں ہوں، اس پر اس نے پھر مجھ کو پکڑا اور تیسری بار بھی زور سے دبایا پھر مجھ کو چھوڑا اور الفاظ کہے:

﴿اقرأ باسم ربك الذي خلق، خلق الإنسان من علق، اقرأ و ربك الأكرم الذي علم بالقلم، علم الإنسان ما لم يعلم﴾

[سورہ اقرأ:۱۔۵]

پڑھئے اپنے رب کے نام سے جس نے کائنات کو پیدا کیا، جس نے آدمی گوشت کے لوتھڑے سے پیدا کیا، پڑھئے آپ کا رب بہت کریم ہے، وہ جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ علم سکھایا، وہ جس نے انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو اسے معلوم نہ تھیں۔

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ ان آیات کے ساتھ جو فرشتہ نے پڑھائی تھیں لیکر گھر لوٹے، آپ پر اتنا بوجھ اور اثر ہو گیا تھا کہ دل کانپ رہا تھا، اپنی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہونچنے پر فرمایا مجھے اڑھاؤ، مجھے اڑھاؤ، تو ان کو اڑھا دیا گیا، یہاں تک آپ پر جو وحشت طاری ہوئی تھی وہ دور ہوئی، پھر آپ نے حضرت خدیجہ کو اپنا حال سنایا، اور اس واقعہ کا اور اس کے عظیم بوجھ کو محسوس کرنے کا اور اپنے خوف کا تذکرہ کیا، اور کہا کہ مجھے ڈر ہو رہا تھا کہ جان نہ چلی جائے، تو انہوں نے دل بڑھایا، اور کہا: ہرگز نہیں، خدا کی قسم ہے کہ اللہ آپ کو ہرگز رسوا نہ کرے گا، بے شک آپ کا تو حال یہ ہے کہ آپ رشتہ داروں کے جو حقوق ہیں ان کو پوری طرح ادا کرتے ہیں، اور کسی کو پریشان اور تھکا ہوا دیکھتے ہیں تو اس کا سامان اٹھا کر پہونچا دیتے ہیں اور کوئی فقر و فاقہ میں ہو تو کمائی کرا دیتے ہیں اور مہمان آجائے تو پوری خاطر کرتے ہیں، ناگہانی اور مصیبت پر مصیبت والوں کی مدد کرتے ہیں(۱)۔

ورقہ بن نوفل سے ملاقات

پھر حضرت خدیجہ آپ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل جو سابقہ آسمانی

(۱) بخاری، کتاب بدء الوحی و کتاب التفسیر، و مسلم و ترمذی و مسند احمد، تاریخ طبری: ۲/۲۹۹۔

کتابوں کا علم رکھتے تھے، کے پاس لے گئیں کہ مزید تقویت کی بات معلوم ہو، انہوں نے تصدیق کی کہ یہ نبی ہونے کی باتیں ہیں، اور آسمانی کتابوں میں ایسا واقع ہونے کا ذکر آیا ہے، یہ اسی کے مطابق معلوم ہوتی ہیں، میں اطمینان دلاتا ہوں، اور اس میں طرح طرح کی مشکلات بھی پیش آئینگی، آپ ان کو برداشت کریں، یہ اللہ تعالی کی طرف سے ہے اس کی مدد رہے گی، کاش میں جوان ہوتا، کاش میں اس وقت تک رہتا جب آپ کی قوم آپ کو یہاں سے نکالے گی، اس پر رسول اللہ ﷺ نے کہا: کیا مجھ کو وہ لوگ نکالیں گے، انہوں نے کہا ہاں، جب بھی کوئی اس طرح کا کام لیکر آیا جیسا کی آپ کے سپرد ہوا، اس کے ساتھ دشمنی کی گئی، اور اگر وہ وقت میرے سامنے آیا تو میں آپ کی پوری اور مضبوط طریقہ سے مدد کروں گا، اس کے بعد کچھ دنوں میں ورقہ کا انتقال ہو گیا(۱)۔

حضور ﷺ جو پڑھنے لکھنے سے ناواقف رہے تھے اس لئے ان کی معلومات کتابی نہیں تھیں کہ وہ جان سکتے کہ آپ سے پہلے آنے والے انبیاء پر جو صحیفے نازل ہوئے ان میں کیا لکھا ہے اور آپ کے بارے میں کیا پیشن گوئی ہے، اس لئے آپ کو وحی آنے پر ایک طرح سے بالکل نئی بات معلوم ہوئی، حالانکہ آپ کے زمانہ میں یہودی اور عیسائی علماء تھے، ان کو آپ کے آنے کے اشارے معلوم تھے، انہی اشاروں کو ورقہ بن نوفل جانتے تھے جو کہ انہوں نے آپ کو بتایا، آپ سے پہلے کی مقدس کتابوں میں جو اشارے آئے ان میں سے بعض حسب ذیل ہیں۔

انجیل وتوریت میں حضور ﷺ کی نبوت کی بشارت

انجیل یوحنا باب ۱۴ میں ایک آنے والے نبی کی بشارت ان الفاظ میں ہے۔

''اور میں اپنے باپ سے درخواست کروں گا اور وہ تمہیں دوسرا ''فارقلیط''

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/ ۲۳۸، صحیح بخاری، باب بدء الوحی، صحیح مسلم کتاب الایمان، باب بدء الوحی۔

بخشے گا کہ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے''۔(۱۶:۱۴)

آگے بڑھکر پھر ہے۔

''لیکن وہ ''فارقلیط'' جوروح القدس ہے جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا اورسب باتیں جو کچھ کہ میں نے کہی ہیں تمہیں یاددلائے گا''۔(۲۶:۱۴)

اسی انجیل کے باب ۱۵۔۱۶ میں ہے۔

''پر جب وہ ''فارقلیط'' جسے میں تمہارے لئے باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی سچائی کی روح جو باپ سے نکلتی ہے تو وہ میرے لئے گواہی دے گا''۔

اسی انجیل کے باب ۱۶۔۷ میں ہے۔

''لیکن میں تمہیں سچ کہتا ہوں کہ تمہارے لئے میرا جانا ہی فائدہ ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو ''فارقلیط'' تمہارے پاس نہ آئے گا، پر اگر میں جاؤں تو میں اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا اور وہ آکر دنیا کو گناہ سے اور راستی سے اور عدالت سے قصور وار ٹھہرائے گا، گناہ کے بارے میں اس لئے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے، راست بازی کے بارے میں اس لئے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں اور تم مجھے پھر نہیں دیکھوگے، عدالت کے بارے میں اس لئے کہ دنیا کا سردار مجرم ٹھہرایا گیا ہے، میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں کہوں پر اب تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے، لیکن جب وہ سچائی کی روح آئیگی تو وہ تمہیں ساری سچائی کی بات بتائے گی، اس لئے کہ وہ اپنی نہ کہے گی، لیکن جو کچھ وہ سنے گی سو کہے گی اور تمہیں آئندہ کی خبر دے گی وہ میری بزرگی کرے گی (۱)۔

---

(۱) خطبات احمدیہ، خطبۂ بشارت محمدی، منقول از گاڈفری ہیگنس، بحوالہ سیرت النبی، ۴۳۲/۳-۴۳۳۔

اس کی تائید قرآن مجید کی حسب ذیل آیات میں اس طرح ملتی ہے:۔

﴿الـذيـن يتبعـون الـرسـول النبي الأمـي الـذي يـجـدونـه مـكتوبـاً عـنـدهـم فـي التـوراة والإنـجيل يـأمـرهـم بـالمعروف وينهاهم عن المنكر ويحل لهم الطيبات ويحرم عـليهـم الـخبـائـث ويـضع عنهم إصـرهـم والأغـلال التـي كـانـت عـليهـم فـالـذيـن آمنوا به وعزروه ونـصـروه واتبـعوا النور الذي أنزل معه أولئك هـم المفلحون﴾

[سورہ اعراف:۱۵۷]

جو لوگ اس امی رسول و نبی کی پیروی کرتے ہیں جسے وہ اپنے ہاں لکھا ہوا پاتے ہیں توریت اور انجیل میں، انھیں وہ نیک کرداری کا حکم دیتا ہے اور انھیں بدکرداری سے روکتا ہے، اور ان کے لئے پاکیزہ چیزیں حلال بتاتا ہے، اور ان پر گندی چیزیں حرام رکھتا ہے، اور ان پر سے بوجھ اور قیدیں جو ان پر اب تک تھیں اتار دیتا ہے، سو جو لوگ اس نبی پر ایمان لائے اور اس کا ساتھ دیا اور اس کی مدد کی، اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتارا گیا ہے سو یہی لوگ تو ہیں پوری فلاح پانے والے۔

قرآن مجید میں دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

﴿وإذ قـال عيسىٰ ابـن مـريم يٰبني إسـرائيـل إنـي رسـول اللّٰـه إليكم مـصـدقـاً لـمـا بين يدي من التوراة ومبشـراً بـرسـول يـأتـي من بعدي اسمه أحمد﴾ (سوره صف:٦)

اور جب عیسیٰ بن مریم نے کہا کہ اے بنی اسرائیل! میں تمہارے پاس خدا کا قاصد بن کر، اور مجھ سے پہلے جو توراۃ آئی، میں اس کی تصدیق کرتا ہوں اور اپنے بعد احمد نام ایک پیغمبر کی خوشخبری لے کر آیا ہوں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس آنے والے پیغمبر کی جو صفتیں گنائی ہیں وہ حرف بحرف آنحضرت ﷺ پر صادق آئی ہیں"(۱)۔

---

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں: سیرت النبی، از علامہ سید سلیمان ندوی، ص:۴۳۳، جلد سوم۔

تاریخ وسیر اور مستند کتب احادیث میں متعدد روایتیں ایسی ہیں جن سے مجموعی طور سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے پہلے مدینہ کے یہودیوں میں بھی ایک آنے والے پیغمبر کے جلد ظاہر ہونے کے چرچے رہا کرتے تھے اوران ہی سے سُن سُن کر اوسؔ وخزرجؔ کے کانوں میں پیغمبر کی بعثت کی خبر پڑی ہوئی تھی اور اکثروں کے لئے یہ خبر ہدایت کا باعث بنی، چنانچہ ابن سعد کے علاوہ دیگر کتب تاریخ وسیر اور حدیث میں ایک نوجوان انصاری کا واقعہ بسند صحیح مذکور ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں چھوٹا تھا تو مدینہ میں ایک یہودی واعظ تھے، اثنائے وعظ میں انہوں نے ایک پیغمبر کے ظہور کی بشارت دی، لوگوں نے پوچھا کہ وہ کب تک ظاہر ہوگا؟ انہوں نے ان انصاری کی طرف جو اس مجمع میں سب سے چھوٹے تھے، اشارہ کرکے کہا کہ اگر یہ لڑکا جیتا رہا تو وہ اس کا زمانہ پائے گا، انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ ایک یہودی کا لڑکا آپؐ کی خدمت میں رہا کرتا تھا، اتفاق سے وہ بیمار پڑا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی عیادت کو گئے اور اس کے باپ سے پوچھا کہ کیا میرا ذکر تم توراۃ میں پاتے ہو؟ اس نے کہا نہیں۔ لڑکے نے فوراً جواب دیا ہاں یارسول اللہ! آپؐ کا ذکر ہم نے توراۃ میں پڑھا ہے۔ اور یہ کہہ کر اس نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہوگیا (۱)۔

عربوں اور یہودیوں میں جب لڑائی ہوتی تو یہودی کہا کرتے تھے کہ ایک پیغمبر آنے والے ہیں، ان کے عہد میں ہم کو کامل فتح ہوگی، قرآن مجید نے ان کے اسی عقیدہ کو دہرا کران کے عدمِ اسلام پر ملامت کی ہے:

﴿وکانوا من قبل یستفتحون علی الذین کفروا فلما جآء ھم ما عرفوا کفروا به فلعنة الله علی الکفرین﴾ (سورة بقرہ:۱۱)	اس سے پہلے کافروں پر اسی آنے والے پیغمبر کا نام لے کر فتح چاہا کرتے تھے، پس جب وہ سامنے آگئے جس کو انہوں نے پہچان لیا تو انکار کردیا، کافروں پر خدا کی لعنت ہو۔

---

(۱) بیہقی باسناد صحیح۔

قرآن مجید نے اس کے علاوہ اور بھی متعدد مقامات پر یہودیوں کو ان کے اس سابق یقین کے خلاف ان کے موجودہ اظہارِ کفر پر ان کی سرزنش کی ہے۔

﴿وإن الذين أوتوا الكتب ليعلمون أنه الحق من ربهم﴾ (سورہ بقرہ: ١٠)

جن کو کتاب پہلے دی جاچکی ہے وہ یقیناً (ان نشانیوں کی بنا پر جو اس کتاب میں مذکور ہیں) جانتے ہیں کہ یہ حق ہے ان کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

﴿الذين آتينٰهم الكتب يعرفونه كما يعرفون أبناء هم وإن فريقاً منهم ليكتمون الحق وهم يعلمون﴾ (سورہ بقرہ: ۱۷)

جن کو ہم پہلے کتاب دے چکے ہیں وہ اسلام کی صداقت کو اسی طرح جانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں لیکن ان میں سے ایک فریق جان کر حق کو چھپاتا ہے۔

﴿الذين آتينٰهم الكتب يعرفونه كما يعرفون أبناء هم﴾۔ (سورہ انعام:۲)

جن کو ہم پہلے کتاب دے چکے ہیں وہ اس کو اسی طرح جانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو(۱)

ویدوں میں حضرت محمد ﷺ کی صفات سے متعلق پیشین گوئیاں

آپ ﷺ کی صفات کا تذکرہ ہندو قوم کی مذہبی کتاب ویدوں میں بھی آیا ہے جو اس طرح ہے:

۱۔ محمد (نراشنس) کی حمد کی جائے گی اور وہ سب کو محبوب ہوگا۔ (رگ وید:۱۔۱۳۔۳)

۲۔ محمد (نراشنس) سواری کی شکل میں اونٹوں کا استعمال کرے گا۔ (اتھر وید۲۔۱۲۷۔۲۰)

(۱) سیرت النبی از سید سلیمان ندوی، جلد سوم

۳۔ محمد (نراشنس) کو علم الٰہی دیا جائے گا۔ (رگ وید سنہتا ۳۔۱۳۔۱)
۴۔ محمد (نراشنس) بہت خوبصورت اور علم کے داعی ہوں گے۔ (رگ وید ۲۔۳۔۲)
۵۔ محمد (نراشنس) لوگوں کو گناہوں سے نکالے گا۔ (رگ وید ۴۔۱۰۶۔۱)
۶۔ محمد (نراشنس) کا ایک دنیاوی نام محمد ہوگا۔ (اتھر وید ۳۔۱۲۷۔۲۰)
۷۔ محمد (نراشنس) ۱۰ مالاؤں والا ہوگا۔ (اتھر وید ۳۔۱۲۷۔۲۰)
۸۔ محمد (نراشنس) ۱۰ ہزار گوؤں والا ہوگا۔ (اتھر وید ۳۔۱۲۷۔۲۰)
۹۔ محمد (نراشنس) کی تعریف کی جائے گی۔ (رگ وید ۳۔۱۳۔۱)
۱۰۔ معاشرے میں انقلاب لائیں گے اور برائیوں کو ختم کریں گے۔ (بھگوت پران ۱۲، اسکند، ۱۲ دھیائے ۲۰ شلوک)
۱۱۔ جب کلکی کے جسم سے خوشبو لوگوں کو چھوئے گی تو ان کا قلب گناہ سے پاک ہو جائے گا۔ (بھگو پران ۱۲ اسکند ۱۲ دھیائے ۲۱ واں شلوک)
۱۲۔ آخری نبی کو ''جگت گرو'' رہبر عالم بنا کر بھیجا جائے گا (۱)۔

جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے واقف ہیں وہ پوری طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اوپر دی گئی تمام خصوصیات حضرت محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی صرف مکمل طور سے ثابت ہوتی ہیں۔

شریعت محمدی کا علم وقلم سے گہرا واسطہ

آپ ﷺ پر اترنے والی پہلی وحی کا آغاز جو اقرأ باسم ربک سے ہوا تھا، اس میں واضح اشارہ کیا گیا تھا کہ دین حق کی تعلیم وتشریح جو اس نبی آخر الزماں کے ذریعہ کی جا رہی ہے، یہ علم وقلم سے گہرا واسطہ رکھتی ہے، اب تک علم وقلم کو انسان نفس پرستی، احساس تکبر کی تکمیل، اظہار عظمت، اپنی معلومات کو دنیاوی خواہشات کے لئے، کمزور

---

(۱) حضرت محمد ﷺ کا ذکر اور مورتی پوجا کی ممانعت ویدوں کی دنیا میں، ص: ۲۵-۲۷، از: مفتی محمد سرور فاروقی ندوی

انسانوں کو غلام بنانے اور اپنی شان دکھانے کے لئے کرتا رہا ہے، اس کو اب انسانوں کی اصلاح اور ارشادات الٰہی پر عمل کرنے اور اصلاح ورشد وہدایت کا جو کام انسان کو اس کے رب نے خلیفۃ اللہ فی الأرض کی حیثیت سے دیا ہے، جس کا بڑا ذریعہ علم وقلم ہے، اسی قلم اور علم سے اس کو اپنے نبی کے ذریعہ ملنے والی رہنمائی میں انجام دینا ہے، اس طرح اس ذات نبوی کو جو اُمی تھا یعنی پڑھنا لکھنا نہ جاننے والے جو صرف فطری اور حسی طریقہ سے حاصل ہونے والی ہی معلومات رکھتے تھے، اپنی ہی طرح کی اُمی قوم کے لئے ہی نہیں بلکہ تمام انسانوں کے تعلیم یافتہ بلکہ بڑے بڑے ماہرین علم کے بھی معلم اور آسمانی تعلیمات کے تنہا پہونچانے والے اور انسانوں کی مکمل مذہبی رہبری کرنے والے تھے، اور اس طرح اس نبی امی پر جو وحی نازل ہوتی رہی خواہ متلو ہو یعنی قرآن مجید والی، یا غیر متلو یعنی خود آپ کی زبان سے ادا ہونے والی یعنی حدیث شریف والی، انسانیت کے خیر وفلاح والے علوم کا سرچشمہ بنی، اور اس طرح یہ وحی حق وہدایت کے حاملین کے لئے علمی تحقیق، علمی کدوکاوش اور تحقیق وترقی کا مہمیز بھی بنی، اور وحی کی ان دو ہدایتوں یعنی ''اقرأ'' اور ''علم الإنسان ما لم یعلم'' (انسان کو وہ سکھایا و بتایا جس سے وہ ناواقف تھا) کے اثر سے انسانیت کیلئے علم کے وہ سرچشمے پھوٹے جن کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی، اور سابقہ علم کا جو سرمایہ تھا اس پر اکتفا نہیں کی گئی، بلکہ اس میں بیش بہا اضافوں کے ساتھ ساتھ قیمتی علوم پیدا ہوئے جو پہلے نہیں تھے، اور ان نئے علوم میں وہ باریکیاں اور گہرائیاں پیدا ہوئیں کہ انسانیت کے لئے طرۂ امتیاز بنیں، قرآن کریم کے تعلق سے نئے علوم اور حدیث شریف کے تعلق سے مزید اور متنوع علوم اور دیگر نئے علوم وجود میں آئے اور ان کے کتب خانے کے کتب خانے تیار ہو گئے، اور اس طرح اس نبی آخر الزماں کی امت علم ودانش کی اور اسی کے ساتھ ساتھ فلاح انسانیت کے لئے رہنمائی کرنے والے علم کی امت بن گئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی اس پہلی وحی نے اپنے ماننے والوں کو علم ودانش کا وہ عظیم راستہ بتادیا جو انسانیت کی فلاح کی ضمانت بنا، اس میں اقرأ کے ساتھ باسم ربک (پڑھ اپنے رب کے نام سے) کے اضافہ سے بڑی بنیادی حقیقت واضح کردی گئی کہ اس میں انسان کے پڑھنے کو انسان کے خالق کے نام سے جوڑا گیا، یعنی انسان اپنے غوروفکر اور بحث وتحقیق سے جو علم حاصل کرے اس کو اپنے خالق ومالک سے وابستہ کرکے حاصل کرے، تاکہ وہ غلط راہ پر نہ چلا جائے کیونکہ وہ خواہش اور پسند وناپسند رکھنے والا یعنی انسان ہے، غلطی کرسکتا ہے اور غلط رخ پر جاسکتا ہے، جب وہ اپنے علم کو اپنے رب کے ساتھ وابستہ کرے گا تو بھٹکنے سے محفوظ رہے گا، مزید یہ کہ اس کو علم کے وہ حقائق بھی معلوم ہوں گے جو صرف اس کا رب ہی جانتا ہے اور بتاسکتا ہے، اور جو بغیر اس کے بتائے معلوم نہیں ہوسکتے، اور وہ صرف وحی الٰہی کے ذریعہ ہی معلوم ہوسکتے ہیں، پھر علم کا وسیلہ قلم کو بنایا کہ اسی کے ذریعہ علم کو محفوظ کیا جاسکے گا، اور رہتی دنیا تک اس کا فائدہ قائم رکھا جاسکے گا۔ اس طرح علم کی دو شاخیں ہوئیں، ایک وہ جو محض دنیاوی تقاضوں اور ضرورتوں سے تعلق رکھتی ہے، اور ان کی فکر کرنے کی بھی اجازت پروردگار عالم نے دی ہے، اور دوسری اس زندگی کے بعد جو آخرت کی طویل زندگی ہے جو دنیاوی زندگی میں مخفی شکل میں ہے، اس کے متعلق رہنمائی کرنے والا علم ہے، دنیاوی زندگی کے جسمانی فائدہ ونقصان کے علم کی رہبری کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کی عقل اور اس کے تجربوں کو ذریعہ بنایا ہے، اور آخرت سے متعلق رہبری کے لئے جو کہ اس دنیاوی زندگی میں نظر نہیں آتی اس کا علم انسان کے خالق کے بتانے ہی سے حاصل ہوسکتا ہے، جس کو انسان کا خالق اپنے برگزیدہ بندہ یعنی نبی کے ذریعہ اس کو اس سے واقف کراتا ہے، اور اب رہتی دنیا تک اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری برگزیدہ بندہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ بتایا اور ان کو اللہ تعالیٰ نے

وسیع اور جامع اور نہ بدلنے والے علم کے بتانے اور سمجھانے کے لئے مقرر کیا، جس میں انسان کے لئے اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی فلاح ہے۔

اس علم کی تفصیلات سے اللہ تعالی نے اپنی کتاب قرآن مجید کے ذریعہ اور پھر اپنے نبی کو وحی کے ذریعہ سے واقف کرایا، اور اس سے واقف ہو جانے کے بعد انسان اس کو ماننے اور اور اس پر عمل کرنے پر مامور قرار دیا گیا ہے، اور اس کا قیامت تک جاری رہنا طے کر دیا، اور اس کے نہ ماننے پر اپنے خالق و مالک اللہ تعالی کی طرف سے سخت سزا کا مستحق قرار دیا، چنانچہ اس صورت حال میں نبی کے لائے ہوئے علم سے واقعی ضرورت تک واقف ہونا ضروری قرار دیا گیا، اور اسی حکم کا نام شریعت ہے، ایسے علم سے نبیوں کے ذریعہ زمین پر بسنے والوں کو واقف کرایا جاتا رہا ہے، لیکن نبیوں اور رسولوں کے دائرے علاقائی ہوتے تھے، اور ایک رسول دوسرے رسول کی مدت تک کے لئے ہوتا تھا۔ لیکن یہ آخری رسول دنیا کی معینہ مدت کے لئے اور جامع علم مقرر کیا گیا۔

ہمہ گیر اور ابدی شریعت

چنانچہ جو شریعت آپ ﷺ کو دی گئی وہ آخری زمانہ تک جاری رہنے والی شریعت قرار دی گئی ہے، اور عالمی سطح پر ہر علاقہ، ہر ملک کے لوگوں کے لئے یکساں رکھی گئی ہے، اسی بنا پر آپ ﷺ کو خاتم الأنبیاء والرسل قرار دیا گیا، اور آپ ﷺ کی شریعت کو ایسی مکمل شریعت بنایا گیا ہے جس میں اب کوئی ترمیم نہیں ہونا ہے، اور شریعت الٰہی کی حفاظت و بقا اسی شریعت میں رکھی گئی ہے، اس لئے اس سے واقف ہونا اور اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالنا لازم قرار دیا گیا ہے، جو شریعت آپ کو دی گئی وہ بنیادی طور پر سابقہ انبیاء کو دی گئی شریعت ہی کی طرح ہے، اس طرح وہ کوئی نئی شریعت نہیں ہے، بلکہ وہ سابقہ انبیاء کو دی گئی شریعت کے تسلسل سے جڑی ہوئی ہے،

البتہ ان کی شریعت اپنے اپنے زمانوں کے لئے اور اپنی اپنی قوموں کے لئے ہوتی رہی ہے اور آخری نبی محمد رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت مکمل اور سارے انسانوں، زمانوں اور آئندہ آنے والے انسانوں کے حالات کے لحاظ سے جامع اور تا قیامت باقی رہنے والی شریعت ہے۔

شریعت محمدی کے بنیادی ارکان

تمام انبیائے سابقین اور آخری نبی محمد ﷺ کو دی گئی شریعت میں مشترک اور مرکزی نقطہ توحید کا نقطہ ہے، اس کی رو سے تنہا اللہ تعالیٰ کو انسانوں اور دیگر تمام مخلوقات کا خالق و مالک ورازق اور یہ آسمان وزمین اور ساری کائنات کو پیدا کرنے والا اور چلانے والا ماننا ہے، اس پر ایمان لانا اور اس کی پرستش کو اسی کے ساتھ مخصوص کرنا لازمی ہے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، کسی اور کو خدا سمجھنا، یہ اس خدائے مالک ورازق کے خلاف بلکہ اس کو ناراض کرنے والا عمل ہے، کسی ذات کو خواہ انسانی ہو یا کسی دوسرے مخلوق سے تعلق رکھتی ہو، خدائے واحد کے ساتھ شریک کرنے کی اجازت نہیں ہے، یہی وہ مقام توحید ہے جس کی دعوت ہر نبی نے دی، اور اس کا پیغام اس کی نازل کی ہوئی تمام کتابوں اور وحی کے ذریعہ نبیوں کو دیا گیا، توریت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر، زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر، انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اور قرآن محمد ﷺ پر اتارا گیا۔

۲۔ پھر اللہ تعالیٰ کے ان ہی حکموں کو ماننے کے لئے اس کے بتانے والے لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ نبی ہوتے رہے، ان کا قول وعمل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہوتا رہا ہے، لہذا اس کو ماننا بھی لازمی ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ بتائی ہوئی بات رب العالمین کی بتائی ہوئی بات ہوتی ہے اور وہ خدائی پیغام (رسالت) ہوتا ہے، اس کو ہر نبی اپنے رب کی طرف سے پہونچاتا ہے، وہ کہتا ہے کہ میں اللہ

کا بھیجا ہوا پیغامبر ہوں اور میری بات اللہ کی طرف سے ہے، اس کو مانو، لہذا نبی اور اس کی بات کو ماننا دوسرا بنیادی نقطہ ہے۔

۳۔اس کے بعد تیسرا بنیادی نقطہ آخرت کا نقطہ ہے کہ اس دنیاوی زندگی کے بعد دوسری دائمی اور ابدی زندگی آخرت کی زندگی ہوگی، جس میں ہر انسان کو جانا ہے، اس میں انسان کو وہاں جو راحت یا سہولت حاصل ہوگی، وہ صرف اسی قدر ہوگی جس قدر اپنے نبی کی بات مانی ہوگی۔

۴۔ان تین بنیادی باتوں کے بعد اس بات کے بھی ماننے کی ضررت ہوتی ہے کہ اللہ تعالی کی ایک مخلوق فرشتے بھی ہیں اور وہ آسمانی مخلوق ہیں جو انسانی آنکھوں سے نظر نہیں آتے، وہ عام طور پر اپنی نہ دیکھی جانے والی شکل میں آتے اور اپنے پروردگار کا پیغام نبیوں تک پہونچاتے ہیں، وہ اللہ تعالی کے مکمل تابعدار بندے ہوتے ہیں اور اپنے پروردگار کی عین مرضی کے مطابق کام کرتے ہیں، اور ہر وقت رب العالمین کی تسبیح وعبادت میں رہتے ہیں۔

۵۔اسی طرح یہ بات بھی ماننا ہے کہ ساری مخلوقات اور سارے عالموں کو تنہا اس ایک خدا ہی نے پیدا کیا ہے، اور ان کو یونہی بے سمجھے بوجھے پیدا نہیں کیا، بلکہ ان کے پیدا کرنے کا مقصد اور پیدا کئے جانے کے بعد ان کی زندگی کی تفصیل پہلے سے طے کر دی تھی، لہذا جو کچھ ہوتا ہے اسی کے مطابق ہوتا ہے، اچھا ہو یا برا، اور اسی کو تقدیر کہتے ہیں، اور دنیا کی اس زندگی کے بعد آخرت کی نہ ختم ہونے والی زندگی ہوگی جس میں دنیا والی زندگی کے اعمال کا حساب وکتاب، جزا وسزا ہوگی، یہ دین کی وہ بنیادیں ہیں جن کو ماننے کے بعد ان کے مطابق عمل کرنے کے جو احکام وہدایات ہیں ان کو شریعت کہتے ہیں اور اسی کو رب العالمین کی طرف سے طے کردہ دین بلکہ دین اسلام کہتے ہیں، فرمایا: ﴿إن الدين عند الله الإسلام﴾ کہ دین اللہ تعالی کی طرف

سے اسلام ہی ہے۔

مذکورہ بالا باتوں کے ماننے کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: "آمنت باللّٰہ وملائکتہ و کتبہ ورسلہ والیوم الآخر والقدرخیرہ وشرہ من اللّٰہ تعالی والبعث بعد الموت" (میں ایمان لایا اللہ پر، اوراس کے فرشتوں پر، اوراس کی کتابوں پر، اوراس کے رسولوں پر، آخرت کے دن پر، اوراس بات پر کہ جو کچھ اچھا برا ہوتا ہے وہ سب اللہ کے حکم اور تقدیر سے ہے اور میں ایمان لایا مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے پر)۔

ان بنیادی باتوں کو ماننے کے بعد ان سب پر عمل کرنے کا معاملہ آتا ہے، جس کو شریعت کہتے ہیں اس میں زندگی کے طور طریق کو خدا کے حکموں کے مطابق انجام دینے کی ہدایات اور تعلیمات ہوتی ہیں جو نبی کو وحی کے ذریعہ دی جاتی ہیں، ہر نبی انسانوں کو اپنے پروردگار کی مرضی کے مطابق زندگی گذارنے، ایک دوسرے کے ساتھ سلوک و معاملات، خدا کی طرف سے دی گئی نعمتوں کے حصول واستعمال کا طریقہ اور خدا کے حکموں پر چلنے کا طریقہ بتلاتا ہے، اور نبی کو یہ ساری تعلیمات وحی کے ذریعہ دی جاتی ہیں، اس طریقہ سے حضور ﷺ پر مکمل کیا جانے والا دین علم وعمل دونوں پر مشتمل ہے۔

ساری انسانیت کے لئے پیغام توحید

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے تقریباً ڈھائی تین ہزار سال قبل آپ کے ہی خاندان کے بہت بڑے اور اہم مورث اور اللہ تعالی کے برگزیدہ نبی حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والتسلیم نے زبردست قربانی دیکر توحید کی عالمی تحریک کی بنیاد ڈالی تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فطرت سلیمہ نے بچپن ہی سے توحید کو سمجھ لیا تھا، اور شرک کو ترک کر کے توحید کی دعوت شروع کردی تھی، ان کا واقعہ خود قرآن

مجید میں بیان کیا گیا ہے:

﴿ولقد آتينا إبراهيم رشده من قبل وكنا به عالمين،إذ قال لأبيه وقومه ما هذه التماثيل التي أنتم لها عاكفون، قالوا وجدنا آباء نا لها عابدين، قال لقد كنتم أنتم وآباؤكم في ضلال مبين﴾

[سورہ انبیاء:۵۱۔۵۴]

اور ہم نے ابراہیم کو پہلے ہی سے ہدایت دی تھی، اور ہم ان (کے حال) سے واقف تھے، جب انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ یہ کیا مورتیں ہیں، جن کی پرستش پر تم معتکف (وقائم) ہو، وہ کہنے لگے کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی پرستش کرتے دیکھا ہے، (ابراہیم نے) کہا کہ تم بھی گمراہ ہو اور تمہارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں پڑے رہے)

پھر ایسی برکت ہوئی کہ اللہ تعالی کے بکثرت نبی ان کے بیٹے حضرت اسحاق کی اولاد میں ہوتے رہے، اور اس پیغام کو آگے بڑھاتے رہے، ان کی اسی خصوصیت کی بنا پر اللہ تعالی نے ان کی شاخ کو بڑا مرتبہ عطا فرمایا، لیکن پھر حضرت اسحاق علیہ السلام کی یہ شاخ جو بنی اسرائیل کے نام سے موسوم رہی، بتدریج راہ مستقیم سے ہٹتی چلی گئی۔

پھر آخر میں اللہ تعالی نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں محمد رسول اللہ ﷺ کو عالمی نبی بنا کر مبعوث کیا اور ان کو تاکید کی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کا راستہ تمہارا راستہ ہے، جن کی اولاد میں اللہ تعالی نے نبی بھیجے اور وہ سب اپنے اپنے زمانہ میں توحید کی دعوت دی اور اللہ تعالی کے حکموں پر عمل کرنے کی دعوت دیتے رہے تھے جیسا کہ حضرت ابراہیم نے ان کو تاکید و تلقین کی تھی، قرآن مجید میں ہے:

﴿ووصى بها إبراهيم بنيه ويعقوب، يبني إن الله اصطفى لكم الدين فلا تموتن إلا وأنتم مسلمون ﴾۔

[سورہ بقرہ:۱۳۲]۔

اور ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اسی بات کی وصیت کی اور یعقوب نے بھی (اپنے فرزندوں سے یہی کہا کہ) بیٹو! خدا نے تمہارے لئے یہی دین پسند فرمایا ہے تو مرنا تو مسلمان ہی مرنا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوری طاقت اورزور اسی دعوت پراور اس کے مطابق عمل کرنے میں صرف کردیا تھااور بڑی تکلیفیں اورقربانیاں برداشت کرنے کے ساتھ مکہ معظّمہ کے مقام پر بیت اللہ شریف کی پہلے سے طے کردہ جگہ پر خانۂ خدا کی تعمیرنو کی، تاکہ وہاں سے توحید کا پرچم بلند ہو، وہاں انہوں نے اپنے شیرخوار پہلے بچہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کوان کی ماں کے ساتھ بسایا، ان کا یہی بچہ حضرت اسماعیل یہاں توحید کی اشاعت کا ذریعہ بنا، اوراس کی اولاد سب سے کٹ کرایک اللہ کی عبادت پر قائم رہی ان کا عہد و پیمان تھا کہ لوگوں کوتوحید کی دعوت دیں گے اور حق بات کی تلقین کریں گے، یہ سلسلہ قائم تھا کہ وہاں کا ایک شخص عراق اور شام کے سفر میں بتوں کی عبادت دیکھ کرمتاثر ہوااور بت یہاں لے آیا، اس کے اثر سے بت پرستی کا عمل دخل شروع ہوگیا، بالآخر پھراسی خاندان کے ایک فرد فرید کواللہ تعالیٰ نے دعوت ابراہیمی تازہ کرنے اوراسی فکروعقیدہ پردنیا کولانے کے لئے انتخاب کیا، انہی پرنبوت کومکمل کیا، اوران کے ماننے والوں کو یہ کام سپرد کیا کہ وہ نسلاً بعدنسل اس مشن کوفروغ دیں، کہ صرف خدائے واحد کی عبادت کا پابند بنائیں اوراپنے خیالی اور ہاتھ سے بنائے ہوئے خداؤں کو باطل سمجھیں، اوراس بات پریقین کوعام کریں کہ تمام دنیاؤں کا کام کاج صرف ایک اللہ کے ہاتھ میں ہے، اسی نے سب کو پیدا کیا، اور پیدا کر کے یونہی چھوڑنہیں دیا، بلکہ اپنی عبادت واطاعت کی پابندی کا حکم دیا، کہ ساری مخلوق کواسی کے حکموں پر چلنا ہے، جوبھی اس کے حکموں سے منہ موڑے گا اسے دوسری آنے والی زندگی میں جواب دہ ہونا پڑے گااورسزاپائے گا۔

محمد ﷺ کی بعثت سے پہلے مکہ والے توحید کے معاملہ میں اپنے راستہ سے بہت بھٹک گئے تھے، جس کی اصلاح کی شدید ضرورت تھی اس ضرورت کواللہ نے حضرت محمد ﷺ کو نبی بنا کر پورا کیا، مکہ والوں کے مورث اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ

السلام نے اللہ سے پہلے ہی یہ دعا کرلی تھی کہ ان لوگوں کی اصلاح وتزکیہ اور تعلیم کے لیے انہی میں سے نبی بھیجئے، اللہ نے ان کی دعاء قبول کرلی تھی، پھر ایک طویل مدت کا موقع دیکر انہی کی اولاد میں سے محمد ﷺ کو منتخب کیا اور یہ اعلان بھی کردیا کہ اب ان کے بعد کوئی دوسرا نبی کسی بھی جگہ اور کبھی بھی نہیں آئے گا، یہی آخری نبی ہیں جو سب کے لیے ہیں اور سارے زمانوں کے لیے ہیں، اس طرح حضرت محمد ﷺ کو ملی ہوئی نبوت ان کے جداعلی حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی نبوت کا ایک طرح کا تسلسل تھی، اور دونوں ایک ہی راہ کے راہرو تھے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جو اپنے نبی پر نازل فرمائی حالات اور ضرورت کے مطابق بتدریج آپ کو اپنے فرشتہ کے ذریعہ آیات پہونچائیں اور ایمان وعمل صالح کے لئے رہنمائی کے ساتھ ساتھ بڑے اچھے اور موثر انداز میں سابقہ قوموں اور نبیوں کے ایسے حالات بھی بیان کئے جن سے معلوم ہو کہ شرک اور گناہوں پر عمل کرتے رہنے پر کس کس طرح اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا۔

لہذا اگر اسی طرح کے حالات مکہ والے عربوں اور ان کا ساتھ دینے والے عرب قبائل میں ہونگے تو ان پر بھی اللہ تعالیٰ کا غضب بصورت عذاب نازل ہوسکتا ہے، لہذا یہ لوگ ان واقعات سے سبق لیں اور سمجھیں کہ سابقہ قوموں کی نافرمانی اور بد دینی پر کیسی سخت سزائیں دی گئیں، لہذا نبی کی بات مانیں اور راہ حق پر آجائیں اور نبی کی رہنمائی میں اپنے کو درست کریں، جن کی سیرت اور اخلاق کی خوبی سے وہ پہلے ہی سے واقف ہیں۔

قرآن مجید

اللہ کی یہ کتاب قرآن مجید جس میں گزشتہ قوموں کے حالات اور توحید

وشرک کا فرق اور نیکی اور بدی کا انجام موثر طریقہ سے بتایا گیا، عربوں کی ایسی فصیح زبان پر اُتاری گئی کہ جس کو سُن کر عرب یہ یقین کرنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جبکہ امی ہیں خود سے ایسی معلومات نہیں بیان کر سکتے، پھر اس میں ایسی فصاحت وبلاغت اور طاقت ہے جو انسانوں کے بس کی نہیں، یہ ضرور اوپر سے رب العالمین کی طرف سے بھیجی گئی ہے، اس طرح یہ کتاب انسانی طاقت سے باہر ہونے کی وجہ سے ایک معجزہ بنی، یہ معجزہ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا، جس سے لوگوں کو یہ باور کرایا جا سکے کہ آپ جو کہہ رہے ہیں وہ آپ کی طاقت اور صلاحیت سے آگے کی بات ہے، اور یہ آسمان کی طرف سے پیغام آنے کی کھلی دلیل ہے، چنانچہ ثابت ہوا کہ یہ اللہ کی طرف سے وحی ہے، اور اس کی ہر آیت اللہ کی ایک نشانی ہے، اور معجزہ ہے، اور واقعات سے بھی یہی ثابت ہوا کیونکہ جس نے بھی غیر جانبدار ہو کر اس کو سنا وہ متأثر ہو کر ایمان لے آیا، اس طرح بڑی تعداد ایمان لانے والوں کی ایسی تھی جو کلام الٰہی کو سن کر ایمان لائی۔

باطل عقیدوں کی اصلاح کی دعوت

مکہ مکرمہ پورے عرب خطہ کا مرکزی مقدس مقام تھا، اس لیے یہاں کے لوگوں کو دین حق اختیار کرنے کی دعوت دینا زیادہ ضروری اور اہمیت کا کام تھا کہ یہاں جو ہوگا اس کا اثر پورے عرب پر پڑیگا، اس لیے آپ برابر اپنے کام میں لگے رہے، اور جہاں تک قابل عمل تھا اپنی بات لوگوں کے سامنے رکھتے رہے، کہ خدائے واحد پر ایمان لاؤ، بتوں کی عبادت کو چھوڑو، تم کو یہ بت اور مورتیاں کچھ بھی فائدہ نہیں پہونچا سکتیں اور اللہ کے بھیجے ہوئے نبی کو مانو، یہ اللہ کے آخری نبی ہیں، اب کوئی دوسرا نبی نہیں آئے گا، اور اس حقیقت کو بھی تسلیم کرو کہ اس موجودہ زندگی کے بعد کی بھی ایک زندگی ہے، وہ آخرت کی زندگی ہے، اس کے لیے تیاری کرو، دنیا کی زندگی

تو آخرت کی زندگی کی کھیتی ہے، جو یہاں بوؤ گے وہ وہاں کھاؤ گے(۱)۔

کافروں اور مشرکوں کے عقیدہ میں فرشتوں اور جنات کے وجود کو ماننے کا عقیدہ بھی تھا، لیکن وہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے، گویا کہ ان کو بھی خدا کی سی طاقت رکھنے والا سمجھتے، اور ایسا ہی مقدس جانتے اور جنوں کو بری روحیں سمجھ کر ان کو بااثر سمجھتے اور ان کو خوش کرنے کے لیے ان کی تعظیم اور ان سے مدد لینے کی ضرورت سمجھتے تھے، اور بھی اس سلسلہ میں طرح طرح کی خرافات اور غلط تصورات وخیالات دل ودماغ میں بٹھا رکھے تھے، نبی آخر الزماں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے ان خیالات کی بھی تصحیح فرمائی کہ فرشتے بھی اللہ کی مخلوق ہیں، اور وہ بھی اللہ کے حکموں کے محتاج اور پابند ہیں، البتہ یہ نہ دیکھی جانے والی مخلوق ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دئے ہوئے حکموں کو بجالانے کے لیے مقرر ہیں، اور اسی کے مطابق کام کرتے ہیں اور جنات انسانوں کی طرح اللہ کی مخلوق ہیں، ان پر بھی انسانوں کی طرح اپنے خالق کو ماننے اور اپنے خالق کی عبادت کرنے کو لازم قرار دیا گیا ہے، انسانوں کو اللہ نے اشرف المخلوقات بنایا، اور انسانوں کے ہی سب سے افضل فرد کو ساری مخلوق میں سب سے افضل قرار دیا(۲)۔

دعوت اخلاق و پیام انسانیت

اصلاح عقائد کی دعوت کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اچھے اخلاق کی بھی بھرپور دعوت دیتے تھے کہ انسانی صفات کو اور انسان کے ساتھ خیر خواہی، آپسی ہمدردی و بھائی چارگی کو اختیار کرو، دوسروں کو تکلیف دینے سے بچو، اور ان تمام کاموں سے دور رہو جن سے خرابی پیدا ہوتی ہے، اور سبھی کے ساتھ مہربانی کرو اور نرمی سے پیش

(۱) سیرت حلبیہ: ۱/۲۶۱، مطبوعہ شرکۃ مکتبۃ مصطفیٰ البابی الحلبی وأولادہ، مصر، ۱۹۶۴ء
(۲) امام ترمذی نے سنن میں، امام حاکم نے مستدرک میں، امام احمد نے مسند میں اس کا تذکرہ کیا ہے

آؤ۔آپ نے اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ بتایا کہ:"الراحمون يرحمهم الرحمن تبارك وتعالىٰ، ارحموا من فى الأرض يرحمكم من في السماء" (رحم کرنے والے وہ لوگ ہیں، جن پر سب سے بڑا رحم کرنے والا یعنی اللہ رب العالمین رحم کرتا ہے، تم لوگ زمین والوں پر رحم کرو تم پر وہ ذات مہربان ہوگی جو آسمان پر ہے)اور آپ نے اخلاقی تعلیمات وہدایات کو جو قرآن مجید کے ذریعہ اتاری گئیں اور جو آپ کو براہ راست بتائی گئیں ان کی طرف توجہ دلائی، گذشتہ قوموں کو ان کے نبی کے ذریعہ جو ہدایات دی گئیں تھیں قرآن مجید میں ان کا ذکر لاکر ان تعلیمات کو ہر زمانہ میں راہ عمل بنا دیا گیا، وہ بھی حضور نے سنائیں، ان آیات میں جو اخلاقی تعلیمات دی گئیں ہیں ان میں پہلی دعوت وتعلیم توحید اور ایک اللہ کی عبادت کی ہے، اس کے ساتھ اچھے اور نیک اور انسانی ہمدردی کے اخلاق کی تلقین ہے، مثالاً سورہ اسراء کی درج ذیل آیات پیش ہیں:

﴿وقضى ربك ألا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحساناً ، إما يبلغن عندك الكبر أحدهما أو كلاهما فلا تقل لهما أف و لاتنهرهما وقل لهما قولاً كريماً، واخفض لهما جناح الذل من الرحمة، وقل رب ارحمهما كما ربياني صغيراً، ربكم أعلم بما فى نفوسكم إن تكونوا صلحين فإنه كان للأوابين غفوراً، وآت ذالقربىٰ حقه والمسكين وابن السبيل ولاتبذر تبذيراً	اور تمہارے پروردگار نے فیصلہ کردیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرتے رہو، اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں، تو ان کو اف تک نہ کہو، اور نہ انہیں جھڑکنا، اور ان سے بات ادب کے ساتھ کرنا، اور عجز ونیاز سے ان کے ساتھ رہو، اور ان کے حق میں دعا کرو کہ آے پروردگار جیسا انہوں نے مجھے بچپن میں شفقت سے پرورش کیا ہے تو بھی ان کے حال پر رحمت فرما، جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے تمہارا پروردگار اس سے بخوبی واقف ہے، اگر تم نیک ہوگے تو وہ رجوع لانے والوں کو بخش دینے والا ہے، اور رشتہ داروں اور محتاجوں اور مسافروں کو ان کا حق ادا کرو، اور فضول خرچی سے مال

إن المبذرين كانوا إخوان
الشياطين وكان الشيطٰن لربه
كفوراً، وإما تعرضن عنهم ابتغاء
رحمة من ربك ترجوها فقل لهم
قولاً ميسوراً، ولاتجعل يدك
مغلولة إلى عنقك ولاتبسطها كل
البسط فتقعد ملوماً محسوراً، إن
ربك يبسط الرزق لمن يشاء ويقدر
إنه كان بعباده خبيراً وبصيراً،
ولاتقتلوا أولادكم خشية إملاق
نحق نرزقهم وإياكم إن قتلهم كان
خطأً كبيراً، ولاتقربوا الزنىٰ إنه كان
فاحشة وساء سبيلاً، ولاتقتلوا
النفس التى حرّم الله الاّ بالحقّ
ومن قُتل مظلوماً فقد جعلنا لوليّه
سلطاناً فلايُصرف فى القتل انه
كان منصوراً، ولا تقربوا مال اليتيم
الا بالتى هى احسن حتى يبلغ
اشده وأوفوا بالعهد ان العهد كان
مسئولاً، وأوفواالكيل اذا كلتم
وزنوا بالقسطاس المستقيم ذٰلك
خير وأحسن تاويلاً، ولاتقف
ماليس لك به علم ان السمع والبصر
والفؤاد كل اولٰئك كان

نہ اڑاؤ، کہ فضول خرچی کرنے والے تو شیطان
کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے پروردگار
(کی نعمتوں) کا کفران کرنے والا (یعنی
ناشکرا) ہے، اور اگر تم اپنے پروردگار کی رحمت
(یعنی فراخ دستی) کے انتظار میں جس کی
تمہیں امید ہو ان (مستحقین) کی طرف توجہ
نہ کرسکو تو ان سے نرمی سے بات کہہ دیا کرو،
اور اپنے ہاتھ کو نہ تو گردن سے بندھا ہوا
(یعنی بہت تنگ) کرلو، (کہ کسی کو کچھ دو ہی
نہیں) اور نہ ہی بالکل کھول دو (کہ سبھی کچھ
دے ڈالو اور انجام یہ ہو کہ) ملامت زدہ اور
باندھ کر بیٹھ جاؤ، بیشک تمہارا پروردگار جس کی
روزی چاہتا ہے فراخ کردیتا ہے اور جس کی
روزی چاہتا ہے تنگ کردیتا ہے، وہ اپنے
بندوں سے خبردار ہے، اور ان کو دیکھ رہا ہے،
اور اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرنا،
کیونکہ ان کو اور تم کو ہم ہی رزق دیتے ہیں،
کچھ شک نہیں کہ ان کا مارڈالنا بڑا سخت گناہ
ہے، اور زنا کے پاس بھی نہ جانا کہ وہ بے
حیائی اور بری راہ ہے، اور جس جاندار کا مارنا
خدا نے حرام کیا ہے اسے قتل نہ کرنا، مگر جائز
طور پر (یعنی بہ فتویٰ شریعت) اور جو شخص ظلم
سے قتل کیا جائے ہم نے اس کے وارث کو
اختیار دیا ہے (کہ ظالم قاتل سے بدلہ لے)

عنه مسئولاً، ولا تمش في الأرض مرحاً انّك لن تخرق الأرض ولن تبلغ الجبال طولاً، كل ذلك كان سيّئه عند ربك مكروهاً، ذلك مما أوحىٰ إليك ربُّك من الحكمة ولاتجعل مع الله إلهاً آخر فتُلقى في جهنم ملوماً مدحوراً﴿﴾۔

(سورہ بنی اسرائیل، از آیت ۲۳ تا آیت ۳۹)

تو اس کو چاہیۓ کہ قتل (کے قصاص) میں زیادتی نہ کرے، وہ منصور اور فتحیاب ہے، اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ پھٹکنا، مگر ایسے طریقے سے کہ بہت بہتر ہو، یہاں تک وہ جوانی کو پہونچ جائے، اور عہد کو پورا کرو، کہ عہد کے بارے میں ضرور پرسش ہوگی، اور جب کوئی چیز ناپ کر دینے لگو تو پیمانہ پورا بھرا کرو، اور جب تول کر دو تو ترازو سیدھی رکھ کر تولا کرو، یہ بہت اچھی بات ہے، اور انجام کے لحاظ سے بھی بہت بہتر ہے، اور اے بندے جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ کہ کان اور آنکھ اور دل ان سب جوارح سے ضرور باز پرس ہوگی، اور زمین پر اکڑ کر اور تن کر مت چل کہ تو زمین کو پھاڑ تو نہیں ڈالے گا، اور نہ لمبا ہو کر پہاڑوں کی چوٹی تک پہنچ جائے گا، ان سب عادتوں کی برائی تیرے پروردگار کے نزدیک بہت ناپسند ہے، اے پیغمبر یہ ان ہدایتوں میں سے ہے جو خدا نے دانائی کی باتیں تمہاری طرف وحی کی ہیں، اور خدا کے ساتھ کوئی اور معبود نہ بنانا کہ ایسا کرنے سے ملامت زدہ اور درگاہ خدا سے راندہ بنا کر جہنم میں ڈال دیۓ جاؤ گے۔

یہ وہ باتیں تھیں جو اسلام کے تحت نبی مکرم محمد ﷺ کی طرف سے مکہ کے باشندوں کو بتائی گئیں، اور پھر عربوں کو ان کی طرف متوجہ کیا گیا، اور پھر تا قیامت آنے والی قوموں کے لیے ان کو پہونچانے کی ذمہ داری دی گئی۔

ان کو یہ بتایا گیا کہ اسلام عقیدہ اور عمل دونوں پر مشتمل ہے، عقیدہ کا ذکر اوپر بیان ہوا، اس عقیدہ کے تحت عمل کے سلسلہ میں چار عمل بتاۓ گئے، ان کو ملا کر اسلام پانچ ارکان پر مشتمل ہے، ایک عقیدہ جس میں توحید، رسالت، آخرت اور آسمانی

کتابوں، ملائکہ اور تقدیر پر یقین شامل ہے، یہ اسلام کا پہلا رکن ہوا، بقیہ چار ارکان جو عملی ہیں جن میں نماز، روزہ، زکوۃ اور حج شامل ہیں جس کو اس حدیث رسول اللہ ﷺ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"بنی الإسلام علی خمس شهادة أن لا إله إلا الله وان محمداً رسول الله وإقام الصلوٰة وإيتاء الزكوٰة وحج بيت الله وصوم رمضان (۱)

(اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر ہے، ۱۔ اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اس کے رسول ہیں، ۲۔ نماز قائم کرنا، ۳۔ زکوۃ دینا، ۴۔ بیت اللہ کا حج کرنا، ۵۔ رمضان کے روزے رکھنا)۔

اور بتایا گیا کہ یہ تو عبادت اور اطاعت کے بنیادی اعمال ہیں، ان کے بعد زندگی کو نیک اور اچھے اخلاق وصفات سے آراستہ کیا جائے اور ظلم وزیادتی اور برے کاموں سے بچا جائے۔

اسلام کی یہ وہ دعوت ہے کہ جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل اور دائمی طور پر اتارا گیا اور کامیابی کو قیامت تک کے لیے آپ ہی کی دی ہوئی ہدایات وتعلیمات کے دائرہ میں منحصر کر دیا گیا اور فرمادیا گیا کہ

﴿إن الدين عند الله الإسلام﴾ (آل عمران:۱۹) دین تو خدا کے نزدیک اسلام ہے۔

مزید یہ بھی فرمادیا گیا کہ:

﴿ومن يبتغ غير الإسلام ديناً فلن يقبل منه وهو في الآخرة من الخاسرين﴾ (آل عمران:۸۵)

اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور ایسا شخص آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں ہوگا۔

---

(۱) بخاری، حدیث نمبر:۸، ومسلم حدیث نمبر:۱۶

اس طرح یہ بات واضح کردی گئی کہ اسلام کی عطا کردہ تعلیمات وہدایات پر ہی چلنے میں نجات کا سامان ہے، ان کو چھوڑ کر کوئی دوسرا طریقہ اختیار کر کے کامیابی اور آخرت میں نجات حاصل کرنا چاہے گا تو وہ مقصد حاصل نہ کر سکے گا، ناکام ہوجائے گا، یہ ساری تعلیمات وہدایات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ملنے والوں کو جہاں تک آپ پہونچا سکتے تھے پہونچادیا، اوران میں جن کا عملی نمونہ ظاہر کیا جاسکتا تھا ان کا عملی نمونہ بھی دکھلایا، چنانچہ یہ تعلیمات وہدایات اوراسوۂ نبوی انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر پھیلا ہوا ملتا ہے اور یہ انسانوں کے خالق ومالک کی طرف سے ہی عطاء کیا گیا ہے جو انسان کی ضرورتوں اور مزاجوں سے خوب واقف ہے، لہذا اس کے نبی کے ذریعہ جو چیزیں مقرر کی گئی ہیں ان میں انسانوں کے فائدے اور مصلحت کا پورالحاظ رکھا گیا ہے، جبکہ رب العزت کی ذات ہی وہ ذات ہے جس نے سب کو پیدا کیا، اوروہی سب کے مزاجوں اورضرورت کو خوب سمجھتا ہے، وہ رحم وکرم والا ہے، اوراس نے اپنے کورحم وکرم والا کہا بھی ہے، کہ وہ فرماتا ہے:

﴿ألا يعلم من خلق وهو اللطيف الخبير﴾ (الملك: ١٤)

کیا وہ نہ جانے گا اس کو جن کو اس نے ہی پیدا کیا وہ تو بڑی باریک باتوں کا جاننے والا اور بڑا ہی باخبر ہے۔

یہ وہ باتیں ہیں جن کو لے کر اسلام شروع ہوا، اور قیامت تک ان باتوں پر اسلام کے ماننے والوں اور ایمان لانے والوں کو چلتے رہنے کا حکم ہوا۔

بہرحال اس دعوت وپیغام الٰہی کو پہونچانے کے لیے نبیوں کے بھیجنے کا جوسلسلہ شروع ہوا تھا وہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مکمل کردیا گیا اوران ہی نبی آخرالزماں ﷺ نے دین حق کو جس کی اشاعت کی ذمہ داری ان پر ڈالی گئی تھی سخت مجاہدوں اور تکلیفوں کو برداشت کرتے ہوئے آگے بڑھایا اور چلایا حتی کہ اس کو مقام کمال تک پہونچا کر اپنے فرض کی ادائیگی کو پورا کردیا، اس میں ان کے صبر

و برداشت، انسانی ہمدردی و خیر خواہی اور حلم وحکمت کا پورا اظہار ہوا اور جو بھی ان کی بات کو مانتا گیا، اس نے بھی آپ کی مذکورہ بالا صفات کی پیروی کرتے ہوئے برداشت سے کام لینے اور راہ حق پر قائم رہنے کا ثبوت دیا۔

اللہ تعالی کا فیصلہ تھا کہ یہ کام انجام پانا ہے، اور نبی اور ان کے جو بھی ماننے والے ہوں ان کو اس کام کی انجام دہی میں ہر طرح کی تکلیف برداشت کرنا ہے اور مزید یہ کہ صرف مکہ اور اطراف مکہ کے لوگوں کی اصلاح پر ہی اکتفا نہیں کرنا ہے بلکہ پورے عالم کی اصلاح کے مقصد کو پیش نظر رکھنا ہے اور اس پر اللہ تعالی کی طرف سے ان کی مدد کا وعدہ آیا، فرمایا گیا:

﴿إن تنصروا الله ينصركم و يثبت أقدامكم﴾ (محمد:٧)

اگر تم اللہ تعالی کی مدد کروگے (یعنی اس کی مقرر کردہ دینی باتوں کو پھیلاؤ گے) تو وہ تمہاری مدد کریگا، اور تمہارے قدموں کو جمادے گا۔

چنانچہ انفرادی سطح پر آپ کو اور آپ کے ماننے والوں کو مکہ میں آپ کے ۱۳ سالہ کام کے دوران ہر طرح کی اذیت برداشت کرنی پڑی، اور پھر اجتماعی طور سے کام کو انجام دینے کے لئے قریب کے شہر مدینہ طیبہ جو یثرب کہلاتا تھا اس کو اختیار کرنا پڑا، اور اس شہر کو اختیار کرنے کی بنا پر اور وہاں کے لوگوں کا پورا تعاون کرنے کے بعد اس شہر کو اللہ تعالی کی طرف سے متعدد خصوصیات کے لحاظ سے دعوت کا مرکز بنایا گیا، کہ دعوت کے کام کو پھیلانے کے لئے وہاں سے برابر کمک بھیجی جائے اور سارے عالم کو اللہ تعالی کے اس پسندیدہ نظام زندگی کو قبول کرنے کی طرف بلایا جائے، اور جب آپ کی حیات طیبہ کی مدت ختم ہونے کے قریب آئی جس میں آپ نے اپنی ذمہ داری کو طے کردہ نشانہ تک پورا کرلیا تھا، تو فرمایا گیا:

﴿اليوم أكملت لكم دينكم و أتممت عليكم نعمتي و رضيت لكم الإسلام ديناً﴾ [المائدة:٣]

آج میں نے تم سب کے لئے دین کو تکمیل کے درجہ تک پہونچا دیا اور تم پر اپنا انعام پورا کردیا اور تم سب کے لئے اسلام ہی کو دین ہونے پر راضی ہوا۔

سورہ مدثر کا نزول

رسول اللہ ﷺ پر وحی کے آنے میں ایک وقفہ ہوا جس میں وحی نہیں آئی جس سے آپ کو انتظار سا رہا پھر وحی کا آنا جاری ہو گیا، آپ ﷺ اس کو اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ میں اس حال میں تھا کہ چل رہا تھا کہ میں نے آسمان کی طرف سے آواز سنی، میں نے اپنی نگاہ اٹھائی تو یہ نظر آیا کہ وہی فرشتہ جو مجھے غار حراء میں نظر آیا تھا ایک کرسی پر زمین وآسمان کے درمیان موجود ہے میں یہ دیکھ کر وحشت میں آ گیا، اور میں نے کہا مجھے اڑھاؤ، مجھے اڑھاؤ، اسی حال میں اللہ تعالی کی طرف سی یہ وحی نازل ہوئی:

﴿یا أیھا المدثر قم فأنذر، و ربك فكبر، و ثیابك فطھر، و الرجز فاھجر، و لا تمنن تستكثر، و لربك فاصبر، فإذا نقر فی الناقور، فذلك یومئذ یوم عسیر، علی الكافرین غیر یسیر﴾ [المدثر:۱-۱۰]

اے کمل اوڑھنے والے! کھڑا ہو جا، اور آگاہ کر دے، اور اپنے رب ہی کی بڑائیاں بیان کر، اپنے کپڑوں کو پاک کر، ناپاکی کو چھوڑ دے، اور احسان کر کے زیادہ لینے کی خواہش نہ کر، اور اپنے رب کی راہ میں صبر کر، پس جب صور میں پھونک ماری جائے گی تو وہ دن بڑا سخت دن ہوگا، جو کافروں پر آسان نہ ہوگا۔

اس طرح آپ کو متوجہ کر دیا گیا کہ اس ذمہ داری کے بوجھ سے اتنا نہ گھبراؤ، اٹھو اپنی ذمہ داری کی انجام دہی شروع کرو، اپنے رب کی بڑائی بیان کرو، اور گندے عمل سے علاحدگی رکھو، دیکھو جب قیامت کا صور پھونکا جائیگا تو یہ دن بڑا سخت مشکل کا دن ہوگا، حق سے روگردانی کرنے والوں کے لئے آسان نہ ہوگا، اس طرح نبوت و رسالت کا وہ عظیم بار ڈالا گیا جو اس وسعت کے لحاظ سے دیگر انبیاء پر نہیں ڈالا گیا تھا، اس وحی کے بعد پھر مسلسل وحی کا سلسلہ قائم ہو گیا اور وحی مسلسل آنے لگی (۱)۔

اس طرح اللہ تعالی کی طرف سے آپ کو نبوت کا عظیم مقام عطا ہوا، اور

---

(۱) تاریخ طبری، ج ۲/ ۳۰۵-۳۰۶، زاد المعاد، ج ۳/ ۱۲۔

انسانوں کی ہدایت کا وہ کام سپرد ہوا جو پہلے کے نبیوں کے کام سے زیادہ وسیع اور جامع کام تھا، اور اسی کے ساتھ آپ کو نبیوں کے سلسلہ کا خاتم بنایا گیا، اور قیامت تک دین حق پر چلنے اور چلانے کا راستہ آپ کے بتائے ہوئے رہنما اصولوں کے مطابق طے کر دیا گیا، اور وعدہ فرمایا گیا کہ آپ کی کوششوں کو کامیابی ملے گی، اور دنیا آپ کی امت کے سامنے سرنگوں ہو جائیگی، لیکن اس سے قبل سخت اور دشوار گذار راستہ کے حالات سے گذرنا ہوگا، اور سنگلاخ زمین میں دعوت حق کا کام کرنا ہوگا، اور صبر وثبات کے ساتھ حالات کو جھیلنا ہوگا، اور جب تک اللہ تعالی کی اجازت نہیں آجاتی صرف صبر و برداشت سے کام لینا ہوگا۔

یہ پیغام چونکہ خدا کی طرف سے وحی کی صورت میں اور فرشتہ کے ذریعہ آیا جو کہ اللہ کی نورانی اور آسمانی مخلوق ہے، اور پیغام بھی رب العالمین کا تھا، آپ انسان تھے، انسانی مخلوق کو پیغام کے وزن سے سابقہ پڑا، آپ کا جسم اس وزن سے ہل گیا، یہ پیغام خصوصی پیغام الہی تھا اور وحی الہی اتنی بلند اور آسمانی سطح کی ہے کہ انسان پر براہ راست اترے تو وہ اس کو برداشت نہیں کرسکتا، جل جائے یا کچل جائے، اسی لئے اس کو فرشتہ لاتا اور اس کے واسطہ سے نبی پر اترتی، فرشتہ کے واسطہ سے آنے پر بھی اس کا بوجھ اتنا ہوتا تھا کہ آپ اس کے بوجھ سے دب جاتے اور سخت دباؤ جھیلنا پڑتا، اگر سواری کے جانور کے اوپر ہوتے تو سواری پر بھی بڑا بوجھ پڑتا، اس لئے آپ اپنی زبان سے وحی کو ادا کرنے کے لئے اپنے ہونٹوں کو زور سے حرکت دیتے، اس پر یہ ہدایت آئی:

﴿لا تحرك به لسانك، لتعجل به، إن علينا جمعه و قرآنه، فإذا قرأناه فاتبع قرآنه، ثم إن علينا بيانه﴾

اپنی زبان کو زیادہ حرکت نہ دو کہ جلدی کی خاطر ایسا کرنے لگو، وحی کو جمع کرنا اور اس کا پڑھانا یہ میری طرف سے ہے۔

[سورہ قیامہ:۱۶-۲۰]

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے پاس جب حضرت جبرئیل آتے تو ان کے پڑھنے کو آپ غور سے سنتے پھر وہ آپ کو پوری یاد ہو جاتی، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ آپ کے پاس وحی کیسے آتی ہے، آپ نے فرمایا: کبھی تو گھنٹی کی آواز کی طرح آواز آتی اور وہ مجھ پر بہت سخت ہوتی ہے، جب وہ پوری ہو جاتی ہے تو مجھے وہ پوری یاد ہو جاتی ہے، اور کبھی فرشتہ انسان کی شکل میں آتا اور مجھ سے باتیں کرتا، اور میں خوب سمجھ لیتا جو وہ کہتا، حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ میں نے آپ کو آپ پر وحی آتے وقت دیکھا کہ سخت سردی کا موسم ہے اور آپ کی پیشانی پر وحی کے ختم ہونے پر پسینہ در پسینہ نظر آتا (۱)۔

پہلی وحی کے تھوڑے وقفہ کے بعد سے وفات تک ۲۳ سالہ مدت میں آپ پر وحی آتی رہی، وہ قابل توجہ امور کے سلسلہ میں تھوڑی تھوڑی آتی، اس کے الفاظ بھی کلام الٰہی ہوتے جو قرآن مجید میں محفوظ ہوتے رہتے، اللہ تعالی کی طرف سے وعدہ ہے کہ وہ قیامت تک اپنی صحیح شکل میں محفوظ رہیں گے، ان ہی سے ایمان وعمل صالح کی حامل زندگی کا دستور اساسی بنا، اسی وحی کو وحی متلو کہتے ہیں یعنی وحی کی وہ قسم جو اللہ رب العزت کے الفاظ میں ہے جس کی تلاوت یعنی اس کو آنکھوں یا زبان سے پڑھنا عبادت ہے، اس کے علاوہ دوسری قسم کی وحی تھی جو پیغام الٰہی کی صورت میں فرشتہ کے ذریعہ یا خواب کے ذریعہ یا دل میں القاء کے ذریعہ آتی تھی، وہ کلام الٰہی کے الفاظ میں نہیں ہوتی تھی، لہٰذا اس کا بوجھ اور دباؤ بھی وہ نہ ہوتا تھا، جو قرآن مجید والی وحی کا ہوتا تھا، وہ وحی بھی اللہ تعالی کے حکم پر مشتمل ہوتی تھی، اور یہ قرآن مجید کی وحی کی تشریح وتوضیح اور مزید امور زندگی کے سلسلہ میں ہدایات پر مشتمل ہوتی تھی، جو خود نبی ﷺ کے کلام کے ذریعہ یا عمل کی صورت میں ظاہر ہوتی تھی، اس وحی کو بھی حکم الٰہی کی ہی

---

(۱) بخاری، کتاب بدء الوحی وطبقات ابن سعد، ج ۱/ ۱۹۷-۱۹۸

حیثیت حاصل تھی کیونکہ یہ بھی خدا کی طرف سے ہی ہوتی تھی، خود قرآن نے بھی اس کے وحی ہونے کی تصدیق کی، فرمایا:

﴿وما ينطق عن الهوى، إن هو إلا وحي يوحى﴾ (النجم:٣،٤) (آپ اپنی خواہش سے نہیں کہتے، یہ اصلاً وحی ہے جو آپ کے پاس بھیجی جاتی ہے۔

اس وحی کو وحی غیر متلو کہتے ہیں۔

دعوت حق کا آغاز

حضورﷺ نے نبوت ملنے پر اپنی ذمہ داری انجام دینا شروع فرمادی، دین کی صحیح حقیقتوں سے باخبر کرنا شروع کیا، اور اس پر عمل کرنے کی تاکید کی، آپﷺ نے فرمایا: "يا أيها الناس قولوا لا إله إلا الله تفلحوا" (اے لوگو! کہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں کامیاب ہوجاؤ گے) اس کی زد ان لوگوں پر پڑی جنہوں نے خیالی ذہن سے پتھر، لکڑی، اور غیر جاندار چیزوں کو خدا کا درجہ دے دیا تھا، اور ان کی عبادت کیا کرتے تھے، آپﷺ نے کہا کہ تم ایسی چیزوں کی عبادت کیوں کرتے ہو جن میں نہ بولنے کی طاقت ہے اور نہ کچھ کر سکنے کی طاقت، اور تم ان کو خدائے واحد کیساتھ شریک کرتے ہو، یہ کیسی بے عقلی کی بات ہے، آپﷺ نے فرمایا ﴿إني رسول الله إليكم﴾ میں تمہارے رب کی طرف سے بھیجا گیا ہوں، کہ تم کو اس کا پیغام پہونچاؤں، کہ تم اس کی پرستش کرو، جو تمہار خدا ہے، اور ادھر ادھر نہ پھرو، اور میری بات مانو، کہ میں تم کو صحیح راہ عمل اور اچھے اخلاق و کردار کی نصیحت کرتا ہوں، اور جو کچھ میرے پروردگار مجھ کو بتاتے ہیں میں تم کو بتاتا ہوں (۱)۔

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/۲۶۲، طبقات ابن سعد: ۱/۱۹۹، السیرۃ النبویۃ، از: ذھبی، ۱/۸۱، سیرت حلبیہ: ۱/۴۶۲۔

حضرت خدیجہ، ابوبکر صدیق، علی اور زید بن حارثہ کا قبول اسلام

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے اس نئے منصب کے لئے کام کا میدان اولاً آپ کے ہم وطن اور خاندان کے لوگ تھے، پھر باہر کے لوگوں کی باری تھی، چنانچہ آپ نے یہ کام اپنے گھر سے شروع کیا، اور آپ کو اس میں فوری کامیابی حاصل ہوئی، آپ کی اہلیہ صاحبہ حضرت خدیجہ بنت خویلد اور ساتھ رہنے والے چچازاد بھائی حضرت علی بن ابی طالب اور آپ کے غلام حضرت زید بن حارثہ اور قریب ترین دوست حضرت ابوبکر صدیق بن ابی قحافہ آپ پر ایمان لائے (۱) پہلی وحی آنے کے بعد سے آپ نے دعوت کا یہ کام قدرے اخفاء کے ساتھ اور صرف اپنے تعلق والوں سے شروع کیا جن سے مان لینے کی پوری امید تھی، اس طرح ایک تعداد اسلام میں داخل ہوئی، لیکن یہ تعداد تھوڑی تھی (۲)۔

حضرت ابوبکر صدیق نے ایمان لانے کے بعد اپنے دوستوں اور قریب کے لوگوں کو بات بتائی اور ایمان کی رغبت دلائی، اس طرح حضور ﷺ کی نبوت اور دعوت کا علم ہو جانے پر قریش کے کئی دیگر افراد بھی ایمان لائے، جن میں خاص طور پر عثمان بن عفان، زبیر بن العوام، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، طلحہ بن عبیداللہ، ابوعبیدہ بن الجراح، الارقم بن الارقم، عثمان بن مظعون، عبیدۃ بن الحارث بن عبدالمطلب، سعید بن زید، خباب بن الارت، عبداللہ بن مسعود، عمار بن یاسر، صہیب وغیرہ ہیں، رضی اللہ عنھم اجمعین (۳)۔ اس طرح اسلام لانے والے بتدریج بڑھتے رہے، لیکن شروع کے اس مرحلہ میں کھل کر دعوت کا کام نہیں کیا جاتا تھا۔

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/۱۴۰-۱۵۰۔

(۲) الکامل فی التاریخ: ۲/۶۰

(۳) سیرت ابن ہشام: ۱/۲۵۰

صبح وشام کی نمازیں

عبادت کے سلسلہ میں دووقت کی نماز پڑھنا ہوتا تھا، جو کہ چھپ کر پڑھتے تھے، ایک طلوع شمس سے پہلے، دوسری غروب شمس سے پہلے، ہوتی تھی اور یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیمات کے مطابق تھی اور بیت المقدس کے رخ پر پڑھی جاتی تھی (۱)۔

دارارقم

حضورﷺ نے الارقم بن الارقم کے گھر کو جو کوہ صفا سے متصل تھا، مسلمان ہونے والوں سے ملنے اور اکٹھا ہونے کے لئے اختیار کرلیا تھا، جس کی خبر صرف مسلمانوں کو تھی وہاں آپس میں آ کر ملتے تھے (۲)۔

کوہ صفا پر اعلان عام

تین سال تک حضورﷺ شخصی اور مقامی طریقہ سے دعوت دیتے رہے، پھر حکم ہوا کہ اٹھو اور کھل کر دعوت دو ﴿یا أیها المدثر قم فانذر﴾ (اے چادر کے کپڑے پہنے ہوئے شخص اٹھو اور لوگوں کو غلط باتوں کے انجام سے ڈراؤ) چنانچہ آپ نے کھل کر دعوت دینا شروع کردی، آپﷺ نے کعبہ کے سامنے کے ایک چھوٹے پہاڑ صفا پر چڑھ کر ہنگامی حالات میں لوگوں کو جمع کرکے اہم خبر سنانے کا جو طریقہ تھا کہ واصباحاہ (ارے صبح بڑی خطرناک ہے) کے مطابق آواز لگائی، سب پہاڑ کے سامنے جمع ہوگئے، آپ نے ان سے کہا کہ اگر میں یہ بتاؤں کہ پہاڑ کے پیچھے جو میری نظر میں ہے دشمن حملہ کے لئے آرہا ہے، تو میری بات مانوگے، لوگوں نے کہا: کیوں نہیں، تم اس طرف دیکھ رہے ہو، ہم نہیں دیکھ رہے ہیں، آپ نے فرمایا: تو

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/۲۴۳۔ (۲) سیرت حلبیہ: ۱/۴۵۶۔

سن لو، میں تم کو تمہاری دوسری زندگی میں جس کا علم مجھے خدا کی طرف سے دیا گیا ہے سخت عذاب کے پیش آنے کے خطرہ سے آگاہ کرتا ہوں، اگر تم نے توحید اختیار نہیں کی، یہ سن کر کئی لوگ بہت سخت غصہ میں آگئے اور کہنے لگے: کیا اس کے لئے تم نے ہم سب کو جمع کیا، اور برا بھلا کہا، اور اس میں آپ کا ایک چچا ابولہب اور قریش کا ایک دوسر لیڈر ابوجہل پیش پیش تھا، اور سخت بات کہی، اس کے بعد ہی قوم کے ضدی اور راہ حق سے بھٹکے ہوئے لوگوں نے آپ ﷺ کی مخالفت شروع کر دی اور آپ کے خلاف دشمنی کا ماحول بنانے لگے، اور اس طریقہ سے ایک خاموش جنگ شروع ہوگئی جو ایک طرفہ تھی (۱) کیونکہ آپ ﷺ کو اس دشمنی اور مخالفت کو صبر کے ساتھ برداشت کرنے کا حکم اللہ کی طرف سے دیا گیا، تا کہ قوم دعوت حق کو کوئی ملک گیری یا لیڈری حاصل کرنے کی بات نہ سمجھے، بلکہ اصلاح اور اپنے رب اور خالق کی تابعداری کی تلقین سمجھے، کیونکہ ملک گیری اور سیاست میں عوام کی پسند کی بات کہی جاتی ہے، تا کہ وہ ساتھ دیں لیکن دعوت میں حق بات کہی جاتی ہے چاہے سب مخالف ہو جائیں، اصل ہمدردی وخیر خواہی قوم کو بھلے برے سے واقف کرنے میں ہے، لیکن آپ کی بات پر غور نہ کرنے کی وجہ سے آپ کے خلاف ایک طرفہ جنگ کی کیفیت اختیار کر لی گئی ہے۔

حضور ﷺ کی طرف سے اصلاح و تلقین کا مسلسل عمل

اس کے بعد سے نبی کریم ﷺ نے سب کو عام طور پر سمجھانا شروع کیا، ہر ایک میلے میں جہاں بات کرنے کا موقع ہوتا جا جا کر لوگوں کو توحید کی خوبی بتاتے، اچھے عمل کی تلقین کرتے، برائیوں سے، ظلم سے اور بے حیائی کی باتوں سے روکتے، بتوں، پتھروں اور درختوں کی پوجا کو غلط، بے فائدہ اور گناہ کی بات قرار دیتے، آپ

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھیں صحیح بخاری ومسلم، طبقات ابن سعد: ۱/۲۰۰، الکامل فی التاریخ: ۲/۶۰، فتح الباری: ۸/۵۰۳، السیرۃ النبویۃ لابن حجر: ۱/۳۹۲-۳۹۷۔

لوگوں کو تلقین فرماتے کہ خدا کی ذات کو ہر نقص سے، ہر عیب سے اور برائی سے پاک سمجھیں، اس بات کا پختہ اعتقاد رکھیں کہ زمین، آسمان، چاند، سورج، چھوٹے، بڑے سب کے سب خدا کے پیدا کئے ہوئے ہیں، سب اسی کے محتاج ہیں، دعا کا قبول کرنا، بیمار کو صحت وتندرستی دینا، مرادیں پوری کرنا اللہ کے اختیار میں ہے، اللہ کی مرضی اور حکم کے بغیر کوئی بھی کچھ نہیں کرسکتا، فرشتے اور نبی بھی اس کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کرتے، عرب میں عُکاظ، عینیہ اور ذی المجاز کے میلے بہت مشہور تھے، دور دور سے لوگ وہاں آیا کرتے تھے، نبی کریم ﷺ ان مقامات پر جاتے اور میلے میں آئے ہوئے لوگوں کو اسلام کی اور توحید کی دعوت فرمایا کرتے تھے (۱)۔

قاضی محمد سلیمان منصور پوری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر روز اسی کام میں لگے رہتے تھے، آبادی مکہ کے اندر ہر ایک مجمع میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پہنچتے تھے اور قرآن سناتے تھے ہر شخص سے تنہائی میں ملتے تھے، اور اسے پیغام الٰہی پہنچاتے تھے۔

آبادی سے باہر بھی جتنے راستے آنے جانے والوں کے تھے، ان سب پر دن کی روشنی اور رات کی تاریکی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم جا پہنچتے تھے اور قرآن کی تلاوت سے آنے جانے والوں کے کانوں میں حکم الٰہی ڈالتے تھے، عرب کی کوئی مشہور منڈی اور مشہور میلہ ایسا نہ ہوتا تھا جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہ پہونچے ہوں، اور دین کی تلقین بذریعہ تلاوت اور اشاعت بذریعہ دعوت نہ فرمائی ہو، عکاظ کا ذرہ ذرہ اور طائف کا پتہ پتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت کا گہوارہ ہے" (۲)۔

قریش کی مخالفانہ سرگرمیاں

بہر حال جس وقت سے قریش کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت

---

(۱) طبقات ابن سعد: ۱/۲۱۶، امام ترمذی نے سنن میں، حاکم نے مستدرک میں اور امام احمد نے مسند میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ (۲) رحمۃ للعالمین از قاضی محمد سلیمان منصور پوری۔

کی ذمہ داری انجام دیتے ہوئے اللہ تعالی کا پیغام رکھا اور دین حق کی دعوت دی قریش نے اپنا رویہ بدل دیا اور آپ کی بات سننے سے بھی انکار کرنے لگے(۱)، حالانکہ وہ آپ کو بہت سچا اور امانت دار اور بہت معتبر فرد خاندان جانتے اور مانتے تھے، حتی کہ آپ کو صادق امین کا خطاب بھی دے چکے تھے، اور مخالفت کے زمانہ میں بھی آپ کو ایسا ہی اچھا سمجھتے رہے، وہی جانا پہچانا اور سمجھا ہوا اور بڑا سچا اور امانت دار آدمی اگر ایک نئی اور معقول بات بتاتا ہے تو اس کی سچائی پر اعتماد کرتے ہوئے مان لینا چاہیے تھا، کیونکہ آپ وہ باتیں بتا رہے تھے جن کو قریش بنیادی طور پر صحیح سمجھتے تھے اور وہ عقل میں بھی آتی تھیں، اور ان کی اصل ان کے ذہنوں میں موجود تھی، کیونکہ قریش حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا پیشوا مانتے تھے، اور ان کی تعلیمات کی بعض باتیں ان میں رائج بھی تھیں، اور ان میں مبعوث ہونے والے نبی محترم نے اپنے اسی جد اکبر اور نبی اعظم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہی اعلان کردہ عقیدہ و عمل کو اپنی سچی اور امانت دارانہ حیثیت کے حوالہ سے بیان کیا، اور واضح کیا کہ نسل ابراہیمی کے ان ہی لوگوں کو اپنے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جو عقیدہ ملا ہے اس کی اصل اور صحیح شکل توحید خالص ہے جس کی شکل میں محض وہم اور سرسری انداز ہ سے شرک شامل کر لیا گیا ہے۔

قریش اصلاً اللہ تعالی ہی کو سب سے بڑا مانتے تھے، بعد میں باہر سے آئے ہوئے خیالات اور ان سے پڑنے والے اثرات کے نتیجہ میں وہ اللہ تعالی کی ذات و صفات کے ساتھ دوسروں کو بھی شریک کرنے لگے تھے، مثلاً فرشتوں کو اللہ تعالی کی بیٹیاں قرار دینے لگے تھے، اور اللہ تعالی کی متعدد صفات میں اپنی بعض قابل تعظیم شخصیتوں کو شریک کرتے ہوئے خدائی حیثیت دیکران کی پرستش کرنے لگے اور ہوتے ہوتے یہ شرک صریح ان میں عام ہو گیا تھا، لیکن اب جبکہ قریش حضور صلی

(۱) سیرت ابن ہشام: ۲۶۴/۱

اللہ علیہ وسلم کو نبوت کا مقام ملنے اور شرک ترک کرنے کی دعوت دینے سے پہلے ہی سے ایک برتر صفات کا اور سچا وایماندار اور اچھا انسان سمجھتے اور مانتے تھے، تو اب ان کی طرف سے ایسی بات جو ان کے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت سے ہم آہنگ تھی ماننے میں کیا دشواری تھی؟، تیسرے آخرت کا تصور کہ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی ہوگی، اور اس میں اچھے اور برے کاموں کا حساب ہوگا، اور سزا اور جزا ملے گی، اس کی خبر بھی قریش کو اس کا یہ سچا اور بلند صفات و کردار کا حامل فرد فرید دے رہا ہے، اور یہ بات ذرا سا بھی غور کرنے سے معقول بھی سمجھی جا سکتی تھی، تو قریش کے لئے معقول رویہ یہی تھا کہ ان باتوں کا انکار نہ کیا جائے۔

لیکن قریش ایک تو اپنے باپ دادا سے چلے آئے طریقوں کے تعصب میں اور کچھ لوگوں نے محمد ﷺ کی مقبولیت دیکھ کر اس کے حسد میں ان باتوں کو سننے سے بھی انکار کر دیا، اور کہہ دیا کہ تم کون ہو ہم کو نصیحت کرنے والے؟ ہمارا کوئی بڑا سردار ایسی کوئی بات کہتا تو اس کو حق بنتا تھا، تم کون ہوتے ہو ایسا کہنے والے؟ ہم اپنے آباء و اجداد کے جس طریقہ پر چلتے رہے ہیں وہی کریں گے، اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر زور دیا کہ ہم جو کہہ رہے ہیں نبی ہونے کے تعلق سے، وہ اپنے مورث اعلی حضرت ابراہیم ہی کی بات کے مطابق اور اسی کعبہ کے رب کی طرف سے آئے ہوئے پیغام کے تحت کہہ رہے ہیں اور اسی پر اللہ تعالی کی طرف سے چلنے کا حکم خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوا ہے:

﴿فاتبع ملة إبراهيم حنيفاً وما كان من المشركين﴾	کہ ابراہیم کا طریقہ اختیار کرو اور وہ شرک کرنے والے نہیں تھے۔

لیکن قریش ضد پر آ گئے اور انکار ہی کرتے رہے، توحید اور نیک باتوں کے لئے اپنے رسم و رواج کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے، بلکہ ان سے ہٹنا وہ اپنی نخوت اور

خود پسندی کے خلاف مانتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم اپنے اختیار کردہ اور پہلے سے چلے آرہے طریقہ اور عقیدہ کو کیسے چھوڑ دیں، اسی کے ساتھ ساتھ چونکہ عربی مزاج سادہ اور حقیقت پسندانہ تھا اس لئے اپنی ضد اور مخالفت کے باوجود جب براہ راست قرآن مجید کی آیات سن لیتے اور خود نبی ﷺ کی بات کھلے ذہن سے سن لیتے تھے تو اس کو وہ مان لیتے تھے، کیونکہ قرآن مجید کی آیات کو سن کر ان کا ذہن اس بات کا ادراک کر لیتا تھا کہ یہ انسانی کلام نہیں ہوسکتا، اور جب کھلے ذہن سے اس کو سن لیتے تو مان لیتے کہ یہ انسان سے اوپر والے کا ہی کلام ہے، لہٰذا یہ خدا ہی کی طرف سے ہوگا اور ایمان لے آتے (۱)۔

اسلام لانے والوں کی آزمائش

ایمان لانے والوں کی تعداد آہستہ آہستہ بڑھتی گئی، کوئی کلام الٰہی کے اعجاز سے متاثر ہو کر، کوئی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق، اخلاص اور آپ کے ہمدردانہ طریقۂ دعوت سے متاثر ہو کر اور آپ کے امین وصادق ہونے کا تجربہ رکھنے کی بنا پر اسلام کی طرف مائل ہوا، اس طریقہ سے اس پیغام حق کو روکنے والے بااثر لوگوں کی مخالفت کے باوجود اسلام میں داخل ہو جاتا تھا، لیکن مخالفوں کی سخت مخالفت کی وجہ سے اس دعوت کو قبول کرنے والوں کو بڑے ظلم وزیادتی کا بھی سامنا کرنا پڑتا تھا، جو ان کے صبر وبرداشت کا غیر معمولی امتحان تھا، اور اللہ تعالیٰ کا حکم بھی تھا کہ اپنے ہاتھوں کو روکے رکھو اور نماز ودعا سے تقویت حاصل کرتے رہو، یہ ایسی حالت میں تھا کہ عربوں کا مزاج لڑنے بھڑنے کا اور مقابلہ میں ہمت نہ ہارنے کا تھا مگر وہ اس موقع پر اپنے مزاج کو دبائے رہے، اور اللہ کی طرف سے صبر کا حکم ملنے پر صبر پر قائم رہے (۲)

لیکن مکہ والوں کی دشمنی مسلسل بڑھتی رہی، اور تکلیف دینے اور تشدد کا رویہ

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/۲۹۳-۳۱۵۔ (۲) سیرت حلبیہ: ۲/۳۴۲-۳۴۸۔

اختیار کرنے کا سلسلہ بھی بڑھ گیا اور بات اتنی بڑھی کہ ایک موقع پر ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم کہاں تک برداشت کریں، پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے، آپ ﷺ ٹیک لگائے بیٹھے تھے، سیدھے ہو گئے اور زور دیکر فرمایا کہ اللہ کی مدد ضرور آئے گی، صبر اور ہمت سے کام لو، اور دیکھو تم سے پہلے کی قوموں میں جنہوں نے دین حق قبول کیا ان کو اس سے بھی زیادہ تکلیفیں پہونچیں، آرہ تک چلا (۱)۔

حضور ﷺ کو ایذاء رسانی

کفار قریش جن میں پیش پیش ابوجہل، ابولہب، اسود بن عبد یغوث، ولید بن مغیرہ، امیہ بن خلف، نضر بن حارث، منبہ بن حجاج، عقبہ بن ابی معیط، حکم بن ابی العاص جیسے سربرآوردہ رؤساء تھے، حضور ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھاتے، نماز پڑھتے وقت ہنسی اڑاتے، سجدہ میں آپ کی گردن مبارک پر اوجھڑی ڈال دیتے، گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچتے کہ گردن مبارک میں بدھیاں پڑ جاتیں، جادوگر کہتے، دعوائے نبوت سن کر مجنون کہتے، باہر نکلتے تو شریر لڑکے پیچھے پیچھے غول باندھ کر چلتے، نماز میں قرآن مجید زور سے پڑھتے تو قرآن کریم، قرآن مجید لانے والے رسول اللہ ﷺ اور قرآن کے اتارنے والے (رب العالمین) کو گالیاں دیتے (۲)۔

ایک دفعہ حضور ﷺ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے، روساء قریش بھی موجود تھے، ابوجہل نے کہا: کاش اس وقت کوئی جاتا اور اونٹ کی اوجھڑی نجاست سمیت اٹھا لاتا کہ جب محمد (ﷺ) سجدہ میں جاتے تو ان کی گردن پر ڈال دیتا، عقبہ نے کہا: یہ خدمت میں انجام دیتا ہوں۔ چنانچہ وہ اوجھ لاکر آپ (ﷺ) کی گردن پر ڈال دی،

---

(۱) بخاری شریف: حدیث نمبر: ۳۶۱۲، سیرت حلبیہ: ۱/۴۸۳۔ (۲) تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں: بخاری، ص: ۶۸۶، مسند امام احمد بن حنبل: ۴/۳۰۲، طبقات ابن سعد: ۱/۲۰۰، سیرت ابن ہشام: ۱/۲۸۹۔

قریش مارے خوشی کے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے، کسی نے جا کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خبر کی، وہ اگر چہ اس وقت صرف پانچ چھ برس کی تھیں، لیکن جوش محبت سے دوڑ آئیں اور اوجھڑی کو ہٹا کر عقبہ کو برا بھلا کہا اور بد دعائیں دیں (۱)۔

جب کسی مجمع میں حضور ﷺ دعوت الی اللہ کا وعظ فرماتے تو ابولہب آپ کے ساتھ کہتا جاتا کہ یہ جھوٹ کہتا ہے، ایک صحابی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ جب کہ میں اس وقت تک اسلام نہیں لایا تھا، حضور ﷺ بازار ''ذوالمجاز'' میں گئے اور گھس کر لوگوں سے کہا ''لا إله إلا الله'' کہو، ابو جہل آپ پر خاک پھینکتا جاتا تھا اور کہتا کہ اس کے فریب میں نہ آنا، یہ چاہتا ہے کہ تم لات وعزی کی پرستش چھوڑ دو (۲)۔

ایک دفعہ حضور ﷺ حرم کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے، عقبہ نے آپ کی گردن میں چادر لپیٹ کر نہایت زور سے کھینچی، اتفاقاً حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آ گئے اور آپ کا شانہ پکڑ کر عقبہ کے ہاتھ سے چھڑایا اور کہا کہ ایسے شخص کو تم مار ڈالنا چاہتے ہو جو صرف یہ کہتا ہے کہ خدا ایک ہے (۳)۔

قبیلۂ دوس کے سردار طفیل بن عمرو کا قبول اسلام

حضرت طفیل بن عمرو دوسی جو قبیلۂ دوس کے سردار تھے اور مکہ زیارت کے لئے آئے تھے اپنا حال بیان کرتے ہیں کہ میں ایک روز بوقت صبح خانہ کعبہ گیا، نبی ﷺ نماز پڑھ رہے تھے، میں نے سنا کہ ایک نہایت عجیب کلام وہ پڑھ رہے ہیں، قریش نے اگر چہ مجھ کو منع کیا تھا کہ ان کا کلام نہ سننا، یہ جادو بھرا کلام ہے، تم کو بہکا دے گا، لیکن میرے دل نے مجھ سے کہا کہ میں خود شاعر ہوں، باعلم ہوں، اچھے برے کی تمیز رکھتا ہوں، میں کیسے دھوکہ کھا جاؤں گا اور اچھے اور برے کے درمیان فرق نہ

---

(۱) بخاری، باب الطہارۃ والصلاۃ والجزیۃ والجہاد، صحیح مسلم، سیرت حلبیۃ: ۱/ ۴۶۹
(۲) مسند امام احمد بن حنبل: ۴/ ۲۳۔ (۳) صحیح بخاری باب مالقی النبی ﷺ واصحابہ من المشرکین بمکۃ، سیرت ابن ہشام: ج۱/ ۲۸۹-۲۹۱، سیرت حلبیۃ: ۱/ ۴۷۲۔

کرسکوں گا، پھر کیا وجہ ہے اور کون سی روک ہے کہ میں اس کی بات نہ سنوں، اچھی بات ہوگی تو مانوں گا، ورنہ نہیں مانوں گا، میں یہ ارادہ کر کے ٹھہر گیا، جب نبی ﷺ واپس گھر چلے تو میں بھی پیچھے پیچھے ہولیا، اور جب مکان پر حاضر ہوا تو نبی ﷺ کو اپنا واقعہ مکہ آنے، لوگوں کے بہکانے، پنبہ درگوش رہنے اور آج حضور ﷺ کی زبان سے کچھ سن پانے کا کہہ سنایا، اور عرض کیا: مجھے اپنی بات سنایئے، نبی ﷺ نے قرآن پڑھا، بخدا! میں نے ایسا پاکیزہ کلام کبھی سنا ہی نہ تھا، جو اس قدر نیکی اور انصاف کی ہدایت کرتا ہو، الغرض طفیل دوسی اسی وقت مسلمان ہو گئے، ان کا مسلمان ہونا اسلام کی تقویت کا باعث بنا، کیونکہ وہ اپنے خاندان دوس کے سردار تھے جس کا اثر پورے قبیلہ پر پڑا(۱)۔

اسی طرح دوسرے لوگوں کا بھی معاملہ تھا، جب آپ کی مخالفت کرنے والے عربوں میں سے کوئی بھی سادہ دلی کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتا اور آپ کی بات کو تعصب سے خالی ذہن سے سن لیتا تو فوراً مان لیتا، اس طرح بتدریج لوگ مسلمان ہوتے گئے، البتہ وہ لوگ جو قبیلہ قریش کے اندر سردار اور بڑے سمجھے جاتے تھے اور اپنے کو معزز اور اونچے مقام پر سمجھتے تھے ان کو یہ دشواری پیش آجاتی تھی کہ اپنے قبیلہ کے اندر کسی دوسرے کے ماتحت کیسے آجائیں، اور اپنے سردارانہ مقام سے کم پر کیسے راضی ہو جائیں، وہ نہ صرف یہ کہ اسلام قبول نہیں کرتے تھے بلکہ سخت مخالفت کرتے تھے(۲)۔

اسلام لانے والوں پر قریش کے مظالم

اس طرح قریش کے یہ دو موقف ہو گئے تھے کہ ایک طرف تو بعض لوگ آہستہ آہستہ اسلام قبول کرتے جاتے تھے، دوسری طرف وہ لوگ تھے جو اپنی بڑائی یا

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/۳۸۲۔ (۲) سیرت ابن ہشام: ۱/۳۱۵

خاندانی عظمت کے احساس سے کام لیتے تھے، انکار کرتے تھے اور بلا سوچے غور کئے مسلمان ہونے والوں پر غصہ کرتے اور ان پر ہر طرح کا دباؤ ڈالتے ، ایذاء پہونچاتے ، کہ وہ خاندان کے مروجہ طریقہ کی طرف لوٹ آئیں، اور مکہ میں جو قریشی نہ تھے بلکہ باہر کے ہونے کی وجہ سے کمزور حیثیت کے تھے ان کو تو سخت ظلم کا نشانہ بنایا جاتا تھا، حتی کہ بعض بعض کی اس ظلم کی وجہ سے موت بھی ہوگئی (۱)۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ حبشی تھے، امیہ بن خلف کے غلام تھے، جب امیہ نے سنا کہ بلال مسلمان ہو گئے ہیں، گونا گوں عذاب ان کے لئے ایجاد کئے گئے، گردن میں رسی ڈال کر لڑکوں کے ہاتھ میں دی جاتی اور وہ مکہ کی پہاڑیوں میں انھیں لیے پھرتے، رسی کا نشان گردن میں نمایاں ہو جاتا، وادی مکہ کی تپتی ہوئی ریت پر ان کو لٹا دیا جاتا اور گرم گرم پتھر ان کی چھاتی پر رکھ دیا جاتا، مشکیں باندھ کر لکڑیوں سے پیٹا جاتا، دھوپ میں بٹھایا جاتا، بھوکا رکھا جاتا، حضرت بلال رضی اللہ عنہ ان سب حالتوں میں احد احد کے نعرہ لگاتے رہتے کہ خدا ایک، خدا ایک (۲)۔

اس حالت میں ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان کے پاس سے گذرے اور امیہ کو حضرت بلال کے بدلہ میں ایک ان سے زیادہ مضبوط و توانا اور سیاہ فام غلام دے کر حضرت بلال کو آزاد کرا دیا (۳)۔

عمار اور ان کے والد یاسر، ان کی والدہ سمیہ مسلمان ہو گئے تھے، بنی مخزوم ان کو باہر لاتے اور ان کو مکہ کی سخت گرمی اور تپش میں مختلف قسم کی تکلیفیں پہونچاتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادھر سے گذر ہوتا تو آپ کو رنج و افسوس ہوتا، لیکن آپ اس وقت اور کچھ نہیں کر سکتے تھے، سوائے اس تلقین کے کہ: "اصبروا یا آل یاسر فإن موعدکم الجنة" (آل یاسر ذرا صبر رکھو! تمہاری منزل جنت ہے) ان پر ظلم اس قدر

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/۳۲۰۔ (۲) سیرت ابن ہشام: ۱/۳۱۸

(۳) سیرت ابن ہشام: ۱/۳۲۰۔

بڑھا کہ کم بخت ابوجہل نے بی بی سمیہ کے اندام نہانی میں نیزہ مارا جس کے اثر سے وہ شہید ہوگئیں (۱)۔

ابوفکیہہ جن کا نام افلح تھا، کے پاؤں میں رسی باندھ کر انہیں پتھریلی زمین پر گھسیٹا جاتا (۲)۔

خباب بن ارت کے سر کے بال کھینچے جاتے، گردن مروڑی جاتے، بارہا آگ کے انگاروں پر لٹایا گیا (۳)۔

قریش کا یہ سلوک غلاموں اور ضعیفوں کے ہی ساتھ نہ تھا، بلکہ اپنے فرزندوں اور عزیزوں کے ساتھ بھی وہ ایسی ہی سنگ دلی کا برتاؤ کیا کرتے۔

حضرت عثمان بن عفان کے اسلام لانے کی خبر ان کے چچا حکم بن ابی العاص بن امیہ کو ہوئی تو وہ حضرت عثمان کو کھجور میں باندھ دیتا اور نیچے سے دھواں دیا کرتا (۴)۔

حضرت مصعب بن عمیر کو ان کی ماں نے ان کو گھر سے نکال دیا تھا، اسی جرم میں کہ وہ اسلام لے آئے تھے (۵)۔

بعض صحابہ کو قریش گائے، اونٹ کے کچے چمڑے میں لپیٹ کر دھوپ میں پھینک دیتے تھے، بعض کو لوہے کی زرہ پہنا کر جلتے جلتے پتھروں پر لٹا دیا کرتے۔

دوسری طرف مسلمان ہو جانے والوں کو ان کے نبی کا حکم تھا کہ تکلیفوں پر صبر ہی کریں، کوئی جوابی کارروائی نہ کریں، کیونکہ اللہ تعالی کی طرف سے فرما دیا گیا تھا:

﴿کفوا أيديكم و أقيموا الصلاة﴾ (٦)   اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز کو قائم کرو

اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی کہ چونکہ اصل مقصد لوگوں کو سمجھانا اور ان کو دین حق ماننے والا بنانا ہے، اگر ان کی مخالفت

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/۳۲۰، زاد المعاد: ۳/۲۲۔ (۲) الکامل فی التاریخ: ۲/۶۹۔
(۳) الکامل فی التاریخ: ۲/۶۷۔ (۴) طبقات ابن سعد: ۳/۳۷۔
(۵) طبقات ابن سعد: ۳/۸۲، استیعاب: ۱/۲۸۸۔

کا جواب انتقامی انداز میں دیا جائے گا تو ان میں دین حق سے انکار میں مزید سختی بڑھے گی، اور ضد میں اضافہ ہوگا، پھر مسلمانوں کو اس وقت تک ایسی طاقت بھی حاصل نہیں تھی، کہ کفار کی طاقت کا اپنی طاقت سے مقابلہ کرسکیں، اور وہ اس ظلم کا جواب طاقت سے دیتے تو اس وقت کی کمزور دعوت کا کام جو کہ جبر سے نہیں بلکہ سمجھا بجھا کر کرنا تھا پیچھے رہ جاتا، ایک دوسرے کے درمیان غصہ اور دشمنی کی طاقت آزمائی ہونے لگتی، لہذا اصل مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے صبر و برداشت سے کام کرنا تھا، اس وقت کی کمزور پوزیشن میں صبر اور انتظار اور پروردگار سے نصرت کی طلب و دعا پر اکتفا کرنا تھا۔

بہر حال انسانوں کی اصلاح اور ان کے عقیدہ وعبادت کی درستگی کی کوشش اصل کام تھا، لہذا جہاں تک گنجائش تھی اسی کو اختیار کیا گیا، اور یہ رویہ اختیار کیا گیا کہ اس راہ میں چلنے والوں کو تکلیف اور دشواری پیش آئے اور اس مدت میں جو آزمائشی صورت حال ہو اس کو برداشت کرنا ہے، حالات کا تقاضہ بھی یہی تھا اور مسلمان کا معاملہ یہ ہے کہ اس کی تکلیفیں اس کی دنیاوی زندگی میں کتنی بھی زیادہ ہوں اس چھوٹی عمر ہی تک رہتی ہیں، اس کی مختصر اور فانی دنیاوی زندگی کے بعد ابدی زندگی شروع ہوگی جہاں ہر انسان کے لئے خواہ کسی طبقہ یا قوم سے تعلق رکھتا ہو اس کے اختیار کردہ عقیدہ وعبادت اور اس کے کردار و عمل کے مطابق عمل ہوگا، صحیح عقیدہ اور اچھا عمل رہا ہوگا تو اچھا معاملہ ہوگا، غلط عقیدہ اور برا عمل رہا ہوگا تو برا نتیجہ بھگتنا پڑے گا، اور اگر راہ حق میں تکلیفیں آئی ہوں تو تکلیفوں کا صلہ مزید اور بھرپور ملے گا، اور آخرت کی زندگی چونکہ طویل سے طویل تر ہوگی، لہٰذا یہ صلہ بھی طویل تر ملے گا، اور اس کی دنیاوی تکلیفوں کی تلافی بڑھ چڑھ کر ہو سکے گی۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سرپرستی میں دعوت کے کام انجام دینے اور دین پر عمل کرنے میں جو مصیبتیں اور تکلیفیں پیش آئیں، ان کو برداشت کرنے کا حکم

ہوا، ایسے ایسے واقعات پیش آئے جو ایک طرف بڑے دل دہلانے والے تھے، لیکن ایسے واقعات بھی سامنے آئے جو ایمان والوں کے دل بڑھانے والے بھی تھے، بہر حال ان کے ساتھ اللہ کی مدد تھی، یہ مدد خاص طور پر قرآن مجید کی آیات کے ذریعہ تسکین دینے کے ذریعہ تھی، جو ایک طرف حضورﷺ کی نبوت اور دین حق کے لانے والے کی حیثیت سے تصدیق وتحسین کرتی تھیں، اور دوسری طرف مسلمانوں کے عزم ویقین کو بڑھانے والی تھیں، اور نئے اسلام لانے والوں کو جب ان تکلیفوں سے پریشانی کا احساس بڑھتا تو آپﷺ تسکین دیتے اور اچھے نتیجہ کی امید دلاتے۔

ایذا رسانی کے لئے باقاعدہ کمیٹیوں کی تشکیل

قریش مکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر جو جور وستم کر رہے تھے ان کے اثر سے جب مسلمانوں میں کوئی تبدیلی ہوتی نہیں دیکھی تو کفار نے مزید تکلیف دینے کے طریقے طے کئے، اور اس کے لئے بجائے متفرق طریقوں کی کوششوں کے باقاعدہ کمیٹیاں بنائی گئیں۔

ایک کمیٹی بنائی گئی جس کا میر مجلس ابولہب تھا اور مکہ کے پچیس سردار اس کے ممبر تھے، اس کمیٹی میں حل طلب سوال ایک یہ بھی تھا کہ جو لوگ دور دراز سے مکہ میں آتے ہیں، ان سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق سے ایسی بات کہی جائے کہ وہ آپ سے ملنے اور آپ کی بات سننے سے بچیں تا کہ وہ لوگ آپ کی باتوں سے متاثر ہوں، نہ آپ کی بات پر دھیان دیں۔

ایک نے کہا کہ ہم نئے آنے والوں کو بتلایا کریں کہ وہ کاہن ہے۔

ولید بن مغیرہ (جو ایک خرانٹ بڈھا تھا) بولا: میں نے بہتیرے کاہن دیکھے ہیں، لیکن کہاں کاہنوں کی تک بندیاں اور کجا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام؟ ہم کو تو ایسی بات نہ کہنی چاہیے، جس سے قبائل عرب یہ سمجھیں کہ ہم جھوٹ کہہ رہے ہیں۔

ایک نے کہا: ہم اسے دیوانہ بتایا کریں گے۔

ولید بولا: محمد کو دیوانگی سے کیا نسبت ہے؟۔

ایک بولا: اچھا ہم کہیں گے: وہ شاعر ہے۔

ولید نے کہا: ہم جانتے ہیں کہ شعر کیا ہوتا ہے، اصناف سخن ہم کو بخوبی معلوم ہیں، محمد کے کلام کو شعر سے ذرا مشابہت نہیں۔

ایک بولا: ہم بتایا کریں گے کہ وہ جادوگر ہے۔

ولید نے کہا: جس طہارت ولطافت ونفاست سے محمد رہتا ہے وہ جادوگروں میں کہاں ہوتی ہے، جادوگروں کی منحوس صورتیں اور نجس عادتیں الگ ہی ہوتی ہیں۔

آخر اس کمیٹی نے مندرجہ ذیل ریزولیوشن پر اتفاق کیا:۔

"محمد کو ہر طرح سے دق کیا جائے، بات بات میں اس کی ہنسی اڑائی جائے، تمسخر اور ایذا اسے اسے سخت تکلیف دی جائے، محمد کو سچا سمجھنے والوں کو انتہا درجہ کی تکالیف کا شکار کیا جائے" (۱)۔

قریش کے سرداروں کی ابوطالب سے ملاقات

اب قریش میں ہر طرف اور ہر وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چرچا ہونے لگا، لوگ ایک دوسرے کو آپ کی مخالفت اور دشمنی پر آمادہ کرتے اور اس کے لئے فضا تیار کرتے، چنانچہ ایک مرتبہ سرداران قریش کا ایک وفد ابوطالب کے پاس گیا اور ان سے کہا:۔

"اے ابوطالب آپ سن رسیدہ ہوگئے ہیں، اور ہماری نگاہ میں آپ کی خاص قدر ومنزلت ہے، ہم نے آپ سے پہلے بھی ذکر کیا تھا کہ آپ اپنے بھتیجے کو منع کردیں، لیکن آپ نے اس سلسلہ میں کچھ بھی نہ کیا، اب خدا کی قسم ہم اس سے زیادہ

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/۲۷۰

صبر نہ کریں گے، جتنا ہم نے اب تک صبر کا ثبوت دیا ہے، اب ہم اپنے آباء واجداد کی باتوں کو غلط قرار دینا، اور ہم کو ناسمجھ اور بے عقل ٹھہرانا اور ہمارے معبودوں میں عیب نکالنا زیادہ برداشت نہیں کر سکتے، یا آپ ان کو اس حرکت سے باز رکھیں، یا پھر ہم ان سے اور آپ سے سمجھ لیں گے، یہاں تک ہم میں سے کوئی ایک فریق ختم ہو جائے''۔

ابو طالب پر اپنی قوم کی جدائی اور دشمنی بھی شاق تھی، لیکن وہ اس پر بھی راضی نہ تھے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد سے ہاتھ اٹھا لیں اور ان کو قوم کے حوالہ کر دیں، انہوں نے آپ کو بلا بھیجا اور کہا:۔

''میرے بھتیجے! تمہاری قوم کے لوگ میرے پاس آئے تھے، اور ایسا ایسا کہہ رہے تھے، بھتیجے! میری جان کا بھی خیال کرو، اور اپنی جان کا بھی، مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جس کو میں اٹھا نہ سکوں''۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سن کر خیال ہوا کہ شاید ابو طالب اب ان کے معاملہ میں متردد ہو گئے ہیں، اور اب آپ کے بچاؤ اور حفاظت کی فکر نہ کر سکیں گے، آپ کو رنج ہوا اور آپ نے اپنی مجبوری بتاتے ہوئے فرمایا:۔

''چچا! خدا کی قسم (مجھ پر ایسی ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ) اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند لا کر رکھ دیں، اور (اس کے بدلہ) یہ چاہیں کہ میں اس کام کو چھوڑ دوں، تو بھی میں ایسا نہیں کر سکوں گا، مجھے تو یہ کام کرنا ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کام کو غالب کر دے یا میں اسی راستہ میں ہلاک ہو جاؤں''۔

یہ کہتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، کیونکہ آپ کو یہ احساس ہوا کہ یہ مشفق چچا بھی جو آپ کو آپ کی آٹھ سالہ عمر کے وقت سے یتیم بھتیجا سمجھ کر بچاؤ اور حفاظت کی فکر رکھا کرتے تھے اور ان کی حمایت سے آپ کی دشواریوں میں کمی ہوتی تھی شاید اب بدلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، اور آپ

رو دئے، اور واپس تشریف لے جانے کے لئے اٹھے، آپ کو اس تأثر کے ساتھ جاتا دیکھ کر مشفق چچا پر اثر پڑا اور انہوں نے آپ کو آواز دی اور کہا کہ میرے بھتیجے! آؤ، آپ سامنے تشریف لائے، انہوں نے کہا: جاؤ اور جیسا تمہارا دل چاہے کرو، خدا کی قسم میں تم کو اپنے سے جدا کر کے کسی کے حوالہ نہ کروں گا(۱)۔

ابوالولید عتبہ اور رسول اللہ ﷺ کی بات چیت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم بدستور دعوت اسلام میں مصروف رہے اور قریش کی طرف سے ایذا رسانیاں اور رکاوٹیں صبر و برداشت کے ساتھ جھیلتے رہے، قریش حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قبیلۂ قریش کی شاخ عبد مناف جو آپ کی خاندانی شاخ تھی، کے دباؤ اور اس کے سردار ابوطالب کی حمایت کی وجہ سے قتل کر دینے کا ارادہ تو نہ کر سکے تھے، لیکن طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے، راہ میں کانٹے بچھاتے تھے، دوران نماز جسم مبارک پر نجاست ڈال دیتے تھے، بدزبانیاں کرتے تھے، قریش متحیر تھے کہ آپ ﷺ یہ سب سختیاں کیوں جھیلتے ہیں؟ انسانی دماغ ایسی سخت نفس کشی اور جانبازی کا مقصد جاہ و دولت اور نام و نمود کی خواہش کے سوا اور کیا خیال کر سکتا ہے، لہذا قریش نے بھی یہی خیال کیا، اس بنا پر قریش کے ایک بڑے شخص عتبہ بن ربیعہ کو قریشی سرداروں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا اور وہ آیا اور کہا کہ تم سے ضروری بات کرنا ہے، تم نے کچھ دنوں سے یہ جو جھگڑے کا کام شروع کر دیا ہے جس سے خاندان میں کشمکش اور مصیبت کھڑی ہو گئی ہے:

یہ تم کیوں کر رہے ہو، تمہارا اس کے پیچھے کیا مقصد ہے؟

تم کیا چاہتے ہو؟ اگر کوئی ایسا مقصد ہے جس کو پورا کرنے میں ہم لوگ کچھ کر سکیں تو ہم کر دیں اور تم اپنی یہ دعوت چھوڑ دو، مکہ کی ریاست چاہتے ہو تو وہ بتاؤ، کسی بڑے گھرانے میں شادی چاہتے ہو تو وہ بتاؤ، دولت کا ذخیرہ چاہتے ہو تو وہ بتاؤ، ہم کچھ کر سکتے ہیں تو کریں گے، ہم اس پر راضی ہیں کہ کل مکہ کا تم کو بادشاہ مان لیں، اگر

---

(۱) سیرت ابن ہشام، ص: ۲۶۵، ۲۶۶، سیرت حلبیہ: ۱/۴۶۲، الکامل فی التاریخ: ۲/۶۴۔

آسیب اور جن وغیرہ کے اثر سے یہ بات ہے تو ہم اس کو دور کرانے کا کوئی ذریعہ فراہم کریں گے اور اس پر پوری فیاضی سے اپنا مال خرچ کریں گے، یہاں تک تم کو اس سے شفائے کامل حاصل ہو جائے، لیکن ان باتوں سے باز آؤ، عتبہ کو اس درخواست کی کامیابی کا پورا یقین تھا۔

جب عتبہ سب کچھ کہہ چکا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا جو کچھ کہنا تھا آپ کہہ چکے؟ اس نے کہا: ہاں۔

آپ ﷺ نے فرمایا: اب میری بات سنیئے!

اس کے بعد آپ ﷺ نے سورۂ فصلت کی کچھ آیتیں سجدہ تک ان کے سامنے تلاوت کیں:

﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، حٰمٓ، تنزيل من الرحمن الرحيم، كتاب فصلت آياته قرآنا عربيا لقوم يعلمون، بشيرا و نذيرا، فأعرض أكثرهم فهم لا يسمعون، و قالوا قلوبنا في أكنة مما تدعونا إليه وفي آذاننا وقر و من بيننا و بينك حجاب فاعمل إننا عاملون﴾

[حٰم السجدة:۷]

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے، حٰم، یہ کلام اتارا ہوا ہے بڑے مہربان بہت رحم والے کی طرف سے، ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں واضح رکھی گئیں ہیں، یہ قرآن ہے عربی زبان میں ان لوگوں کے لئے جو (حقیقتوں کا) علم رکھتے ہیں، خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا ہے پھر بھی ان میں سے اکثر لوگوں نے اس سے اپنا منہ پھیر لیا، اور وہ سنتے ہی نہیں، اور (مزید یہ کہ) انہوں نے کہا کہ تو جس کی طرف ہمیں بلا رہا ہے ہمارے دل تو اس سے پردے میں ہیں، اور ہمارے کانوں (تک پہونچنے) میں (کانوں کی) گرانی (حائل) ہے اور ہم میں اور تم میں ایک حجاب (حائل) ہے (پھر اللہ تعالی نے اپنے نبی سے فرمایا کہ) اچھا تو اب اپنا کام کئے جاؤ ہم بھی یقیناً اپنا کام کرنے والے ہیں)۔

عتبہ کے کان میں جب یہ کلام پڑا تو اس نے خاموشی کے ساتھ اس کو سننا شروع کیا، اس نے دونوں ہاتھ پشت کی طرف ٹیک لئے تھے، اور کان کلام ربانی کے سننے میں محو تھے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آیت سجدہ تک پہونچے تو آپ نے سجدہ فرمایا، اور ارشاد ہوا: ابوالولید! تمھیں جو کچھ سننا تھا سن لیا، اب جیسا تم سمجھو۔

کلام پاک سننے سے عتبہ پر محویت کا ایک عالم طاری ہوگیا وہ ہاتھوں پر سہارا دیئے گردن پشت پر ڈالے ہوئے سنتا رہا، اور بالآخر چپ چاپ اٹھ کر چلا گیا، عتبہ واپس گیا تو وہ عتبہ نہ تھا، سرادارانِ قریش نے پوچھا کیا دیکھا؟ کیا کہا؟ کیا سنا؟ عتبہ بولا: اے قریش کے لوگو! میں ایسا کلام سن کر آیا ہوں جو نہ کہانت ہے، نہ شعر ہے، نہ جادو ہے، نہ منتر ہے، تم میرا کہا مانو، میری رائے پر چلو، محمد کو اپنے حال پر چھوڑ دو، اگر وہ کامیاب ہوکر عرب پر غالب آجائیں گے تو یہ تمہاری ہی عزت ہے، ورنہ عرب ان کو خود فنا کردیں گے، لوگوں نے یہ رائے سن کر کہا: لو عتبہ پر بھی محمد کی زبان کا جادو چل گیا اور عتبہ کی رائے منظور نہ کی (۱)۔

حضرت ابوبکر کے ساتھ کفارِ قریش کا معاملہ

ایک دن ابوبکر رضی اللہ عنہ ایک مجمع میں تبلیغ کی نیت سے کھڑے ہوئے اور اللہ اور اس کے رسول کی دعوت دینی شروع کی، تو مشرکین غیظ وغضب کے عالم میں ان پر ٹوٹ پڑے، اور ان کو بہت زیادہ زدوکوب کیا، عتبہ بن ربیعہ دو پھٹے پرانے جوتوں سے ان کے چہرہ کو اس طرح مارتا رہا کہ بعد میں ان کے چہرے کے خدوخال پہچانے نہ جاتے تھے۔

حضرت ابوبکر کے خاندان کے لوگ بنو تیم حضرت ابوبکر کو اس حالت میں اٹھا کر لے گئے کہ ان کو ان کی موت میں کوئی شبہ نہ تھا، دن ڈھلے آپ کو ہوش آیا اور پہلا

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/۲۹۳-۲۹۴۔

لفظ جو آپ کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا کہ بتاؤ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیریت سے ہیں؟ ان لوگوں نے اس پر ان کو برا بھلا کہا (کہ اس حال میں بھی ان کو اپنے سے زیادہ ان کی فکر ہے جن کی وجہ سے یہ ساری پریشانی اٹھانی پڑی)، اسی وقت ام جمیل جو اسلام لاچکی تھیں ان سے قریب ہوئیں تو انہوں نے ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں دریافت کیا، انہوں نے کہا آپ کی والدہ قریب کھڑی ہیں سن لیں گی، انہوں نے کہا میری اللہ سے نذر ہے کہ میں اس وقت تک نہ کچھ کھاؤں گا، نہ پیوں گا، جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت بابرکت میں حاضر نہ ہو جاؤں، یہ سن کر وہ دونوں وہاں رک گئیں، جب لوگوں کی آمد و رفت بند ہوئی اور سناٹا ہوا، تو وہ دونوں حضرت ابو بکرؓ کو سہارا دیکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائیں، ان کی یہ حالت دیکھ کر حضور ﷺ پر اثر پڑا، آپ ﷺ نے ان کی والدہ کے لئے بہت دعاء کی، اور ان کو اسلام لانے پر آمادہ کیا، اور وہ اسی وقت مسلمان ہوگئیں (۱)۔

حضرت حمزہ کا قبول اسلام

ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوہ صفا پر بیٹھے تھے، ابو جہل وہاں پہنچ گیا، اس نے نبی ﷺ کو پہلے گالیاں دیں، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چپ رہے، پھر مزید اس نے ایک پتھر حضور ﷺ کے سر پر پھینک مارا، جس سے خون چلنے لگا، اور حضور ﷺ نے برداشت کیا، جوابی کاروائی نہیں کی، تھوڑی دیر میں حضور ﷺ کے چچا حضرت حمزہ تیر کمان لگائے ہوئے ایک شکار سے واپس آئے، وہ اس وقت تک آپ کی نبوت پر ایمان نہیں لائے تھے، وہ قریش کے مضبوط بہادر اور حوصلہ مند نوجوان سمجھے جاتے تھے، ان کو عبد اللہ بن جدعان کی باندی نے جو ابو جہل کی حرکت

(۱) سیرت ابن کثیر: ۱/ ۴۳۹-۴۴۱، الاصابۃ: ۱/ ۴۲، ترجمہ از: نبی رحمت از سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، جزوی تبدیلی کے ساتھ، ص: ۱۶۷۔

کو دیکھ رہی تھی ماجرا سنایا، حضرت حمزہ کو یہ سن کر غصہ آیا اور وہ غصہ میں اسی وقت ابو جہل کے پاس پہنچے اور اس کے سر پر زور سے کمان کھینچ ماری، اس سے وہ زخمی ہوگیا، اور مارتے ہوئے کہا کہ تمہاری یہ جرأت کہ تم میرے بھتیجے محمد کو برا بھلا کہو، اور گالی دو، اب میں بھی ان کے دین کو مانے لیتا ہوں، اور وہ جو کہتے ہیں وہی میں کہتا ہوں، ابو جہل خاموش رہا، اس طرح حضرت حمزہ اسلام لے آئے، اور ان کے اسلام لانے سے قریش کے اسلام دشمن لوگوں پر ان کی شجاعت، رسوخ اور وجاہت کی وجہ سے ایک بڑی ضرب لگی (۱)۔

رسول اللہ ﷺ کو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے سے تقویت ملی، کیونکہ وہ مضبوط آدمی تھے، قریش کچھ ان سے دبتے تھے، لیکن پھر بھی آپ کو مزید تقویت کی خواہش تھی، چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے پروردگار سے دعا کی کہ قریش کے دیگر دو زبردست جوانوں عمر بن خطاب اور ابو جہل میں سے کسی کو اسلام کی توفیق مل جائے، آپ کی یہ دعا حضرت عمر بن خطاب کے لئے قبول ہوگئی۔

حضرت عمر کا قبول اسلام

حضرت حمزہ کے اسلام لانے سے تین دن بعد حضرت عمر بن خطاب کو بھی جو حضور ﷺ کی مخالفت میں دیگر قریشیوں سے کم نہ تھے اسلام کی توفیق مل گئی، وہ شخصی طور پر بڑے بہادر اور دلیر تھے، اور قریش کی جانب سے بیرونی ممالک کی سفارت کا کام بھی ان سے متعلق ہوتا تھا، قریشی نوجوانوں کی ایک نشست میں حضور ﷺ کے خلاف تدبیریں سوچی جارہی تھیں کہ حضرت عمرؓ لوگوں کی بات چیت اور اس مسئلہ کا حل نکالنے کے لئے غور و خوض سے متاثر ہو کر کہنے لگے کہ روز روز کی یہ چخ چخ کی ضرورت نہیں، قصہ ہی ختم کر دیتا ہوں، اور اپنی بہادری کے بھروسہ پر نبی ﷺ کے قتل کا ارادہ کر کے مجلس سے نکلے، بدن پر سب ہتھیار سجا رکھے تھے، راستہ میں ایک مسلمان حضرت نعیم بن عبد اللہ ملے، اور حضرت عمر کے دم خم دیکھ کر بولے کہ عمر کہاں کا ارادہ ہے؟ عمر بولے: ارے یہ محمد جنھوں نے ایک مصیبت کھڑی کر رکھی ہے ان کو ختم کرنے کا ارادہ ہے، حضرت نعیم پر اثر پڑا، اور وہ ان کا ذہن موڑنے کے لئے بولے: پہلے اپنی بہن اور بہنوئی کو بھی تو دیکھو، وہ

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/ ۲۹۱-۲۹۲

دونوں بھی مسلمان ہو چکے ہیں، حضرت عمرؓ الٹے پاؤں اپنی بہن اور بہنوئی کی طرف چل دیئے، اس وقت ان کے پاس خباب بن الارتؓ بیٹھے ہوئے تھے، ان کے ساتھ ایک صحیفہ تھا جس میں سورۂ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی، اور وہ ان کو یہ سورہ پڑھا رہے تھے، جب ان کو حضرت عمر کی آہٹ محسوس ہوئی تو خبابؓ گھر کے ایک اندرونی کمرہ میں چھپ گئے، فاطمہ نے یہ صحیفہ جلدی سے ران کے نیچے دبالیا، لیکن حضرت عمر نے خباب بن الارتؓ کی تلاوت وقرأت سن لی تھی، جب اندر داخل ہوئے تو پوچھا کہ یہ کیا کھسر پھسر ہو رہی تھی؟ ان دونوں نے جواب دیا کہ کیا تم نے کچھ سن لیا؟ انھوں نے کہا: ہاں سنا ہے، اور مجھے معلو ہو چکا ہے کہ تم نے محمدؐ کا دین قبول کرلیا ہے، پھر وہ اپنے بہنوئی سعید بن زید کو مارنے دوڑے ان کی بہن فاطمہؓ ان کو بچانے کے لئے لپکیں تو انہوں نے ان کی بھی خبر لی اور زخمی کردیا۔

جب یہ سب کچھ کر چکے تو ان کی بہن اور بہنوئی نے کہا کہ ہاں بے شک ہم مسلمان ہو چکے ہیں، اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لا چکے ہیں، اب تم ہمارا جو چاہے کرلو۔

جب عمرؓ نے اپنی بہن کے جسم پر خون کے دھبے دیکھے، تو ان کا جوش ٹھنڈا ہوا اور ان کو اپنے اس فعل پر ندامت اور خجالت سی ہوئی، کیونکہ عرب شرفاء میں عورت کو اس طرح مارنا عیب سمجھا جاتا تھا، بدنامی ہوتی، وہ رک گئے، اور کہنے لگے، مجھے وہ صحیفہ دو جو ابھی میں نے پڑھتے ہوئے تم دونوں کو سنا تھا، میں دیکھوں کہ محمدؐ کی تعلیم کیا ہے؟ حضرت عمرؓ پڑھے لکھے تھے، جب انھوں نے یہ کہا تو ان کی بہن بولیں کہ ہمیں ڈر ہے کہ معلوم نہیں تم اس کے ساتھ کیا کرو، انھوں نے کہا تم ڈرو نہیں اطمینان رکھو، انھوں نے اپنے معبودوں کی قسم کھا کر ان کو اس کا یقین دلایا، جب انھوں نے ایسی باتیں کہیں تو ان کی بہن کو یہ لالچ ہوئی کہ شاید عمر اسلام لے آئیں، انھوں نے نرمی سے کہا، بھائی جان آپ شرک کی وجہ سے نجس و ناپاک ہیں، اور اس صحیفہ کو صرف پاک آدمی چھو سکتا ہے۔

حضرت عمر کھڑے ہوئے جا کر غسل کیا تب ان کی بہن نے یہ صحیفہ ان کے ہاتھ میں دیا، اس میں سورۂ طٰہٰ درج تھی، تھوڑا ہی سا پڑھا تھا کہ حضرت عمرؓ بول اٹھے کیا پاکیزہ اور لائق احترام کلام ہے؟

جب خبابؓ نے یہ سنا تو اپنے حجرہ سے نکل کر سامنے آ گئے، اور کہنے لگے، اے عمر، خدا کی قسم مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی دعوت سے آپ کو ضرور سرفراز کرے گا، اس لئے کہ میں نے کل ہی حضورؐ کو یہ دعا کرتے سنا تھا، اے اللہ اسلام کی ابوالحکم بن ہشام (ابوجہل) یا عمر بن الخطاب کے ذریعہ مدد فرما، اے عمر! اب تو تم کو کچھ اللہ کا خوف اور شرم ولحاظ آنا چاہئے۔

اس وقت عمر نے کہا، خباب! مجھے محمد ﷺ کے پاس لے چلو، میں ان کے ہاتھ پر اسلام قبول

کرنا چاہتا ہوں، خبابؓ نے کہا کہ وہ صفا کے پاس ایک گھر دارارقم میں ہیں، آپ کے ساتھ اور کئی ہمراہی ہیں، حضرت عمرؓ نے تلوار حمائل کی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلے، اور دروازہ پر دستک دی، حضرت عمر اندر داخل ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابن خطاب! یہاں کس ارادہ سے آئے ہو؟۔ حضرت عمرؓ نے کہا، یارسول اللہ میں آپ کے پاس اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے اور اللہ تعالی نے جو ہدایت اور تعلیم ان کے ذریعہ بھیجی ہے اس کو قبول کرنے حاضر ہوا ہوں (۱)۔

یہ تھا دعوت حق کا اثر کہ جو گھر سے قاتل بن کر نکلا تھا، وہ حقیقت سے واقف ہوجانے پر جاں نثار بن گیا، آگے چل کر ان کا لقب فاروق ہوا۔ انہوں نے اسلام کے لئے بڑے بہادرانہ معرکے انجام دئے۔

وہاں سے نکل کر حضرت عمر نے اپنے مسلمان ہونے کا کھل کر اعلان کیا، یہ بات قریش میں فوراً پھیل گئی، وہ حضرت عمر سے بھی لڑنے پر آمادہ ہوگئے، لیکن حضرت عمر بھی سخت بنے رہے، اور مخالفین اور دشمنان اسلام ان سے کچھ دبے، لیکن جن مسلمانوں پر بس چلتا ان کو زیادہ سے زیادہ تنگ کرتے اور ایذاء پہونچاتے رہے۔

ہجرت حبشہ

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ آپ کے اصحاب ورفقاء کو سخت آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اور آپ ان کی حفاظت اور مدافعت نہیں کر پا رہے ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا، اگر تم لوگ حبشہ کی طرف نکل جاؤ تو اچھا ہے، وہاں کا جو بادشاہ ہے اس کی حکومت میں کوئی دوسرے پر ظلم نہیں کرتا، وہ ایک اچھا ملک ہے، یہاں تک اللہ تعالی تمہارے لئے نجات وکشادگی کا کوئی سامان پیدا کردے۔

اس موقع پر مسلمانوں میں سے جو بہت پریشان ہوگئے تھے انہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی، یہ اسلام میں پہلی ہجرت تھی، یہ دس آدمی تھے، انہوں نے اپنا امیر حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا تھا، اس کے بعد حضرت جعفر بن ابی طالب نے ہجرت کی، پھر بہت سے مسلمان یکے بعد دیگرے وہاں پہونچے، ان میں کچھ تنہا تھے اور کچھ اہل وعیال کے ساتھ تھے، ان سب لوگوں کی جنھوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی، کل تعداد ۸۳ بتائی گئی ہے (۲)۔

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/۳۴۲-۳۴۸۔

(۲) سیرت ابن ہشام: ۱/۳۲۱، الکامل فی التاریخ: ۲/۷۶، طبقات ابن سعد: ۱/۲۰۸۔

قریش کا تعاقب

کفار قریش نے حبشہ ہجرت کرنے والے مسلمانوں کا سمندر تک تعاقب کیا، مگر یہ کشتیوں میں بیٹھ کر روانہ ہو چکے تھے، قریش نے جب یہ دیکھا کہ مسلمان وہاں پہونچ گئے جہاں ان کو اور آرام وسکون مل گیا ہے، تو انہوں نے عبداللہ بن ابی ربیعہ اور عمرو بن العاص بن وائل کو وہاں بھیجا، یہ دونوں نمائندے بہت سے تحائف اور ہدایا لیکر شاہ حبش نجاشی کے پاس گئے، اور جا کر کہا کہ ان لوگوں کو جو ہمارے ملک سے بھاگ کر آئے ہیں، ہمارے سپرد کر دیا جائے، لیکن نجاشی نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا، اور مسلمانوں کو بلایا اور اپنے پادریوں کو جمع کیا، اور مسلمانوں کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے کہا: وہ دین کیا ہے جس کے لئے تم نے اپنی قوم کو چھوڑ دیا، اور اس کو ترک کرنے کے بعد نہ میرے دین کو قبول کیا اور نہ کسی اور معروف دین و مذہب کو اختیار کیا، اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی جعفر بن ابی طالب کھڑے ہوئے اور انہوں نے نجاشی سے کہا: میں ان لوگوں سے کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں، آپ ان سے جواب طلب فرمائیں:۔

۱۔ کیا ہم کسی کے غلام ہیں جو اپنے آقاؤں سے بھاگ کر آئے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو بیشک ہم لائق واپسی ہیں۔

نجاشی نے عمرو بن العاص سے مخاطب ہو کر کہا: کیا یہ لوگ کسی کے غلام ہیں؟۔

عمرو بن العاص نے کہا: غلام نہیں، بلکہ آزاد اور شریف ہیں۔

۲۔ حضرت جعفر نے نجاشی سے کہا: آپ ان سے یہ بھی دریافت کریں کہ کیا ہم کسی کا خون کر کے آئے ہیں؟ اگر ہم کسی کا ناحق خون کر کے آئے ہیں تو آپ ہم کو بلا تامل اولیائے مقتول کے حوالہ کر دیجئے۔

نجاشی نے عمرو بن العاص سے مخاطب ہو کر کہا: کیا یہ لوگ کوئی ناحق خون کر کے آئے ہیں؟۔

عمرو بن العاص نے کہا: خون کا ایک قطرہ بھی نہیں۔

۳۔ حضرت جعفر نے نجاشی سے کہا: آپ ان سے یہ بھی دریافت کریں کہ کیا ہم کسی کا مال لیکر بھاگے ہیں؟ اگر بالفرض ہم کسی کا مال لیکر آئے ہیں، تو ہم اس کو ادا کرنے کے لئے تیار ہیں۔

نجاشی نے عمرو بن العاص سے مخاطب ہوکر کہا: اگر یہ لوگ کسی کا مال لیکر آئے ہیں تو میں اس کا کفیل اور ضامن اور اس کے تاوان کا ذمہ دار ہوں۔

عمرو بن العاص نے کہا: یہ لوگ تو کسی کا ایک قیراط یعنی ایک پیسہ بھی لے کر نہیں آئے۔

نجاشی نے وفد قریش سے مخاطب ہوکر کہا: پھر کس چیز کا مطالبہ ہے؟۔

عمرو بن العاص نے کہا: ہم اور یہ ایک دین پر تھے، ہم اسی دین پر قائم رہے اور ان لوگوں نے اس کو چھوڑ دیا اور ایک نیا دین اختیار کرلیا۔

نجاشی نے صحابہ سے مخاطب ہوکر کہا: جس دین کو تم نے چھوڑا اور جس دین کو تم نے اختیار کیا وہ کیا دین ہے؟۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے دونوں دین کی وضاحت کرتے ہوئے حسب ذیل تقریر کی۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی تقریر

''اے بادشاہ! ہم ایک جاہلیت والی قوم تھے، بتوں کو پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، ہر قسم کی بے حیائیوں اور گناہوں میں آلودہ تھے، ہم میں جو طاقتور ہوتا وہ کمزور کو پھاڑ کھاتا، ہم اسی حال میں تھے کہ اللہ تعالی نے ہم میں ہی سے ایک رسول بھیجا، جس کے خاندان اور نسب وحسب سے اور جس کی سچائی سے، امانت داری، اور عفت و پاکبازی سے ہم پہلے سے واقف تھے، انہوں نے ہم کو یہ دعوت دی کہ ہم صرف ایک اللہ پر ایمان لائیں، اور اسی کی عبادت کریں، اور ہم اور ہمارے باپ دادا جن بتوں اور پتھروں کو پوجتے تھے، اس کو بالکل چھوڑ دیں، اور ان سے قطع تعلق کر لیں، انہوں نے ہم کو سچ بولنے، امانت ادا کرنے، ناجائز اور حرام باتوں اور ناحق خون سے پرہیز کرنے کا حکم دیا، بے حیائی کے کاموں، جھوٹ فریب، یتیم کا مال کھانے، پاک دامن و پاک باز عورتوں پر الزام لگانے سے منع فرمایا، انہوں نے ہم کو حکم دیا ہے

کہ ہم صرف اللہ کی عبادت کریں، اور اس کے ساتھ کسی شے کو شریک نہ ٹھہرائیں، انہوں نے ہمیں نماز کا، زکاۃ کا، روزہ کا حکم دیا، ہم نے ان کی تصدیق کی، ان پر ایمان لائے، اور جو طریقہ اور تعلیم وہ اللہ کی طرف سے لائے ہیں اس کی پیروی کی، صرف ایک اللہ کی عبادت اختیار کی، اس کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں کیا، جو انہوں نے حرام کیا اس کو حرام مانا، جو انہوں نے حلال کیا، اس کو حلال تسلیم کیا، اس پر ہماری قوم ہماری دشمنی پر کمربستہ ہوگئی، انہوں نے ہم کو طرح طرح کی تکلیفیں پہونچائیں، اور ہم کو اس دین سے پھیرنے کے لئے مختلف آزمائشوں میں ڈالا، اور اس کی کوشش کی کہ اللہ کی عبادت چھوڑ کر ہم پھر بتوں کی عبادت کو اختیار کرلیں، اور جن گناہوں اور جن جرائم کو پہلے جائز سمجھتے تھے، پھر جائز اور حلال سمجھنے لگیں، جب انہوں نے ہمارے ساتھ بہت زور زبردستی کی، ہم پر ظلم کیا، ہمارا جینا دوبھر کردیا، اور ہمارے دین کے راستہ میں دیوار بن کر کھڑے ہوگئے، تو ہم آپ کے ملک میں پناہ لینے کے لئے آئے اور اس کے لئے آپ ہی کا انتخاب کیا، آپ کے جوار اور پناہ کی خواہش کی، اے بادشاہ! ہم یہاں یہ امید لے کر آئے ہیں کہ ہم پر کوئی ظلم نہ کیا جاسکے گا" (۱)۔

نجاشی کا ہمدردانہ رویہ

نجاشی نے یہ تقریر سن کر پسندیدگی کا اظہار کیا اور کہا: جاؤ تم کو یہاں امن ہے، اور قریش کے بھیجے ہوئے لوگوں کو ان کے ہدیے واپس کئے اور ان کی بات نہیں مانی، دوسرے روز یہ دونوں قریشی پھر نجاشی کے پاس گئے اور کہا کہ یہ حضرت عیسی بن مریم کو بھی نہیں مانتے، نجاشی نے مسلمانوں کو بلا کر پوچھا، اس پر حضرت جعفر نے قرآن مجید سے سورہ مریم کی ابتدائی آیتیں تلاوت کیں، تو نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھا کر کہا: بخدا ابن مریم اس سے زیادہ نہ تھے اور رو پڑا، حتی کہ آنسوؤں سے اس کی

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/۳۳۴-۳۳۸، الکامل فی التاریخ: ۲/۷۹-۸۲، ترجمہ از نبی رحمت، از سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، ص: ۱۷۵، ۱۷۶۔

داڑھی تر ہوگئی، اس کے دربار کے پادریوں پر بھی گریہ طاری ہوگیا، یہاں تک کہ ان کے (مذہبی) صحیفے آنسوؤں سے بھیگ گئے، اور نجاشی نے کہا: محمد تو وہی رسول ہیں جن کی خبر یسوع مسیح نے دی تھی، اللہ کا شکر ہے کہ مجھے اس رسول کا زمانہ ملا، اس کے بعد نجاشی نے مسلمانوں کو بہت اعزاز واکرام سے رخصت کیا، ان کو امان دی، اور قریش کے دونوں قاصد ذلیل وخوار ہوکر وہاں سے نکلے، اور مسلمانوں نے بہت اچھے گھر اور اچھے پڑوس میں عزت کی جگہ پائی (۱)۔

شعب ابی طالب کا حصار

جب قریش نے دیکھا کہ ہزارہا اذیتوں اور مخالفتوں کے باوجود اسلام کا دائرہ بڑھتا جارہا ہے، عمر اور حمزہ جیسے مضبوط اشخاص اسلام لاچکے ہیں، اور نجاشی نے بھی مسلمانوں کو اپنی طرف سے حفاظت دی ہے، سفراء بے نیل مرام واپس آئے، مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، اب یہ تدبیر سوچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل خاندان کو پہاڑ کے درے کے اندر محصور کرکے مجبور و بے سہارا کردیا جائے، اور پہاڑ کا یہ درہ وہی درہ تھا جس میں ابوطالب کا خاندان رہتا تھا جو شعب ابی طالب کے نام سے موسوم تھا، چنانچہ تمام قبائل نے ایک معاہدہ مرتب کیا، کہ کوئی شخص نہ خاندان بنی ہاشم سے قربت کرے گا، نہ ان کے ہاتھ خرید وفروخت کرے گا، نہ ان سے ملے گا، نہ ان کے پاس کھانے پینے کا سامان جانے دے گا، جب تک وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کے لئے حوالہ نہ کردے، یہ معاہدہ منصور بن عکرمہ نے لکھا، اور در کعبہ پر آویزاں کیا گیا (۲)۔

حضور ﷺ اپنے شفیق چچا وسرپرست حضرت ابوطالب کی سرکردگی میں بنی ہاشم کے بیشتر افراد کے ساتھ جن میں آپ کا دشمن چچا ابولہب شریک نہیں ہوا لیکن

(۱) الکامل فی التاریخ: ۲/ ۸۱۔ (۲) السیرۃ النبویۃ للذھبی: ۱/ ۲۲۱۔

خاندان بنی ہاشم کے وہ سب بھی شریک تھے جو مسلمان نہیں ہوئے تھے لیکن خاندانی ہمدردی رکھتے تھے حضورﷺ کے ساتھ شعب ابی طالب میں پناہ گزیں ہوئے، یہ زمانہ ایسا سخت گذرا کہ محصور مسلمان طلح کے پتے کھا کھا کر رہتے تھے، بچے جب بھوک سے روتے تھے تو باہر تک آواز جاتی تھی، قریش سن سن کر خوش ہوتے تھے، حضرت سعد بن ابی وقاص کا بیان ہے کہ ایک دفعہ سوکھا چمڑا ہاتھ آ گیا، میں نے اس کو پانی سے دھویا، پھر آگ پر بھونا، اور پانی ملا کر کھایا، لیکن بعض رحم دلوں کو مسلمانوں کی اس حالت زار پر ترس بھی آتا تھا، ایک دن حکیم بن حزام نے جو حضرت خدیجہ کے بھتیجے تھے، تھوڑے سے گیہوں اپنے غلام کے ہاتھ حضرت خدیجہ کے پاس بھیجے، راہ میں ابوجہل نے دیکھ لیا اور چھین لینا چاہا، اتفاق سے ابوالبختری کہیں سے آ گیا، وہ اگرچہ کافر تھا، لیکن اس کو رحم آ گیا، اور ان محصور افراد خاندان کی سنی جو سب ایک دوسرے کے عزیز وقریب ہی ہوتے تھے، ان کی بے بسی پر ترس کھا کر کہا کہ ایک شخص اپنی پھوپھی کو کھانے کے لئے کچھ بھیجتا ہے تو کیوں روکتا ہے؟ ان ہی حالات میں حضورﷺ کو اپنی قریشی شاخ بنو ہاشم کے اکثر افراد کے ساتھ تین سال گذارنے پڑے(۱)۔

محاصرہ سے گلوخلاصی

بالآخر وہ دن آیا کہ ہشام بن عمرو، زہیر بن اُبی اُمیہ بن المغیرہ، مطعم بن عدی اور زمعہ بن الاسود جو کہ مسلمانوں کے تئیں ایک گونہ نرمی اور انسانیت کا پہلو رکھتے تھے، قریش کے پنجۂ استبداد سے مسلمانوں کو نجات دلانے کے لئے مشورہ کرنے لگے اور آپس میں غور وخوض اور مظلوموں پر اس قدر سختی کو ناپسند کرتے ہوئے اس بات پر متفق ہوئے کہ قریش سے ان حضرات کی گلوخلاصی کے لئے کوشش کی جائے، چنانچہ

(۱) السیرۃ النبویۃ للذھبی: ۱/۲۲۱۔

یہ سب لوگ مل کر حرم میں گئے، زہیر نے سب لوگوں کو مخاطب کر کے کہا: اے اہل مکہ! یہ کیا انصاف ہے کہ ہم لوگ آرام سے بسر کریں، اور بنو ہاشم کو آب و دانہ نصیب نہ ہو، خدا کی قسم جب تک یہ ظالمانہ معاہدہ چاک نہ کر دیا جائیگا، میں باز نہ آؤں گا، ابوجہل برابر سے بولا ہرگز کوئی اس معاہدہ کو ہاتھ نہیں لگا سکتا، زمعہ نے کہا تو جھوٹ کہتا ہے، جب یہ لکھا گیا اس وقت بھی ہم راضی نہ تھے، دوسری طرف حضور ﷺ کو وحی کے ذریعہ معلوم ہوا کہ کعبہ کے اندر رکھی ہوئی وہ دستاویز دیمک کی نذر ہوگئی ہے، اور اس میں سوائے بسم اللہ کے سب ختم ہوگیا ہے، آپ نے یہ بات ابوطالب کو بتائی، انہوں نے قریش سے کہا اور اسی حال میں مطعم نے اندر جا کر ہاتھ بڑھا کر دستاویز نکالی تو اس کے ایک حصہ کو دیمک کھا چکی تھی، اور اس میں لکھی ہوئی عبارت ختم ہوگئی تھی، یہ بات کفار کو دکھا کر دستاویز چاک کر دی، اور مطعم بن عدی، عدی بن قیس، زمعہ بن الاسود، ابوالبختری، زہیر سب ہتھیار باندھ باندھ کر بنو ہاشم کے پاس گئے، اور ان کو درہ سے نکال لائے، مسلسل تین برس تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام آل ہاشم شعب ابی طالب میں محصور رہے تھے اس کے بعد اس حصار سے ان کی گلوخلاصی ہوئی (۱)۔

عام الحزن

شعب ابی طالب سے رہائی پانے کے بعد قریش کا معاملہ ایذاء رسانی کا بدستور جاری رہا، البتہ آپ کے لئے ایک مزید پریشانی اس طور پر بڑھی کہ آپ کے بڑے باثر حامی چچا ابوطالب اور آپ کی بڑی دلداری اور ہمدردی کرنے والی اہلیہ محترمہ حضرت خدیجہ کی وفات ہوگئی، یہ دونوں آپ کے نہایت خیر خواہ اور مشفق تھے، ان کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حسن صحبت، حسن سلوک، وفاداری اور نصرت وحمایت کا جو معاملہ تھا وہ روز روشن کی طرح عیاں تھا، دونوں کی وفات ۱۰ نبوی

(۱) طبقات ابن سعد: ۱/۲۱۰۔

میں شعب ابی طالب سے رہائی ملنے کے بعد یکے بعد دیگرے پیش آئی (۱)، انکی وفات کا آپ کے قلب پر نہایت گہرا اثر پڑا، اور اس طرح یہ سال آپ کے لئے عام الحزن بنا اور آپ کو اپنی حمایت اور ہمدردی ملنے کے معاملہ میں فکرمندی بہت بڑھ گئی۔

طائف کا سفر

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی میں نبوت کی ذمہ داری ملنے کے شروع کے تین سال تک مخفی کوشش کے بعد دعوت اسلام کے اعلان کے وقت سے کفار کی طرف سے ایذارسانی اور ظلم وستم کے جو سخت آزمائشی مواقع پیش آئے، ان سے جسمانی خطرات اور ذہنی پریشانی پیش تو آتی تھی، لیکن چچا ابوطالب کی طرف سے ملنے والی حمایت کی وجہ سے کسی بڑے واقعہ کا خطرہ نہیں محسوس ہوتا تھا، مزید یہ کہ لوگوں کی ایذارسانی سے طبیعت کو جو ملال پیش آتا تھا وہ گھر میں جا کر اہلیہ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے تسکین کی پاس سے دور ہوجاتا تھا، لیکن اب ابوطالب کے نہ رہنے سے بعض سنگین خطرات کا اندیشہ ہوگیا تھا، اس صورت میں آپ کو خیال آیا کہ مکہ کے ہمسر شہر طائف کی کسی بڑی وبااثر شخصیت کی ہمدردی اگر حاصل ہوجائے تو دعوت کے کام میں خطرات کی کمی ہوسکتی ہے۔

لہذا آپ کو کسی مضبوط خاندان کی بڑی شخصیت کی ہمدردی وتعاون کے حصول کی ضرورت محسوس ہوئی، جس کی بنا پر آپ کی نظر طائف پر پڑی، جہاں کے بااثر خاندان قبیلہ ثقیف کی شخصیتوں میں کئی ایک شخصیتیں تھیں، آپ نے وہاں جاکر ان سے بات کرنے کا ارادہ کیا، اور بروقت سفر کرکے وہاں تشریف لئے گئے، اور وہاں کے تین سربراہوں عبد یالیل، مسعود اور حبیب سے حق کی ہمدردی اور حمایت طلب کی، لیکن خدا کو یہاں بھی اپنے رسول کے لئے عزم واستقامت اور صبر وبرداشت کو ہی پسند کرنا تھا، لہٰذا وہاں کے بااثر لوگوں سے آپ کو ہمدردی نہیں ملی، بلکہ

---

(۱) سیرت حلبیہ: ۲/۴۰-۵۰۔

اس کے برعکس یہ ہوا کہ انہوں نے مسافروں کے ساتھ کیا جانے والا عربی اخلاق بھی آپ کے ساتھ نہیں برتا، اور قریش کے مخالفانہ رویہ کو بنیاد بناتے ہوئے آپ کے ساتھ ہمدردی کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے، ان میں سے ایک نے کہا جو کعبہ کا پردہ سی رہا تھا: ''کیا تم کو خدا نے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے''، دوسرے نے کہا: ''کیا خدا کو تیرے سوا اور کوئی نہیں ملتا تھا''؟ تیسرے نے کہا: ''میں بہر حال تجھ سے بات نہیں کرسکتا، تو اگر سچا ہے تو تجھ سے گفتگو کرنا خلاف ادب ہے، اور اگر جھوٹا ہے تو گفتگو کے قابل نہیں'' اور صرف یہی نہیں، بلکہ عام انسانی اخلاق کے برعکس شہر کے اوباش لوگوں کو پیچھے لگا دیا، انہوں نے آپ پر پتھر چلائے جس سے آپ کے قدم لہولہان ہوگئے، اور آپ شہر کے لوگوں سے مایوس اور زخم خوردہ ہوکر نکلے، اور شہر کے باہر ایک جگہ بیٹھ گئے (۱)۔

عداس کا قبول اسلام

وہاں قریشی خاندان کے کچھ لوگوں (عتبہ بن ربیعہ وشیبہ بن ربیعہ) کا باغ تھا، وہ باغ میں اس وقت اتفاقاً موجود تھے، آپ کی بے بسی اور زخم خوردگی دیکھ کر باوجود مخالف ہونے کے رشتہ داری کے تقاضہ سے ہمدردی کا احساس ہوا، اور اپنے غلام عداس کے ذریعہ انگور کا ایک خوشہ بھیجا، عداس آئے، اور اس کو پیش کیا، آپ نے بسم اللہ کہتے ہوئے تناول کیا، تو عداس نے بسم اللہ پر تعجب کرتے ہوئے پوچھا، تو آپ نے اپنے نبی ہونے کا ذکر کیا، عداس انجیل کی باتیں جانتے تھے، اس کی بنا پر سمجھ گئے کہ یہ واقعی نبی ہونگے، اور ان کو بوسہ دینے لگے اور مسلمان ہوگئے اور جب لوٹ کر اپنے آقا کے پاس آئے تو انہوں نے ملامت کی اور کہا کہ اس شخص پر اعتبار نہ کرو، عداس نے ان کی بات خاموشی میں ٹال دی (۲)، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹھ کر اللہ تعالی سے اپنی پریشانی کا ذکر کرتے ہوئے دعا کی، آپ نے اپنی دعا میں بھی صرف اپنی بے بسی کے اظہار کے ساتھ راہ حق میں صبر و برداشت اور رضاء الہی پر اکتفا کرنے کو اختیار کیا تھا، جس کا اظہار آپ کی دعا سے بخوبی ہوتا ہے:۔

(۱) سیرت حلبیہ: ۲/۵۲۔ (۲) سیرت ابن ہشام: ۱/۴۲۱۔

" اللّٰھم إليك أشكو ضعف قوتی و قلة حيلتی، و هوانی علی الناس، یاأرحم الراحمين أنت رب المستضعفين، و أنت ربی، إلی من تكلنی، إلی بعيد يتجهمنی، أم الی عدو ملكته أمری،إن لم يكن بك غضب علی فلا أبالی،غير أن عافيتك هی أوسع لی، أعوذ بنور وجهك الذی أشرقت له الظلمات ، و صلح عليه أمر الدنيا، و الآخرة، من أن ينزل بی غضبك، أو يحل علی سخطك، لك العتبی،حتی ترضی، و لا حول و لا قوة إلا باللّٰه" (الٰہی تیرے ہی سامنے اپنی کمزوری ، بے سروسامانی اورلوگوں کی طرف سے تحقیر کا برتاؤ کئے جانے سے اپنی پریشانی بیان کرتا ہوں،تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے، درماندہ اور عاجزوں کا مالک تو ہی ہے، اور میرا مالک بھی تو ہی ہے، مجھے کن کے حوالہ کررہا ہے؟ کیا کسی ایسے بیگانہ کے جو میرے ساتھ ترش روئی اختیار کرے، یا کسی دشمن کے جس کو مجھ پر پورا قابو حاصل ہوگیا ہو،لیکن اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں تو پھر مجھے کسی چیز کی پرواہ نہیں،لیکن تیری طرف سے مجھکو عافیت ملے تو میرے لئے زیادہ آسانی ہے، میں تیری ذات کے اس نور کی پناہ میں رہنا چاہتا ہوں جس سے سب تاریکیاں روشن ہوجاتی ہیں، اور جس سے دین و دنیا کے کام ٹھیک ہوجاتے ہیں، اس بات کے مقابلہ میں کہ تیرا غضب مجھ پر اترے، یا تیری ناراضی مجھ پر وارد ہو، مجھے تو تیری ہی رضامندی حاصل کرنے کی برابر فکر کرتے رہنا ہے حتی کہ تو راضی رہے، اسکے لئے کوشش کرتا ہوں، ساری حفاظت اور طاقت تیرے ہی پاس ہے)۔

پردیس میں اللہ تعالی کو اپنے حبیب کی یہ کیفیت دیکھکر خصوصی رحم آیا، اور خصوصی مدد کی پیشکش ہوئی، اور حضرت جبرئیل علیہ السلام پیغام لائے، کہ زلزلہ کے ذریعہ ان ظالموں کو تباہ و برباد کردینے کے لئے فرشتہ تیار ہے، آپ کہیں تو ان کو ابھی سزا دیدی جائے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصلاح وارشاد کی مصلحت کے اعلی معیار کو ترجیح دیتے ہوئے سزا دینے کی فرمائش نہیں کی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف سے واپس ہوتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ میں ان لوگوں کی تباہی کے لئے دعا نہیں کرتا، اگر یہ لوگ خدا پر ایمان نہیں لائے، تو

کیا ہوا، امید ہے کہ ان کی آئندہ نسلیں ایک خدا پر ایمان لانے والی ہوں (۱)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طائف سے کامیابی کے بغیر واپسی آپ کے لئے مکہ میں مزید پیچیدگی پیدا کرنے والی بات تھی، کہ مکہ سے باہر کی کسی شخصیت کی حمایت حاصل کرنے میں ناکامی ہوئی، اس سے آپ کو مزید کمزور اور بے سہارا سمجھتے ہوئے معلوم نہیں قریشی اب کیا کریں، لہذا آپ کو کسی بااثر مکی باشندہ کے جوار کے حاصل کرنے کی ضرورت تھی، جوار حاصل ہونے پر آدمی ایک طرح سے محفوظ ہوجاتا تھا، حضرت ابوبکر جب حبشہ کی ہجرت سے واپس آئے تھے، تو ابن الدغنہ کے جوار میں واپس آئے تھے (۲)، حضور ﷺ نے مطعم بن عدی کو جو ایک خیر پسند فرد تھے اختیار کیا، اور ان کا جوار حاصل کر کے مکہ میں داخل ہوئے (۳)۔

اس جوار سے آپ کو کسی سخت ترین معاملہ سے بچاؤ تو ایک حد تک مل گیا، لیکن قریش کی ایذارسانی سے محفوظ نہیں رہے، آپ کی قوم آپ کی مخالفت، دشمنی اور آپ کے تمسخر و ایذارسانی میں جس طرح ابوطالب کے زمانہ میں سرگرم عمل رہی تھی اس نے اس کو قائم رکھا، بلکہ ابوطالب جیسی بڑی اور مؤثر شخصیت کے باقی نہ رہنے سے مزید سختی اور جرأت جاری رکھی۔

نصیبین کے جناتوں کے قبول اسلام کا واقعہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم طائف کے ذمہ داروں کی طرف سے اہانت آمیز اور ظالمانہ طرز عمل سے شکستہ خاطر ہوکر جب واپس ہوئے، مقام نخلہ پر پہونچے اور تہجد کے وقت نماز میں مشغول ہوئے تو مقام نصیبین میں رہنے والے جناتوں کی ایک جماعت وہاں سے گزری اور قرآن مجید کی آیات سننے لگی اور متأثر ہوکر ایمان کے ساتھ اپنے مقام سکونت پر پہونچی۔ اس واقعہ کو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے اپنے کلام قرآنی میں اپنے رسول مکرم ﷺ کو بتایا، اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رنجیدہ حالات میں تسکین کا سامان ہوا اور آپ کو معلوم ہوا کہ طائف کے انسانوں نے اگر سخت رویّہ اختیار کیا تو اس کے عوض اللہ نے اپنی دوسری مخلوق جنات کو آپ کی پیروی کی توفیق دی جو آپ کی دعوت کی وسعت اور مقبولیت کی خوش کن علامت ہے اور اسلام کی آفاقیت (انسان سے جنوں تک پھیل جانے) کا واقعہ ہے۔

---

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں زادالمعاد، ج۱، ص:۳۰۲۔ سیرت ابن ہشام، ج۱، ص:۴۱۹، سیرت ابن کثیر، ج۲، ص۱۴۹ تا ۱۵۳۔ (۲) بخاری شریف بروایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، باب ہجرت النبی ﷺ واصحابہ۔ (۳) طبقات ابن سعد: ۲۱۲/۱۔

باب پنجم

واقعہ معراج، بیعت عقبہ، ہجرت مدینہ

گذشتہ سات سال سے مخالفتوں اور اذیتوں کو جھیلتے ہوئے آپ کے قلب پر جو بوجھ محسوس ہوتا تھا اس میں اضافہ کے حالات پیدا ہوجانے کے باوجود آپ کا اپنے خدا پر بھروسہ اور مستقبل میں بہتر حالات کے وعدہ الٰہی کا جو آپ کو یقین تھا وہ آپ کو سنبھالے ہوئے تھا، بہر حال پھر بھی انسان ہونے کے ناطے آپ کے دل پر بوجھ پڑتا تھا، اگر چہ آپ کو یہ سہارا حاصل تھا کہ جو کچھ ہوا اور جو ہو رہا ہے، وہ سب خدا کی طرف سے ہے، حالات کی شدت ہو یا تسکین کی کوئی صورت ہو، تقدیر الٰہی کے مطابق ہے، غالباً تقدیر الٰہی کی طرف سے ہی یہ تھا کہ جن شدتوں سے آپ کو گذارا جارہا تھا، وہ آپ کی ہمت وعزیمت کے لئے اور خدائی وعدہ پر یقین کو محکم کرنے میں معاون ہے۔

بہر حال جب آپ کی ہمت وارادہ اور وعدہ الٰہی کے پورا ہونے کا یقین محکم اپنے پورے معیار پر پہونچ گیا کہ آپ اس طرح کے تمام سہاروں کے ختم ہوجانے پر بھی جن سے آپ کو سخت حالات کا مقابلہ کرنے میں کچھ نہ کچھ مدد مل رہی تھی، آپ کے یقین محکم اور عمل پیہم اور صبر و رضا کی برقراری میں فرق نہیں آیا، اگر چہ حالات کی سختی سے دل بے چین بھی ہوجاتا تھا، اللہ تعالیٰ نے آپ کی تقویت وتسکین خاطر کے لئے اور آپ کے رنجیدہ دل کو مسرور بنانے کے لئے آپ کو آخرت میں جو ہونے والا

ہے اور عند اللہ آپ کا جو مقام ہے اس کا حقیقی منظر آپ کو معراج کے ذریعہ دکھادیا، اور یہ تقریبا اسی طرح ہوا جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ایک طرح سے پیش آیا تھا، کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رضائے الہیٰ کے لئے اپنی محبوب ترین چیزوں کی قربانی دیدی، جس میں وطن کی قربانی، بیوی بچے سے محبت کی قربانی، اور پھر نوجوان اور ہونہار بیٹے کی قربانی کی اپنی حد تک تعمیل کردی، اور اس طرح انہوں نے اپنے ان امتحانات میں کامیابی حاصل کرلی، لیکن انہوں نے اپنی مزید تسکین کے لئے اللہ تعالی سے درخواست کی " کیف تحی الموت" یہ دیکھنے کا جی چاہتاہیکہ آپ مردوں کو کس طرح زندہ کریں گے، جواب آیا کہ "أو لم تؤمن " کیا تمہیں یقین نہیں؟ انہوں نے کہا: "بلیٰ، ولکن لیطمئن قلبی " کیوں نہیں یقین پورا ہے، لیکن قلب کی تقویت کے لئے دیکھنا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالی کس طرح مردے کو زندہ کرتے ہیں، تو اللہ تعالی نے ان کو اس کا منظر بھی دکھادیا۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حکم الہی پر عمل اور رضا بالقضاء کے اس مقام بلند کو حاصل کرلیا تو اگر چہ انہوں نے مطالبہ نہیں کیا، لیکن اللہ تعالی نے ان کے دل کی تقویت کے لئے ان کو آخرت کے مقام و منصب کا مشاہدہ کرادیا اور اپنے قریب تک بلاکر عزت عطا فرمادی، آپ اس رات حرم شریف ہی کے اندر آرام کررہے تھے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے اور کہا کہ چلئے آپ بلائے گئے ہیں اور راتوں رات آپ کو وہاں سے شام (فلسطین) کے شہر بیت المقدس کی مسجد اقصی لے جایا گیا، وہاں اللہ تعالی نے گذشتہ سارے انبیاء سے آپ کو ملایا، پھر آپ نے ان کی امامت کی اور اس طریقہ سے آپ کو سارے انبیاء کے سردار ہونے کی حیثیت حاصل ہوگئی، اور اس کو آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، اور آپ کو آسمانوں کی طرف سفر کرایا گیا، اور عرش الٰہی سے قریب تر جہاں تک آپ کا پہونچنا اللہ کو منظور تھا وہاں تک لے جایا گیا، اور رب العالمین سے کلام کرنے کی اور تخلیۂ قرب کی سعادت حاصل کرائی گئی۔

اللہ تعالی نے دراصل انسان کو ایسی مخلوق بنایا ہے جس میں مادی جسمانی ڈھانچے اور اس کے اثرات جو ظاہری احساسات کے ذریعہ دیکھے اور سمجھے جاسکتے ہیں، اس کے ساتھ ملکوتی حالات الگ بھی رکھے ہیں جن کو ملکوتی احساسات سے ہی سمجھا جاسکتا ہے، اور اس کا مشاہدہ اصلاً انسان کی دوسری زندگی ہی میں کیا جاسکتا ہے، لیکن دنیاوی زندگی میں کبھی کبھی ان حالات کا مشاہدہ اللہ تعالی اپنے نبیوں کو کرادیتا ہے، یہ حالات کیا ہیں جو اپنا ایک طرف ظاہری رخ رکھتے ہیں جو دیکھے اور سنے جاسکتے ہیں اور دوسری طرف غیر مرئی رخ رکھتے ہیں جو ان دنیاوی آنکھوں اور کانوں سے نہیں جانے جاسکتے، یہ مثال کے طور پر اس طرح ہیں کہ حلال مال انسان کے ظاہری اور مادی احساسات کے لحاظ سے حرام مال ہی کی طرح محسوس ہوتا ہے، لیکن ملکوتی دائرہ میں حلال مال پاکیزہ اور صاف ستھری کیفیت رکھتا ہے، اور حرام مال گندگی اور بدبو کا حامل ہوتا ہے، اسی طرح نیک اعمال انسان کے ظاہری احساسات میں بداعمال کی طرح معلوم ہوتے ہیں، لیکن باطنی احساسات میں جس کی نشاندہی انبیاء کے ذریعہ کی گئی ہے تکلیف دہ اور مصیبت کے اعمال ہوتے ہیں، جس کی مثالیں قرآن مجید میں اور حدیث شریف میں بتائی گئیں ہیں، مثلاً سونے چاندی کے حرام طریقہ سے حصول کو بتایا گیا ہے کہ آخرت میں جہاں باطنی خصوصیت کا ظہور ہوگا، وہاں وہ حرام چاندی اور سونا گرم لوہے کی طرح ہوں گے، جس سے ان سے فائدہ اٹھانے والے کے پہلو اور پیشانی داغے جائیں گے، فتکوىٰ بها جباههم و جنوبهم، اسی طرح حدیث شریف میں آیا ہے کہ کوئی کسی کی زمین پر ناجائز طریقہ سے قبضہ کرلے تو آخرت میں طوق بنا کر اس کی گردن میں ڈالی جائیگی، اسی طرح سود اور ناجائز مال کی حیثیت پاخانے جیسی ہوجائے گی، اس طریقہ سے انسان کی زندگی کے اعمال دو پہلو رکھتے ہیں، ایک پہلو اس دنیا کا ظاہری ہے، جو اپنی ظاہری کیفیت رکھتا ہے، اور دوسرا پہلو باطنی ہے، جو اللہ کے رسولوں کے ذریعہ بتایا گیا ہے، جس سے دوسری زندگی میں سابقہ پڑے گا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی ہونے کی بنا پر اس پہلو

سے واقفیت یقینی صورت میں حاصل تھی، پھر بھی مزید تقویت کے لئے معراج میں آپ کو ان کا مشاہدہ بھی کرادیا گیا، جو علم الیقین سے حق الیقین تک پہونچ گیا، اس طرح آپ نیکیوں کی جو تلقین فرماتے تھے وہ آپ کی دیکھی ہوئی چیز بن گئی، اس سلسلہ میں انسانوں کو یہ بتانا تھا کہ تم جو کچھ کرتے ہو اس کے صرف ظاہری پہلو سے مطمئن نہ ہو جاؤ، کیوں کہ یہ دنیا کی چند روزہ زندگی تک ہی تمہیں محسوس ہوتا ہے، اور آخرت کی جو نہ ختم ہونے والی زندگی ہے اس میں اس کا باطنی پہلو سامنے آئیگا، پھر وہاں اس سے بچنے کی کوئی صورت نہ ہوگی، یہیں سے اس سے بچنے کی فکر کرلو۔

بہر حال آپ کو جو چیزیں دکھائی گئیں ان کا تذکرہ روایات میں آیا ہے، مثال کے طور پر جیسا کہ سنن ابوداؤد کی روایت ہے جس میں حضور ﷺ نے بتایا کہ جب میری معراج ہوئی میرا گذر ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا جن کے تانبے کے ناخن تھے، جن سے وہ اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے، میں نے کہا اے جبرئیل یہ کون ہیں؟ انہوں نے کہا: یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے تھے، اور لوگوں کی ناموس کا خیال نہیں کرتے تھے (یعنی غیبت کرتے اور بدنام کرتے تھے)۔

سیرت ابن ہشام اور تفسیر ابن کثیر میں اور بھی لوگوں کا ذکر ہے، مثلاً یتیموں کی حق تلفی کرنے والے، سودخور، زناکار، وغیرہ، جن کا برا حال ان کے اپنے اپنے اعمال کے اعتبار سے آپ پر ظاہر ہوا۔ ان باتوں کے علاوہ اچھے حال والی بھی بعض باتیں دکھائی گئیں، آپ کو جنت میں آپ کے قیام کی جگہ دور سے دکھائی گئی، آپ نے قریب سے دیکھنا چاہا تو بتا گیا کہ اسوقت اتنا ہی کافی ہے۔

شب معراج میں آپ ﷺ کو بارگاہ الٰہی سے تین عطیے مرحمت ہوئے، سورہ بقرہ کی آخری آیتیں، جن میں اسلام کے عقائد وایمان کی تکمیل، اور اس کے دور مصائب کے خاتمہ کی بشارت ہے، رحمت خاص نے مژدہ سنایا کہ امت محمدی میں سے ہر ایک جو شرک کا مرتکب نہ ہوا ہو کرم اور مغفرت سے سرفراز ہوگا، اور ندا آئی: امت پر پچاس وقت کی نماز فرض کی گئی۔

بخاری میں ابن عباس سے روایت ہے کہ شبِ معراج میں دجال بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھایا گیا(۱)۔

معراج کی تفصیل قرآن مجید میں بھی بیان کی گئی ہے، ایک تو سورۃ الاسراء میں اس کا ذکر ہے، سورۃ النجم میں اس کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے:

﴿والنجم إذا هوىٰ، ما ضلّ صاحبكم وما غوىٰ، وما ينطق عن الهوىٰ، إن هو إلّا وحي يوحىٰ، علّمه شديد القوىٰ، ذو مرّة، فاستوىٰ، وهو بالأفق الأعلىٰ، ثم دنا فتدلّىٰ، فكان قاب قوسين أو أدنىٰ، فأوحىٰ إلىٰ عبده ما أوحىٰ، ما كذب الفؤاد ما رأى، أفتمارونه علىٰ ما يرىٰ، ولقد رآه نزلة أخرىٰ، عند سدرة المنتهىٰ، عندها جنة المأوىٰ، إذ يغشىٰ السدرة ما يغشىٰ، ما زاغ البصر وما طغىٰ، لقد رأى من آيات ربه الكبرىٰ﴾ [النجم: ۱-۱۸]

قسم ہے ستارے کی جب وہ گرے کہ تمہارا رفیق (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نہ تو بھٹکا ہے اور نہ وہ یہ باتیں اپنے دل سے بنا کر کہتا ہے، بلکہ وہ تو وہی ہے جو اسکو بتایا جاتا ہے، اسکو اس نے جو بڑی طاقتوں والا اور بڑی عقل والا ہے بتایا ہے، وہ آسمان کے اونچے کنارے سیدھا ہو کر نمودار ہوا، پھر قریب ہوا اور جھکا تو دو کمانوں کا فاصلہ رہ گیا، اس سے بھی کم، پھر اس نے بندے سے جو باتیں کیں، دل نے جو دیکھا اس نے جھوٹ بیان نہیں کیا، اے لوگو کیا وہ جو دیکھتا ہے اس پر تم اس سے جھگڑا کرتے ہو، اس نے بلا شبہ دوبارہ بھی اس کو اترتے دیکھا سدرہ المنتہی درخت کے مقام کے پاس جس کے قریب (نیک بندوں) کے رہنے کی بہشت ہے، جب اس درخت پر چھا رہا تھا جو چھا رہا تھا نہ نظر بہکی نہ اچٹی، اس لئے یقیناً اپنے پروردگار کی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

معراج کی رات کے بعد صبح آپ نے اپنی معراج کا تذکرہ لوگوں سے کیا تو جو لوگ آپ کے مخالف اور دشمن تھے وہ مذاق اڑانے لگے کہ ایسی سواری کہاں ہوتی

---

(۱) صحیح بخاری باب بدء الخلق۔

ہے جس کے ذریعہ کوئی آدمی مکہ سے بیت المقدس تھوڑی دیر میں پہونچ جائے اور صبح ہونے سے پہلے واپس آجائے، یہ تو ثبوت ہے کہ یہ جھوٹ باتیں کہنے والے ہیں، لیکن مسلمانوں نے سنا تو کہا کہ اس سے بڑی باتوں کو ہم مانتے ہیں اس کے ماننے میں کیا مانع ہے اور ان کا ایمان بڑھ گیا (۱)۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر آپ ﷺ نے ایسی بات کہی ہے تو سچ کہی ہے، تم کو اس پر تعجب کیوں؟ خدا کی قسم آپ مجھے یہ خبر دیتے ہیں کہ وحی آپ کے پاس دن رات کے کسی حصہ میں آسمان سے زمین تک آجاتی ہے تو میں آپ ﷺ کی تصدیق کرتا ہوں، یہ تو اس سے بھی مشکل ہے اور بعید ہے، جس پر تم لوگ تعجب کر رہے ہو (۲)۔

حضرت ابوذر غفاری کا قبول اسلام

حضرت ابوذر غفاریؓ اپنے شہر یثرب میں ہی تھے، کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کچھ اڑتی سی خبر سنی، اپنے بھائی سے کہا کہ تم اس وادی یعنی مکہ میں جاؤ اور ذرا ان صاحب کا جو اپنے کو نبی کہتے ہیں، اور جو یہ دعوی کرتے ہیں کہ ان کے پاس آسمان سے وحی آتی ہے، ان کا کچھ پتہ لگاؤ، ان کی گفتگو سنو اور پھر مجھے آکر بتاؤ، چنانچہ وہ روانہ ہوئے، ان کے برادر انیس خود ایک مشہور فصیح شاعر اور زبان آور تھے، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے، آپ کی بات سنی، پھر بھائی کو جا کر بتایا، کہ میں نے دیکھا کہ وہ بہت پسندیدہ واعلی ترین اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں، جو کلام میں سن کر آیا ہوں، اسے کسی طرح بھی شعر نہیں کہا جاسکتا ہے، حضرت ابوذر بولے، اتنی سی بات

(۱) صحیح بخاری، باب حدیث الاسراء، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء برسول اللہ ﷺ الی السماوات، السیرۃ النبویۃ، امام ذہبی: ۱/ ۲۴۱-۲۷۸، سیرت ابن کثیر، جلد۲، ص: ۹۶۔ سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص: ۳۹۹۔ دلائل النبوۃ للبیہقی، جلد دوم، طبقات ابن سعد ۱/ ۲۱۳-۲۱۶، سیرۃ النبی، جلد سوم، از علامہ سید سلیمان ندوی۔

(۲) سیرت ابن ہشام: ۱/ ۳۹۹۔

سے تو کچھ تسلی نہیں ہوتی، آخر خود پیدل چل کر مکہ پہونچے۔

حضرت ابوذر کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شناخت نہ تھی، اور کسی سے دریافت کرنا بھی مناسب نہ سمجھتے تھے، اسی تلاش میں رات ہوگئی، اس وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ان کو دیکھا، اور ان کو اندازہ ہوگیا کہ یہ کوئی نووارد اور مسافر ہے، علی مرتضی نے کہا: اچھا میرے ہاں چلو، یہ رات کو وہیں رہے، لیکن کسی نے ایک دوسرے سے کچھ نہ پوچھا، جب صبح ہوئی، تو وہ اپنا مشکیزہ اور زادراہ لیکر پھر اسی مسجد میں پڑ گئے، اور یہ دن بھی اسی طرح گذر گیا، دل میں آنحضرت ﷺ کی تلاش تھی، مگر کسی سے دریافت نہ کرتے تھے، علی مرتضی پھر آپہونچے، انہوں نے فرمایا، شاید تمہیں اپنا ٹھکانہ نہیں ملا، ابوذر نے اثبات میں جواب دیا، علی مرتضی پھر ساتھ لے گئے، اب انہوں نے پوچھا، تم آخر ہو کون؟ اور یہاں کس لئے آئے ہو؟ انہوں نے کہا، اگر تم مجھ سے راز داری، اخفائے حال اور میری رہنمائی کا وعدہ کرو، تو بتا سکتا ہوں، علی مرتضیؓ نے وعدہ کرلیا، ابوذر نے کہا، میں نے سنا ہے کہ اس شہر میں ایک شخص ہے جو اپنے آپ کو نبی اللہ بتاتا ہے، میں نے اپنے بھائی کو بھیجا تھا، وہ یہاں سے کچھ تسلی بخش بات لیکر نہ گیا، اس لئے خود آگیا ہوں، علی مرتضی نے کہا: تم خوب آئے، اور خوب ہوا کہ مجھ سے ملے، دیکھو میں انہی کی خدمت میں جارہا ہوں، میرے ساتھ چلو، میں پہلے اندر جا کر دیکھ لوں گا، اگر اس وقت ملنا مناسب نہ ہوگا، تو میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو جاؤں گا گویا جوتا درست کررہا ہوں۔

الغرض ابوذر علی مرتضی کے ساتھ خدمت نبوی میں پہونچے، اور عرض کیا: مجھے بتایا جائے کہ اسلام کیا ہے؟ آپ ﷺ نے اسلام کی بابت بیان فرمایا، آپ ﷺ کی بات سن کر وہ اسی جگہ مسلمان ہوگئے، نبی ﷺ نے فرمایا: ابوذر تم ابھی اس بات کو چھپائے رکھو اور اپنے وطن کو چلے جاؤ، جب تمہیں ہمارے ظہور کی خبر مل جائے تب

آجانا، انہوں نے کہا: بخدا میں تو ان دشمنوں میں اعلان کر کے جاؤں گا، اب ابوذر کعبہ کی طرف آئے، قریش جمع تھے، انہوں نے سب کو سنا کر بآواز بلند کلمۂ شہادت "أشهد أن لا اله الا الله و أشهد أن محمدا رسول الله" پڑھا، یہ سن کر لوگوں نے ان کو گھیر لیا، اور اتنا مارا کہ بے دم ہوکر زمین پر لیٹ گئے، اتنے میں حضرت عباس آگئے، انہوں نے انہیں جھک کر دیکھا اور کہا کم بختو! یہ قبیلۂ غفار سے تعلق رکھتے ہیں، اور تمہارے شام کے تاجروں کا راستہ انہی کے قبیلہ سے ہوکر گزرتا ہے، لوگ یہ سن کر ہٹ گئے، اگلے دن پھر سب کو سنا کر کلمہ پڑھا، پھر لوگوں نے انہیں مارا، اور حضرت عباس نے آکر ان کی مدد کی (۱)۔

اہل یثرب کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ حج کے زمانہ میں سرداران قبائل کے پاس جاکر تبلیغ اسلام فرمایا کرتے تھے، اس سال (رجب/۱۰ نبوی) میں بھی آپ متعدد قبائل کے پاس تشریف لئے گئے، منیٰ کی ایک گھاٹی عقبہ کے پاس جہاں اب مسجد العقبہ ہے، قبیلۂ خزرج کے چند اشخاص نظر آئے، آپ نے دعوت اسلام دی اور قرآن مجید کی آیتیں سنائیں، یہ لوگ مدینہ میں یہودیوں کے پڑوس میں رہتے تھے اور ان سے یہ سنتے رہتے تھے کہ قریبی زمانہ میں کوئی نبی آنے والا ہے، وہ آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ واللہ یہ وہی نبی معلوم ہوتے ہیں جن کی خبر تم کو یہود دیتے تھے، دیکھو یہود ہم سے اس اولیت میں بازی نہ لے جائیں، یہ کہکر سب نے ایک ساتھ اسلام قبول کیا (۲)۔

---

(۱) بخاری شریف (باب اسلام ابی ذر رضی اللہ عنہ) وصحیح مسلم، باب فضائل أبی ذر، ترجمہ از نبی رحمت، مؤلفہ سید ابوالحسن علی ندویؒ۔

(۲) سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص: ۴۲۸-۴۲۹۔ والسیرۃ النبویۃ للامام الذھبی، ۱/۲۹۰۔

بیعت عقبہ اولی

دوسرے سال جب حج کا زمانہ آیا تو انصار کے بارہ آدمیوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی، اور اس بات کی خواہش کی کہ احکام اسلام سکھلانے کے لئے کوئی معلم ان کے ساتھ کر دیا جائے، آنحضرت ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیر کو اس خدمت پر مامور فرمایا، ان لوگوں نے آپ کے دست مبارک پر چوری، زنا، چغلی، دروغ گوئی اور قتل اولاد سے پرہیز کرنے اور اچھی باتوں میں اطاعت کرنے نیز توحید پر قائم رہنے کی بیعت کی (۱)۔

مدینہ میں اسلام

یہ بیعت عقبہ اولی جو ۱۱ بعثت کے آخر میں ہوئی تھی، اسی موقع پر حضرت مصعب بن عمیر کو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے مدینہ بھیج دیا تھا، حضرت مصعب بن عمیرؓ یثرب جا کر دین کے مبادیات اور اسلام کے مسائل سے باخبر کرنے لگے، ان کی محنت و جانفشانی سے لوگ اسلام کی طرف مائل ہونے لگے۔ وہ حضرت اسعد بن زرارہ کے مکان پر ٹھہرے تھے، اسعد بن زرارہ ایمان لا چکے تھے، چنانچہ دونوں دعوت کا کام کرنے لگے، اور جب چالیس کی تعداد میں مسلمان ہو گئے تو حضرت مصعب نے نماز جمعہ شروع کر دی، یہ مدینہ میں پہلا جمعہ تھا اور حضور ﷺ کی ہجرت سے قبل تھا (۲)۔

اسعد بن زرارہ کے ایک خالہ زاد بھائی سعد بن معاذ اور ان کے ایک ساتھی اسید بن حضیر قبیلہ اوس کے سرداروں میں تھے، دوسری طرف خزرج کے سردار سعد بن عبادہ اور عبداللہ بن ابی بن سلول تھے، سعد بن معاذ کو حضرت مصعب کے کاموں کی خبر ملی، تو بہت ناراض ہوئے اور اسید بن حضیر سے کہا کہ میرے خالہ زاد بھائی سے سختی سے کہو کہ یہ کس شخص کو ٹھہرا رکھا ہے؟ جو عجیب باتیں کرتا ہے، میرے معبودوں کو برا

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/۴۳۲۔ (۲) سیرت ابن ہشام: ۱/۴۳۵۔

کہتا ہے، اس قریشی کو اپنے یہاں سے روانہ کر دیں، چنانچہ اسید بن حضیر آئے اور غصہ کے ساتھ اسعد بن زرارہ سے بات کی، حضرت مصعب نے کہا: صاحب آپ بات سن لیجئے پھر فیصلہ کیجئے، کہ میں بری بات کرتا ہوں یا ٹھیک بات کرتا ہوں، بری بات ہو تو ہم کو نکال باہر کیجئے گا، اسید نے کہا ٹھیک ہے سن لیتا ہوں، حضرت مصعب نے قرآن کریم پڑھ کر سنایا اور کچھ بات کی، اس کا اتنا اثر پڑا کہ انہوں نے نہا دھو کر کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گئے، اور کہا کہ سعد بن معاذ (ہماری قوم کے) بڑے با اثر آدمی ہیں، اگر وہ ایمان لے آتے ہیں، تو بہت اثر پڑے گا، میں ان کو بھیجتا ہوں، چنانچہ اسید بن حضیر سعد بن معاذ کے پاس گئے، کہ ان کو بھی سننے کے لئے بھیجیں، اگر چہ سعد بن معاذ کو مصعب بن عمیر کے پاس بھیجنا آسان کام نہ تھا، لہٰذا اسید نے یہ ترکیب کی کہ سعد بن معاذ کے پاس پہونچے اور اپنی بات تو بتائی نہیں کہ کیا کر کے آئے ہیں، بلکہ یہ کہا کہ خاندان بنی حارثہ کے لوگ جو تمہارے خاندان کے مخالف ہیں وہ تمہارے خالہ زاد بھائی اسعد بن زرارہ کو مارنے کے لئے جا رہے ہیں، یہ سنتے ہی سعد بن معاذ کو خاندانی رشتہ کا جوش آ گیا اور مزید کچھ پوچھے بغیر لپکے کہ دیکھیں کیا ہے، اور اسعد بن زرارہ کی مدد کریں، وہاں مصعب بن عمیر ملے، سعد بن معاذ اس بات پر اپنے بھائی پر برس پڑے، لیکن دونوں نے ان کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا، اور کہا کہ بات تو سن لیجئے، پھر جو چاہیئے کیجئے گا، انہوں نے کہا: اچھا بتاؤ، چنانچہ مصعب نے قرآن مجید کی آیات سنائیں، اور دین کی تشریح کی، جو سعد بن معاذ کے بھی دل میں اتر گئی اور وہ مسلمان ہو کر واپس لوٹے اور پھر اپنے خاندان بنو عبد الأشہل کو جمع کر کے اور اپنے تعلق کا حوالہ دیکر بتایا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں، اور اب تم سب کو بھی ہونا ہے، اس کا اثر یہ پڑا کہ بنو عبد الاشہل کا پورا خاندان مسلمان ہو گیا، اسی طرح کچھ نہ کچھ ہوتا رہا حتی کہ ایک سال کے اندر مدینہ اسلامی شہر بن گیا (۱)۔

---

(۱) سیرت ابن ہشام، جلد اول، ص: ۴۳۵-۴۳۸۔

بیعت عقبہ ثانیہ

حضرت مصعب کی تعلیم سے یثرب کے گھر گھر میں اسلام کا چرچا ہونے لگا، اوراس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگلے سال (۱۳ر نبوی) ۷۳ مرد اور دوعورتوں پر مشتمل ایک وفد مکہ آیا، اور مقام عقبہ پر کچھ دیر رات میں جمع ہوئے اور آپ ﷺ کے دست مبارک پر بیعت اسلام کی، اوراسی کے ساتھ آپ ﷺ سے یہ مطالبہ بھی کیا کہ اب یثرب (مدینہ) میں مسلمانوں کی تعداد قابل اطمنان حد تک ہوگئی ہے اب مکہ سے ہجرت فرما کر یثرب آجائیں اوراس کو اپنی دعوت و تبلیغ کا مرکز بنائیں، آپ ﷺ کے چچا حضرت عباس بھی جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے اس موقع پر حاضر خدمت تھے، انہوں نے انصار سے یہ بات سن کران سے خطاب کر کے کہا: کہ گروہ خزرج! اگر تم محمد ﷺ اوران کے رفقاء کا ہمیشہ دشمنوں کے مقابلہ میں ساتھ دے سکتے ہو، اور ہر موقع پر آپ ﷺ کی حفاظت کا وعدہ کرتے ہو، اگر تم لوگ مرتے دم تک ان کا ساتھ دے سکتے ہو تو ٹھیک ہے، ورنہ ابھی سے جواب دے دو، انصار کی طرف سے جواب ملا، ہم لوگ تلواروں کی گود میں پلے ہیں، ہمیں معلوم ہے کہ ہم کس چیز پر بیعت کرر ہے ہیں، اور یہ بھی جانتے ہیں کہ آپ کی بیعت درحقیقت عرب وعجم اور جن و انس سے جنگ ہے، عباس بن عبادہ نے کہا کہ اگر حضور کی اجازت ہو تو ہم کل ہی مکہ والوں کو اپنی تلوار کے جوہر دکھادیں، آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، مجھے جنگ کی اجازت نہیں، اس کے بعد نبی ﷺ نے انصار میں سے بارہ شخصوں کا انتخاب کیا، یہ سب کے سب اپنے قبیلے کے سربرآوردہ لوگ تھے(۱)۔

مدینہ میں اسلام کو پناہ حاصل ہوئی، تو آنحضرت ﷺ نے صحابہ کو اجازت دی کہ مکہ سے ہجرت کر جائیں، قریش کو جیسے ہی اس کی بھنک لگی تو انہوں نے روک

---

(۱) سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص: ۴۴۱-۴۴۴۔

ٹوک شروع کردی، لیکن چوری چھپے صحابۂ کرام ہجرت کرتے رہے، اور رفتہ رفتہ ان کی ایک بڑی تعداد مدینہ پہونچ گئی، مکہ میں صرف آنحضرت ﷺ، حضرت ابوبکر، اور حضرت علی اور وہ لوگ جو مفلسی کی وجہ سے ہجرت پر قادر نہ تھے، باقی رہ گئے۔

ہجرت کرنے والوں کو ہجرت کرتے وقت قریش مکہ کی سخت مخالفتوں اور مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا، قریش نے حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ کا سارا مال و متاع چھین لیا(۱)

حضرت ام سلمہ کی ہجرت

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اپنے متعلق روایت کرتی ہیں کہ جب ابوسلمہؓ نے مدینہ ہجرت کا پختہ عزم کرلیا تو سفر کے لئے اپنا اونٹ تیار کیا، مجھ کو اس پر سوار کرایا اور میرے لڑکے سلمہ بن ابی سلمہ کو میری گود میں دے دیا، پھر اونٹ کی نکیل ہاتھ میں لی اور روانہ ہوئے، جب میرے شوہر کے خاندان بنی المغیر ہ کے کچھ لوگوں کی نظر ان پر پڑی تو وہ ان کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ تمہاری حد تک ٹھیک ہے تم اپنے کو بچا کر جا رہے ہو، ان بی بی کو ہم تمہاری ہمرکابی کے لئے کیسے چھوڑ سکتے ہیں، یہ کہہ کر انھوں نے اونٹ کی نکیل ان کے ہاتھ سے چھین لی اور مجھے اپنے ساتھ لے گئے، یہ دیکھ کر بنو عبدالاسد میں جو ابوسلمہ کے حمایتی تھے، سخت اشتعال پیدا ہوا، انھوں نے کہا کہ خدا کی قسم تم نے ان کو ہمارے بھائی سے چھین لیا ہے، لیکن ہم اپنے لڑکے کو اب ان کے پاس ہرگز نہیں چھوڑیں گے، اس کے بعد دونوں میں میرے بچہ پر کشاکش شروع ہوگئی اور دونوں اس کو اپنی طرف کھینچنے لگے حتی کہ اس کا ہاتھ اکھڑ گیا، میرے سسرالی بنو عبدالاسد اس کو چھین لینے میں کامیاب ہوگئے اور اس کو اپنے ساتھ لے

(۱) صحیح بخاری، کتاب اللباس باب التقنع، وباب رجع عامۃ من کان ھاجر، السیر ۃ النبویۃ، ذھبی :۱/۳۱۱۔ سیرت ابن ہشام :۱/۴۷۷، دلائل النبوۃ للبیھقی :۲/۵۲۲۔

گئے، بنوالمغیرہ نے مجھے اپنی قید میں کرلیا، میرے شوہر مدینہ روانہ ہو چکے تھے، اس طرح میرا لڑکا میرے شوہر اور میں، تینوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

میں ہر صبح کو باہر آتی اور ''ابطح'' میں بیٹھ جاتی اور شام تک روتی رہتی، اس پر پورا ایک سال گزر گیا، ایک دن بنوالمغیرہ ہی میں سے میرے چچازاد بھائیوں میں سے ایک بھائی کی مجھ پر نظر پڑی اور میری اس حالت کو دیکھ کر اسے رحم آیا اور اس نے بنوالمغیرہ سے کہا کہ اس غریب کو کیوں نہیں چھوڑ دیتے، تم نے اس کو شوہر اور بیٹے دونوں سے محروم کر دیا ہے؟ وہ کہنے لگے! اگر تمہارا دل چاہے تو اپنے شوہر کے پاس چلی جاؤ، اس وقت بنوعبدالاسد نے میرا لڑکا مجھے واپس کیا، میں نے اپنا اونٹ تیار کیا، بچہ کو گود میں لیا اور مدینہ میں اپنے شوہر کی تلاش کے لئے چل کھڑی ہوئی، اس حالت میں کہ اللہ کا کوئی بندہ میرے ساتھ نہ تھا، جب میں ''تنعیم'' (جو مکہ سے تین کیلومیٹر کے فاصلہ پر ہے) تک پہونچی تو میری ملاقات ایک پڑوسی عثمان بن طلحہؓ سے ہوگئی، جو بنی عبدالدار میں سے تھے، وہ دیکھتے ہی بولے، اے ابوامیہ کی لڑکی! تم کہاں جارہی ہو؟ میں نے کہا مدینہ میں اپنے شوہر کے پاس جانا چاہتی ہوں، انھوں نے کہا، تمہارے ساتھ کوئی ہے؟ میں نے جواب دیا میرے ساتھ اللہ کے سوا اور اس بچہ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے، کہنے لگے: خدا کی قسم تمہیں (بغیر کسی کی مدد کے) منزل پر پہونچنا آسان نہیں ہے، انھوں نے اونٹ کی نکیل اپنے ہاتھ میں لے لی اور مجھے لے کر آگے روانہ ہوئے، خدا کی قسم جن لوگوں سے اب تک میرا واسطہ پڑا ہے میں نے کسی کو بھی ان سے زیادہ شریف اور کریم النفس نہیں پایا، جب کوئی منزل آتی اور رکنا پڑتا تو وہ اونٹ کو بٹھا کر علیحدہ ہٹ جاتے، جب میں اتر آتی تو اونٹ کے پاس آکر سامان اتارتے پھر ایک درخت سے اس کو باندھتے پھر کسی درخت کے سایہ میں لیٹ جاتے جب شام ہوتی اور روانگی کا وقت آتا تو اٹھتے، اونٹ کو تیار کرتے سامان وغیرہ

اس کے اوپر لادتے پھر وہاں سے کچھ دور ہٹ جاتے اور مجھ سے کہتے کہ بیٹھ جاؤ جب میں اچھی طرح بیٹھ جاتی تو آ کر اس کی نکیل تھام لیتے اور اسی طرح دوسری منزل تک پہونچتے، اسی طرح کرتے ہوئے انھوں نے مجھے مدینہ پہونچایا، جب ان کی نظر بنی عمرو بن عوف کے گاؤں ''قُبا'' پر پڑی تو مجھ سے کہنے لگے کہ تمہارے شوہر اسی گاؤں میں ہیں، (ابوسلمہ یہیں مقیم تھے) اب تم اللہ کا نام لے کر وہاں چلی جاؤ، یہ کہہ کر انھوں نے مجھے رخصت کر دیا، اور مکہ کے لئے واپس روانہ ہو گئے (۱)۔

وہ کہتی تھیں کہ اسلام میں کسی گھرانہ کو وہ تکالیف نہیں اٹھانی پڑیں جو ابوسلمہؓ کے گھر والوں نے اٹھائی ہیں، اور میں نے کسی شخص کو عثمان بن طلحہؓ سے زیادہ شریف اور باحوصلہ نہیں پایا۔

ابوسلمہ کو ہجرت کی خاطر اپنی بیوی اور بچے سے محروم ہونے سے سابقہ پڑا اور ان کی بیوی کو اپنے شوہر کے چھوٹنے اور بچہ کے چھینے جانے سے سابقہ پڑا اور دونوں نے برداشت کیا، ایسی ہی مشکلات کا سامنا تقریباً ہر ایک صحابی کو کرنا پڑا تھا۔

قتل کی سازش

جب مکہ میں مسلمان گنتی کے رہ گئے، مشہور صحابہ میں سے صرف حضرت ابوبکر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما تھے، تو قریش مکہ نے کہا کہ اب محمد کو قتل کر دینا ہی حل ہے، قتل کی تدبیر پر غور کرنے کے لئے دار الندوۃ میں کفار مکہ کا ایک خفیہ اجلاس ہوا، مختلف تدبیریں زیر بحث آئیں، بالآخر ابوجہل کی تدبیر پر اتفاق رائے ہو گیا، تجویز اور تدبیر حسب ذیل تھی:۔

''عرب کے ہر ایک مشہور قبیلہ سے ایک ایک جوانمرد کا انتخاب کیا جائے، یہ سب بہادر رات کی تاریکی میں محمد کے گھر کا محاصرہ کر لیں، اور جیسے ہی وہ نماز صبح کے لئے

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/ ۴۶۷، السیرۃ النبویۃ للامام الذھبی: ۱/ ۳۱۲۔

نکلیں، یہ سب کے سب ہلہ بول کر اپنی اپنی تلوار سے ان پر وار کریں، اس تدبیر کا فائدہ یہ ہوگا کہ آپ کا خون قریش کی سب شاخوں پر تقسیم ہوجائے گا، اور محمد کا خاندان یا اس کے رفقاء اس کے خون کا بدلہ لینے پر قادر نہ ہوں گے، اس طریقہ سے ایک بھیانک شر جو روز بروز بڑھتا جارہا ہے، صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لئے مٹ جائے گا" (۱)۔

ہجرت مدینہ

ادھر آپ کے قتل کی سازش مکمل ہوچکی تھی، اور آپ کے گھر کا محاصرہ ابھی باقی تھا کہ اللہ تعالی کی طرف سے ہجرت کا حکم آ گیا، چنانچہ محاصرہ کے وقت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذن الٰہی کے مطابق لوگوں کی امانتوں کا مکمل انتظام کر کے ﴿الـلّٰه يعصمك من الناس﴾ کی سپر لئے گھر سے باہر نکلے، اور ان کی آنکھوں میں خاک ڈالتے ہوئے سورہ یسین پڑھتے ہوئے صاف نکل گئے، کسی کو آپ کے جانے کی بھنک تک نہ لگی، یہ واقعہ ۲۷ رصفر ۱۳ انبوی روز پنجشنبہ کا ہے (۲)۔

اس سے قبل دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کی اجازت ملنے پر حضرت ابوبکرؓ کے پاس تشریف لائے تھے، اور ذکر فرمایا تھا کہ اللہ تعالی نے مجھے یہاں سے نکلنے اور ہجرت کی اجازت عطا فرمادی ہے، حضرت ابوبکر نے کہا: الصحبة یا رسول اللہ" رسول اللہ ﷺ رفاقت وصحبت کا طلب گار ہوں، آپ نے فرمایا "الصحبة" ہاں تم ہی رفیق رہو گے، اس کے بعد انہوں نے دو سواریاں پیش کیں، اور عبد اللہ بن اریقط کو بطور رہبر کے معاوضہ پر طے کرلیا، رات میں جب آپ اپنے گھر سے ہجرت کے لئے نکلے اور حضرت ابوبکر کے مکان پر پہونچے تو حضرت ابوبکر کی بیٹی حضرت اسماء

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/ ۴۸۰-۴۸۲، تاریخ طبری: ۲/ ۳۷۱- ۳۷۲، طبقات ابن سعد: ۱/ ۲۲۷، نہایة الأرب: ۱۶/ ۳۲۷، عیون الأثر: ۱/ ۱۸۷-۱۷۹۔

(۲) صحیح بخاری: کتاب المناقب، باب هجرة النبی وأصحابہ الی المدینہ، مسند احمد: ۱/ ۳۴۸، مصنف عبد الرزاق: ۵/ ۳۸۹، زاد المعاد: ۳/ ۵۰۔

نے راستہ کے لئے ستو بطور زادراہ تیار کر کے کمر کے پٹہ کو کاٹ کر ستو کے تھیلے کا منہ باندھا، باہر نکل کر آپ ﷺ نے کعبہ کی طرف دیکھا اور کہا: مکہ تو مجھ کو تمام دنیا سے زیادہ عزیز ہے، لیکن تیرے فرزند مجھ کو رہنے نہیں دیتے، رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ شب تاریک میں مکہ سے چھپتے چھپاتے روانہ ہوئے، راستہ سنگلاخ تھا نکیلے پتھر حضور ﷺ کے پائے مبارک کو زخمی کر رہے تھے اور ٹھوکر لگنے سے بھی تکلیف ہوتی تھی، مکہ سے چار پانچ کیلومیٹر کی دشوار گذار مسافت طے کرنے کے بعد ثور نامی پہاڑ کی بلندی پر واقع ایک غار میں پہونچے، حضرت ابوبکر نے حضور ﷺ کو باہر ٹھہرایا اور خود اندر جا کر غار صاف کیا اور اپنے کپڑے پھاڑ پھاڑ کر غار کے سوراخ بند کئے اور پھر عرض کیا کہ حضور ﷺ بھی اندر تشریف لے آئیں، یہاں تین دن مقیم رہے اور چوتھے روز آگے کی طرف روانہ ہوئے، دوران قیام حضرت اسماء بنت ابی بکر گھر سے کھانا پہونچا جاتیں، عبد اللہ بن ابی بکر اہل مکہ کی باتیں سنا جاتے، عامر بن فہیرہ وہاں بکریاں لے آتے اور دودھ پہونچا کر واپس چلے جاتے (۱)۔

سراقہ بن جعشم کا واقعہ

ادھر قریش نے اشتہار دیا تھا کہ جو شخص محمد ﷺ یا ابوبکرؓ کو گرفتار کر کے لائے گا اس کو ایک خوں بہا کی قیمت کے بقدر (سو اونٹ) انعام دیا جائے گا، سراقہ بن جعشم نے سنا تو انعام کی لالچ میں نکلا، عین اس حالت میں کہ آپ مکہ سے نکل کر قریبی ہی راستہ میں تھے اس نے آپ کو دیکھ لیا، اور گھوڑا دوڑا کر قریب آ گیا، لیکن گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور گر پڑا، اس نے اپنے ترکش سے فال کے تیر نکالے تا کہ فال لے کہ حملہ کرنا چاہیے یا نہیں، جواب میں ''نہیں'' نکلا، لیکن سو اونٹوں کا گراں بہا معاوضہ ایسا نہ تھا کہ تیر کی بات مان لی جاتی، دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا اور آگے بڑھا، اب کی

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/ ۴۸۵-۴۸۸، دلائل النبوۃ للبیہقی: ۱/ ۱۱۱-۱۱۲۔

بار (ریتلی زمین میں) گھوڑے کے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے، گھوڑے سے اترنا پڑا، پھر فال دیکھی، اب بھی وہی جواب تھا، لیکن مکرر تجربہ نے اس کی ہمت پست کردی اور یقین ہوگیا کہ یہ کچھ اور آثار ہیں، چنانچہ آنحضرت ﷺ کو آواز دی کہ صرف بات کرنا ہے اور پاس آکر قریش کے اشتہار کا واقعہ سنایا، (اور اپنے ارادہ سے باز آجانے کا ذکر کیا) اور درخواست کی کہ مجھ کو امن کی تحریر لکھ دیجئے، حضرت ابوبکرؓ کے غلام عامر بن فہیرہ نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر فرمان امن لکھ دیا (۱)۔

ام معبد کا واقعہ

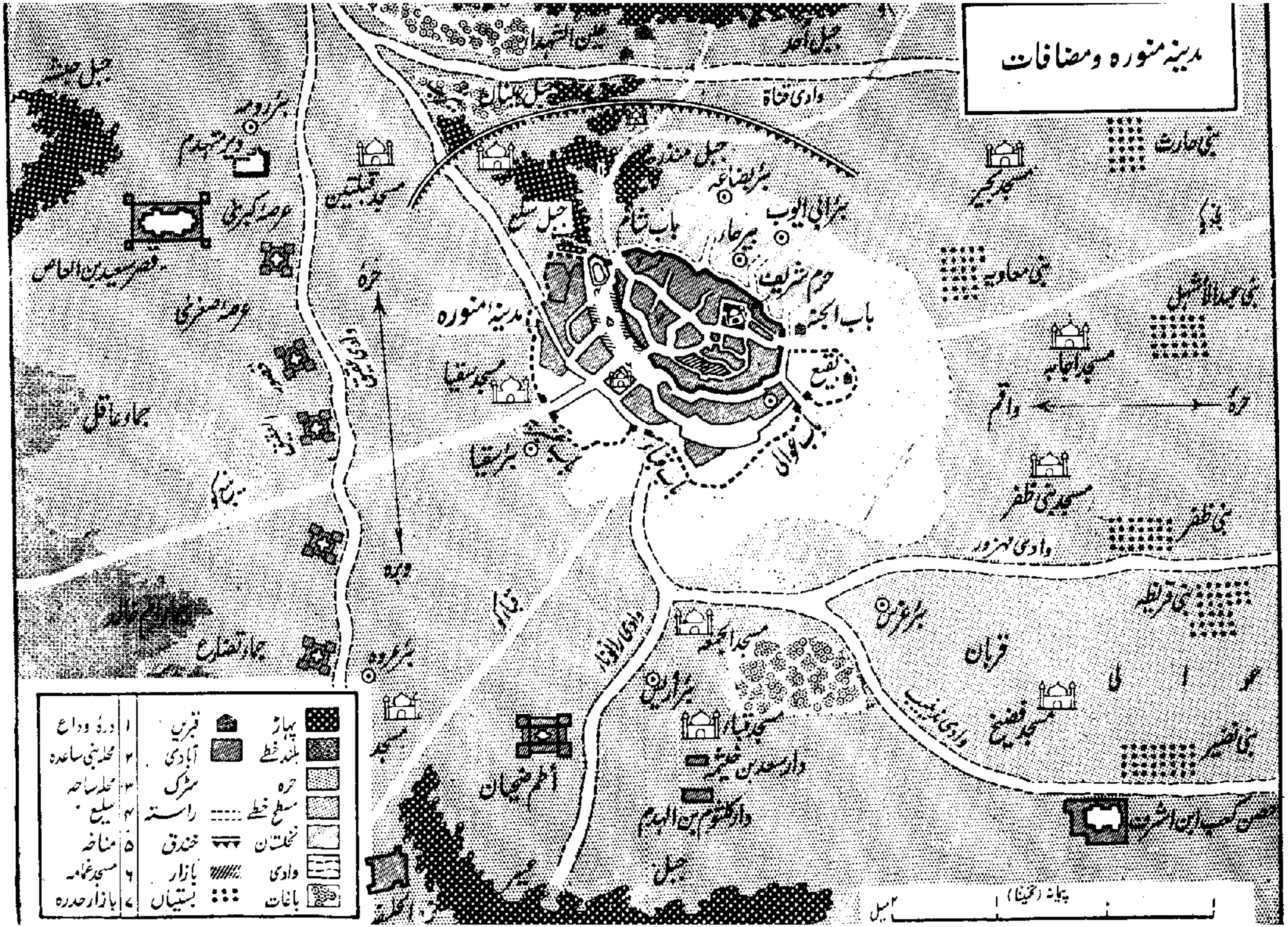
راستہ میں قریش اور ان کے حلیف بنو کنانہ کے علاقہ سے نکل کر جب بنوخزاعہ کے علاقہ میں آپ ﷺ پہونچے تو چونکہ بنوخزاعہ قریش سے دوستی نہیں رکھتے تھے اس لئے آپ ﷺ نے ان کے علاقہ میں اپنے سفر کا اخفاء ختم فرمادیا، کہ اب اس علاقہ میں ضرر کا اندیشہ کم ہے، اور اس علاقہ میں داخل ہونے کے بعد جب آپ ﷺ کو غذا کی ضرورت محسوس ہوئی تو وہیں ایک خیمہ کے پاس ٹھہر کر عربوں کے دستور کے مطابق بطور مسافر مہمان سامنے آئے، یہ خیمہ خزاعہ قبیلہ کی خاتون ام معبد کا خیمہ تھا، انہوں نے آپ ﷺ کی خاطر کرنی چاہی لیکن بکری کے تھنوں میں دودھ معلوم نہیں ہوتا تھا، آپ ﷺ نے دعا کی اور تھنوں پر ہاتھ پھیرا، اللہ تعالی نے کرم فرمایا اور دودھ آگیا، آپ ﷺ نے اور آپ کے رفقاء نے استعمال کیا اور مزید بچا بھی اور آپ ﷺ اپنے سفر میں روانہ ہوگئے، اس واقعہ کا ذکر خود ام معبد نے مسرت کے ساتھ کیا ہے (۲)۔

کچھ دیر بعد ام معبد کے شوہر آئے، خیمہ میں دودھ کا برتن بھرا دیکھ کر حیران ہوگئے کہ یہ کہاں سے آیا، ام معبد نے کہا کہ ایک بابرکت شخص یہاں آئے تھے، اور یہ

---

(۱) صحیح بخاری: مناقب الأنصار، باب ھجرۃ النبی واصحابہ الی المدینۃ، سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص: ۴۸۹-۴۹۰

(۲) طبقات ابن سعد: ۱/۲۳۰، السیرۃ النبویۃ للامام الذھبی: ۱/۳۲۹۔



مدینہ منورہ و مضافات
جبل احد
وادی قناۃ
جبل سلع
مدینہ منورہ
حرم شریف
باب الجنۃ
بقیع
باب شام
بئر ابی ایوب
مسجد قبلتین
مسجد سقیا
بئر سقیا
بنی حارثہ
بنی معاویہ
بنی عبدالاشہل
مسجد اجابہ
واقم
حرہ
بنی ظفر
مسجد بنی ظفر
وادی مہزور
بنی قریظہ
قربان
بئر عرس
مسجد جمعہ
بنی النضیر
مسجد فضیخ
وادی بطحان
مسجد قبا
بئر اریس
دار سعد بن خیثمہ
دار کلثوم بن الہدم
حصن کعب ابن اشرف
جبل عیر
جبل
مسجد
بئر غرس
جماء تضارع
جماء عاقل
قصر سعید بن العاص
عرصہ کبریٰ
عرصہ صغریٰ
بئر رومہ
جبل جماء
حرہ
وبرہ
وادی عقیق
پہاڑ
بلند خطے
حرہ
مسطح خطے
نخلستان
وادی
باغات
قبریں
آبادی
سڑک
راستہ
خندق
بازار
بستیاں
۱ درۂ وداع
۲ محلہ بنی ساعدہ
۳ محلہ ساجہ
۴ سلیع
۵ مناخہ
۶ مسجد غمامہ
۷ بازار حدرہ
پیمانہ (تخمیناً)
۲ میل

دودھ ان کے قدوم کا نتیجہ ہے، وہ بولے کہ یہ تو وہی صاحب قریش معلوم ہوتے ہیں جن کی مجھے تلاش تھی، اچھا ذرا ان کی توصیف کرو، ام معبد بولیں:۔

''میں نے ایک شخص کو دیکھا، جس کی نظافت نمایاں، جس کا چہراہ تاباں اور جس کی ساخت میں تناسب تھا، پاکیزہ رو اور پسندیدہ خو، نہ فربہی کا عیب، نہ لاغری کا نقص، نہ پیٹ نکلا ہوا، نہ سر کے بال گرے ہوئے، چہرہ وجیہ، جسم تنومند اور قد موزوں تھا، آنکھیں سرمگیں تھیں، فراخ اور سیاہ تھیں، پتلیاں کالی تھیں، ڈھیلے بہت سفید تھے، پلکیں گھنی اور لمبی تھیں، پروقار خاموش دلبستگی لئے ہوئے، کلام شیریں اور واضح، نہ کم سخن، نہ بسیار گو، گفتگو اس انداز کی جیسے پروئے موتی، دو نرم و نازک شاخوں کے درمیان ایک شاخ تازہ جو دیکھنے میں خوش منظر، رفیق ان کے گردوپیش رہتے ہیں، جو کچھ وہ فرماتے ہیں، وہ سنتے ہیں، جب حکم دیتے ہیں، تو تعمیل کے لئے جھپٹتے ہیں، مخدوم ومطاع، نہ کوتاہ سخن نہ فضول گو''۔

یہ صفت سن کر وہ بولا کہ یہ تو ضرور صاحب قریش ہیں اور میں ان سے ضرور جا ملوں گا(۱)۔

بہر حال آپ ﷺ کے رہبر نے آپ اور آپ کے رفقاء کو ساتھ لیکر اپنا سفر جاری رکھا، یہاں تک یہ قبا تک جو مدینہ شہر سے تقریبا تین کیلو میٹر جنوبی جانب واقع ہے، پہونچ گئے۔

☆☆☆

(۱) مستدرک حاکم:۳-۹، طبقات ابن سعد:۱/۲۳۰، زاد المعاد:۳/۵۶۔

باب ششم

مدینہ منورہ کا قیام

اور اجتماعی نظام اور دشمنوں کی نئی سازشوں کا مقابلہ

مکہ مکرمہ میں زمانہ نبوت شروع ہونے پر آپ کو دعوت اور تبلیغ دین کا جو اہم اور صبر طلب کام سپرد کیا گیا تھا، مکہ کی تیرہ سالہ مدت میں آپ کو اور آپ کی سرکردگی میں آپ کی دعوت پر ایمان والوں کو اس کام کی ادائیگی کی ذمہ داریوں سے اور اس راہ کی دشواریوں سے سابقہ پڑا اور اس کے سلسلہ میں ان حضرات نے پوری عزیمت و برداشت کا ثبوت دیا اور اس کا پورا حق ادا کیا۔

تیرہ سال کی مدت انسان کی ابتدائی زندگی کی ایسی مدت ہوتی ہے جس میں اس کی پوری تربیت بھی انجام پا جاتی ہے اور اس کو اس کی عملی زندگی کے لئے بنیادی تجربات بھی حاصل ہو جاتے ہیں، جو اس کی عملی زندگی میں اس کی رہنمائی کرتے ہیں اور کسی تحریک یا دعوت کے لئے کام کرنے والوں کی صلاحیت کارکردگی کو مضبوط بنانے اور اس کو پروان چڑھانے کا ذریعہ بنتے ہیں، تیرہ سال کی مدت ایک طرح سے انسان کے پیدا ہو کر سن بلوغ کے قریب تک پہونچنے کی مدت ہوتی ہے، یہی مدت اللہ تعالی کی طرف سے مقرر کئے گئے پیغام حق کے شروع ہو کر بلوغ تک پہونچنے کی مدت بنی، اس کو صبر و ثبات کے ساتھ پورا کر لینے کے بعد اب آگے کا مرحلہ شروع ہوا۔

مکہ کی تیرہ سالہ مدت کے لئے اللہ تعالی کی طرف سے بظاہر یہ نظام رہا کہ دین کی دعوت کا فریضہ انجام دینے کا پر مشقت اور تربیتی نظام عمل میں آیا اور دعوتی کام کی تربیت کا ذریعہ بنا اور یہ اس پورے علاقہ کے مرکزی مقام مکہ میں انجام پایا جو پورے جزیرۃ العرب کا مرکزی شہر تھا، جوکہ پورے عالم ارضی کی آبادی کے عین وسط میں مرکزی نقطہ کی حیثیت رکھتا ہے، یہاں کام گویا اسی طرح شروع ہوا کہ وہ آسمانی مدد ونگرانی میں مضبوطی حاصل کر لے اور جب وہاں اس عظیم کام کی عملی صلاحیت اور اندرونی طاقت وجذبہ سے بھرپور جماعت ایک ضروری تعداد میں تیار ہو جائے اور جب مکہ کے مقامی حدود میں اس کام کے لئے حالات کی سازگاری نہ رہے تو آپ دوسری جگہ جہاں حسب ضرورت کام کرنے اور نظام قائم کرنے کی گنجائش ہو، منتقل ہو جائیں اور آئندہ کے لئے اس نئی جگہ کو دعوت اور اس کی کارکردگی کا مرکز بنائیں۔

چنانچہ یہ نئی جگہ مدینہ منورہ کی صورت میں حاصل ہوگئی جہاں عمل کو مضبوط اور وسیع الاطراف کرنے کا موقع ملا، وہاں خود آپ کے منتقل ہونے سے قبل آپ کے رفقاء کے وہاں پہونچ جانے اور آپ کی آمد کے لئے زمین ہموار کر لینے کی ضرورت تھی، وہ ضرورت بھی انجام پا چکی تھی اور آپ کے اصحاب کرام وجاں نثاران اسلام مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کر کے ایک خاندان کی طرح اکٹھا ہو گئے تھے اور تقریبا سب ہی وہاں منتقل ہو گئے تھے، اسی کے بعد آپ کو ہجرت کی اجازت اس وقت ملی جب مکہ کے کافروں نے یہ دیکھ کر کہ آپ کے ماننے والوں کو مکہ چھوڑ کر ایک محفوظ جگہ منتقل ہونے میں کامیابی حاصل ہو چکی ہے اور ظاہر ہے اب آپ بھی وہاں چلے جائیں گے اور وہاں سے اپنی دعوت حق جاری رکھیں گے تو انہوں نے آپ کی زندگی کو ہی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا، چنانچہ اللہ تعالی کی طرف سے فیصلہ ہوا کہ اب آپ بھی مدینہ منتقل ہو جائیں، چنانچہ آپ نے خاموشی کے ساتھ رات کی تاریکی میں دشمنوں

کے درمیان سے نکلتے ہوئے مکہ کو چھوڑا اور ہجرت فرما کر وہاں تشریف لے آئے اور اس طرح اب ایک مستحکم مرکز اور نظام قائم کرنے کا موقع حاصل ہو گیا جہاں سے کام کو آگے بڑھایا جاسکتا تھا اور دعوت حق کو دور دور تک پہونچایا جاسکتا تھا۔

یثرب (مدینہ منورہ) کے اصل عرب باشندے اوس وخزرج کے دو قبیلوں کے لوگ تھے (۱)، یہ آپ ﷺ کی آمد تک اکثر وبیشتر مسلمان ہو چکے تھے، اور مہاجرین کے ساتھ برادرانہ ہمدردی رکھتے ہوئے باقاعدہ مسلمانوں کی مشترکہ برادری کی حیثیت اختیار کر چکے تھے، وہ سب آپ کے استقبال کے لئے تیار تھے (۲)۔

مدینہ میں آپ ﷺ کی آمد

حضور ﷺ مدینہ پہونچنے پر قباء کی طرف سے داخل ہوئے، یہ شہر کے جنوبی جانب تقریباً تین میل کے فاصلہ پر مدینہ سے تعلق رکھنے والی ایک بستی ہے، جہاں کھجور کے باغات ہیں، اسی کے ساتھ اس کے جنوبی علاقوں میں مشرقی اور مغربی جانب مدینہ شہر تک دشوار گذار پہاڑی نشیب وفراز بھی ہیں، جن کو حرۃ کہتے ہیں (۳)، ایسے خطوں کے پتھر کالے، ناہموار اور نوک دار کناروں کے ہوتے ہیں، جن پر چلنا دشوار ہوتا ہے، مدینہ منورہ ایسے پتھروں کے خطوں سے مشرق، جنوب اور پورب سے گھرا ہوا ہے، اس لئے وہاں جانے والے صرف اس کے شمال کی طرف سے شہر میں داخل ہوتے ہیں، لیکن حضور ﷺ جنوبی طرف سے آئے، غالبًا احتیاط کی خاطر ایسا کیا تھا اور آپ کا اسی طرف سے آنے کا انتظار بھی تھا، آپ قبا پہونچنے پر کئی روز وہاں مقیم رہے، اور آپ نے وہاں مسجد کی تعمیر کی جو اسلام کی پہلی مسجد کہلائی (۴) جس کے بارے میں قرآن نے کہا:

---

(۱) المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، از: ڈاکٹر جواد علی: ۴/۱۲۹۔

(۲) سیرت ابن ہشام: ۱/۴۹۲۔ (۳) المغانم المطابة فی معالم طابة، از: علامہ مجد الدین فیروز آبادی: ۱۰۸-۱۱۴۔ (۴) البدایة والنهایة: ۳/۱۹۶، سیرت ابن ہشام: ۱/۴۹۴۔

﴿لمسجد أسس على التقوىٰ من أول يوم أحق أن تقوم فيه، فيه رجال يحبون أن يتطهروا، والله يحب المطّهرين﴾

(سورہ توبہ،آیت:۱۰۸)

وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے تقوی پر رکھی گئی ہے زیادہ اس قابل ہے کہ اس میں جایا اور نماز پڑھایا کرو، اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں اور خدا پاک رہنے والوں ہی کو پسند کرتا ہے۔

آپ وہاں دوشنبہ کے روز پہونچے تھے اور تین روز بعد جمعہ کے دن مدینہ کے لئے روانہ ہوئے ، راستہ میں جمعہ کی نماز کا وقت ہوا اور آپ نے راستہ ہی میں جمعہ کی نماز ادا کر لی (۱)، مدینہ شہر میں داخل ہونے پر آپ کا وہاں زبردست استقبال ہوا اور ہر ایک خاندان کے سربراہ نے اپنے یہاں اترنے اور قیام کرنے کی درخواست کی ،لیکن آپ نے خود سے فیصلہ کرنے کے بجائے اپنی سواری کو آزاد چھوڑ دیا، آپ کو خدا کی طرف سے اسی کا حکم تھا اور سواری کے لئے خدا کی طرف سے انتظام تھا کہ جہاں وہ رکے وہی جگہ غیب سے مقرر ہے، آپ کو اللہ کے حکم سے اسی جگہ کو اختیار کرنا تھا، ورنہ تو آپ کو ہر طرف سے دعوت دی جا رہی تھی کہ ان کے مکان پر رکیں۔

بہر حال یہ شرف حضرت ابوایوب انصاریؓ کو حاصل ہوا کہ انہی کے دروازے پر آپ کی اونٹنی بیٹھی اور آپ نے وہیں قیام کا فیصلہ کیا (۲) اور یہ بھی ایک حسن اتفاق تھا کہ حضرت ابوایوب مدینہ کے خزرجی قبیلہ کی ایک ایسی شاخ کے فرد تھے، جس سے حضور ﷺ کے دادا عبدالمطلب کی والدہ تھیں، اس طرح حضور ﷺ کی اس گھرانے سے قرابت بھی تھی۔

مسجد نبوی کی تعمیر

پھر آپ نے اسی کے سامنے کی زمین کو خرید کر اس میں مسجد کی تعمیر فرمائی، یہ

(۱) سیرت ابن ہشام:۱/۴۹۴، زاد المعاد:۳/۵۹، دلائل النبوۃ:۲/۵۰۰۔
(۲) سیرت ابن ہشام:۱/۴۹۶، دلائل النبوۃ:۲/۵۰۳۔

زمین دو یتیم بچوں کی تھی، انہوں نے مسجد کا نام سن کر ہدیہ کرنا چاہا، لیکن آپ نے بغیر قیمت کے لینا پسند نہیں کیا اور اس کی پوری قیمت عطاء فرمائی اور مسجد کی تعمیر کے کام میں برابر شریک بھی رہے، یہ مسجد "مسجد نبوی" کہلائی (۱)، جو مدینہ کی بڑی اور اصل مسجد بنی۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ عزت عطا فرمائی کہ آپ کی یہ بنائی ہوئی مسجد عند اللہ ایسی متبرک قرار پائی کہ وہاں نماز ادا کرنے پر دوسری عام مسجدوں کے مقابلہ میں ۵۰ ہزار نمازوں کے برابر ثواب مقرر فرما دیا گیا، اسی مسجد کے جنوب و مشرق میں متصلاً آپ نے اپنی ازواج مطہرات کے لئے حجرے بنوائے (۲) اور اس طرح آپ کی قیام گاہ مسجد سے متصل بن گئی، پھر آپ کی وفات کے موقع پر اسی مسجد سے متصل آپ کی زوجہ مطہرہ حضرت عائشہ کے حجرہ میں جہاں آپ کی وفات ہوئی آپ کی آرام گاہ بھی بنی، اس طرح اس مسجد میں نماز پڑھنے کے موقع سے آپ کو سلام پیش کرنے اور اظہار محبت و تعلق کا ایک ذریعہ بن گیا، چنانچہ جو بھی حج کرنے جاتا ہے، اس مسجد میں بھی حاضری دیتا ہے، اس مسجد کا وہ حصہ جو آپ کی آرام گاہ سے متصل مسجد کے منبر تک واقع ہے، جنت کی کیاریوں میں سے ایک کیاری قرار دیدیا گیا جس میں نماز پڑھنا جنت میں نماز پڑھنے کی طرح ہے۔

مدینہ میں آپ کی تشریف آوری تک وہاں کی آبادی کی بڑی تعداد آپ کی ماننے والی بن چکی تھی، اور وہاں کے اصل باشندوں کی طرف سے وعدہ بھی ہو گیا تھا کہ وہ آپ کی حفاظت کریں گے، اور آپ کی رہنمائی میں اپنی زندگی کو اسلامی زندگی بنائیں گے، اس طرح آپ کی دعوت حق یہ کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا، جس کا شرف یثرب نامی شہر کو ملا، یثرب اصلاً شہر کے ایک حصہ کا نام تھا، جو آہستہ آہستہ پورے شہر کے لئے استعمال ہونے لگا، اس لفظ میں ایک مذموم پہلو تھا، آپ نے اس لفظ کے

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/۴۹۶، طبقات ابن سعد: ۱/۲۳۹، زاد المعاد: ۳/۶۲۔

(۲) طبقات ابن سعد: ۱/۲۴۰۔

بجائے دوسرے الفاظ سے اس کی تعبیر پسند فرمائی اور اس وقت سے وہ طیبہ، طابہ، اور آپ کی نسبت سے مدینۃ النبی کے نام سے موسوم ہونے لگا اور مدینۃ النبی کے اختصار کی بنا پر المدینہ کہا جانے لگا (۱)۔

یہ عزت وشرف ایک موقع آیا تھا کہ شاید طائف کے شہر کو حاصل ہو جاتا اگر وہاں کے ذمہ داران اس دعوت کی عظمت کو سمجھتے اور اس کی نصرت کے لئے اپنے کو پیش کر دیتے اور آپ کو اپنے یہاں بلا لیتے، اس دعوت حق کے رہبر نے ان لوگوں کے سامنے پر مشقت سفر کر کے تعاون دینے کی بات رکھی تھی، لیکن اس شہر کی قسمت میں یہ مقام بلند نہ تھا، انہوں نے اپنی ضد وہٹ دھرمی کے باعث اپنے کو اس شرف وعزت سے محروم کر لیا، جو دراصل خدا کی طرف سے ہی اس کے مقدر میں نہیں تھی۔

بالآخر اسی کے تین سال بعد وہ شرف وعزت یثرب یعنی مدینہ کو عطا ہوئی جہاں کے لوگوں نے اس کی پیشکش پر لبیک کہا، اور اس کی نصرت کے لئے جان دل سے تیار ہو گئے اور اس طرح یثرب کا شہر المدینۃ المنورۃ (یعنی وہ شہر جو نور سے منور ہوا) بن گیا، اور اللہ تعالیٰ کے آخری نبی کا مستقر اور مقام بن گیا، جس میں آپ کو مضبوط حمایتیوں کے درمیان رہتے ہوئے اسلام کی دعوت پھیلانے کا موقع ملا، اور دعوت اسلام کا یہ مرحلہ حضور ﷺ کو نبوت ملنے اور اس کے تحت دعوت حق دینے میں سخت سے سخت دشواریوں اور زحمتوں میں ۱۳ سال کی مدت گذارنے کے بعد شروع ہوا۔

اس منتقلی کے ذریعہ آپ کو اور آپ کے رفقاء کرام کو دعوت دین حق کے آغاز والے مقام شہر مکہ کے افراد کی دشمنی اور ایذا رسانی سے بچاؤ کا موقع بھی ملا، اور مسلمانوں کو یہاں برادرانہ اور تعاون کا ماحول حاصل ہو جانے سے دین حق کی تبلیغ و اشاعت کی ذمہ داری کی انجام دہی کا فریضہ زیادہ منظّم اور زیادہ توجہ سے انجام دینے کا

---

(۱) المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام: ۴/۱۳۰۔

بھرپور موقع ملا، البتہ اس مرحلہ میں انفرادی دشمنی اور ایذا رسانی کی جگہ پر اجتماعی اور منظّم سطح کی دشمنی سے سابقہ پڑا۔

مدینہ کی طبعی اور جغرافیائی حالت

مدینہ منورہ اپنے جائے وقوع کے اعتبار سے مخصوص اہمیت رکھتا تھا، وہ مکہ مکرمہ سے تقریباً ساڑھے چار سو کیلو میٹر شمال میں واقع تھا، اس کے ارد گرد پہاڑیوں کا سلسلہ تھا، مغربی جانب کے پہاڑوں کے دوسری طرف تھوڑے فاصلہ پر سمندر تھا، سمندر اور پہاڑ کے درمیان مسطح جگہ تھی، جو اپنے جائے وقوع کے لحاظ سے تہامہ کا جزء تھی، جنوب سے آنے والے قافلے اسی میں گذر کر شام، مصر اور ترکی جاتے تھے، یہ راستہ مدینہ سے قریب ہونے کی بنا پر ایک طرح سے مدینہ والوں کے زیر اثر تھا، مدینہ شہر اپنے مشرقی رخ کے لحاظ سے پہاڑی سلسلہ جسے حجاز کہتے ہیں کے مغربی کنارے واقع ہے اور اس کی زمین پیداواری صلاحیت رکھتی ہے، چنانچہ اس میں کھیتی باڑی ہوتی رہی ہے اور کھجور اور انگور کے باغات بھی ہوتے ہیں، اس کی وجہ سے یہاں کے باشندے عام طور پر کسان اور اور زمیندار ہوتے تھے، اور یہ بات مکہ کے برعکس تھی جہاں کی زمین خشک تھی، وہاں کے لوگ تجارت پیشہ ہوتے تھے اور اس کے لئے ان کو کبھی مال کے ساتھ یمن جانا پڑتا تھا، کبھی شام، اور شام جانے میں مدینہ کے قریب سے گذرنا ہوتا تھا، چنانچہ جزیرۃ العرب کے اطراف میں یہاں کے لوگوں کی یہ اہمیت سمجھی جاتی تھی کہ وہ اگر ناراض ہوں تو تجارتی راستوں پر رکاوٹ کا باعث بن سکتے ہیں، خاص طور پر قریش کے لئے جو کہ تجارتی پیشہ والے تھے، اپنے شام جانے والے راستہ کے مدینہ کے قریب سے گذرنے کی نزاکت کو سمجھتے تھے، نیز مدینہ کے بسنے والے قبیلے اوس وخزرج عربوں کی قحطانی نسل سے تھے، جب کہ قریشی اور ان کے دوست اور قرابت والے قبائل اسماعیلی نسل سے تھے، اس قبائلی فرق سے بھی دونوں

کے درمیان ایک حد تک الگ الگ ذہن اور اپنے اپنے قبیلہ کی نسلی عصبیت بھی پائی جاتی تھی (۱)۔

اجتماعی حالت

مدینہ کا یہ شہر یہاں کے لوگوں کے مسلمان ہونے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہاں آمد سے پہلے دوسرے علاقوں کے عرب قبائل کی عادت و دستور کے مطابق آپس میں احساس عزت کی زیادتی کی بنا پر خانہ جنگی سے گزر رہا تھا اور یہاں کے علاقائی اور مقامی حالات اپنی مخصوص پیچیدگیاں بھی رکھتے تھے، یہاں عربوں کے دو قبیلے اوس و خزرج تھے جو اصلاً ایک ہی نسل سے تھے، آپس میں قبائلی عصبیت میں ایک دوسرے سے لڑتے رہے تھے، ان کے ساتھ پڑوس میں یہودی قبائل بھی تھے، جو عرب نہ ہونے کی وجہ سے باہری سمجھے جاتے تھے، ان کی آبادی بھی کم تھی، ان میں خاص اور بڑے خاندان بنونضیر، بنوقریظہ، بنوقینقاع کے نام سے معروف تھے، یہ وہاں کے متمول لوگ تھے، یہ عموماً زمیندار بن گئے تھے، یہ عربوں کو اپنے باغات اور کھیتوں میں مزدوری پر رکھتے اور ان کے غریبوں کو سودی قرضے دیتے تھے، اور ان کی آپس کی لڑائیوں میں ایک فریق کو دوسرے فریق کے مقابلہ میں تقویت پہونچاتے تھے، اس سے عرب قبائل کے آپسی ٹکراؤ میں شدت اور بڑھ جاتی تھی (۲)، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی تحریر فرماتے ہیں:

”وہاں کی زندگی پیچیدگی میں مکہ سے بڑھی ہوئی تھی، اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیش آنے والے مسائل مختلف نوعیت کے تھے، وہاں کئی مذاہب اور معاشرے اور ثقافتیں تھیں جن پر قابو پانے اور مدینہ کو ایک عقیدہ اور ایک دین کے رنگ میں رنگنے کا کام مؤید من اللہ رسول ہی کر سکتا تھا، جسے اللہ نے حکمت و بصیرت اور

---

(۱) المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام: ۴/ ۱۲۸-۱۴۲۔ (۲) تاریخ العرب العام، از: سیڈیو، ترجمہ عربی: عادل زعیتر، ص: ۵۱، مکہ والمدینہ في الجاهلیہ وعهد الرسول، از: احمد ابراہیم الشریف۔

قوت فیصلہ اور انسانیت کے بکھرے شیرازے کو جمع کرنے اور متحارب قوتوں اور نظریوں کو ہدایت اور تعمیر انسانیت کے کام میں ایک دوسرے کا مددگار بنانے کی غیر معمولی صلاحیت سے نوازا تھا، اور جسے ایک دلکش شخصیت عطا کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں اس کو اس طرح فرمایا کہ:

﴿هو الذي أيدك بنصره وبالمؤمنين ،وألف بين قلوبهم لو أنفقت مافي الأرض جميعاً ماألفت بين قلوبهم ولكن الله ألف بينهم إنه عزيز حكيم﴾ (سورة الانفال، ٦٢-٦٣)

وہی ہے جس نے اپنی مدد اور مسلمانوں کے ذریعہ آپ کی پُشت پناہی کی اور ان کے دل ملا دیئے کہ اگر آپ دنیا کی ساری دولت بھی خرچ کر دیتے تب بھی ان کے دلوں کو نہیں جوڑ سکتے تھے، لیکن اللہ ہی نے ان میں جوڑ اور اتفاق پیدا کر دیا، وہ غالب اور حکمت والا ہے“(۱)۔

عالمی مواخات

اب قریش کے مسلمانوں کے مدینہ آکر اوس وخزرج کے ساتھ اتحاد کر لینے سے مدینہ کی آبادی میں دونسلوں کے درمیان یعنی اوس وخزرج اور قریش کے مسلمانوں کے درمیان اخلاقی ودینی رشتہ نے کم از کم ان دونوں کے درمیان عصبیت والی علیٰحدگی بڑی حد تک ختم کر دی، اور اسلام کے جھنڈے کے نیچے دونوں ایک ہوگئے، دونوں کے مرشد ورہنما ایک ہوگئے، اور اس طرح اس سے اسلامی نظام حیات کو خاصی تقویت حاصل ہوگئی، جس کو حضور ﷺ کی دانشمندانہ اور محبت واخلاق والی رہبری حاصل ہوئی، اس طرح یہاں ایک ایسی طاقت بن گئی جس کی باگ ڈور حضور ﷺ کے ہاتھ میں تھی، مکہ سے آنے والے مسلمان اسماعیلی نسل سے ہونے کی وجہ سے اوس وخزرج کے اصل قرابت والے نہ تھے، بلکہ ایک دوسرے کو ایک طرح سے غیر بلکہ حریف سمجھتے تھے، اس دوری واجنبیت کے مداوا کے لئے حضور ﷺ نے یہ

---

(۱) نبی رحمت جدید ایڈیشن، ۲۵۶-۲۵۷

کیا کہ ان میں باقاعدہ مواخات یعنی بھائی بھائی ہونے کا معاہدہ رشتہ داری طرز کا کرادیا(۱) جس سے دونوں کی نسلی علیحدگی قربت واخوت میں تبدیل ہوگئی۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

''یہ مواخاۃ (بھائی چارہ) اپنی نوعیت کی منفرد اسلامی وعالمی اخوت کی اساس ایک صاحب دعوت امت کے قیام کا مقدمہ تھی، جو ایک نئی دنیا کی تعمیر کے لئے برپا ہورہی تھی اور جو صحیح ومعین عقائد اور دنیا کو بدبختی وبدنظمی سے نجات دینے والے نیک مقاصد اور ایمان ومعنوی اخوت ومتحدہ سرگرمی کے تعلقات کے لئے قائم ہورہی تھی، اس طرح مہاجرین وانصار کے درمیان یہ محدود اخوت دنیائے انسانیت کی نئی زندگی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی''(۲)۔

چنانچہ اسلام کے اس شہر میں آنے اور اسلامی ہدایات قبول کر لینے سے ان کو بھائی بھائی بننے کی تلقین کی گئی اور قبائلی عصبیت چھوڑ کر انسانی ہمدردی اور انصاف کی تلقین کی گئی، ان میں باوجود قبائلی عصبیت کے اخوت پیدا ہوئی اور انہوں نے آپس میں ہی نہیں بلکہ مکہ کے لوگوں کو بھی اپنا بھائی بنالیا، آپ ﷺ کے وہاں تشریف لانے سے محبت و بھائی چارگی، ہمدردی وغمخواری کی شاندار فضا قائم ہوگئی۔

یہود مدینہ سے معاہدہ

مدینہ میں عربوں کے ساتھ جو یہودی قبائل آباد تھے، اصلاً شام کے علاقہ کے تھے، وہ عربوں کے کھجور والے علاقوں میں سے کسی ایک علاقہ میں نبی آنے کی پیشن

(۱) صحیح بخاری: باب اخاء النبی بین المہاجرین والأنصار، طبقات ابن سعد: ۱/ ۲۳۸۔

(۲) نبی رحمت، ص: ۲۶۶، نیز مدینہ کی جغرافیائی، مذہبی، اخلاقی اور اجتماعی حالت کے لیے ملاحظہ کریں ''الیہود فی بلاد العرب'' از ڈاکٹر اسرائیل ویلفنسن، ''بنواسرائیل فی القرآن والسنۃ'' از ڈاکٹر سید محمد طنطاوی، و ''تاریخ العرب قبل الاسلام'' از ڈاکٹر جواد علی، ''مکۃ والمدینۃ فی الجاہلیۃ وعہد الرسول'' از احمد ابراہیم الشریف، ''بلوغ الأرب فی معرفۃ احوال العرب'' از علامہ محمود شکری الآلوسی، ''وفاء الوفا فی اخبار دار المصطفیٰ'' از سمہودی، ''معجم البلدان'' از یاقوت حموی، ''التراتیب الاداریۃ'' از کتانی۔

گوئی اپنی کتاب میں دیکھ کر یہاں آ کر بس گئے تھے، اپنے نسلی فرق کی بنا پر اپنے ذہن اور خصوصیات سے عربوں سے مختلف تھے، اور مذہبی لحاظ سے بھی علیحدگی رکھتے تھے، اس طرح نسلی، مذہبی، اور وطنی بنیاد پر یہاں اصلی باشندوں سے مختلف حیثیت رکھتے تھے، اسی کے ساتھ علمی اور اقتصادی لحاظ سے عربوں پر ان کو برتری حاصل تھی، جس سے وہ سیاسی اور اقتصادی فائدہ اٹھاتے تھے، لیکن آبادی میں تعداد کے لحاظ سے عربوں کو ان پر برتری حاصل تھی، یہودی افراد عربوں پر اپنی اقتصادی برتری اور علمی بنیاد پر عربوں کو اپنے سے کمتر سمجھتے تھے اور اقتصادی دائرہ میں ان پر اپنا زور دکھاتے تھے اور علمی بنیاد پر دھمکاتے ہوئے کہتے تھے کہ ہماری کتابوں میں یہ پیشین گوئی ہے کہ ان اطراف میں ایک نبی آنے والا ہے، ان کے آنے پر ہم ان کی قیادت میں تم پر باقاعدہ اپنا غلبہ اور برتری حاصل کرلیں گے (۱)۔

حالانکہ ان کا دین دین موسوی تھا اور موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی تھے، لیکن ان یہودیوں کا اور دیگر علاقوں کے یہودیوں کا بھی اپنے دین پر عمل پورا نہیں تھا، انہوں نے اپنی آسمانی کتاب ''توریت'' میں اپنی مرضی سے تصرف بھی کیا تھا اور اس تصرف کی بنیاد پر بعض غلط کاموں کو بھی صحیح قرار دیکر اپنی پسند کے مطابق عمل کرتے تھے۔

بالآخر اس طرح کی اللہ تعالیٰ کی مسلسل نافرمانی کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان کو مبغوض قرار دے دیا، لیکن وہ اس غلط فہمی میں تھے کہ آنے والا نبی انہی میں سے ہوگا، کیونکہ کچھ عرصہ سے ایسا ہی ہو رہا تھا، اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہونے کی بنا پر ان پر فضل ہو رہا تھا، جس کی مسلسل ناقدری نے ان کو مبغوض بنا دیا، لیکن وہ اپنی خام خیالی کی بنا پر اس آخری نبی کے اپنے ہی میں ہونے کے متوقع تھے، اور جگہ کی علامتوں کی بنا پر ان کی کچھ خاندانی شاخیں مدینہ اور اس کے شمالی علاقوں میں آ کر بس گئی تھیں اور انتظار میں تھے۔

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/ ۴۲۸

لیکن جب نبی ان کے بجائے عربوں میں مبعوث ہوا تو ان کو ناگوار ہوا اور انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا، لیکن مدینہ کے عربوں نے یہودیوں سے جو سنا تھا اس کی بنا پر حضور ﷺ کی نبوت کی خبر ان کو یہودیوں کی بتائی ہوئی بات سے مطابقت رکھنے والی بات معلوم ہوئی، بلکہ ان کو اس کی بنا پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے صحیح ہونے کی ایک طرح سے دلیل بھی معلوم ہوئی، اسی لئے مدینہ میں آسانی کے ساتھ اسلام کے قبول کرنے کی صورت بن گئی اور پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے آئے تو یہود نے یہ دیکھ کر کہ آپ ﷺ کے ساتھ مدینہ والوں کی اکثریت ہوگئی ہے، اس اکثریت سے کچھ ڈر کر اپنی ناگواری اپنے دل ہی میں رکھی، ادھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صورت حال کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا، لہذا مناسب سمجھا کہ یہودیوں سے امن معاہدہ کر لیا جائے تاکہ مدینہ کی آبادی میں کسی طرح کے خلفشار کی فضا نہ بنے، یہودیوں نے چونکہ اقلیت میں تھے یہ معاہدہ مصلحتًا قبول کر لیا، اس معاہدہ میں عرب مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ایک دوسرے کے ساتھ پر امن برتاؤ اور ایک دوسرے کی مذہبی وسماجی خودمختاری رکھی گئی تھی اور بیرونی خطرہ پیش آنے پر ایک دوسرے کی مدد کرنا طے کیا گیا تھا، اس معاہدہ کے بعد مدینہ کے شہر میں اسلامی دعوت اور اسلامی نظام وطرز حیات کے اختیار کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی (۱)۔

اسلام کے اجتماعی نظام کا قیام

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہاں تشریف لا کر یہاں کے باشندوں کے درمیان اتفاق واتحاد پیدا کر کے اسلامی زندگی کا اجتماعی نظام قائم فرما دیا جس میں سب مسلمان ایک امیر کے ماتحت شریعت کے مطابق زندگی گذارنے کے اصول کے پابند ہوگئے، اس نظام میں ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ مکہ سے آئے ہوئے

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/۵۰۰-۵۰۴

مسلمان اور مدینہ میں مقیم مسلمان الگ الگ وطن اور الگ الگ قبیلہ کے تھے اور مکہ سے آنے والوں کو اپنے وطن کے سامان اور اپنے اقتصادی وسائل سب چھوڑ کر خالی ہاتھ اس نئی جگہ پر آنا پڑا تھا، جہاں ان کو اپنے معاش کے وسائل کا فوراً نظم کرنا آسان نہ تھا، لیکن ان دونوں کی ایمانی زندگی ان کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت کے اثر سے اس سطح کی ہوگئی تھی کہ آپ جو نظام تجویز فرماتے وہ مان لیا جاتا، آپ نے اسلامی اخوت نیز آپسی تعاون کے اصول پر ان میں آپسی مواخات کا حل تجویز فرمایا کہ مکہ سے آئے ہوئے مسلمانوں اور مدینہ کے باشندوں کے درمیان میں ایسا بھائی چارہ قائم ہو، کہ اس کے ذریعہ ہر مدنی کے ساتھ ایک مکی پوری طرح شریک اور مثل بھائی کے ہوجائے، اس طریقہ سے ہجرت کر کے آنے والے اور ان کے مدنی شریک کار ایک دوسرے سے جڑ گئے اور گویا کہ دونوں اصل باشندوں کی طرح بلکہ بھائی بھائی ہوگئے، جس کا اثر معاشی صورت حال پر بھی پڑا، اس مواخات کا یہ ایک فائدہ ہوا کہ مہاجرین وانصار کے درمیان رشتہ جیسا تعلق قائم ہوگیا اور اس سے پورے شہر کے لوگوں کی متحدہ اسلامی سوسائٹی کی تشکیل انجام پا گئی، دوسری طرف یہودی آبادی اس معاہدہ کے ذریعہ سے جو ان سے کیا گیا تھا اس سوسائٹی کی حلیف ہوئی اور اس طرح اس شہر سے اسلامی نظام زندگی اور اس کا اپنے مقاصد کے مطابق عمل اختیار کرنے کا پورا ماحول بن گیا، اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اسلام کا اجتماعی نظام قائم کرنے کا موقع حاصل ہوگیا، جو مکہ میں وہاں کی دشمنی اور سخت حالات اور کفار کے غلبہ وعداوت کی وجہ سے قائم نہیں کیا جاسکا تھا، اور وہاں صرف انفرادی سطح ہی پر احکام الٰہی پر عمل ہو رہا تھا، اور اس کے ساتھ دعوت کا بھی انفرادی سطح پر کام انجام دیا جارہا تھا اور آخر میں وہ بھی مشکلات میں گھر گیا تھا، جس کی وجہ سے مکہ سے منتقل ہونے پر مجبور ہونا پڑا تھا، اور قریش کی طرف سے پکڑ دھکڑ کے باعث ان کی گرفت سے بچنے کے لئے ایک چکّر دار راستہ سے مدینہ منورہ سفر کرنا پڑا تھا۔

اذان کا آغاز

عبادت کے سلسلہ میں نماز پہلے سے فرض تھی جو مکہ میں علیحدہ علیحدہ اور ایک حد تک چھپ کر پڑھی جاتی تھی، مدینہ آ کر یہ دشواری ختم ہوئی، اس کے لئے مسجد میں جماعت سے پڑھنے کے لئے بلانے کی ضرورت تھی، اس کے لئے ہجرت کے پہلے سال ہی اذان دینا مقرر کردیا گیا، جماعت کے ساتھ باقاعدہ نماز ہونے پر جب ضرورت محسوس ہوئی کہ لوگوں کو بلائے جانے کا کیا طریقہ ہو، کسی نے ناقوس بجا کر اطلاع دینے کی رائے دی، کسی اور نے کسی اور طریقہ کی نشاندہی کی، اسی غور وفکر کے دوران ایک صحابی آئے اور اپنا خواب بیان کیا، کہ انہوں نے ایک شخص کو فلاں الفاظ میں اعلان کرتے دیکھا اور اذان کے الفاظ سنائے، یہ الفاظ ایسے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ تلقین الٰہی ہے جو خواب کے ذریعہ بھی ہوتی ہے، لہٰذا حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بلا کر ان کو سکھا دیا، اس طرح اذان کا سلسلہ شروع ہوا(۱)۔

تحویل قبلہ

مسجد نبوی کا جائے وقوع چونکہ بیت المقدس اور مسجد حرام مکہ کے درمیان ہے اس کی وجہ سے اس میں قبلہ کے تعین کا مسئلہ تھا، کیونکہ سابقہ آسمانی شریعت کے مطابق اب تک قبلہ بیت المقدس کی طرف تھا، حضور ﷺ اور مسلمان جب تک کوئی نیا حکم نہ آئے اسی رخ کے پابند تھے، البتہ کعبہ کے تقدس کی بنا پر ان کا جی اسی کو چاہتا تھا، شاید اس لئے مسجد حرام میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز پڑھتے تھے تو مسجد حرام کے جنوبی رخ پر کھڑے ہو کر شمال کا رخ اختیار کرتے تھے، اس طرح دونوں کا رخ ایک ہو جاتا تھا، لیکن یہ یہاں مدینہ میں ممکن نہیں تھا، اور قبلہ کے لئے کوئی نیا حکم نہیں آیا تھا،

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الأذان، باب بدء الأذان، سیرت ابن ہشام: ۱/ ۵۰۸-۵۰۹۔

لہٰذا آپ اپنے سے پہلے آنے والے انبیاء کے ہی اختیار کردہ یعنی بیت المقدس کا رخ اختیار فرماتے رہے، اس میں کعبہ کا رخ پشت کی جانب پڑنے لگا۔

لیکن آپ کی خواہش کعبۃ اللہ کے رخ کو اختیار کرنے کی تھی کیونکہ بیت المقدس کو مسجد و قبلہ بنانے والے ابو الأنبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہی کعبہ کی تعمیر کی تھی، اور اس کو دین و عبادت کا سب سے بڑا مرکز قرار دیا تھا اور اس کی اہمیت و عظمت کے لئے دعاء کی تھی اور ان سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے بھی اس جگہ کو عبادت کی جگہ بنائی تھی، اس طرح یہ اللہ کا سب سے پہلا گھر کہلایا اور دنیا کا سب سے مرکزی عبادت خانہ بنا، جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إن أول بيت وضع للناس للذى ببكة مبركا و هدى للعالمين﴾ [آل عمران:۹۶]

پہلا گھر جو لوگوں کے عبادت کرنے لئے مقرر کیا تھا وہی ہے جو مکہ میں ہے بابرکت اور جہان کے لئے موجب ہدایت۔

اس طرح وہ قبلہ بننے کا مستحق معلوم ہوتا تھا، لیکن اس کو قبلہ بنانے کا جب تک خدا کی طرف سے آپ کو حکم نہ ملے آپ محض اپنی خواہش پر عمل نہیں کر سکتے تھے، صرف اظہار خواہش کر سکتے تھے، چنانچہ آپ کی خواہش کو قبولیت ملی اور بیت اللہ شریف کو قبلہ بنانے کا حکم نصف ماہ شعبان ۲ھ میں آ گیا۔

یہ تاخیر غالباً مسلمانوں کو اپنی خواہش اور رائے کو کچھ مدت تک دبانے کی مشق کرانے کے لئے تھی، شاید اسی لئے حکم آنے میں تاخیر ہوئی، بہر حال کعبہ کو دونوں مسجدوں یعنی مسجد بیت المقدس اور مسجد نبوی سے بھی زیادہ افضل قرار دیا گیا، وہاں نماز پڑھنے کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے ثواب کے برابر قرار دیا گیا، حکم نازل ہوا:

﴿فول وجهك شطر المسجد الحرام﴾

اپنے چہرہ کا رخ مسجد حرام کی طرف کرو۔

یہ حکم آپ کے مدینہ تشریف لانے کے ایک سال چار ماہ بعد آیا (۱)، اس مدت میں آپ نے یہاں سے مسجد بیت المقدس کے رخ پر نمازیں ادا فرمائیں۔

یہ بات یہودیوں کو بری لگی کیونکہ وہ اصل عبادت گاہ ہونے کا حق صرف اپنی عبادت گاہ بیت المقدس کا سمجھتے تھے، لیکن اللہ تعالی نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ حضرت محمد ﷺ کو اس طرح شامل فرمادیا کہ دونوں کی شریعت ایک شریعت ہوگئی تھی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بنی اسرائیل کو حاصل شدہ خصوصیت بنی اسرائیل سے ہٹ کر محمد ﷺ کی طرف منتقل ہوگئی اور کعبہ سے تعلق کا معاملہ دونوں میں یکساں تھا اور اب دینی رہبری کی وراثت حضرت محمد ﷺ کی طرف منتقل ہوگئی تھی، لہذا بیت المقدس کی مرکزیت کعبہ کی طرف منتقل ہوگئی۔

اسلامی معاشرہ کی تشکیل

حضور ﷺ کی طرف سے مدینہ منورہ کو اپنے قیام کا مستقر بنالینے سے مسجد نبوی کو بھی اہمیت ملی اور مدینہ شہر کو بھی اسی لحاظ سے خصوصیت حاصل ہوگئی اور وہاں سے مسلمانوں کے معاملات ومسائل اور ان کی مذہبی اور اجتماعی زندگی کے معاملات کا نظم وانتظام اور ہدایات جاری ہونے لگیں اور اس طریقہ سے اسلامی نظام عمل جاری ہونے کا انتظام ہوگیا، اور دینی، اجتماعی اور اخلاقی معاملات کے لئے ہدایات آنے لگیں اور چونکہ اسلامی شریعت سابقہ نبیوں پر مکمل نہیں کی گئی تھی، اور اب آپ پر مکمل کی جانے والی تھی، لہذا اس کی تکمیل وجامعیت کے لئے زندگی کے متنوع اور مختلف مواقع کے لحاظ سے احکام بتدریج آنا شروع ہوئے، نمازوں کا تعین، روزوں کا تعین، اُذان کا تعین، جوا اور شراب کی حرمت، اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں خواہ وہ انفرادی دائرہ کے ہوں، یا اجتماعی دائرہ کے ہوں، ان کی درستگی اور اچھائی کے

(۱) طبقات ابن سعد: ۱/۲۴۱، زاد المعاد: ۳/۶۶۔

لئے سہولت کا لحاظ کرتے ہوئے ہدایات آنے لگیں، اسی کے ساتھ دوستوں سے دوستی، حلیفوں کے ساتھ معاہدہ کی پابندی اور حملہ آوروں کے ساتھ مقابلہ کی اجازت، انسانیت کی بھلائی کا لحاظ، ایمان والوں کے آپسی تعلقات اور جو مسائل پیدا ہوتے ہیں ان سب کے احکام موقع موقع سے آپ کو بتدریج دئے جاتے رہے جو قرآن مجید کی آیات کے ذریعہ اور آپ پر مختلف طریقہ سے آنے والی وحی کے ذریعہ آتے تھے، اور اس طرح زندگی کے سارے احکام حالات اور واقعات کا جو جو تقاضہ ہوتا اس کے لحاظ سے نازل ہوتے، اس طرح ان کی عملی شکل لوگوں کے سامنے آتی رہی، اور یہ احکام صرف نظری طور پر نہیں رہے، بلکہ ان کو عملی شکل میں بھی بتایا جانے لگا، مسلمان ان پر عمل کرتے اور ان کو اپنی یادداشت میں محفوظ کر لیتے جن کو بعد میں کتابوں میں محفوظ کیا گیا، تاکہ مسلمانوں کی آئندہ زندگیوں میں جب اور جہاں ایسی صورت ہو تو اس میں ان کا انطباق کیا جاسکے اور اس طریقہ سے اسلام آئندہ کی ضرورتوں کے لئے بھی مکمل دین اور مکمل شریعت کی حیثیت سے محفوظ ہو گیا۔

صفہ اور اصحاب صفہ

تحویل قبلہ کے بعد جب مسجد نبوی کا رخ بیت اللہ کی طرف ہو گیا تو قبلہ اول کی طرف کی دیوار اور اس کے متصل جو جگہ ایک چبوترے کے طور پر تھی وہ ان مسلمان افراد کے ٹھہرنے کے لئے چھوڑ دی گئی جو حضور ﷺ سے دین کی باتیں معلوم کرنے اور سیکھنے کے لئے آکر مقیم ہونا چاہتے تھے، چنانچہ وہاں پر لوگ ٹھہرنے لگے جن کے کھانے پینے کا انتظام حضور ﷺ اپنے گھر والوں کی طرح کرتے تھے اور حضور ﷺ کو اپنی سخاوت کی وجہ سے اور غریبوں کی مدد کرنے کے باعث وقتاً فوقتاً بڑی دشواری ہو جاتی تھی اور فقر و فاقہ تک کی نوبت آجاتی تھی جس کو آپ ﷺ برداشت کرتے تھے اور یہ دین سیکھنے والوں کی تعداد کبھی کبھی ستر افراد تک پہونچ جاتی تھی، لیکن اس طرح

دین کی تعلیم یافتہ ایک جماعت تیار ہوگئی، یہ جگہ صفہ کے نام سے مشہور تھی (۱) اور یہ اسلام کا پہلا مدرسہ بنا جو صرف مسلمانوں کا نہیں، بلکہ عربوں میں بھی قائم ہونے والا پہلا مدرسہ ثابت ہوا جو صفہ یعنی چبوترے کے نام سے موسوم ہوا، یہیں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کے مسائل اور اسلامی تعلیمات کے حصول کا سلسلہ شروع ہوا اور پھر پورے عالم میں اسلامی مدارس قائم ہوتے چلے گئے۔

دعوت کی راہ میں صبر و برداشت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ پر ایمان لانے والے اصحاب کو مکہ کی زندگی میں کفار کی ایذا رسانی سے سابقہ دراصل اپنے عزیزوں اور ہم وطنوں سے ہی پیش آیا تھا، اور وہ ان سے عموماً ایک ہی خاندان کے ہونے کی بنا پر ہمت، غیرت اور احساس عزت میں کم نہ تھے، چاہتے تو انتقام کے ایسے طریقے اختیار کرتے کہ ان کے چین وسکون کو بھی باقی نہ رہنے دیتے، اور دن رات میں جب موقع ملتا تو بدلہ لے لیا کرتے، لیکن ان کو حکم الٰہی تھا کہ وہ خاموشی کے ساتھ صبر و برداشت اور دعوتی افہام و تفہیم تک اپنے کو محدود رکھیں، ان کو حکم تھا کہ ﴿ كفوا أيديكم و أقيموا الصلاة ﴾ اپنے ہاتھوں کو روکے رکھو اور نماز قائم کرو (۲)، ۱۳ سال تک یہ سلسلہ رہا اور آخر میں وطن سے بھی نکلنا پڑا اور دوسری جگہ حاصل ہوئی جہاں معتد بہ تعداد کے ساتھ اجتماعیت قائم ہوگئی اور اجازت ملی کہ اب مسلسل برداشت کرتے رہنے کی ضرورت نہیں، اپنی حفاظت اور دشمن کے حملہ کو روکنے کے لئے طاقت استعمال ہوسکتی ہے (۳)۔

چنانچہ اب اس کی اجازت کی بنا پر حسب ضرورت تدابیر اختیار کرنا شروع کردی گئیں، البتہ اس سلسلہ میں بے ضرورت کارروائی سے پرہیز اور ضرورت پڑنے

---

(۱) طبقات ابن سعد: ۱/ ۲۵۵-۲۵۶۔ (۲) سیرت حلبیہ: ۲/ ۳۴۳۔
(۳) زاد المعاد: ۳/ ۷۰۔

پر انسانی قدروں کا لحاظ، عورتوں اور بچوں کی رعایت، حسن معاملہ اور عمومی خیر طلبی اور صلح جوئی اختیار کرنے کا حکم رہا، چنانچہ دشمن کی دشمنی نا کام ہوتی رہی اور دعوت اسلامی کو کامیابی ملتی رہی، جس کے نتیجہ میں آپ ﷺ کی وفات سے قبل ہی پورا جزیرۃ العرب آپ ﷺ کی ہدایات کو تسلیم کرنے والا اور آپ ﷺ کے اقتدار کو قبول کرنے والا بن گیا، اور مکہ کے بڑے بڑے سورما جنہوں نے ہر طریقہ سے آپ ﷺ کو روکنے بلکہ ختم کرنے کی کوشش کی تھی بالآخر آپ کی تابعداری میں آ گئے۔

دعوت حق کی تبلیغ کے لئے ضروری وسائل اختیار کرنے کی تاکید

مدینہ منورہ میں مسلمانوں کو جب باقاعدہ معاشرہ قائم کرنے کا موقع حاصل ہو گیا اور ان میں یہ صلاحیت پیدا ہو گئی کہ اب وہ اپنے دشمن کی ظالمانہ کارروائیوں کو طاقت کے ذریعہ روک سکتے ہیں اور اس کی اجازت مل گئی کہ اگر دشمن مسلح تصادم کا پروگرام بنائے تو اس کے مقابلہ کے لیے ضرورت کی حد تک مسلح تدبیر اختیار کر سکتے ہیں، تو ان کی اسلامی زندگی کے لئے وہ مرحلہ آ گیا کہ وہ صرف انفرادی طریقہ کار پر اکتفاء نہ کریں، بلکہ اجتماعی تدبیر کے لیے اجتماعی نظام کے قیام کا بھی انتظام کریں، کیونکہ مذہب اسلام میں جس طرح انفرادی زندگی کے لئے ہدایات رکھی گئیں ہیں، اسی طرح اس میں اجتماعی زندگی کے لئے بھی احکام اور لائحہ عمل رکھا گیا ہے، اس کے اصول اور بنیادی احکام تو گزشتہ قوموں کے انبیاء کے زمانوں میں بھی جاری رہے، آپ ﷺ کی سرکردگی اور رہنمائی میں مسلمانوں کو اس سلسلہ کے احکام حسب ضرورت بتدریج آپ ﷺ کی حیات طیبہ کے دوران عطا کئے جاتے رہے حتی کہ آپ ﷺ کی حیات طیبہ کے آخری سال میں وہ تکمیل تک پہونچا دیئے گئے۔

مکی زندگی چونکہ اضطراری اور انفرادی حالات کی تھی اس لئے اس میں صرف اسی حد تک زندگی کے احکام آئے، لیکن اب جب کہ مسلمانوں کو مدینہ آ کر

اجتماعیت اور نفاذ کی قوت حاصل ہوگئی تو اب ان کی ضرورت کے احکام بھی عطا کردئے گئے جن کا دائرہ تمام اجتماعی پہلوؤں تک پھیلا ہوا تھا، لہٰذا حکم تھا کہ اس کے تحت اب یہ انفرادی ضرورت کی حد تک ہی نہیں بلکہ پورا انسانی معاشرہ اپنے پروردگار کی مرضی کے مطابق زندگی کا نظام اختیار کرنے کا آغاز کردے جو مکہ کے زمانۂ قیام میں وسیع طریقہ سے قابل عمل نہیں ہوسکتا تھا، لیکن اب مدینہ پہونچ کر اس پر عمل ممکن ہوسکا اور چونکہ مسلمانوں کا معاملہ عملی زندگی کا انفرادی درستگی سے وسیع ہوکر اجتماعی درستگی کی ضرورت تک پہونچ گیا، لہذا اب مسلمانوں کی کوششوں کو اس کے مطابق کرنے کا حکم ہوا اور مدینہ میں مسلمانوں کو جو اجتماعی طاقت حاصل ہوگئی تھی، اس طاقت کو اپنے خیر پسند دینی مقاصد کے کام میں لانے کے ساتھ ساتھ اپنے دفاع اور دین حق کی نصرت کے لئے استعمال کرنے کی اجازت بھی دے دی گئی اور جب دشمن باقاعدہ کارروائی پر آ گیا تو اس کے مقابلہ کے لئے باقاعدہ طاقت کے استعمال کی اجازت دیدی گئی، دشمن کے ظلم وتشدد کو ۱۳ سال صبر واستقامت کے ساتھ جھیل لیجانے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی مظلومیت کو تسلیم شدہ حقیقت قرار دیدیا گیا اور ان کو مظلوم کی حیثیت سے مدد کا حقدار قرار دیدیا گیا یعنی وہ اب مقابلہ کرسکتے ہیں، فرمان آیا کہ:

﴿أذن للذين يقاتلون بأنهم ظلموا، و إن الله على نصرهم لقدير﴾ [الحج:۳۹]

اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان لوگوں کے لئے اجازت ہوگئی جن سے جنگ کی جارہی ہے کہ وہ مظلوم ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان کی مدد پر پوری طرح قادر ہے۔

اس سے ان کو مسلح طریقہ سے مقابلہ کرنے کی اجازت مل گئی، اور پھر جب دشمن کیطرف سے مسلح کاروائی زور وقوت سے ہونے لگی تو مقابلہ کرنے کی باقاعدہ تاکید آ گئی:

﴿و قاتلوهم حتى لا تكون فتنة و يكون الدين كله لله﴾ (بقرہ:۱۹۳)

اوران سے جنگ کروتا کہ اس زمین پر فتنہ وفساد نہ ہواور (ملک میں) خدا ہی کا دین ہو جائے۔

اوراس کی مصلحت بتائی گئی کہ:

﴿ولولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لفسدت الأرض و لكن الله ذو فضل على العالمين﴾ [سورہ بقرہ:۲۵۱]

اگر اللہ تعالی بعض لوگوں کو بعض سے دفع نہ کرے تو زمین میں فساد پھیل جائے، لیکن اللہ تعالی دنیا والوں پر بڑا فضل وکرم کرنے والا ہے(۱)۔

بات یہ تھی کہ مسلمانوں کے مدینہ منورہ پہونچ کر متحد اور اکٹھا ہو جانے پر مسلمانوں کو مکہ کے کفار مزید ناگواری اور تشویش کی نظر سے دیکھنے لگے تھے اور مدینہ پہونچ کر ان کو کچل دینے کی تدابیر تیار کرنے لگے اور اس سلسلہ میں جو مسلح اقدام قابل عمل محسوس کرتے اس کو اختیار کرنے کی ترکیبیں کرنے لگے تھے، لہذا مسلمانوں کی طرف سے ان کو یہ محسوس کرا دینا ضروری ہوا کہ اب ان کو مکہ کے زمانہ کا مسلمان نہ سمجھیں، وہ اب اپنے خلاف زیادتیوں کو برداشت نہیں کریں گے، چنانچہ حضور ﷺ نے شروع شروع میں مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے مسلح دستے سریے کے نام سے ایسے مختلف اطراف میں بھیجنے شروع کئے، جہاں سے ریشہ دوانی کا خطرہ محسوس کیا، یہ زیادہ تر مدینہ منورہ کے قریب کے علاقوں پر نظر رکھنے اور وہاں قریش کی کارروائیوں کے خطرہ کو محسوس کرنے پر تھا اور اس طرح دشمنوں کو یہ محسوس کرانا تھا کہ مسلمان غافل نہیں ہیں اور دشمن کی کارروائیوں پر نظر رکھے ہوئے ہیں اور وہ اب خاموشی سے برداشت نہیں کرینگے، لہذا کوئی دھوکہ میں نہ رہے۔

مسلمانوں کو فوجی ٹکراو سے پہلا سامنا

اسی کو سامنے رکھتے ہوئے حضور ﷺ نے مدینہ کی مختلف سمتوں میں سرایا

(۱) زاد المعاد: ۳/۷۰، سیرت حلبیہ: ۲/۳۴۴۔

بھیجے جن کو صرف حالات معلوم کرنے اور اس بات کا اظہار کرنے کی اجازت دی گئی کہ دشمن کو صرف یہ احساس ہو جائے کہ مسلمان اب کمزور نہیں اور وہ طاقت کا مقابلہ طاقت سے کرنے میں کوتاہی نہ کریں گے، اس کے لئے آپ ﷺ نے اولاً پہلی صورت یہ اختیار کی کہ قریش کی نقل و حرکت معلوم کی جاتی رہے اور ان کی طرف سے کسی کاروائی کے امکان کو نظر میں رکھا جائے، مدینہ سے متصل ساحلی علاقہ مکہ اور شام کے درمیان آنے جانے والے قافلوں کا راستہ تھا، قریش کو کعبہ کے متولی ہونے کی وجہ سے ہر جگہ پر امن طریقہ سے آنے جانے کی سہولت حاصل تھی، وہ سہولت ان کو اس راستہ پر بھی حاصل تھی، کوئی قبیلہ ان سے تعرض نہیں کرتا تھا، اس لئے قریش کے قافلے بے خطر شمال و جنوب کو تجارتی مقصد سے جاتے آتے تھے اور یہ امتیاز صرف قریش کو حاصل تھا، ورنہ عربوں کا نظام یہ تھا کہ کوئی قبیلہ دوسرے قبیلہ کے کسی آدمی کو اپنے علاقہ سے بلا اجازت گذرنے نہیں دیتا تھا، اور کوئی زبردستی کرے تو اس سے باقاعدہ لڑائی کی نوبت آتی تھی، اس طرح ایک علاقہ کے لوگ دوسرے علاقہ کے کسی بااثر شخص کی پناہ حاصل کر کے ہی گذرتے تھے۔

مدینہ اب مسلمانوں کا علاقہ ہو گیا تھا، یہ مسلمان بہت سے قریشی بھی تھے جن کو قریش نے اتنا پریشان کیا تھا کہ ان کو اپنا مال و متاع سب چھوڑ کر مکہ سے نکلنا پڑا تھا، اور وہ مدینہ میں لٹے پٹے پہونچے تھے، ان کی جائدادوں اور مال و متاع پر ان کے دشمن قریشیوں نے قبضہ کر لیا تھا اور اس سے اپنی مالی حیثیت بڑھالی تھی، پھر اسی مال کو اپنی طاقت بڑھانے میں استعمال کرنے لگے تھے، لہذا مدینہ پہونچ کر مسلمانوں نے اپنے پیش نظر یہ بھی رکھا کہ قریش کی جماعتیں ان اطراف سے گذریں تو ان سے اپنا چھینا مال حاصل کرنے کی کوشش کی جائے جو قریش کے کافروں نے اپنے قبضہ میں لے لیا تھا اور اس کے ان سے چھینے جانے سے مسلمان پردیس میں ہونے کے ساتھ ساتھ سخت مالی پریشانی میں تھے اور قریش اس مال سے بھی اپنی تجارت کو مضبوط کر رہے تھے۔

لہٰذا جب مسلمانوں کو یہ اطلاع ملی کہ قریش کی ایک جماعت مسلمانوں کے دشمن اول ابوجہل کے زیر سرکردگی تجارت کے عنوان سے سفر کرتے ہوئے مسلمانوں کے علاقہ سے گذر رہی ہے تو اس کو سمجھنے کے لئے مسلمانوں کا ایک گروپ گیا لیکن وہ اس وقت تک وہاں سے گذر چکے تھے، اس لئے آمنا سامنا نہیں ہوا، لیکن جب قریش کی یہ جماعت تجارتی مال لیکر واپس لوٹی تو حضور ﷺ نے اس کو چیک کرنے کے لئے تیس نوجوانوں کو سمندری راستہ کی طرف روانہ کیا اور حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کو اس کا امیر بنایا، مسلمانوں کا وہاں پہونچ کر اس جماعت سے سامنا بھی ہوا، اور ٹکراؤ کی نوبت آنے کے قریب ہوگئی تھی کہ قبیلۂ جہینہ کے ایک شخص نے جس کا تعلق دونوں فریقوں سے تھا، بات چیت کرا کے ٹکراؤ سے بچالیا، یہ واقعہ ہجرت سے چھ ماہ بعد کا ہے (۱)۔

دوسرا واقعہ ہجرت کے آٹھویں مہینہ پیش آیا، آپ کو مکہ اور مدینہ کے درمیان دشمن کے دوسو جوانوں کے رابغ کے مقام پر جمع ہونے کی خبر ملی، تو آپ نے عبیدہ بن الحارث کی سرکردگی میں تقریباً ساٹھ ستر مسلمان نوجوانوں کو معلومات حاصل کرنے کے لئے بھیجا، یہاں ایک ہلکی ٹکر ہوئی، لیکن باقاعدہ جنگ نہیں ہوئی (۲)، اسی طرح ہجرت کے نویں مہینہ آپ کو اطلاع ملی کہ ''خراز'' (۳) کے مقام پر قریش کی ایک جماعت اکٹھی ہو رہی ہے، اس کے لئے آپ نے حضرت سعد بن اُبی وقاص کی سرکردگی میں مسلمانوں کے بیس سواروں کے ایک دستہ کو بھیجا، مسلمانوں کے وہاں پہونچنے سے قبل ہی قریش کے لوگ وہاں سے بھاگ گئے، لہذا یہ حضرات واپس آگئے (۴) پھر ودّان کے مقام پر قریش کے اجتماع کی اطلاع ملی، چنانچہ آپ حضرت سعد بن عبادہ کو مدینہ میں اپنا نائب بنا کر خود تشریف لے گئے (۵) وہاں بھی آپ کے

---

(۱) سیرت ابن ہشام:۱/۵۹۵، البدایۃ والنھایۃ:۳/۲۳۴، السیرۃ النبویۃ للإمام الذهبي:۲/۴۶ (حصہ مغازی)، الکامل فی التاریخ:۲/۱۱۰۔ (۲) سیرت ابن ہشام:۱/۵۹۵۔ (۳) معجم البلدان:۲/۳۵۰
(۴) البدایۃ والنھایۃ:۳/۲۳۴۔ (۵) الکامل فی التاریخ:۲/۱۱۳۔

پہونچنے سے پہلے وہ لوگ وہاں سے بھاگ گئے، پھر سترہویں مہینہ بواط کے علاقہ میں قریش کی ایک جماعت کے پہونچنے کی اطلاع ملی، وہاں بھی آپ خود تشریف لے گئے، لیکن دشمن پہلے ہی سے واپس جاچکا تھا، اور آمنا سامنا ہونے کی نوبت نہیں آئی (۱)، اسی مہینہ دشمنوں میں سے ایک جماعت نے عمرو بن جابر فہری کی قیادت میں شخصی طور پر مدینہ منورہ کے مضافات میں پہونچ گئی اور لوٹ مار مچائی، اس کے تعاقب کے لئے آپ ﷺ کو مسلمانوں کی ایک جماعت لیکر تشریف لے جانا پڑا اور آپ بدر کے قریب تک اس کے تعاقب میں گئے، لیکن وہ اور اس کے ساتھی اتنے دور چلے گئے تھے کہ نہیں مل سکتے تھے، اس واقعہ کا نام غزوہ سفوان پڑا (۲)۔

غزوہ بدر کفار اور مسلمانوں کے درمیان کا پہلا مقابلہ جنگ

حضور ﷺ کو سولہویں مہینہ یہ خبر ملی کہ قریش کی ایک جماعت شام کے راستہ پر جارہی ہے، جو کفار کے جنگی قائد ابوسفیان کی سرکردگی میں ہے اور قریش کی طاقت کو بڑھانے کا سامان کرنے کی نیت رکھتی ہے، آپ ﷺ نے ایک جماعت کے ساتھ اس کا تعاقب کیا، اور ینبوع کے قریب ایک مقام تک پہونچ گئے، لیکن وہ لوگ آپ ﷺ کے پہونچنے سے پہلے نکل گئے، اسی جماعت کے جب شام سے واپس ہونے کی آپ ﷺ کو اطلاع ملی تو آپ ﷺ اس کے تعاقب کے لئے مسلمانوں کی ایک تعداد لیکر نکلے، آپ کے نکلنے کی اطلاع ملنے پر قریش کی اس جماعت نے فوراً مکہ اطلاع بھیج دی، اور وہاں سے خصوصی مدد طلب کی، مسلمان ان کے تعاقب میں بدر کے قریب تک پہونچے، وہ جماعت ان کے پہونچنے تک وہاں سے آگے نکل چکی تھی، مسلمان واپس مدینہ آنے کا ارادہ کررہے تھے کہ آپ کو اطلاع ملی کہ مکہ والوں نے

---

(۱) الروض الأنف: ۳/ ۲۷، معجم البلدان: ۱/ ۵۰۳، السیرۃ النبویۃ للامام الذھبی: ۲/ ۴۷، البدایۃ والنھایۃ: ۳/ ۲۴۶۔ (۲) البدایۃ والنھایۃ: ۳/ ۲۴۷، سیرت ابن ہشام: ۱/ ۶۰۱۔

مسلمانوں سے باقاعدہ جنگ کے ارادہ سے زبردست تیاری کے ساتھ فوج روانہ کردی، آپ ﷺ نے اپنے رفقاء سے مشورہ کیا، آپ کے ساتھ صرف ۳۱۳؍ افراد تھے، جو دراصل قریش کی شام جانے والی جماعت کے لئے کافی سمجھتے ہوئے ساتھ لے لئے گئے تھے، باقاعدہ لڑائی کی نیت سے نہیں لائے گئے تھے اور اب چونکہ دشمن کی باقاعدہ فوج کی آمد کا مسئلہ آگیا تھا تو مشورہ کی ضرورت تھی کہ آیا قریش کی آنے والی فوج کا سامنا کیا جائے، تاکہ یہ نہ سمجھا جائے کہ مسلمانوں نے بزدلی دکھائی اور میدان کارزار سے بھاگ گئے، یا ان کے پہونچنے سے قبل ہی مدینہ جلدی لوٹ جایا جائے، تاکہ باقاعدہ جنگ کی ضرورت نہ پڑے، لیکن مشورہ یہی ہوا کہ اب جب کہ دشمن باقاعدہ لڑنے کے لئے آرہا ہے تو یہاں سے لوٹ جانا فرار سمجھا جائیگا، اور ذلت ہوگی لہذا اب جو ہو سو ہو، اس کو دیکھ لیا جائے، یہی واقعہ بدر کا واقعہ کہلایا، جو باقاعدہ بھرپور جنگ کی صورت میں پیش آیا(۱)۔

قریش کی طاقت پوری طرح مسلح تھی اور ایک ہزار کے لگ بھگ فوج تھی اور مسلمانوں کی تعداد ان کے مقابلہ میں ایک تہائی تھی، لیکن مسلمانوں کو اللہ تعالی کی طرف سے نصرت و مدد پر بھروسہ تھا، بہرحال دشمن اپنی زبردست فوج لیکر پہونچ گیا اور مقابلہ ہوا اور مسلمان اگرچہ اس کے مقابلہ میں ایک تہائی تھے لیکن حیرت انگیز طریقہ سے کامیاب ہوئے، اور قریش کو شکست کا سامنا کرنا پڑا، اس معرکہ نے مسلمانوں کی عزت بہت بڑھادی اور مسلمانوں کو ایک بے سہارا اور کمزور قوم سمجھنے کا تصور بدل گیا اور اس سے مسلمانوں کی طاقت کا اندازہ قریش اور قرب و جوار کے لوگوں کو ہوگیا۔

بدر کی اس جنگ کے سلسلہ میں اس ایک واقعہ کا تذکرہ بھی قابل ذکر ہے کہ

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/۶۰۶، سیرت ابن اسحاق: ۱/۳۸۳-۳۸۷، زاد المعاد: ۳/۳۴۲۔

بدر کے اس معرکہ سے خاصا پہلے آپ ﷺ کو قریش کے کچھ لوگوں کی نقل وحرکت کی اطلاع مقام نخلہ میں ملی تھی اور آپ ﷺ نے وہاں عبداللہ بن جحش کو بارہ آدمیوں کے ساتھ روانہ کیا تھا، کہ صرف معلومات حاصل کر کے واپس آجائیں، وہاں پہونچنے پر قریش کے ایک قافلہ سے ان کا سامنا ہوا تھا اور ٹکراؤ کی نوبت آگئی تھی، اس میں قریش کا ایک فرد عمرو بن الحضرمی مارا گیا (۱)، یہ واقعہ رجب کی آخری تاریخ میں پیش آیا تھا، اور رجب میں جنگ کرنا ممنوع سمجھا جاتا تھا، لہذا قریش نے اس مسئلہ کو اس مہینہ کی بے حرمتی قرار دیا اور اس سے مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے اور انتقام کے لئے ابھارنے اور مشتعل کرنے کا موقع مل گیا تھا جس کے ذریعہ جنگ کی منصوبہ بندی شروع کردی تھی اور اسی واقعہ کے نام سے مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لئے باقاعدہ کارروائی پر آمادہ کیا اور جنگ کے لئے تمام قریشی لوگوں کو ابھارا اور اکسایا اور اس طرح مضبوط فوج تیار کر کے مدینہ کا رخ کیا اور بدر پہونچ کر مسلمانوں سے جنگ کی، لیکن ان کی یہ شرپسندی خود ان کے لئے الٹی پڑی اور اللہ تعالی کی مدد سے مسلمانوں کو ہی کامیابی ملی۔

یہ معرکۂ عظیم مذکورہ بالا مقام نخلہ کے واقعہ کے دو ماہ بعد اور ہجرت کے دوسرے سال ۱۷ر رمضان جمعہ کے دن پیش آیا۔

معرکہ کا مختصر حال

جنگ کا واقعہ اس طرح پیش آیا کہ مقام بدر مدینہ سے جنوب میں تقریبا ڈیڑھ سو کیلو میٹر کے فاصلہ پر پہاڑوں کے درمیان ایک میدان تھا، اس میں ایک کنواں تھا اور اصلاً بدر اسی کنواں کا نام تھا، اسی کے مغربی رخ پر قریب ہی سے مکہ کا

(۱) الروض الأنف: ۳/ ۲۸-۲۹، البدایۃ والنھایۃ: ۳/ ۲۴۸-۲۵۲، سیرت ابن ہشام: ۱/ ۶۰۱-۶۰۵۔

راستہ شام کی طرف جاتا تھا اور تمام قافلے اسی راستہ سے آتے جاتے تھے، حضور ﷺ قریش کے قافلہ کو روکنے کے لئے اسی بدر کے قریب تک ہی پہونچے تھے، کہ خبر ملی کہ دشمن کا وہ قافلہ تو آگے نکل گیا اور اسی کے ساتھ معلوم ہوا کہ مکہ کے کفار فوج بنا کر لڑنے کے لئے روانہ ہو چکے ہیں، آپ ﷺ نے اپنے رفقاء مہاجرین اور انصار دونوں سے رائے دریافت کی، جواب میں سب کی رائے مقابلہ کرنے کی ہوئی، لہذا آپ ﷺ ٹھہر گئے، جب قریش کی فوج آ گئی تو میدان کے اچھے حصہ میں آکر ٹھہری، مسلمان ان کے مقابلہ میں ایک تہائی تھے اور سامان جنگ بھی بہت کم تھا، لیکن مسئلہ مسلمانوں کے اسلام کے بقا کا تھا، اگر کفار خدانخواستہ کامیاب ہوتے ہیں تو مسلمان صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا، کیونکہ مسلمانوں کی جو اصل طاقت تھی وہ یہی تھی۔

مسلمانوں نے بدر کے ایک بلند مقام پر حضور ﷺ کے لئے ایک خیمہ نصب کر دیا تھا، جہاں سے پورا معرکۂ بدر نظر آتا تھا، اس میں حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ تشریف رکھتے تھے اور حضرت سعد بن ابی وقاص مسلح ہو کر اس کے سامنے پہرا دے رہے تھے اور حضور ﷺ کی حفاظت کر رہے تھے، حضور ﷺ نے اپنا سر زمین پر ڈال دیا تھا اور روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ اے پروردگار اگر یہ چھوٹی جماعت ختم ہوگئی تو تیری عبادت کرنے والا کوئی نہیں رہ جائیگا، ابن اسحاق کی روایت ہے کہ سب سے پہلے کفار کی طرف سے اسود بن عبد اللہ الاسد نے مسلمانوں کے حوض پر حملہ کیا لیکن مارا گیا، پھر ولید بن عتبہ، عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ صف سے نکلے اور مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں کو للکارا، چنانچہ ادھر سے حضرت علی، حضرت حمزہ اور حضرت عبیدہ بن حارث آگے بڑھے، مقابلہ ہوا اور ان کے ہاتھوں سے مذکورہ بالا تینوں کافر مارے گئے، البتہ مجاہدین میں سے حضرت عبیدہ زخمی ہو گئے، ان کا پیر کٹ گیا تھا جس کے اثر سے فتح کے بعد لوٹتے وقت مقام صفراء میں انہوں نے وفات پائی۔

مذکورہ بالا کافروں کے مارے جانے کے بعد عام حملہ ہوگیا، مسلمانوں کی طرف پہلے پہلے مجع مولی عمر بن خطاب ایک تیر لگنے سے شہید ہوگئے، پھر حارث بن سراقہ انصاری حوض سے پانی پی رہے تھے کہ ایک تیر لگا اور شہید ہوگئے، حضرت عمیر بن حمام نے ایک زور کا حملہ کیا اور شہید ہوگئے۔

جنگ بڑی زور کی ہورہی تھی اور حضور ﷺ دعا میں مشغول تھے، استغراق کا یہ عالم تھا کہ چادر مبارک شانہ سے گرگئی اور آپ ﷺ گریہ وزاری میں مشغول تھے، حضرت ابوبکر صدیق نے چادر شانہ پر درست کردی، آپ ﷺ نے اسی عالم کیف میں ایک مٹھی سنگ ریزے زمین سے اٹھائے اور اس پر " شاهت الوجوه" دم کیا، اور قریش کی طرف پھینکا، کفار اپنی آنکھیں ملنے لگے، اس سے ان کے حملہ پر اثر پڑا اور مسلمان بھاری پڑنے لگے اور غالب آتے گئے، اسی کے متعلق اللہ تعالی فرماتا ہے: ﴿و ما رميت إذ رميت و لكن الله رمى﴾ (یعنی جب تم نے سنگ ریزے پھینکے تو تم نے نہیں پھینکے بلکہ خدا نے پھینکے، یعنی اللہ تعالی نے ہی اس میں یہ اثر پیدا کیا) اسی کے ساتھ اللہ تعالی کی مدد فرشتوں کے ذریعہ بھی ہوئی، انہوں نے مسلمانوں کے بھیس میں آکر باقاعدہ جنگ میں شرکت کی اور کفار کو سخت مار ماری، الغرض تھوڑی دیر میں لڑائی کا رنگ بدل گیا اور مسلمانوں کو نمایاں فتح حاصل ہوئی، کفار کے بڑے بڑے سردار مارے گئے، بقیہ میں مسلمانوں نے گرفتاریاں شروع کردیں اور بہتوں کی مشکیں باندھ لیں اور مسلمان فتح سے ہمکنار ہوئے (۱)۔

یہ مسلمانوں کی کفار سے پہلی جنگ تھی، مسلمان کم تعداد میں تھے، اور پہلے سے ایسی کسی جنگ کے تجربہ کے بغیر اور اپنے سے کئی گنا تجربہ کار فوج سے مقابلہ پر آئے تھے اور زبردست فتح حاصل کی، کفار کا یہ حال ہوا کہ بھاگنا چاہتے تھے اور پناہ نہ ملتی تھی۔

---

(۱) البدایۃ والنهایۃ: ۳/۲۵۶-۳۰۳، السیرۃ النبویۃ للإمام الذھبی: ۱/۵۰-۶۰، زادالمعاد: ۳/۱۷۱-۱۸۸

دشمنوں کا انجام

جنگ کے دوران دو کم عمر نوجوانوں نے جو انصاری تھے اور ابھی لڑک پن میں ہی تھے، اپنے ایک بڑے سے پوچھا: چچا یہ ابو جہل جو ہمارے نبی کا بڑا بد باطن دشمن ہے کہاں ہے؟، ذرا اس کو دکھایئے، انہوں نے کہا: دیکھو وہ کھڑا ہے، یہ سنتے ہی دونوں تیزی سے جھپٹے اور اس پر ٹوٹ پڑے اور وہ زبردست اور غرور والا دشمن چھوٹے بچوں کے ہاتھ مارا گیا، مارے جانے کے بعد یہ گرا پڑا تھا کہ اس شخص نے اس کو دیکھا ابھی جان باقی تھی، اس کی گردن پر پیر رکھا تو کہنے لگا جانتے ہو تم کس پر پیر رکھ رہے ہو؟ یہ بڑے سردار کی گردن ہے، اور یہ غرور والی بات کرتے کرتے مر گیا۔

حضور ﷺ جاننا چاہتے تھے کہ آپ کے اصل دشمن کا کیا حال ہوا، جو کفر کے ساتھ آپ سے حسد بھی رکھتا تھا، فرمایا کہ کوئی ابو جہل کی خبر لائے، ابو جہل وہ شخص تھا جو حضور ﷺ کی دشمنی میں سب سے آگے تھا اور آپ ﷺ کو ختم کرنے کی کوشش میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور اس جنگ کی قیادت بھی وہی کر رہا تھا، تھوڑی دیر میں حضور ﷺ کے پاس اس کا سر آیا اور خبر دی گئی کہ وہ قتل کر دیا گیا، آپ ﷺ نے کہا: "الله الذي لا إله إلا هو" (تین مرتبہ)، پھر کہا: "الله أكبر الحمد لله الذي صدق وعده و نصر عبده و هزم الأحزاب وحده"، اللہ سب سے بڑا ہے، ساری تعریف اسی کے لئے ہے، اس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور اپنے بندہ کی مدد کی اور اس نے تنہا (دشمن کے) گروہوں کو شکست دی، اس کے بعد فرمایا: اس کا سر ہمیں دکھاؤ، جب آپ ﷺ نے دیکھا تو فرمایا: "هذا فرعون هذه الأمة" یہ اس امت کا فرعون تھا (۱)۔

---

(۱) زاد المعاد: ۳/۱۸۵، صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب دعاء النبی ﷺ علی کفار قریش، وباب شهود الملائكة بدراً، صحیح مسلم، کتاب الجہاد، باب قتل أبی جہل۔

جنگ کے اختتام پر دیکھا گیا کہ کفار ستّر کی تعداد میں مارے گئے تھے اور ان کے بڑے بڑے سردار جنگ میں کام آئے اور ان کی لاشیں بدر کے کنویں میں ڈال دی گئیں، آپ ﷺ کفار کی نعشوں کے سامنے کھڑے ہوئے اور فرمایا: ''کیسے برے رشتہ دار اپنے نبی کے تم لوگ تھے، تم نے ہمیں جھٹلایا، اور دوسروں نے تصدیق کی، تم نے ہم کو ذلیل کیا، اور دوسروں نے مدد دی، تم لوگوں نے ہم کو ہمارے گھر اور وطن سے نکال دیا، دوسروں نے پناہ دی'' (۱)۔

مارے گئے کفار کی تعداد کے مقابلہ میں مسلمان شہداء کی تعداد بہت کم تھی، وہ صرف چودہ کی تعداد میں شہید ہوئے، جن میں چھ مہاجر اور باقی انصار تھے (۲) اور باقی کامیاب واپس ہوئے، بدر کی جنگ میں نصرت دین اور طلب رضائے الٰہی کے جس عام مخلصانہ جذبہ سے مسلمان شریک ہوئے تھے اس کی قبولیت میں شرکائے بدر کے اگلے پچھلے گناہوں کی بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی دیدی گئی، اور اس طرح ان کا درجہ بہت بڑھا دیا گیا۔

قیدیوں کے ساتھ سلوک

دشمن کے جو افراد قید ہو کر آئے حضور ﷺ نے اپنے اصحاب سے مشورہ کرکے یہ طے فرمایا کہ فدیہ لیکر ان کو چھوڑ دیا جائے، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اظہار فرمایا گیا کہ یہ دشمن قابل گردن زدنی تھے، ان کا چھوڑنا ٹھیک نہیں تھا، لیکن اب ایسا کرلیا گیا تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اب اسی میں خیر ہوگی۔

جنگ ختم ہونے کے بعد حضور ﷺ کی طرف سے کفار کے جنگی قیدیوں کے ساتھ جیسی مصلحت ہوئی ویسا سلوک کیا گیا، اسلام کے ساتھ ان میں سے کسی کی دشمنی شدید اور آئندہ کے لئے خطرناک معلوم ہوئی تو اس کو قتل کیا گیا، اور دوسروں کو فدیہ

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/ ۶۳۹، زاد المعاد: ۳/ ۱۸۷۔

(۲) زاد المعاد: ۳/ ۱۸۸۔

میں مال لیکر چھوڑ دیا گیا، اور وہ مال عام اسلامی ضرورتوں میں صرف کیا گیا جو مسلمانوں کے کام آیا، چنانچہ کسی کو مسلمان قیدی کے بدلہ میں چھوڑا، کسی کو یونہی بلا کسی بدلہ کے بھی بطور رحم چھوڑ دیا، عقبہ اور نضر بن حارث قتل کر دیئے گئے، گرفتار شدہ فوجی مدینہ لائے گئے، ان میں حضرت عباس، عقیل (حضرت علی کے بھائی) ابو العاص (آنحضرت ﷺ کے داماد) بھی تھے، ان کو بھی فدیہ لے کر رہائی دی گئی۔

ان میں آپ ﷺ کی ایک صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے شوہر ابو العاص بن الربیع جو اس وقت تک کافر تھے اور جنگ میں لوگوں کے دباؤ سے شریک ہو گئے تھے، گرفتار ہو کر پیش ہوئے، آپ ﷺ نے ان کو فدیہ یعنی تاوان لیکر چھوڑنے کی اجازت دی، ان کے پاس تاوان دینے کے لئے کچھ نہیں تھا، انہوں نے اپنی بیوی کے کنگن تاوان میں پیش کئے تھے جو آپ ﷺ کی بیٹی کو نکاح کے وقت ان کی والدہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے دیئے تھے اور وہ ان کے پاس اپنی محبوب ماں کی یادگار تھے، جب وہ کنگن آپ کے سامنے آئے تو آپ کو اپنی محبوب اور ہمدردترین بیوی یاد آگئیں، اور آپ کی طبیعت پر اثر پڑا، آپ ﷺ نے مسلمانوں سے کہا: اگر تم لوگ چاہو تو اجازت دو تو یہ کنگن بیٹی کو واپس کر دیئے جائیں، سب نے خوشی سے اجازت دی، آپ کے یہ داماد اتنے متاثر ہوئے کہ دل میں ایمان اتر گیا، لیکن ان پر مکہ کے لوگوں کی کچھ ذمہ داریاں تھیں، اس کے لئے مکہ گئے اور واپس آکر مسلمان ہو گئے (۱)۔

ان کے علاوہ اور کئی چند ایسے تھے جن کے پاس دینے کو کچھ نہ تھا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان میں جو پڑھے لکھے ہیں وہ مسلمانوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دیں، یہ ان کی طرف سے فدیہ ہوگا (۲)۔

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/۶۵۰-۶۵۳۔
(۲) غزوہ بدر کی تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں: بخاری شریف، کتاب المغازی۔ صحیح مسلم: کتاب الجہاد و السیر، سیرت ابن ہشام، جلد اول۔ الروض الأنف: ۲/۲۵-۱۳۵۔ زاد المعاد، جلد سوم۔ اسد الغابہ" جلد ۴۔ تاریخ طبری: ۲/۴۲۱-۴۷۹۔ البدایۃ والنہایۃ: ۳/۲۵۶۔ الرسول القائد، از جنرل محمود شیت خطاب اور حدیث دفاع، از پاکستانی میجر جنرل محمد اکبر خاں۔

بدر کے واقعہ کے بعد

غزوۂ بدر کے بعد تقریباً ایک سال کی مدت کے درمیان کئی مواقع ایسے آئے کہ آپ ﷺ نے قریب کی کسی جگہ پر دشمنوں کے جمع ہونے کی خبر سنی اور آپ وہاں مجاہدین کے ساتھ تشریف لے گئے، یا مسلمانوں کی جماعت کو بھیجا، یا کسی واقعہ کے تدارک کا کوئی اور انتظام فرمایا، لیکن عام طور پر ایسے مواقع پر جنگ کی نوبت نہیں آئی، اس میں خاص طور پر غزوۂ بنی سلیم، غزوۂ سویق، غزوۂ بنی غطفان اور غزوۂ نجران قابل ذکر ہیں، جن میں کسی میں جنگ کی نوبت نہیں آئی، اور دشمن پہلے ہی سے میدان سے ہٹ گیا۔

یہودیوں کی عہد شکنی

مسلمانوں کے مرکز مدینہ منورہ میں مقیم یہودی قبائل سے آپ ﷺ کا معاہدہ تھا، کہ وہ باہری طاقت سے ٹکراو پیش آنے کی صورت میں مسلمانوں کے خلاف دشمن کا ساتھ نہیں دیں گے، لیکن انہوں نے اس کی پابندی نہیں کی بلکہ خفیہ طریقہ سے دشمن کو مدینہ پر یلغار کرنے کے لیے اُکسایا اور ان سے اپنے شریک جنگ ہونے یا دیگر تعاون کا وعدہ کیا، یہ معاہدہ کی خلاف ورزی تھی، اس سلسلہ میں بنو قینقاع خاص طور پر ملوث ثابت ہوئے، چنانچہ آپ ﷺ نے ان کے خلاف کارروائی کی اور کعب بن اشرف جو بڑا سرغنہ تھا، اور کھل کر مسلمانوں کے خلاف سازش کرتا رہا تھا، اس کو سزا دی گئی اور اس کو ختم کر دیا گیا (۱)۔

کفار کے مقابلہ میں مسلمانوں کی برتری ثابت ہونے کے باوجود کفار کی طرف سے دشمنی کی تدبیریں جاری رہیں اور سازشوں اور جنگوں کی پلاننگ کا سلسلہ قائم رہا، اس طرح مسلمانوں کو کچھ کچھ عرصہ سے مقابلہ کرنا پڑ جاتا تھا، لیکن یہ عموماً

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۲/ ۴۷-۵۷، زاد المعاد: ۳/ ۱۹۰-۱۹۲، صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قتل کعب بن الأشرف، صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب قتل کعب بن الأشرف، البدایۃ والنہایۃ: ۴/ ۵-۹۔

چھوٹے چھوٹے واقعات تھے جن کا مسلمانوں نے مقابلہ کیا اور جہاں جہاں سے سازش اور حملہ کا خطرہ معلوم ہوا وہاں فوج کا دستہ کبھی خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی قیادت میں اور کبھی کسی اہم اور تجربہ کار شخص کی قیادت میں بھیج کر دشمن کے ارادے کو ناکام بنایا، چنانچہ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے مختلف جگہوں پر آپ ﷺ نے دشمن کو روکنے اور ناکام بنانے کے لئے حسب ضرورت تعداد میں فوجی ٹکڑیاں بھیجیں، ان میں سے جو آپ ﷺ کی قیادت میں ہوئیں وہ غزوہ کہلائیں اور جو آپ کے بغیر کسی صحابی کی سرکردگی میں ہوئیں ان کو سریہ کا نام دیا گیا، بدر کے بعد پانچ سال کی مدت میں فوجی مہمات کے سلسلہ میں بیشتر میں سوائے غزوۂ احد کے جنگ کی یا جھڑپوں کی خاص ضرورت نہیں پڑی اور اگر پڑی بھی تو مناسب تدبیروں اور طاقت کے اظہار سے کام چل گیا۔

روزہ کی فرضیت

اسلام کے بنیادی احکام اسلام کے پانچ ستون قرار دئے گئے ہیں، ان میں عقیدۂ توحید اور نماز کا حکم مکہ کی ہی مدت میں آگیا تھا، یہ دو رکن ہوئے، تیسرا اور چوتھا رکن روزہ اور زکوۃ ہے، ان کا حکم مدینہ پہونچنے کے بعد غزوہ بدر کے بعد ۲ھ میں آیا(۱)، پانچواں رکن حج ہے اور اس پر عمل سب ہی عرب کرتے تھے، لیکن اسلامی تعلیمات کے تحت اس کی وضاحت وتعیین بعد میں انجام پائی۔

روزوں کا حکم رمضان کے پورے مہینہ میں رکھنے کا آیا جو سال کے اس ایک مہینہ میں فرض قرار دیا گیا، رمضان کے اختتام پر اگلا دن عید یعنی اپنے رب کا شکر اور مسرت کا دن قرار دیا گیا اور اس میں صدقہ کی ترغیب دی گئی، جو صدقہ فطر کہلایا۔

رمضان کے روزہ کی فرضیت سے قبل سابقہ نبی کی شریعت کے تحت ماہ محرم کی

---

(۱) البدایۃ والنھایۃ: ۲۵۴/۳

دس تاریخ کو روزہ رکھا جاتا تھا، رمضان میں روزے رکھے جانے سے اصل روزے یہی رمضان کے روزے قرار پائے اور ان کو اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے ایک رکن قرار دیا گیا، اس کی خصوصیت میں عبادت الٰہی کے ساتھ غریب اور معاشی تنگی رکھنے والوں کے ساتھ ہمدردی اور ان کی تکلیف کا انسانی سطح پر احساس اور تعاون کا پہلو رکھا گیا، رمضان کے ۲۹ یا ۳۰ دن کھانے پینے سے پرہیز غریب آدمی کے بھوکے رہنے کی پریشانی کو یاد دلاتا ہے، نیز غروب آفتاب کے وقت افطار کے موقع پر غریبوں کے افطار کی بھی فکر کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔

تو ایک طرف تو خوش حال شخص کو بھوک کی تکلیف محسوس کرائی جاتی ہے اور دوسری طرف غذا کی کمی رکھنے والے کے ساتھ اس کی غذا کے معاملہ میں تعاون کا موقع فراہم کیا گیا ہے۔

بنوقینقاع کا معاملہ

بنوقینقاع ایک یہودی قبیلہ تھا اور اس سے اور دیگر یہودی قبائل سے شروع ہی میں باہمی امن کا معاہدہ ہوگیا تھا، بنوقینقاع کے ایک زیور کے تاجر نے ایک مسلمان عورت کے ساتھ ایسا گندا مذاق کیا کہ اس کو برسر عام بازار میں برہنہ کردیا اور مذاق اڑایا، اس نے مسلمانوں کی دہائی دی اور مسلمان جمع ہوگئے اور وہ یہودی مارا گیا اس پر دیگر یہودی آگئے اور انہوں نے جواباً مسلمان کو قتل کردیا، ہنگامہ کی خبر سن کر حضور ﷺ تشریف لائے اور پھر بنوقینقاع کی بدعہدی پر ان کے قلعہ کا محاصرہ فرمایا حتی کہ بنوقینقاع کو جھکنا پڑا اور حضور ﷺ کے فیصلہ پر تیار ہوگئے، آپ نے ان کو مدینہ چھوڑ دینے کا حکم دیا اور وہ اس کے مطابق مدینہ چھوڑ کر خیبر چلے گئے (۱) اور اس طرح مسلمانوں کو اس قبیلہ کے فتنوں سے نجات ملی۔

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۲/ ۴۷-۴۹۔

احد (شوال ۳ھ)

بدر کی جنگ کے بعد قریش کے کافروں کے غصہ اور عداوت میں مزید اضافہ ہوگیا اور انتقامی جذبہ پیدا ہوگیا، اور انہوں نے یہ کہلایا کہ وہ بدر کی شکست کا بدلہ ضرور لیں گے، چنانچہ مہینوں تیاری کرنے کے بعد جنگ بدر کے دوسرے سال ہی اپنے قرب وجوار کے قبائل کو اپنا حامی بنا کر تین ہزار کی فوج کے ساتھ روانہ ہوئے اور مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوئے، جب وہ مدینہ کے مضافات میں پہونچ گئے تو آپ ﷺ کو ان کے آنے کی خبر ملی، آپ ﷺ نے اپنے صحابہ سے مشورہ فرمایا کہ مدینہ سے نکل کر مقابلہ کیا جائے، یا مدینہ میں رہتے ہوئے مقابلہ کیا جائے؟ خود آپ کا رجحان مدینہ میں رہتے ہوئے مقابلہ کرنے کا تھا اور متعدد صحابہ کا بھی یہی رجحان تھا(۱)، لیکن بعض دیگر صحابہ جن میں جوش زیادہ تھا، وہ مدینہ سے نکل کر دشمن کے پڑاو پر جا کر جنگ کرنے کو بہتر قرار دے رہے تھے، اور انہوں نے زور دیتے ہوئے یہی رائے دی۔

چنانچہ آپ ﷺ ایک ہزار مجاہدین کو لے کر مقام احد کی طرف تشریف لے چلے، جو مدینہ کے مضافات میں وسط شہر سے صرف تین کیلومیٹر کے فاصلہ پر ہے، دشمن کی فوجوں نے وہاں جماؤ کیا تھا، اور مدینہ شہر کے سامنے وہی کھلی ہوئی جگہ تھی اور پہاڑ کے سامنے کے میدان میں بھی تھی، ان ایک ہزار آدمیوں میں وہ افراد بھی تھے جن کی رائے مدینہ شہر کے اندر رہکر مقابلہ کرنے کی تھی، اور بعض کچھ کمزور طبیعت اور منافقین بھی تھے، جو اگرچہ حالات کے دباؤ سے شریک تو ہوگئے تھے، لیکن پھر صورت حال کا اندازہ لگاتے ہوئے انہوں نے راستے ہی میں یہ اعتراض اٹھا دیا کہ جنگ شہر کے اندر رہ کر کرنی چاہئے تھی، اس میں حفاظت زیادہ تھی، آمنے سامنے جا کر جنگ

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۲/۶۳۔

کرنے میں ہلاکت کی بات زیادہ ہے، انہوں نے راستہ ہی میں یہ معاملہ کھڑا کر کے دوسروں کو بھی اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کی اور کہا کہ باہر نکل کر جنگ کرنے کا یہ فیصلہ نقصان دہ ہے اور بلا وجہ اپنے کو خطرہ میں ڈالنے کا ہے، ان باتوں سے تین سو افراد متاثر ہو گئے، اور یہ سب کچھ نہ کچھ عذر بیان کر کے راستہ سے واپس ہو گئے، جس کی وجہ سے مسلمانوں کی طاقت کمزور ہو گئی (۱)۔

چنانچہ سات سو (۷۰۰) آدمیوں کو تین ہزار (۳۰۰۰) آدمیوں کے مقابلہ پر آنا ہوا جس سے دشواری کا سامنا ہوا، پہلے وہلہ میں کامیابی ہوئی، پھر پہاڑی پر بٹھائے ہوئے مسلمانوں کے دستہ کی ایک غلطی کی بنا پر قریش کی فوج نے ایک نئی حکمت عملی اچانک اختیار کی، اس سے مسلمان مجاہدین میں اچانک کمزوری پیدا ہو گئی، اور فتح کے بجائے شکست کی صورتحال بننے لگی (۲)، لیکن حضور سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمان مجاہدین کو پھر سے للکارا اور وہ سب پھر سے اکٹھا ہو گئے، اس سے قریش کے فوجیوں نے پسپائی اختیار کی، مگر یہ کہتے ہوئے واپس گئے کہ ہم پھر آ کر اس سے بڑی طاقت کے ساتھ مقابلہ کریں گے۔

اس معرکہ میں مسلمانوں کو بڑے صبر آزما حالات سے گزرنا پڑا، اس میں درمیانی شکست کے موقع پر یہ افواہ پھیلا دی گئی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں رہے اور شہید ہو گئے جب کہ خبر غلط تھی (۳)، البتہ ایک حملہ سے ایسا ہوا کہ آپ ﷺ کے منہ پر چوٹ آئی اور آپ کے دندان مبارک شہید ہوئے، اچانک حملہ سے متعدد صحابہ شہید ہوئے ان میں عم نامدار سید الشہداء حضرت حمزہ بن عبد المطلب (۴)

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۲/۶۴، البدایہ والنہایہ: ۴/۱۳، الکامل فی التاریخ: ۲/۱۵۰۔
(۲) الکامل فی التاریخ: ۲/۱۵۳-۱۵۴، البدایہ والنہایہ: ۴/۱۴، زاد المعاد: ۳/۱۹۶۔ (۳) الکامل فی التاریخ: ۲/۱۵۵-۱۵۶۔ (۴) صحیح بخاری، غزوہ احد، باب قتل حمزۃ رضی اللہ عنہ، سیرت حلبیہ: ۲/۷۲۔

اور معلم صحابہ حضرت مصعب بن عمیر (۱) اور بعض دوسرے جلیل القدر صحابہ تھے، لیکن بالآخر کفار نے پسپائی اختیار کی اور مسلمانوں کو فتح ہوئی، لیکن زیادہ قربانی دینا پڑی۔

احد کا واقعہ مسلمانوں کے لیے ایک بڑا سبق بھی ثابت ہوا، اس سبق کو قرآن مجید میں بھی مسلمانوں کے سامنے ظاہر کیا گیا ہے کہ ان سے جو کمزوریاں ہوئیں ہیں جو ان کے قوی الایمان ہونے کی صورت میں نہیں ہونا چاہئے تھیں، ان کی طرف متوجہ ہوں، کیونکہ درمیانی شکست کا اصل سبب وہی کمزوریاں ہیں۔

ان کمزوریوں میں جو اصل کمزوری تھی وہ یہ تھی کہ میدان جنگ اور مدینہ شہر کے درمیان ایک خشک نالہ تھا، جس کا ایک سرا کفار کی فوجوں کے مقام تک تھا، اس نالہ کے میدان جنگ کے رخ والے کنارہ پر ایک بڑا ٹیلہ تھا، حضور ﷺ نے اس پر تیر اندازوں پر مشتمل ایک فوجی دستہ بٹھا دیا تھا، کہ کفار اس نالہ سے اندر اندر جا کر مسلمانوں پر پیچھے سے آ کر حملہ نہ کر دیں، جنگ میں اول اول جب کفار کو شکست ہوئی اور وہ بھاگنے لگے، تو مسلمان فوجی دستہ کے اکثر افراد یہ سمجھ کر نیچے اتر آئے کہ اب کفار تو بھاگ رہے ہیں، اب اوپر بیٹھے رہنے کی ضرورت نہیں، کفار کا مال غنیمت جو مسلمان جمع کر رہے ہیں اس میں شریک ہو جانے میں کوئی حرج نہیں، لیکن ان کا خیال غلط نکلا اور کفار نے ٹیلہ پر مسلمانوں کو نہ دیکھ کر اپنی ایک ٹکڑی کو نالہ کے ذریعہ فوراً جا کر مسلمانوں کے پشت سے حملہ کرنے کے لئے بھیج دیا جس کے اچانک حملہ سے مسلمانوں میں افراتفری ہوگئی اور بمشکل ان کو تھاما جاسکا، اس میں حضور ﷺ کی شہادت کی افواہ نے بھی افراتفری پھیلائی، بہرحال اللہ تعالی کی طرف سے مسلمانوں کو ان کی کوتاہیوں کی طرف توجہ دلائی گئی، فرمایا:

---

(۱) زاد المعاد: ۳/ ۱۹۷، سیرت ابن ہشام: ۲/ ۷۳۔

﴿ولقد صدقكم اللّٰه وعده إذ تحسونهم بإذنه حتى إذا فشلتم وتنازعتم في الأمر وعصيتم من بعدما ما أراكم ما تحبون، منكم من يريد الدنيا ومنكم من يريد الآخرة، ثم صرفكم عنهم ليبتليكم ولقد عفا عنكم والله ذو فضل على المؤمنين﴾۔

(سورة آل عمران:۱۵۲)

اور خدا نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا یعنی اس وقت جب کہ تم کافروں کو اس کے حکم سے قتل کر رہے تھے یہاں تک کہ جو تم چاہتے تھے خدا نے تم کو وہ دکھا دیا، لیکن اس کے بعد جب تم نے ہمت ہار دی، اور حکم (پیغمبر) میں جھگڑا کرنے لگے، اور اس کی نافرمانی کی، بعض تو تم میں سے دنیا کے خواستگار تھے (یہ اشارہ مال غنیمت جمع کرنے کی طرف توجہ کرنے کی طرف بتایا جاتا ہے) بعض آخرت کے طالب تھے، اس وقت تم کو ان کے مقابلہ سے پھیر کر ہٹا دیا، تاکہ تمہاری آزمائش کرے اور اب اس نے تمہارا قصور معاف کر دیا ہے اور خدا مومنوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔

بہر حال ٹیلے پر بٹھائے گئے تیر اندازوں کی کوتاہی سے مسلمانوں کو جو خمیازہ بھگتنا پڑا اس نے مسلمانوں کو آئندہ کے لیے متنبہ کر دیا اور یہ بات بھی اپنی جگہ پورے طور سے سامنے آگئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکموں پر چلنا ہی کامیابی کی شاہ کلید ہے۔

قریش کا احد کے واقعہ سے ایک حد تک دل ٹھنڈا ہوا، حالانکہ اس میں بھی انہیں بھاری نقصان اٹھانا پڑا، مگر بدر کے مقابلہ میں وہ اس کو اپنی فتح سمجھ رہے تھے، چنانچہ سردار قریش ابوسفیان جن کی قیادت و امارت میں دشمن جمع ہوئے تھے، مقام احد سے یہ سب دشمن واپس ہونے لگے تو بلند آواز میں یہ نعرہ لگانے لگے کہ ''جنگ کا معاملہ برابر سرابر رہا، آج اس کی فتح کل اس کی، اور اپنے معبودوں کی دہائی بھی دے رہے تھے، ہُبل اور عزیٰ کی جے کہہ رہے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے جواب دینے کو کہا اور کہا کہ کہو ''اللّٰہ مولانا ولا مولی لکم'' اللہ ہمارا سرپرست ہے

تمہارا کوئی سرپرست نہیں، اور یہ بھی کہنے کو کہا کہ اللہ بہت بلند و بالا ہے اس کے سوا کوئی نہیں (۱)۔

غزوۂ احد سنیچر کے روز ماہ شوال کی نصف کو ہوا، ہجرت کا تیسرا سال تھا، اس غزوہ کی خاص بات یہ تھی کہ میدان جنگ میں جاتے ہوئے جو لوگ پلٹ گئے تھے ان کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کے کچھ لوگوں میں نفاق کا ہونا سامنے آ گیا، اور منافقین ڈھکی چھپی چیز نہ رہے، کہ مدینہ کے لوگوں میں کچھ ایسے افراد بھی ہیں جو دل سے اسلام نہیں لائے، وہ مسلمانوں کے غلبہ اور مقبولیت کو دیکھ کر اپنے کو بھی مسلمان ظاہر کرتے ہیں اور یہ بات لوگوں پر آشکارا ہوگئی کہ سچے مسلمانوں کے درمیان کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو ظاہری طور پر مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنے والے ہیں، دل سے مسلمان نہیں ہیں، لیکن رسول اللہ ﷺ نے یہ معلوم ہونے پر ان کی پردہ پوشی ہی رکھی اور ان سے بھی اخلاق ہی کا معاملہ فرماتے رہے، کہ ہوسکتا ہے کہ بالآخر ان کے بھی دل ٹھیک ہو جائیں۔

حمراء الأسد

غزوۂ احد میں مسلمانوں کو نقصان اور مصیبت تو ضرور پیش آئی لیکن کفار کو مرعوب رکھنے کے لئے حمراء الاسد تک قریش کے تعاقب میں حضور ﷺ تشریف لے گئے، لیکن مقابلہ کی نوبت نہیں آئی۔

احد کے بعد

غزوۂ احد کے بعد متعدد جگہوں پر دشمنوں کی تیاری اور اقدام کی خبر ملنے پر آپ ﷺ نے مسلمانوں کی جماعت روانہ کی، یا خود تشریف لے گئے، یا صرف

---

(۱) زاد المعاد: ۳/۲۰۱، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو صحیح بخاری، کتاب المغازی، اور سیرت ابن ہشام، جلد دوم

مسلمانوں کا جتھا کسی صحابی کی امارت میں بھیجا۔

سب سے پہلے ارمحرم ۴ھ میں طلحہ اور سلمہ بن خویلد نے اپنے قبیلہ کو جو فید کے کوہستانی علاقہ قطن میں رہتا تھا، مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ کیا، آپ ﷺ کو خبر ملی تو حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں ۱۵۰ ر آدمیوں کو آپ ﷺ نے روانہ کیا، لیکن خبر ملنے پر یہ دشمن بھاگ گئے۔

اس کے بعد سفیان بن خالد کے حملے کی تیاری کی اطلاع ملی، اس کے مقابلہ کے لئے آپ ﷺ نے عبداللہ بن اُنیس کی سرکردگی میں ایک سریہ بھیجا، انہوں نے جا کر سرکوبی کی (۱)۔

واقعہ رجیع

قبیلہ عضل وقارہ کے کچھ لوگ آ کر مسلمان ہوئے اور کہا کہ ہمارے ساتھ ہم کو ہماری تعلیم و تربیت کے لیے کچھ لوگ مہیا کر دیجئے جو ہمارے یہاں رہیں، اور ہم کو تعلیم دیں، اور اسلام کے عقائد و احکام سکھائیں، آپ ﷺ نے دس اشخاص ساتھ کر دیئے لیکن یہ ان لوگوں کی سازش تھی، ان لوگوں نے ان معلمین کو مدینہ سے نکل کر کچھ فاصلہ پر مقام رجیع میں پکڑ کر قید کر لیا، ان ۱۰ ر آدمیوں میں تین نے تو مقابلہ کیا اور مقابلہ میں شہید ہو گئے اور تین کو ان کے قید کرنے والوں نے بیچ دیا، ان میں سے حضرت خبیبؓ کو اور حضرت زید بن دثنہ کو مکہ میں لے جا کر فروخت کیا، اور ان کو باقاعدہ شہید کر دیا گیا (۲)، اس موقع پر حضرت خبیب نے جس اطمینان اور ایمان ویقین کے ساتھ شہادت پائی، وہ تاریخ میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

حضرت خبیب اور زید بن الدثنہ رضی اللہ عنہما کی شہادت

حضرت خبیب اور زید بن الدثنہ رضی اللہ عنہما کو ان لوگوں نے قریش کے

---

(۱) زاد المعاد: ۳/۲۴۳-۲۴۴۔ (۲) زاد المعاد: ۳/۲۴۴-۲۴۶۔

ہاتھ جب فروخت کرنے کے لئے پیش کیا تو خبیبؓ کو حجیر بن ابی اہاب نے خرید لیا تا کہ اپنے باپ اہاب کے بدلہ میں قتل کر سکے، زید بن الدثنہ کو صفوان بن امیہ نے اپنے باپ امیہ بن خلف کے بدلہ کے لئے خریدا، زید رضی اللہ عنہ کو حرم سے باہر قتل کے لئے لے جایا گیا تو اس وقت قریش کے بہت سے لوگ جمع تھے، جن میں ابوسفیان بھی تھے، انھوں نے حضرت زید سے کہا: زید میں تم سے قسم دلا کر پوچھتا ہوں کیا تم یہ پسند کرو گے کہ تم آرام سے اپنے گھر والوں میں ہو اور تمہاری جگہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں؟ انھوں نے جواب دیا کہ مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں کہ میں اپنے گھر میں آرام سے ہوں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک کانٹا بھی چبھے! ابوسفیان نے اس پر کہا کہ میں نے کسی کو کسی سے اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا جتنی محبت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھی کرتے ہیں (اس کے بعد ان کو شہید کر دیا گیا)۔

جب یہ لوگ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو سولی دینے کے لئے لائے تو انھوں نے کہا کہ اگر اس میں کوئی حرج نہ سمجھو تو مجھے دو رکعت نماز پڑھ لینے کی اجازت دے دو، انھوں نے کہا کہ ہاں پڑھ لو، انھوں نے نماز کی دو رکعت اطمینان اور پورے آداب کے ساتھ پڑھیں، پھر ان کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ تم لوگ اس کو ڈر پر محمول کرو گے تو میں ابھی اور نماز پڑھتا، اس کے بعد انھوں نے یہ اشعار پڑھے:۔

فلست أبالي حين اقتل مسلماً
على أي شق كان في الله مصرعي

(جب میں اسلام کے لئے قتل کیا جا رہا ہوں تو مجھ کو اس کی پرواہ نہیں کہ اللہ کی راہ میں کس پہلو پر گر کر جان دوں گا)۔

وذلك في ذات الإله وإن يشاء
يبارك على أوصال شلو ممزع

(یہ جو کچھ ہے خالصاً اللہ کے لئے ہے اگر وہ چاہے گا تو اس پارہ پارہ جسم پر برکت نازل کریگا)۔

یہ شوقیہ اشعار پڑھتے ہوئے راہ حق میں شہید ہوئے (۱)۔

بیر معونہ

پھر صفر ۴ھ میں بئر معونہ کا واقعہ پیش آیا، اس میں بھی نجد کے ایک سردار ابو براء کلابی نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کچھ اصحاب کو نجد بھیجنے کے لیے کہا تھا کہ وہاں وہ اسلام کی دعوت دیں، آپ ﷺ نے منظور فرمایا، اور ایک خاصی تعداد میں صحابہ کرام (جن کی تعداد چالیس سے ستر تک بتائی جاتی ہے) کو روانہ کیا، ان لوگوں کو بیر معونہ کے مقام پر دھوکہ دے کر شہید کر دیا گیا، یہ بڑا ہی دردناک والمناک واقعہ تھا، جس کو بہت محسوس کیا گیا، مگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی فوجی کارروائی نہیں فرمائی (۲)۔

حرام بن ملحان کی شہادت

اسی واقعہ میں حرام بن ملحان بھی شہید ہوئے، ان کو جبار بن سلمی نے قتل کیا، حرام بن ملحان نے انتقال کے وقت جو الفاظ کہے وہی ان کے اسلام لانے کا سبب بن گئے، جبار خود بیان کرتے ہیں کہ مجھے جس چیز نے اسلام کی طرف کھینچا وہ یہ واقعہ ہے کہ میں نے ان کے ایک آدمی کے دونوں شانوں کے درمیان ایک نیزہ مارا میں نے دیکھا کہ وہ سینہ کے پار ہو گیا ہے، اسی وقت ان کے منہ سے یہ الفاظ نکلے "فزت ورب الکعبة" رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا، میں نے اپنے دل میں حیرت سے کہا کیسی کامیابی؟ کیا میں نے ان کو قتل نہیں کیا! بعد میں میں نے ان کے الفاظ کی تحقیق کی تو لوگوں نے بتایا کہ ان کا مطلب شہادت تھا، میں نے کہا خدا کی قسم وہ کامیاب

---

(۱) سیرت ابن ہشام، ج ۲، ص: ۱۶۹-۱۷۶۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، البدایۃ والنہایۃ: ۴/۶۲-۶۹

(۲) صحیح بخاری، کتاب المغازی، سیرت ابن ہشام: ۲/۱۸۳، الکامل فی التاریخ: ۲/۱۷۱-۱۷۲۔

رہے، اس طرح یہ جملہ ان کے اسلام لانے کا سبب بنا(۱)۔

ذات الرقاع

۴ھ میں ذات الرقاع کا غزوہ پیش آیا، اس میں آپ ﷺ تشریف لے گئے، بنو غطفان سے مقابلہ تھا، فریقین ایک دوسرے سے قریب ہوئے، لیکن لڑائی نہیں ہوئی، اس مہم میں غربت کی وجہ سے پیروں میں جوتے نہیں تھے، چیتھڑے باندھنے پڑے تھے اور چیتھڑوں کو عربی میں الرقاع کہتے ہیں، اس کی وجہ سے اس کو ذات الرقاع کہتے ہیں (۲)۔

بنو نضیر کا معاملہ

۴ھ کا ذکر ہے کہ نبی ﷺ مدینہ کے مضافات میں آباد یہودی قبیلہ بنی نضیر کے پاس تشریف لے گئے، یہ یہودیوں سے کئے گئے معاہدہ کے تحت بھی آتے تھے، وہاں جا کر آپ ﷺ نے ان سے بنی عامر کے دو مقتولین کے دیت میں مدد چاہی، انہوں نے آپ ﷺ کو ایک دیوار کے نیچے بٹھا دیا، اور آپ ﷺ کو دھوکہ میں رکھتے ہوئے شہید کر دینے کی سازش کی جس کی تدبیر یہ کی کہ ابن جحاش ملعون دیوار کے اوپر جا کر ایک بھاری پتھر آپ ﷺ کے اوپر گرا دے اور حضور ﷺ کی زندگی کا خاتمہ کر دے، آپ ﷺ کے ساتھ اس موقع پر کئی حضرات صحابہ موجود تھے، جن میں حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم بھی تھے، آنحضرت ﷺ کو وہاں جا بیٹھنے کے بعد اللہ تعالی کی طرف سے اس شرارت کی اطلاع آپ کو وحی کے ذریعہ ہوگئی، یہ معلوم ہوتے ہی آپ فوراً وہاں سے اٹھ آئے اور بحفاظت الٰہی مدینہ

---

(۱) بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الرجیع۔ سیرت ابن ہشام، ج ۲، ص: ۱۸۷

(۲) صحیح بخاری، باب غزوۃ الرقاع، الروض الأنف: ۲/۲۴۶، سیرت ابن ہشام: ۲/۲۰۴، والبدایۃ والنھایۃ: ۴/۸۵، الکامل فی التاریخ: ۲/۱۷۴، السیرۃ النبویۃ للإمام الذھبی: ۲/۲۴۶۔

واپس آ گئے اور بنو نضیر کو ان کی بدعہدی اور اس جرم کی یہ سزا طے فرمائی کہ وہ مدینہ سے نکل جائیں، ورنہ ان کو پھر طاقت کے ذریعہ سزا دی جائیگی، وہ لوگ صورت حال کی سنگینی محسوس کرتے ہوئے معمولی مزاحمت اور پس وپیش کے بعد اس پر راضی ہو گئے کہ جس قدر مال واسباب اونٹوں پر لے جاسکیں، لے جائیں، اور مدینہ سے باہر نکل جائیں (۱)، چنانچہ وہ گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر مدینہ سے نکل گئے، ان میں سے کچھ لوگ خیبر میں جا بسے، کچھ لوگ شام چلے گئے اور مسلمانوں کو اپنے شہر کے اندر ہی مکر و فریب، سازش اور منافقت کے قائم ایک بہت بڑے اڈہ سے نجات ملی اور طاقت کے استعمال کرنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئی (۲)۔

مخالفین کی مدینہ پر یورش اور خندق کا واقعہ ۵ھ

جب مختلف طریقوں اور سازشوں کے اختیار کرنے کے بعد بھی مسلمانوں کی طاقت اور مضبوطی کو توڑا نہ جاسکا، تو مدینہ کے یہودی اور منافقین اور قریش اور ان کے ہمنوا قبائل ان سب نے مل کر ایک زیادہ زوردار اسکیم بنائی کہ ایک بڑی اور متحدہ فوج تیار کر کے مسلمان علاقہ پر حملہ کر کے مسلمانوں کی طاقت توڑ دی جائے، اس میں مدینہ کے یہودی اور ان کے وہ ہمنوا جو وہاں رہ گئے تھے، جن میں خاص طور پر بنو قریظہ پیش پیش تھے، انہوں نے قریش کو یہ یقین دلایا کہ وہ پوری مدد کریں گے، اور دونوں مل کر مسلمانوں کو مدینہ سے نکال دیں گے، یا ان کی طاقت کو بالکل ختم کر دیں گے، ان کوششوں کے نتیجہ میں ان کے درمیان ایک فوجی معاہدہ ہو گیا، جس کے اہم شرکاء میں مکہ کے قریش، علاقہ نجد کے قبیلہ غطفان اور ان کے ساتھ در پردہ طور پر مدینہ کے یہودی اور منافقین اور دیگر قبائل کے بعض جتھے شامل تھے، چنانچہ ذی قعدہ ۵ھ میں قریش نے چار ہزار آدمیوں کے ساتھ مدینہ کا رخ کیا تھا، غطفان

---

(۱) سیرت ابن ہشام، ج ۲، ص: ۱۹۰-۱۹۱۔

(۲) الکامل فی التاریخ: ۲/ ۱۷۳، الروض الأنف: ۲/ ۲۴۰، البدایۃ والنہایۃ: ۴/ ۷۴، سیرت حلبیہ: ۲/ ۵۵۹

نے چھ ہزار اس میں شامل کئے، چنانچہ یہ ساری تعداد دس ہزار جنگجوؤں کی باہر سے چل کر مدینہ طیبہ پہونچ گئی، ان سے بنی قریظہ کا وعدہ تھا کہ وہ اندر سے جو مدد ہوگی کریں گے، ابوسفیان بن حرب کفار کے اس لشکر کا سپہ سالار تھا (۱)۔

یہاں حضور - روحی فداہ - صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ صرف تین ہزار یا اس سے کم وبیش لوگ تھے، صورتحال بہت ہی خطرہ کی تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ کیا، تو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے یہ رائے دی کہ تین طرف سے پہاڑی رکاوٹیں ہیں، ایک طرف سے مدینہ میں داخل ہونے کا راستہ ہے، اگر وہاں خندق کھود دی جائے تو مسلمان قلعہ بند ہو کر مقابلہ کر سکتے ہیں (۲)، چنانچہ اس پر عمل کیا گیا اور مسلمانوں نے خندق کی سخت نگرانی کر کے اپنی حفاظت کا انتظام کیا، سخت سردی کا زمانہ، رسد کی کمی، خندق کھودنے کی مشقت اور پھر اس کے کنارے ہر وقت موجود رہنے کو تین ہفتہ سے زیادہ برداشت کرنا پڑا اور شب وروز خندق کے سامنے مقابلہ کے لیے تیار رہنا پڑا، یہ ان کے لئے سخت امتحان تھا۔

مدت کی طوالت اور تین ہفتوں تک ہمہ وقت دشمن کے شہر کے اندر گھس آنے کا خطرہ، رسد کی شدید کمی، یہ ایسی صورت حال کہ بڑے سے بڑے باہمت شخص کی ہمت ٹوٹ جائے، اس میں اصحاب رسول اللہ ﷺ کے ایمان ویقین بالغیب کا امتحان تھا، کہ آپ جبکہ سچے نبی ہیں اللہ تعالی کی تائید آپ کے ساتھ ہے تو پھر ایسی پریشانی اور دشمن کی سرکشی کیوں اور اتنی مسلسل طویل مدت تک کیوں جاری ہے؟ لیکن سارے مسلمان اپنے ایمان بالغیب، توکل اور اعتماد علی اللہ پر قائم رہے، شاید اللہ تعالی کو مسلمانوں کے ایمان کی پختگی کا امتحان لینا تھا، اسی لئے سخت نفسیاتی اور جسمانی دونوں سطح پر سخت حالات سے گزارا گیا اور مسلمان اس ایمان میں کامیاب رہے، اور پھر اللہ تعالی نے غیب سے مدد دی، اللہ تعالی کی اس طرح مدد آئی کہ سخت آندھی اور طوفان آیا

---

(۱) زاد المعاد: ۳/۲۷۰۔ (۲) البدایۃ والنہایۃ: ۴/۹۵، سیرت ابن ہشام: ۲/۲۲۴۔

اور دشمنوں کے خیمے اُکھڑ گئے اور اللہ نے مسلمانوں کو فتح وغلبہ عطا فرمایا، اور بغیر جنگ کئے فتح حاصل ہوگئی، دشمن مایوس اور بدحواس ہوکر واپس چلے گئے (۱)۔قرآن مجید میں اس آزمائش کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے:۔

﴿إذجاء وكم من فوقكم ومن أسفل منكم وإذ زاغت الأبصار وبلغت القلوب الحناجرو تظنون باللّٰه الظنونا، هنالك ابتلى المؤمنون وزلزلوا زلزالاً شديدا﴾
(سورة الأحزاب، ۱۰۔۱۱)

جب وہ تمہارے اوپر اور نیچے کی طرف سے تم پر چڑھ آئے، اور جب آنکھیں پھر گئیں، اور دل (مارے دہشت کے) گلوں تک پہونچ گئے اور تم خدا کی نسبت طرح طرح کے گمان کرنے لگے، وہاں مومن آزمائے گئے اور سخت طور پر ہلائے گئے۔

﴿يأيهاالذين آمنوا اذكروا نعمة الله عليكم إذ جاء تكم جنود فأرسلنا عليهم ريحاً وجنوداً لم تروها، وكان الله بما تعملون بصيراً۔﴾

(سورۂ احزاب۔۹)

مومنو! خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جو (اس نے) تم پر (اس وقت کی) جب فوجیں تم پر (حملہ کرنے کو) آئیں تو ہم نے ان پر ہوا بھیجی، اور ایسے لشکر (نازل کئے) جن کو تم دیکھ نہیں سکتے تھے، اور جو کام تم کرتے ہو خدا ان کو دیکھ رہا ہے]۔

﴿ورد الله الذين كفروا بغيظهم لم ينالوا خيراً، وكفىٰ الله المؤمنين القتال، وكان الله قوياً عزيزاً﴾۔

(سورۂ احزاب۔ ۲۵)

اور جو کافر تھے ان کو خدا نے پھیر دیا وہ اپنے غصہ میں بھرے ہوئے تھے کچھ بھلائی حاصل نہ کر سکے اور خدا مومنوں کو لڑائی کے بارے میں کافی ہوا اور خدا طاقت ور (اور) زبردست ہے(۲)۔

یہ آندھی طوفان کے ذریعہ مسلمانوں کی نصرت اس مہم کے شروع میں ہی ہوسکتی تھی، لیکن شائد ایمان والوں کے ایمان کی آزمائش لینا تھی، کہ رضائے الٰہی کے

(۱) سیرت ابن ہشام:۲/۲۳۲۔ (۲) البدایۃ والنھایۃ:۴/۹۳۔

لئے تین ہفتہ سخت خطرہ اور مشقت میں رکھا گیا، اس پوری مدت میں حضورﷺ بحیثیت ذمہ دار اور قائد کے صورت حال پر پوری نظر رکھے ہوئے تھے اور جب حالات سخت سے سخت ہونے لگے اور صحابہ سخت امتحان سے گزرنے لگے تو آپﷺ نے حضرات انصار سے مشورہ کیا کہ کہو تو اس آفت کو ختم کرنے کے لئے کھجور کے باغات کی آمدنی کا کچھ حصہ سالانہ دینے کی پیشکش کی جائے کہ یہ بلا ٹلے، اس پر انہوں نے عرض کیا کہ ہم جاہلیت میں اپنے دشمن کو دینے کے لئے تیار نہیں ہوئے تھے اب کیا اسلام میں ایسا کریں گے، آپﷺ اپنے اختیار کردہ طریقہ پر قائم رہیں، ہم آپ کے ساتھ ہیں (۱)۔ اس پوری مدت میں جماعت صحابہ نے اپنے ایمان کی پختگی ثابت کردی، یہاں تک کہ یہ مصیبت ہٹالی گئی۔

بنی قریظہ کا معاملہ

مدینہ کی آبادی میں عربوں کے قبائل میں اوس وخزرج بڑے اور شہر پر حاوی قبیلے تھے، وہ اسلام کے دائرہ میں داخل ہوکر حضورﷺ کی سرکردگی میں متحد ہوگئے تھے، عربوں کے علاوہ یہودیوں کے تین بڑے قبیلے بنوقریظہ، بنونضیر اور بنوقینقاع تھے، ان سے شروع ہی میں حضورﷺ نے معاہدہ کرلیا تھا، کہ ایک دوسرے کے مفادات کو نقصان نہ پہونچائنگے اور باہر کے دشمن کے حملہ کی صورت میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے، لیکن ان قبائل نے الگ الگ موقعوں پر ایسی بدعہدی اختیار کی کہ مسلمانوں کو سخت نقصان پہونچا، چنانچہ حضورﷺ کو ایسے تمام موقعوں پر ان کے خلاف کارروائی کرنی پڑی، بنونضیر نے جب بدعہدی کی، تو وہ شہر سے نکالے گئے، ان کی بدعہدی کو دیکھتے ہوئے آپ نے بنوقریظہ قبیلہ سے معاہدہ کو از سر نو پکا کیا اور وعدہ لیا،

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۲/۲۲۳

کہ جنگ میں ایک دوسرے کی مدد کرنا لازم ہوگا، مدینہ پر حملہ ہوا تو مشترکہ طور پر مقابلہ کریں گے۔

لیکن اس قبیلہ کے سردار حیی بن اخطب نے یہودیوں کو ورغلا کر اور انہیں آپ ﷺ کے خلاف بھڑکا کر اس عہد نامہ کی پامالی اور قریش سے اتحاد اور دوستی پر آمادہ کرلیا، جب رسول اللہ ﷺ کو اس عہد شکنی کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے عرب قبیلہ اوس کے سردار سعد بن معاذ اور قبیلہ خزرج کے سردار سعد بن عبادہ اور کچھ انصار کو اس واقعہ کی تحقیق کے لئے روانہ کیا، وہاں جاکر انہوں نے پتہ لگایا، تو جتنا سنا تھا اس سے زیادہ خطرناک بدعہدی کی صورت حال پائی، مزید یہ کہ اس تحقیق کے موقع پر اس قبیلہ کے لوگوں نے آپ ﷺ کے لئے نازیبا الفاظ استعمال کئے اور تلخ لہجہ میں کہنے لگے کہ کیسا اللہ کا رسول؟ ہمارے اور محمد (ﷺ) کے درمیان کوئی عہد و معاہدہ نہیں (۱)۔

بنو قریظہ کی یہ شرانگیزی، شرارت اور بدعہدی جب سامنے آئی تو محسوس ہوا کہ آئندہ ان سے سنگین خطرہ پیش آسکتا ہے، اس لئے ان کی سرکوبی ضروری ہے، لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے جنگ سے فارغ ہوکر حکم دیا کہ ابھی لوگ ہتھیار نہ کھولیں، اور بنو قریظہ کا رخ کریں، میں بھی وہیں کا ارادہ کررہا ہوں، کہ ان کا تدارک کردوں، رسول اللہ ﷺ نے بنی قریظہ میں پہونچ کر ان کا محاصرہ کرلیا، جس کا سلسلہ پچیس شب و روز جاری رہا، یہاں تک کہ وہ اس محاصرہ سے تنگ آگئے، اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔

اس درمیان میں بنی قریظہ نے رسول اللہ ﷺ کو یہ پیغام بھیجا کہ آپ ﷺ ہمارے پاس بنی عمرو بن عوف کو بھیج دیجئے (یہ لوگ اوس کے حلیف بھی تھے) تاکہ ہم ان سے اپنے معاملہ میں مشورہ کرسکیں، ان کی درخواست پر رسول اللہ ﷺ نے

---

(۱) سیرت ابن ہشام، ۲/ ۲۲۰-۲۲۳

ابولبابہ رضی اللہ عنہ کو وہاں بھیج دیا، ان کو دیکھتے ہی سب لوگ سروقد کھڑے ہو گئے اور عورتیں اور بچے دہاڑیں مار کر رونے لگے، یہ دیکھ کر ان کا دل کچھ پسیج گیا، اس کے بعد یہ سب لوگ کہنے لگے: ابولبابہ! کیا محمد ﷺ کے فیصلہ پر سر تسلیم خم کر لیا جائے؟ انہوں نے کہا: ہاں، اسی کے ساتھ اپنے گلے پر ہاتھ پھیر کر اس کی طرف اشارہ کیا، ابولبابہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ابھی میرے قدم بھی وہاں سے نہ ہٹے تھے کہ مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی خیانت کی ہے، چنانچہ وہ فوراً الٹے پاؤں واپس ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے بجائے مسجد نبوی کے ایک ستون سے اپنے کو باندھ دیا اور اعلان کر دیا کہ میں اس وقت تک اس جگہ سے نہ ہٹوں گا جب تک اللہ تعالی میرے قصور کو معاف نہ فرما دیگا، انہوں نے اللہ تعالی سے یہ عہد کیا کہ آئندہ وہ بنی قریظہ کے علاقہ میں قدم بھی نہ رکھیں گے، اور اس مقام کی بھی شکل نہ دیکھیں گے جہاں انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی خیانت کی تھی، جب اللہ تعالی نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وآخرون اعترفوا بذنوبهم خلطوا عملاً صالحاً وآخر سيئاً، عسى الله أن يتوب عليهم إن الله غفور رحيم﴾ [سورہ توبہ:۱۰۲]

اور کچھ لوگ ہیں کہ اپنے گناہوں کا (صاف) اقرار کرتے ہیں، انہوں نے اچھے اور برے عملوں کو ملا جلا دیا تھا، قریب ہے خدا ان پر مہربانی سے توجہ فرمائے، بیشک خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

تو فوراً لوگ ان کو کھولنے کے لئے تیزی سے آگے بڑھے، انہوں نے کہا کہ نہیں، خدا کی قسم جب تک رسول اللہ ﷺ خود اپنے دست مبارک سے مجھے آزاد نہ کریں گے میں اسی حالت میں رہوں گا، جب نماز فجر کے لئے حضور ﷺ باہر تشریف لائے اور ان کے قریب سے گزرے تو آپ ﷺ نے ان کو کھولا، یہ کھجور کے اس تنے سے تقریباً بیس رات بندھے رہے، ہر نماز کے وقت ان کی اہلیہ آتیں اور نماز کے لئے

ان کو کھول دیتیں، پھر وہ دوبارہ اپنے کو اس سے باندھ لیتے (۱)۔

حضرت سعد بن معاذ کا امتحان

بنو قریظہ نے درخواست پیش کی کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو ہمارے معاملہ میں حکم بنادیا جائے وہ جو فیصلہ کریں ہم کو منظور ہے (۲)۔

جاہلی دور میں بنو قریظہ کے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے تعلقات رہے تھے، اسی کی بنیاد پر وہ ان سے اپنے حق میں امید رکھتے تھے کہ رعایت سے کام لیں گے، کیونکہ یہود کی شریعت میں دغابازی کی سزا میں سختی تھی کہ جنگجو لوگوں کو قتل کردیا جائے، اسی لئے بنی قریظہ نے حضرت سعد بن معاذ کو حکم تجویز کیا کہ وہ رعایت کرادینگے، حضور ﷺ نے بنی قریظہ کی یہ بات مان لی، حضرت سعد بن معاذ نے حکم طے ہونے کے بعد یہودی شریعت کے مطابق ہی فیصلہ دیا اور کہا: میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ ان کے بچے اور عورتیں بحیثیت غلام کے باقی رکھے جائیں، باقی ان کے مرد ختم کردیے جائیں، ان کا مال تقسیم کرلیا جائے، بنو قریظہ کا جو جرم تھا ان کی مذہبی کتاب توریت میں اس طرح کے جرم کی یہی سزا لکھی تھی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم نے اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا ہے، کیونکہ یہ فیصلہ بنی اسرائل کی شریعت کے جنگی قوانین کے مطابق تھا، لہذا اسی کے مطابق عملدرآمد کیا گیا اور اس طرح بنو قریظہ کی شرارت سے بچاؤ کا انتظام ہوگیا (۳)۔

حضرت سعد بن معاذ اس فیصلہ کے وقت بیمار تھے، اور بیماری سخت تھی جس سے وہ جانبر نہ ہوسکے اور انتقال کرگئے، ان کے انتقال کو مسلمانوں کا ایک بڑا خسارہ

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۲/ ۲۳۶-۲۳۸۔ (۲) سیرت ابن ہشام، ۲/ ۲۳۹۔ (۳) تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں: البدایۃ والنھایۃ: ۴/ ۱۱۶-۱۲۶، الکامل فی التاریخ: ۲/ ۱۸۵، سیرت النبی از: علامہ شبلی نعمانی۔ جلد اول، ص: ۲۶۰-۲۶۳، اور نبی رحمت از: سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، ص: ۳۴۸-۳۵۶۔

سمجھا گیا، اور حضور ﷺ نے ان کی مقبولیت عنداللہ کی خبر دی (۱)۔

بنوالمصطلق کا معاملہ

شعبان ۶ھ میں آپ ﷺ کو یہ اطلاع ملی کہ بنی المصطلق (جو خزاعہ کی ایک شاخ تھے) جنگ کے لئے جمع ہورہے ہیں، آپ ﷺ نے مزید تحقیقات کے لئے حضرت زید بن خصیب رضی اللہ عنہ کو بھیجا، انہوں نے واپس آکر خبر کی تصدیق کی، تو آپ ﷺ بھی مقابلہ کے لئے تشریف لے چلے، مقام مریسیع (بنی المصطلق کا چشمہ) میں خبر پہونچی کہ حارث بن ابی ضرار (قبیلۂ بنی المصطلق کا سردار) کی جمعیت منتشر ہوگئی، اور وہ خود بھی کسی طرف نکل گیا، لیکن مریسیع میں جو لوگ رہتے ہیں، وہ لڑنے پر کمربستہ ہیں اور انہوں نے صف آرائی کی، چنانچہ مقابلہ ہوا اور مسلمانوں کو فتح ہوئی (۲)

حضرت جویریہ سے آپ کا نکاح

شکست دینے کے بعد جب بنوالمصطلق بے چارگی اور کسمپرسی کی حالت میں آگئے تو آپ ﷺ نے ان پر احسان کرتے ہوئے ان کے لیڈر حارث بن ضرار کی صاحبزادی جویریہ کو جو کہ باندی کی حیثیت سے مسلمانوں کے قبضہ میں آگئی تھیں، آزاد فرمادیا، پھر مزید یہ احسان فرمایا کہ ان کو اپنے نکاح میں بھی لے لیا، آپ ﷺ کی اس دلداری کا یہ اثر ہوا کہ سب مصطلقی مسلمان ہوگئے، اور مسلمانوں نے حضور ﷺ کا یہ رویہ دیکھ کر ان کے اختیار میں آئے ہوئے غلام و باندی آزاد کردئے اور اس طرح یہ واقعہ بڑا بابرکت ثابت ہوا (۳)۔

منافقین کی فتنہ انگیزی اور واقعۂ افک

اس غزوہ میں آپ ﷺ کے ساتھ منافقین کی بھی ایک تعداد تھی جن کا نفاق

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۲/۲۵۰-۲۵۲۔ (۲) سیرت ابن ہشام: ۲/۲۸۹، البدایۃ والنہایۃ: ۴/۱۵۶

(۳) سیرت ابن ہشام، ۲/۲۹۴

چھپا ہوا تھا اور دیگر مسلمانوں کی طرح ہی سمجھے جاتے تھے، اتنی تعداد اس سے پہلے کسی غزوہ میں نہیں ہوئی تھی، جب دشمنان اسلام کو جن میں مخفی طور پر یہ منافقین شامل تھے یہ یقین ہو گیا کہ مسلمانوں کو اب میدان جنگ میں اور کثرت تعداد اور ساز و سامان سے شکست نہیں دی جا سکتی، تو منافقین نے داخلی محاذ میں رخنہ اندازی اور فتنہ پردازی کا راستہ اختیار کیا، مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کے لئے محترم شخصیتوں کے مقام کو گرانے اور آپسی اعتماد کو کمزور کرنے کا راستہ اختیار کیا، حضور ﷺ کے اعلی ترین مقام رسالت پر حرف گیری کی، وراس پر مسلمانوں کے اعتماد و یقین کو کمزور کرنے کا منصوبہ بنایا، اور کاشانۂ نبوت کے خلاف زبان درازی اور الزام تراشی کی مہم چلانے کا موقع نکالا۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا راستہ میں ایک صبح سویرے قضائے حاجت کے لئے تشریف لے گئیں اور واپسی پر دیکھا کہ قافلہ روانہ ہو چکا ہے، قافلہ ان کو ان کے اونٹ میں ہونے کا خیال کر کے ان کے بغیر روانہ ہو گیا، پھر وہ ایک صحابی کے تعاون سے قافلہ میں پہونچ گئیں، صرف اسی قدر ان کے قافلہ سے جدا ہونے کو بہانہ بنا کر ان پر تہمت لگائی گئی، یہ ایک نہایت خطرناک اور گہری سازش تھی اور یہ غزوۂ بنی المصطلق میں جس طرح کھل کر سامنے آئی اتنی کسی اور غزوہ میں نہ آئی تھی، اس واقعہ کا تذکرہ واقعۂ افک کے (یعنی جھوٹی تہمت لگانے کا واقعہ) کے نام سے ملتا ہے۔

یہ حرکت ناشائستہ اسی غزوہ سے واپسی میں پیش آئی، منافقین نے شک وشبہ پیدا کر کے اس پر طرح طرح کی رائے زنی کی اور پھر مدینہ پہونچ کر مسلسل اس کا چرچا کیا، اس سازشی تہمت سے کچھ سادہ دل مسلمان بھی متاثر ہو گئے، حضور ﷺ کو اس تکلیف دہ صورت حال سے تھوڑی مدت گزرنا پڑا، بالآخر اللہ تعالی کی طرف سے وحی کے ذریعہ ان کی براءت کے اعلان کے ساتھ الزام لگانے والوں کی شر پسندی پر سخت نکیر کی گئی کہ ایک عفیفہ خاتون پھر رسول ﷺ کی معتمد علیہ زوجہ ہونے پر بھی شبہ

کیا گیا، اور اس کو یقینی بنا کر پیش کیا گیا، قرآن مجید کی آیات کے ذریعہ اس کی تردید ہوئی اور مزید یہ کہ بلا تحقیق تہمت لگانے کی سزا تہمت لگانے والوں کو دی گئی، جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ میں مذکور ہے، اس آسمانی تردید سے قبل قریب تھا کہ منافقین اپنی گھناؤنی سازش میں کامیاب ہوجاتے، اور خاندان نبوی کے مقام بلند کو شک کے دائرہ میں لے آتے، لیکن سات آسمانوں کے اوپر سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت کا اعلان آگیا، اس طرح اس زبردست فتنہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا:

﴿إن الذين جاء وا بالإفك عصبة منكم، لا تحسبوه شراً لكم، بل هو خير لكم، لكل امرئ منهم ما اكتسب من الإثم و الذى تولى كبره منهم له عذاب عظيم، لولا إذ سمعتموه ظن المؤمنون و المؤمنات بأنفسهم خيراً و قالوا هذا إفك مبين﴾

[سورۂ نور:۱۱-۱۲]

جن لوگوں نے بہتان باندھا ہے تم ہی میں سے ایک جماعت ہے، اس واقعہ کو تم اپنے لئے برا نہ سمجھو بلکہ یہ تمہارے لئے خیر بن گیا (یعنی ایسے موقعوں کے لئے تم کو احتیاط کرنے کی سخت تلقین کر کے ایسے امور میں بے احتیاطی کا سدباب کردیا گیا) ان میں جس شخص نے گناہ کا جتنا حصہ لیا اس کے لئے اتنا ہی وبال ہے، اور جس نے ان میں سے اس بہتان کا بڑا بوجھ اٹھایا ہے اس کو بڑا عذاب ہوگا، جب تم نے وہ بات سنی تو مومن مردوں اور عورتوں نے کیوں اپنے دلوں میں نیک گمان نہیں کیا اور کیوں یہ نہیں کہا کہ یہ صریح بہتان تراشی ہے؟(۱)۔

عمرہ ادا کرنے کے لئے مکہ مکرمہ کا سفر اور صلح حدیبیہ

غزوۂ احزاب میں جسے غزوۂ خندق بھی کہتے ہیں مکہ کے کفار ومشرکین

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۲/ ۲۹۷-۳۰۷، البدایۃ والنہایۃ: ۴/ ۱۶۰-۱۶۴، الکامل فی التاریخ: ۲/ ۱۹۵۔

اور مدینہ کے یہود ومنافقین متحد ہوکر مسلمانوں کے خلاف صف بستہ ہوئے تھے، لیکن انہیں اپنی منصوبہ بندی میں کھلی ناکامی ہوئی اور وہ مایوس ودل برداشتہ ہوکر واپس ہونے پر مجبور ہوگئے تھے، اس طریقہ سے مسلمانوں کی طاقت اور مقابلہ کی صلاحیت کا اندازہ قریش کو ہوگیا، اوراس کے بعد قریش نے کسی بڑی مہم کا منصوبہ نہیں بنایا، لیکن چھیڑ چھاڑ کی باتیں ان کی طرف سے ہوتی رہیں، اور جہاں جہاں سے خطرات کا علم ہوتارہا، وہاں مسلمانوں کی طرف سے اس کی روک تھام کی کوشش کی جاتی رہی، چنانچہ ان پر یہ بات واضح ہوگئی کہ مسلمان اب مضبوط حالت میں ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ آپ ﷺ مکہ میں داخل ہوئے اور بیت اللہ کا طواف کیا(۱)۔

یہ ایک سچا خواب تھا، لیکن اس میں زمانہ، مہینہ اور سال کا کوئی تعین نہ تھا، آپ ﷺ نے صحابۂ کرام کو مدینہ میں یہ خواب سنایا، یہ خوش خبری سن کر سب لوگ بہت مسرور ہوئے، مکہ اور کعبہ (جس کی محبت وعظمت ان کے خمیر میں شامل اور ان کے رگ وریشہ میں پیوست تھی) مدت ہوئی وہ اس سے محروم تھے، ان کے دل میں کعبہ کی زیارت اوراس کے طواف کا بڑا اشتیاق تھا اور وہ بہت بے چینی سے اس دن کے منتظر تھے کہ یہ سعادت ان کو دوبارہ حاصل ہو، مہاجرین میں مکہ کا اشتیاق قدرتی طور پر بہت زیادہ تھا، اس لئے کہ وہ وہیں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے تھے، اوراس کی محبت گویا ان کی گھٹی میں پڑی تھی، اوراب وہ عرصۂ دراز سے حسرت دل میں لئے ہوئے تھے، چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ خبر دی تو وہ متوقع ہوگئے کہ اس خواب کی تعبیر اسی سال نکل آئے گی اس بات نے ان کی آتش شوق کو اور بھڑکا دیا، حضور ﷺ کا خواب نبی ہونے کی بنا پر سچا ہی ہوتا ہے، چنانچہ آپ نے کعبہ کی

(۱) سیرت حلبیہ: ۲/ ۶۸۸

زیارت وطواف کا ارادہ فرمالیا اور سب صحابہ بھی آپ ﷺ کے ساتھ روانہ ہونے کے لئے آمادہ ہوگئے، شاذ ونادر ہی کوئی اس سے مستثنیٰ تھا، ارادہ صرف عمرہ کا تھا کسی ٹکراؤ کا نہ تھا، اور عمرہ وہاں ہر ایک عمرہ کی نیت سے آنے والے کے لئے کھلا تھا اس لئے کسی کو بھی روکا نہیں جاتا تھا، لیکن صرف مسلمانوں کے لئے اس کو مشکل بنادیا گیا تھا، کیونکہ قریشی ان سے دشمنی رکھتے تھے، آنے نہ دیتے، لیکن اب مسلمانوں کی طاقت ایسی تھی کہ روکا نہیں جاسکتا تھا، بہرحال چونکہ وہاں عمرہ کا ہی ارادہ تھا اس لئے حضور ﷺ اور مسلمانوں نے عمرہ کا احرام شروع ہی سے باندھ لیا تھا تاکہ لوگوں کو بھی اس کا علم ہوجائے کہ آپ ﷺ صرف زیارت بیت اللہ کی غرض سے تشریف لے جارہے ہیں (۱)۔

وہاں پہونچ کر آپ ﷺ نے قبیلہ خزاعہ کے ایک مخبر کو قریش کا پتہ لگانے کے لئے متعین کیا، جب آپ مقام ''عسفان'' کے قریب پہونچے تو اس مخبر نے آپ ﷺ کو اطلاع دی کہ قبیلۂ کعب بن لوی نے آپ ﷺ کے مقابلہ اور پیش قدمی روکنے کے لئے احابیش کو اکٹھا کررکھا ہے اور خاصی بڑی فوج منظم کرلی ہے، ان کا ارادہ ہے کہ جنگ کرکے آپ ﷺ کو بیت اللہ تک پہونچنے سے باز رکھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش قدمی جاری رکھی جب آپ ﷺ اس گھاٹی پر پہونچے جہاں سے ان کی طرف اتار شروع ہوتا ہے تو آپ ﷺ کی اونٹنی ''قصواء'' بیٹھ گئی لوگوں نے یہ دیکھ کر کہنا شروع کیا قصواء اڑگئی، قصواء اڑگئی، آپ ﷺ نے فرمایا قصواء اڑی نہیں، اور یہ اس کا شیوہ نہیں، اس کو ہاتھیوں کے روکنے (آپ کا اشارہ ابرہہ کے ہاتھی کی طرف تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے مکہ میں داخل ہونے سے باز رکھا) والے نے روکا ہے، اور قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، وہ لوگ کوئی بھی ایسا منصوبہ پیش کرتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی تعظیم کا پہلو مدنظر رکھا جاتا ہے، اور مجھ سے صلۂ رحمی

---

(۱) زاد المعاد: ۳/ ۲۸۸، سیرت ابن ہشام: ۲/ ۳۰۸۔

کا سوال کرتے ہیں تو میں ان کا سوال ضرور پورا کروں گا، پھر آپ ﷺ نے اونٹنی کو جھڑکا وہ کھڑی ہوگئی، لیکن اپنا رخ بدل کر حدیبیہ کی طرف روانہ ہوگئی (۱)۔

مسلمانوں کے مکہ میں داخلہ سے قریش کی روک اور صلح

قریش کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری اور اس جگہ قیام کی خبر ملی تو ان کو اس سے سخت فکر و بدگمانی ہوئی، آپ ﷺ نے اس موقع پر مناسب سمجھا کہ اپنے اصحاب کرام میں سے کسی ایک کو بھیج کر ان کو اطمینان دلا دیا جائے، کہ مسلمانوں کی طرف سے کسی ٹکراؤ یا جنگ کا اندیشہ نہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت عثمانؓ کو بلوا کر قریش کے پاس بھیجا اور فرمایا کہ ان سے جا کر کہدو کہ ہم جنگ کرنے کے لئے نہیں بلکہ عمرہ کے ارادہ سے یہاں آئے ہیں، ان کو اسلام کی بھی دعوت دینا، آپ ﷺ نے ان کو یہ بھی ہدایت کی کہ مکہ میں جو اہل ایمان مرد و عورتیں مجبوری سے مقیم ہیں ان کے پاس جا کر ان کو فتح کی بشارت دیں اور ان کو یہ خوش خبری سنائیں کہ اللہ تعالیٰ بالآخر مکہ میں اپنے دین کو غالب کرنے والا ہے کہ پھر ان کو اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی (۲)۔

حضرت عثمانؓ روانہ ہوئے مکہ پہونچ کر وہ ابوسفیان اور قریش کے سربرآوردہ اشخاص کے پاس گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ پیغام ان کو پہونچایا (۳)۔

بیعت رضوان

حضرت عثمان کے جانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر یہ ملی کہ حضرت عثمانؓ شہید کردیئے گئے، آپ ﷺ نے لوگوں کو حق کے لئے جان دیدینے کا عہد کرنے کے لئے بیعت کی دعوت دی، تمام لوگ جوش و وارفتگی کے ساتھ

---

(۱) زاد المعاد: ۳/۲۸۹۔ (۲) زاد المعاد: ۳/۲۹۰۔ (۳) سیرت ابن ہشام ۲/۳۱۵۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چاروں طرف جمع ہو گئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت ایک درخت کے نیچے تشریف رکھتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بیعت کی کہ (اب جو صورت حال پیدا ہو گئی ہے اس کے مقابلہ میں) کوئی راہ فرار نہ اختیار کرے گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنا دست مبارک تھاما اور فرمایا یہ عثمانؓ کی طرف سے ہے(۱)، یہ بیعت بیعت رضوان کہلائی، یہ حدیبیہ میں ببول کے ایک درخت کے نیچے انجام پائی، اس کو اللہ تعالی نے مسلمانوں کے اخلاص وایمان کی مضبوطی کی علامت کے طور پر پسند فرمایا، اور اسکا ذکر قرآن مجید کی حسب ذیل آیات میں فرمایا:۔

﴿لقد رضي الله عن المؤمنين إذ يبايعونك تحت الشجرة فعلم ما في قلوبهم فأنزل السكينة عليهم وأثابهم فتحا قريبا۔

(سوره فتح-۱۸)

(اے پیغمبر) جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے، تو خدا ان سے خوش ہوا، اور جو (صدق وخلوص) ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کر لیا تو ان پر تسلی نازل فرمائی اور انھیں فتح کا فائدہ عنایت کیا جو قریب ہے)۔

مسلمانوں کا امن پسندانہ رویہ اور مصالحت پر رضامندی

یہ الجھی ہوئی صورت حال ابھی قائم تھی کہ اچانک بدیل بن ورقاء الخزاعی، خزاعہ کے کچھ آدمیوں کے ساتھ وہاں پہونچا اس نے ان معاملات پر گفتگو کرنا چاہی، اور دریافت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کا مقصد کیا ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم لوگ کسی سے جنگ کرنے کے لئے نہیں آئے ہیں، ہم صرف عمرہ کی نیت سے یہاں آئے ہیں، قریش کو جنگ نے پہلے ہی چور چور کر رکھا ہے، اگر وہ چاہیں تو میں کچھ مدت ان سے طے کر لوں، اور وہ میرے اور لوگوں کے درمیان کا راستہ چھوڑ دیں، اور اگر وہ چاہیں تو وہ بھی اسی گروہ میں شامل ہو جائیں

(۱) زاد المعاد: ۳/ ۲۹۱

جس میں اور لوگ شامل ہوئے ورنہ انھیں کچھ مدت آرام کا موقع تو مل ہی جائے گا، لیکن اگر جنگ کے علاوہ کوئی صورت ان کو قبول نہیں تو اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، میں اپنے اس معاملہ (دین) کے سلسلہ میں جنگ کروں گا، یہاں تک کہ میرا سرتن سے جدا ہو جائے، یا اللہ اپنے دین کو غالب فرمادے۔

جب بدیل نے واپس جا کر قریش کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہونچایا (۱) تو عروۃ بن مسعودؓ الثقفی نے کہا کہ انھوں نے بہت سمجھ داری کی تجویز رکھی ہے، میری رائے یہ ہے کہ تم اس کو مان لو اور مجھے ان سے مل لینے دو، سب نے کہا ہاں جاؤ بات کرلو، عروہ بن مسعود رسول للہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آ کر ملے اور آپ ﷺ نے ان سے گفتگو شروع فرمائی، عروہ کنکھیوں سے صحابۂ کرام کو دیکھتے جاتے تھے، جن کا حال یہ تھا کہ اگر آپ ﷺ تھوکتے تو کوئی نہ کوئی اس کو ہاتھ پر لے لیتا اور اپنے چہرے اور جسم پر لگا لیتا، آپ ﷺ کوئی حکم فرماتے تو ہر شخص تعمیل کے لئے لپکتا، وضو فرماتے تو وضو کے پانی پر جاں نثار اس طرح ٹوٹتے کہ لڑائی کا خطرہ ہونے لگتا، آپ ﷺ کلام فرماتے تو سب ہمہ تن گوش ہو جاتے، فرط تعظیم اور ادب کی وجہ سے کوئی آپ ﷺ سے نظریں ملانے کی ہمت نہ کرتا، عروہ نے واپس جا کر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اے قوم! میں بادشاہوں کے دربار میں گیا ہوں، میں نے قیصر وکسریٰ اور نجاشی کی شان وشوکت بھی دیکھی ہے، لیکن خدا کی قسم میں نے نہیں دیکھا کہ کسی بادشاہ کے درباری ومصاحبین ایسا ادب اور اس درجہ تعظیم کرتے ہوں جیسے کہ محمد ﷺ کے ساتھی محمد ﷺ کی کرتے ہیں، انھوں نے جو کچھ یہاں دیکھا اس کی تفصیل ان کو بتائی اور کہا کہ انھوں نے بہت اچھی تجویز رکھی ہے تم لوگ اس کو مان لو (۲)۔

معاہدہ وصلح نامہ

اس درمیان میں بنی کنانہ کا ایک اور شخص (جس کا نام مکرز بن حفص تھا) بھی

(۱) زادالمعاد: ۳/۲۹۲۔ (۲) زادالمعاد: ۳/۲۹۳۔

وہاں پہونچا تھا، دونوں نے اپنے چشم دید واقعات قریش کے سامنے بیان کئے، قریش نے سہیل بن عمرو کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں روانہ کیا، آپ ﷺ نے ان کو دیکھتے ہی فرمایا کہ ان کو بھیجنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صلح کے خواہشمند ہیں، آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ معاہدہ کی تحریری دستاویز تیار کرو(۱)۔

آپ ﷺ نے معاہدہ کی تحریر کے لئے کاتب (جو اس وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے) طلب فرمایا اور ارشاد ہوا لکھو "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو رحمٰن (بیحد رحم کرنے والے) اور رحیم (بہت مہربان) ہے، سہیل نے کہا جہاں تک رحمٰن کے لفظ کا تعلق ہے بخدا ہم اس سے واقف نہیں ہیں، پرانے دستور کے مطابق باسمک اللّٰھم لکھو، یعنی اے اللہ تیرے نام سے شروع کرتا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ لکھ دو باسمک اللّٰھم، مسلمان یہ دیکھ کر بول اٹھے کہ نہیں ہم تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھیں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہوا نہیں، باسمك اللّٰهم ہی لکھدو۔

پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ لکھو یہ وہ ہے جس کا اللہ کے رسول ﷺ نے معاہدہ کیا، یہ سنکر سہیل نے کہا کہ خدا کی قسم اگر ہمارا اس پر ایمان ہوتا کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں تو ہم آپ ﷺ کو بیت اللہ سے روکتے ہی کیوں؟ اور آپ ﷺ سے جنگ ہی کیوں کرتے، اور آپ ﷺ سے کہا کہ اچھا پھر اس کی جگہ محمد بن عبد اللہ لکھو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (حقیقت تو یہی ہے کہ) میں اللہ کا رسول ﷺ ہوں خواہ تم جھٹلاؤ، محمد بن عبد اللہ ہی لکھدو، آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو جو لکھ گیا تھا اس کے تبدیل کردینے کا حکم دیا، حضرت علیؓ نے کہا کہ خدا کی قسم مجھ سے یہ کام نہیں ہوسکتا، یعنی رسول اللہ کا جو لفظ لکھ گیا ہے اس کو اپنے ہاتھ سے مٹاؤں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے اس کی جگہ دکھاؤ انھوں نے آپ ﷺ کو یہ جگہ دکھائی تو آپ ﷺ نے اس کو خود مٹادیا(۲)۔

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۳۱۶/۲۔ (۲) صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب عمرۃ القضاء، زاد المعاد: ۲۹۴/۳۔

صلح کے لئے قریش کا ایک طرفہ سخت رویہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ کی یہ دفعہ لکھائی کہ اللہ کے رسول نے یہ معاملہ اس پر کیا ہے کہ تم لوگ ہمارے اور بیت اللہ کے درمیان حائل نہ ہو اور ہم اس کا طواف کرلیں، سہیل نے کہا کہ اگر ایسا ہوگا تو ہمیں ڈر ہے کہ عربوں میں یہ چرچا ہونے لگے کہ ہم نے دب کر معاہدہ کیا ہے، اس لئے اس پر عمل اس سال نہیں، آئندہ سال کیا جائے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ دفعہ بھی معاہدہ میں قبول کرلی۔

سہیل نے کہا کہ اس معاہدہ کی رو سے یہ بھی ہوگا کہ اگر ہمارے یہاں سے کوئی شخص آپ ﷺ کے یہاں چلا جائے خواہ وہ آپ ﷺ ہی کے مذہب کا ماننے والا ہو تو آپ ﷺ اس کو ہمیں پلٹا دیں گے، مسلمانوں نے کہا کہ سبحان اللہ اگر کوئی مسلمان ہوکر ہمارے پاس آتا ہے تو ہم اس کو مشرکوں کے حوالے کیسے کرسکتے ہیں؟

یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ اچانک خود سہیل ہی کے بیٹے ابو جندل بن سہیل بیڑیوں میں گرتے پڑتے پہونچے وہ مکہ کے نشیب سے آئے تھے، اور کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو مسلمانوں تک پہونچا دیا تھا، سہیل نے اپنے بیٹے کے اس طرح پہونچ جانے کو دیکھا تو کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) معاہدہ کے تحت یہ پہلا شخص ہے جس کی واپسی کا مطالبہ میں آپ ﷺ سے کرتا ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ابھی تو ہم نے معاہدہ کی تحریر مکمل بھی نہیں کی، اس نے جواب دیا اگر ایسا ہے تو پھر میں کسی بات پر آپ سے معاملہ کرنے پر تیار نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا میرے کہنے پر (یعنی میری ذاتی فرمائش پر ہی) انھیں اجازت دیدو، اس نے کہا میں آپ ﷺ کے کہنے پر بھی اجازت نہیں دے سکتا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اچھا جو تمہارا جی چاہے کرو، اس نے کہا مجھے کچھ نہیں کرنا ہے، یہ سن کر ابو جندل بولے، مسلمانو! میں مسلمان

ہوکر آیا ہوں، اور پھر مشرکوں کو واپس کیا جارہا ہوں، کیا تم لوگ دیکھتے نہیں میرے ساتھ کیا ہورہا ہے؟ انھوں نے اللہ کے راستے میں سخت تکلیفیں اٹھائی تھیں (۱) صورت حال کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریشی نمائندہ کے مطالبہ کی بنا پر ان کو واپس فرما دیا۔

اس معاہدہ میں فریقین میں یہ بھی طے ہوا کہ دس سال تک دونوں کشت وخون سے پرہیز کریں گے، تا کہ لوگ امن واطمینان کے ساتھ رہ سکیں، اور کوئی کسی پر دست درازی نہ کر سکے، دوسری بات یہ طے ہوئی کہ اگر قریش سے کوئی شخص اپنے ولی وسرپرست کی اجازت کے بغیر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آنکلا تو وہ اس کو واپس کردیں گے، اور اگر محمد ﷺ کے ساتھیوں میں سے کوئی شخص قریش کے پاس آنکلا تو وہ اس کو واپس نہ کریں گے، نیز یہ کہ جو کوئی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے معاہدہ اور جوار (حفاظت) میں داخل ہونا چاہے وہ ان کے ساتھ ہوسکتا ہے، اسی طرح جو قریش کے معاہدہ اور جوار میں آنا چاہے، اس کو اس کی اجازت ہوگی، چنانچہ قبیلہ بنوبکر کے لوگ قریش کے حلیف بنے اور قبیلہ بنوخزاعہ کے لوگ مسلمانوں کے حلیف بنے (۲)۔

مسلمانوں کا امتحان

جب مسلمانوں نے اس طرح کی صلح ہوجانے اور اس کی بنا پر واپسی کی بات سنی اور انھوں نے یہ دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح اس کو برداشت کیا تو یہ بات ان کے لئے اتنی روح فرسا ثابت ہوئی کہ ان کی جان پر بن گئی، یہاں تک کہ حضرت عمرؓ حضور ﷺ کے پاس گئے پھر حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ کیا ہم حق پر اور یہ کفار باطل پر نہیں ہیں؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: کیوں نہیں؟، ہم حق پر ہیں اور

---

(۱) صحیح بخاری، باب الشروط فی الجہاد، مسند احمد: ۴/ ۳۲۵، سیرت ابن ہشام: ۲/ ۳۱۸، زاد المعاد: ۳/ ۲۹۴۔
(۲) سیرت ابن ہشام: ۲/ ۳۱۷، زاد المعاد: ۳/ ۳۰۰۔

کفار باطل پر ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہا: تو پھر کیوں دین کے معاملہ میں ہم کو یہ حقارت حاصل ہورہی ہے؟ اور کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم لوگ بیت اللہ جائیں گے اور طواف کریں گے؟ انھوں نے کہا: ہاں، فرمایا تھا، لیکن کیا انھوں نے تم سے یہ کہا تھا کہ تم اسی سال بیت اللہ جاؤ گے اور طواف بھی کروگے؟، یہ اللہ کے رسول ہیں، ان کی رکاب تھامے رہو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح کی بات کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسی طرح سمجھایا (۱)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بعد میں اپنی اس بات پر افسوس کیا کرتے تھے کہ انہوں نے اتنا بھی کیوں کہا، اپنے اسی افسوس میں انہوں نے کئی خیراتی کام کئے، تاکہ وہ جس کو چوک اور غلطی محسوس کرتے تھے اس کی تلافی ہوجائے، شاید ان کے ذہن میں قرآن مجید کی وہ آیت تھی کہ جس میں نبی کے فیصلہ پر دل میں بھی تردد لانے سے منع کیا گیا ہے

﴿ثم لا يجدوا في أنفسهم حرجاً مما قضيت ويسلموا تسليماً﴾ (النساء:٦٥)

اور جو تم فیصلہ کردو اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں۔

اور تمام صحابہ کرام مع حضرت عمر رضی اللہ عنہم کا یہی رویہ تھا اس میں فرق نہیں آیا تھا، کہ نبی کی بات اللہ تعالی کی طرف سے ہوتی ہے، اس میں کسی تردد کی گنجائش نہیں ہے اور اسی کی تلقین قیامت تک کے لئے مسلمانوں کو کی گئی ہے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس صلح نامہ سے فارغ ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے فرمایا کہ منیٰ میں قربانی کرنے کے لئے لائے ہوئے جانوروں کو اب یہیں ذبح کردو، مسلمانوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیسے ہورہا ہے اور کیا ہورہا ہے، اس لئے وہ نہیں سمجھ پائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا مطلب کچھ اور تو

---

(۱) صحیح بخاری، باب الشروط فی الجہاد۔

نہیں ہے، اس لئے کہ قربانی کے جانور مکہ پہونچنے سے پہلے ذبح کرنے کا کوئی دستور نہیں رہا ہے، اسی لئے وہ قربانی کرنے کیلئے آگے نہیں بڑھے، حضور ﷺ کو یہ محسوس کر کے کہ شاید مسلمان بات نہیں مان رہے ہیں، بڑی فکر اور ملال ہوا کہ کیا مسلمان اپنے نبی کا حکم ماننے سے گریز کر رہے ہیں، آپ ﷺ اسی احساس ملال کیساتھ اپنے خیمہ میں داخل ہوئے، آپ ﷺ کے ساتھ آپ کی زوجہ محترمہ حضرت ام سلمہ آئی تھیں، آپ نے ان سے اپنے اس احساس کا تذکرہ کیا، انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ نافرمانی نہیں ہے، یہ ذہن کے شدید تاثر کی وجہ سے بات نہ سمجھ پانے کی وجہ سے ہوگا، لہذا آپ خود قربانی شروع کریں، تو لوگوں کا ذہن کھل جائے گا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ قربانی کے جانوروں کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کو جا کر ذبح کرنا شروع کر دیا اور اس کے بعد حلق کرایا، مسلمانوں کے لئے یہ بات ایک بڑے سانحہ سے کم نہ تھی، اس لئے کہ مدینہ سے نکلتے وقت ان کے دل میں اس کا وسوسہ بھی نہیں تھا کہ انھیں مکہ جانے اور عمرہ کرنے کا موقع نہ مل سکے گا اور ان کو اپنی مرضی کے خلاف ایسی بات پر عمل کرنا ہوگا جس میں ان کی ایک طرح سے بے عزتی ہوگی جس کے لئے وہ اسلام سے قبل بے تکلف جان دیدیتے اور جان لے لیتے تھے، لیکن جب انھوں نے آپ ﷺ کو قربانی کرتے اور حلق کراتے دیکھا تو سب اسی وقت تیزی سے کھڑے ہوگئے اور آپ ﷺ کی اتباع کرتے ہوئے قربانی اور حلق میں مشغول ہوگئے کہ نبی کے عمل کے خلاف عمل نہیں کرنا ہے(۱)۔

صلح بظاہر ذلت آمیز لیکن نتیجہ کے لحاظ سے مفید

اس کے بعد آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے اور راستہ ہی میں اللہ تعالیٰ نے یہ

(۱) صلح حدیبیہ کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الحدیبیہ، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد، زاد المعاد: ۳/ ۲۸۶، سیرت ابن ہشام: ۲/ ۳۰۸، البدایۃ والنہایۃ: ۴/ ۱۶۴، الکامل فی التاریخ: ۲/ ۲۰۰

آیات نازل فرمائیں:

﴿إنا فتحنا لك فتحاً مبيناً، ليغفر لك اللّٰه ما تقدم من ذنبك وما تأخر ويتم نعمته عليك ويهديك صراطاً مستقيماً، وينصرك الله نصراً عزيزاً﴾

اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تم کو فتح دی صریح وصاف فتح (تا کہ تم کو اس طرح یہ بات حاصل ہو جائے کہ) خدا تمہارے اگلے اور پچھلے گناہ بخش دے اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دے اور تمہیں سیدھے راستہ پر چلائے، اور خدا تمہاری زبردست مدد کرے۔

[سورۂ فتح۔ا۔۳]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا یہ فتح ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں! (۱)

یہ معاہدہ دراصل مسلمانوں کے لئے غیر معمولی فتح کا باعث ثابت ہوا، جیسا کہ بعد کے حالات اور واقعات نے ثابت کر دکھایا۔

بصورت ناکامی، بحقیقت کامیابی

معاہدہ کے بعد آپ ﷺ جب مدینہ واپس تشریف لے آئے آپ ﷺ کے پاس قریش کے ایک فرد ابوبصیر عتبہ بن اسید مسلمان ہو کر پہونچے، ان کی تلاش وتعاقب میں قریش نے دو شخص بھیجے اور وہ معاہدہ آپ کو یاد دلایا، چنانچہ آپ ﷺ نے معاہدہ کی بنا پر ابوبصیر کو ان دونوں کے حوالے کیا، اور یہ دونوں انہیں ساتھ لے کر واپس لوٹے، لیکن راستہ میں ابوبصیر کا ان دو سپاہی نما شخصوں میں سے ایک سے ٹکراؤ ہو گیا اور ابوبصیر نے اس کو ختم کر دیا، دوسرا آدمی بھاگ کر مدینہ آیا اور حضور ﷺ سے شکایت کی، ابوبصیر بھی آئے اور کہا کہ آپ ﷺ نے مجھے واپس کر دیا تھا، آپ نے معاہدہ پر عمل کر دیا تھا، اب تو میں خود اپنی ذاتی بنیاد پر آیا ہوں، آپ ﷺ پر ذمہ داری

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر، باب صلح الحدیبیۃ۔

نہیں، لیکن آپ ﷺ نے یہ بات قبول نہیں کی کہ اس سے غلط رائے قائم کی جائیگی، لہٰذا آپ نے ابوبصیر کو ٹھہرنے کی اجازت نہیں دی، تو ابوبصیر بجائے مکہ کے، سمندر کے ساحل پر آگئے، اسی طرح ایک دوسرے فرد ابو جندل بن سہیل بھی مسلمان ہوکر قریش کی زد سے نکلے اور بجائے مدینہ جانے کے ابوبصیر سے آملے اور اب یہ ہونے لگا کہ قریش کا جو بھی مسلمان مکہ سے جان اور ایمان بچا کر نکلتا تو وہ سیدھا ابوبصیر سے جاملتا، رفتہ رفتہ ان کی پوری جمعیت تیار ہوگئی، اور ساحلی علاقہ پر جو مکہ اور شام کے راستہ میں تھا جگہ بنالی، پھر یہ لوگ یہ کرنے لگے کہ (مکہ اور شام کے راستہ پر اپنا مستقر بنا لینے کی وجہ سے) وہاں سے قریش کا جو بھی قافلہ شام جانے والا انھیں ملتا یہ اس کا راستہ روک کر اس کے مال واسباب پر قبضہ کر لیتے اور قافلے والے مزاحمت کریں تو ان کو قتل کر ڈالتے (۱) بالآخر قریش نے اس صورت حال سے عاجز ہوکر اللہ کا واسطہ اور رشتہ داری اور قرابت کی دہائی دے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ ﷺ ان لوگوں کو اپنے پاس ضرور بلوا بھیجیں، اور معاہدہ میں یہ ترمیم کی جاتی ہے کہ اب مسلمان ہوکر جو بھی جائے اس کو آپ قبول کر سکتے ہیں، معاہدہ کی وہ شرط ختم سمجھیں، اب جو بھی مسلمان ہوکر آپ ﷺ کے پاس پہونچے گا وہ مامون ومحفوظ رہے گا (۲)۔

صلح کے فوائد اور حیرت انگیز نتائج واثرات

پھر دیگر پیش آنے والے واقعات نے بھی یہ ثابت کردیا کہ صلح حدیبیہ سے (جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے موقف سے بہت کچھ اتر کر معاہدہ فرمایا تھا اور قریش کا مطالبہ مان لیا تھا، اور انھوں نے بھی اس کو اپنی بڑی جیت اور نفع کا سودا سمجھا تھا

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۲/۲۲۳-۲۲۴، البدایۃ والنھایۃ: ۴/۱۷۶۔
(۲) صحیح بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد۔

اور مسلمانوں نے اس کو صرف اپنی ایمانی قوت اور نبی کی کامل اطاعت کے جذبہ سے اس کو برداشت کرلیا تھا) دراصل اسلام کے اقبال وظفر مندی کا ایک نیا دروازہ کھل گیا اور قریش سے اس معاہدہ کے ہوجانے کے نتیجہ میں مسلمانوں کو آزادانہ آنے جانے اور ملنے جلنے کا موقع ملنے لگا اوران کو اس طرح دعوتی کام کی بھی آسانی ہوگئی، اس کے اثر سے اسلام کو جزیرۃ العرب میں اس قدر تیزی کے ساتھ فروغ ہوا کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا، کیونکہ اب مسلمانوں کو بلاخطر دعوت حق کا کام کرنے کی آزادی حاصل ہوگئی تھی، دوسری طرف قریش دوسال ہی گزرے تھے کہ خود ہی معاہدہ کی پابندی سے عاجز ہوگئے اور کھلے طریقہ سے معاہدہ کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے، انہوں نے مسلمانوں کے حلیف قبیلۂ خزاعہ سے جنگ کرڈالی، جس کی معاہدہ میں گنجائش نہیں تھی، خزاعہ نے مسلمانوں سے قریش کے ناجنگ معاہدہ کے حوالہ سے مدد طلب کرلی اور معاہدہ کے ٹوٹ جانے کی اطلاع دی (۱) اس کی بناپر مسلمانوں نے فوج لیکر مکہ کی طرف کوچ کیا، ان کی تعداد اتنی زبردست تھی کہ مکہ والوں کی ہمت جواب دے گئی اور وہ ایسے مرعوب ہوئے کہ مکہ بلا جنگ کئے مسلمانوں کو مل گیا اور اس طرح پورے جزیرۃ العرب کے مرکز پر مسلمانوں کا اقتدار قائم ہوگیا، اس سے قبل بھی معاہدہ کی دوسالہ امن کی مدت میں مختلف علاقوں کے حکمرانوں کو بھی حضور ﷺ نے دعوت اسلام کے خطوط لکھے تھے اوران کے ذریعہ قیصر وکسریٰ، مقوقس، نجاشی اور امرائے عرب کو دعوت اسلام دی تھی جس کا اسلام کی قوت وعظمت کے قائم ہونے میں گہرا اثر پڑا، اللہ تعالیٰ نے بالکل صحیح ارشاد فرمایا ہے:

﴿وعسیٰ أن تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم، وعسیٰ أن تحبوا شیئاً وھو شر لکم واللہ یعلم وأنتم لا تعلمون﴾۔ [بقرہ: ۲۱٦]

مگر عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بری لگے اور وہ تمہارے حق میں بھلی ہو اور عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بھلی لگے اور وہ تمہارے لئے مضر ہو اور (ان باتوں کو) خدا ہی بہتر جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

---

(۱) زادالمعاد: ۳/۳۹۵-۳۹٦، تاریخ طبری: ۳/۴۳-۴۵

اس طرح اسلام کے تعارف اور اس کی مقبولیت میں بڑا اضافہ ہوا اور اسلام میں لوگ جوق در جوق داخل ہونے لگے، انہی اسباب کی بنا پر اس معاہدہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فتح ہی قرار دیا گیا، نیز اس معاہدہ کی رو سے معاہدہ کے اگلے سال ہی مسلمانوں کو بیت اللہ جانے اور عمرہ کرنے کا موقع ملا اور کفار نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور بغیر کسی کشمکش کے مسلمانوں کی عمرہ کی خواہش پوری ہوئی، دوسری طرف کفار کے سامنے مسلمانوں کی امن پسندی کا رخ واضح ہوا کہ امن کی بحالی کے لئے وہ صرف معمولی امن پسند ہی نہیں، بلکہ اس کے لئے انہوں نے اپنے جذبات اور حمیت کے تقاضوں تک کو دبایا(۱)۔

حضرت خالد بن الولید اور حضرت عمرو بن العاص کا قبول اسلام

حضرت خالد بن الولید اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما اپنی شروع زندگی ہی سے قریش کے نامی گرامی لوگوں میں تھے اور کفار ومشرکین ان کے تعاون و شرکت سے بڑی قوت محسوس کرتے تھے، صلح حدیبیہ کے وقت بھی یہ قریش کے ہی حامی تھے، حضرت خالد اپنی فوجی صلاحیت اور حضرت عمرو بن العاص سیاسی بصیرت میں ممتاز تھے، صلح حدیبیہ کے بعد یہ دونوں اسلام کی حقانیت اور خیر پسندی کے قائل ہوکر اسلام لے آئے، ان کے اسلام لے آنے سے اسلام کی جڑوں کو مضبوط کرنے میں ان دونوں کا بڑا حصہ رہا اور انہوں نے بڑے کارنامے انجام دیئے، حضرت خالد کی تلوار نے روم وشام میں زلزلہ پیدا کردیا حتی کہ جنگوں میں ان کی شرکت فتح کی ضمانت سمجھی جانے لگی، جنگوں میں انہوں نے جو کارنامے انجام دے، وہ آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیف اللہ یعنی اللہ کی تلوار کا انہیں خطاب دیا۔

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۲/ ۳۷۰

حضرت عمرو بن العاص (جن کے حصہ میں مصر کی فتح مقدر تھی) عقل وذہانت میں عرب کے چار ممتاز افراد میں سے ایک کہے جاتے تھے، انہوں نے بھی اسی زمانہ میں اسلام قبول کیا، ان دونوں کے اسلام لانے سے اسلام اور مسلمانوں کو بڑی تقویت ملی، اوران کی صلاحیتیں دین کے فروغ میں خوب کام آئیں (۱)۔

☆☆☆

(۱) سیرت ابن ہشام: ۲/ ۲۷۷-۲۷۸

حکمراں طبقہ کو دعوت اسلام

صلح ہونے کے بعد قدرتی طور پر آپس میں رابطہ اور تعلقات کی وجہ سے دعوت کے کام میں سہولت پیدا ہوئی اور اسلام کو سمجھنے کے مواقع فراہم ہوئے اور اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت اور غلبہ کے اثر سے اس کی اہمیت کا اندازہ عام ہونے اور لوگوں میں اس کو جاننے کا خیال بڑھا اور قریش سے صلح ہو جانے کی صورت میں امن کی جو فضاء قائم ہوئی اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ حق کے کام کو بڑھایا اور آپ ﷺ کو دور دور تک پیغام حق پہونچانے کی کوشش میں آسانی حاصل ہوئی اور آپ ﷺ نے کمزور طبقہ سے لے کر طاقتور طبقہ تک، عرب کے امراء وسلاطین سے لے کر عجم کے بادشاہوں اور ان کی قوموں کو بھی دعوت حق پہنچائی، جہاں خود نہیں جا سکے وہاں اپنے نمائندے بھیجے، جنہوں نے ان کے رتبہ ومنصب کا خیال کرتے ہوئے دعوت حق قبول کرنے اور اسلام کے سایہ تلے آنے کی دعوت دی، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قرب وجوار کے علاقائی حکمرانوں کو دعوت حق کے خطوط بھی لکھے، کہ وہ حق قبول کریں اور پیغام خداوندی کو مانتے ہوئے آپ ﷺ کی رہبری میں آجائیں اور دین صحیح کو نافذ کریں، اور اس طرح وہ دنیا کی کامیابی کے ساتھ آخرت کی بھی کامیابی حاصل کر سکیں۔

چنانچہ آپ ﷺ نے اواخر ۶ھ یا اوائل ۷ھ میں مختلف خطوں کے سلاطین کو جو مکتوب لکھے انہیں آپ ﷺ کے مقرر کردہ قاصد لے کر روانہ ہوئے، لوگوں نے آپ ﷺ سے کہا کہ سلاطین کو جو خطوط بھیجے جاتے ہیں، ان پر مہر بھی ہوتی ہے، لہذا

آپ ﷺ نے اپنی مہر بھی بنوائی جس میں اپنے نام مبارک کو کندہ کرایا، اس میں نام مبارک محمد نیچے، اس کے اوپر رسول اس کے اوپر اللہ کا لفظ کندہ کرایا، اور خطوط روانہ فرمائے، ایک خط شاہ حبشہ کو بھیجا جو حضرت عمرو بن امیہ الضمری لے کر گئے، ایک خط شاہ روم کو بھیجا جن کا مستقر شام تھا، یہ خط حضرت دحیہ بن خلیفۃ الکلبی لے کر گئے، تیسرا شاہ ایران کو بھیجا جس کو حضرت عبد اللہ بن حذافہ سہمی لے کر گئے، چوتھا شاہ اسکندریہ مقوقس مصر کو بھیجا جس کو حضرت حاطب ابن بلتعہ لے کر گئے، پانچواں مکتوب غسانی بادشاہ حارث بن شمر کے پاس بھیجا جس کو حضرت شجاع بن وہب الأسدی لے کر گئے، چھٹا نامۂ مبارک شاہ یمامہ کو بھیجا جسے حضرت سلیط بن عمر بن عبد شمس لے کر گئے (۱)۔

ان سلاطین وامراء میں حبشہ کے بادشاہ (نجاشی) اور قیصر روم (ہرقل) نے تو دعوت حق پر دھیان دیا اور مکتوب مبارک کی قدر کی، قاصدوں کی عزت افزائی کی، ایران کے بادشاہ کسریٰ نے نازیبا سلوک کیا اور خط چاک کر دیا اور صرف اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اپنے گورنر کو جو یمن میں تھا یہ لکھا کہ آدمی بھیج کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تادیب کرے، لیکن اس کی بدتمیزی کی سزا اللہ کی طرف سے اس کو ملی، کہ خود اس کے بیٹے نے ہی انقلاب کر کے اس کی حکومت چھین لی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر ملکی حکمرانوں کے علاوہ عرب حکمرانوں کو علیحدہ سے خطوط روانہ کئے اور ان کا فائدہ بھی ہوا، ان میں عمان کے بادشاہ کے پاس حضرت عمرو بن العاص کے ہاتھ نامۂ مبارک بھیجا، اور اس کا اچھا نتیجہ نکلا، اور انہوں نے حق کو قبول کیا، یمن کے حکمران حارث عبد کلال کو حضرت معاویہ مخزومی کے ہاتھ خط بھیجا انہوں نے فوراً تو نہیں، مگر اطاعت قبول کی، ان کے علاوہ حضرت معاذ بن جبل کو یمن بھیجا، تا کہ وہاں وہ حق کی دعوت دیں، ان کو کامیابی حاصل ہوئی، وہاں کے باشندوں

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھیں: الکامل فی التاریخ: ۲/۲۱۰

نے حق کو قبول کیا، بعد میں حضرت علی کو بھیجا گیا، ان کے ذریعہ بھی وہاں ہدایت پھیلی، ان کے علاوہ اور کئی حکمرانوں کو خطوط روانہ فرمائے، ان خطوط کے ذریعہ سے پورے جزیرۃ العرب بلکہ اس سے متصل علاقوں کے حکمرانوں کو دعوت دی، اس طریقہ سے دعوت حق پورے علاقہ میں پہونچ گئی، جس کا خاص فائدہ ہوا اور وہ دعوت دین جس کا آغاز مکہ معظّمہ کے محدود ماحول سے ہوا تھا اور مکہ والے اس کے سخت مخالف ہو گئے تھے اور دشمنی پر آمادہ تھے، وہ اس پورے خطہ میں پہونچ گئی اور ابتدائی حجت سب پر قائم ہو گئی، آپ ﷺ نے جو خطوط لکھے تاریخ میں ان میں سے متعدد خطوط محفوظ ہیں، جنہیں سیرت نگاروں نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے، نمونہ کے طور پر چند مکتوب پیش کئے جا رہے ہیں (۱)۔

شاہ حبشہ نجاشی کے نام نامۂ مبارک

"بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم من محمد رسول اللّٰہ إلی النجاشي ملك الحبشة، أسلم أنت فإني أحمد إلیك اللّٰہ الذی لا إله إلّا هو الملك القدوس السلام المؤمن المهیمن، وأشهد أن عیسیٰ بن مریم روح اللّٰہ و کلمته ألقاها إلی مریم البتول الطیبة الحصینة فحملت بعیسی فخلقه اللّٰہ من روحه و نفخه کما خلق آدم بیده وإني أدعوك وجنودك إلی اللّٰہ عزوجل و بلغت و نصحت فاقبلوا نصیحتي والسلام علی من اتبع الهدیٰ"۔ (شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بہت رحم کرنے والا اور رحیم ہے، اللہ کے پیغامبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے نجاشی بادشاہ حبشہ کی جانب۔ اسلام قبول کرو میں تمہاری طرف خدا کی حمد بھیجتا ہوں، جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ بادشاہ ہے، پاک ہے، سارے عیب سے مبرا ہے، اپنے رسولوں کی تصدیق کرنے والا ہے، اپنے بندوں کو قیامت کے میدان میں امن

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ: ۲۶۲/۴-۲۷۷۔

دینے والا ہے، ان کو مدارج علیا عنایت کرنے والا ہے، اور گواہی دیتا ہوں کہ عیسیٰ بن مریم خدا کی روح اور کلمہ ہیں، خدا نے ان کو مریم بتول پاک محصنہ پر ڈالا جس سے وہ حاملہ ہوئیں تو خدا نے حضرت عیسیٰؑ کو اپنی روح اور نفخ سے پیدا کیا جس طرح آدم کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور میں تم کو اور تمہارے جیش کو خدائے عزوجل کی طرف بلاتا ہوں، میں نے خدا کا حکم پہنچادیا اور نصیحت کردی، تم میری نصیحت قبول کرو اور سلام اس پر جو راہ راست کی پیروی کرے)(۱)۔

شاہ مصر واسکندریہ مقوقسؑ کے نام نامۂ مبارک

”بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم من محمدعبد اللّٰہ ورسوله إلى المقوقس عظیم القبط۔ سلام علی من اتبع الهدیٰ، أما بعد، فإني أدعوك بدعاية الإسلام، أسلم تسلم وأسلم یؤتك اللّٰہ أجرك مرتين، فإن توليت فعليك إثم أهل القبط، يا أهل الكتاب تعالوا إلى كلمة سواء بيننا وبينكم أن لانعبد إلا اللّٰہ ولانشرك به شيئاً ولايتخذ بعضنا بعضاً أرباباً من دون اللّٰہ فإن تولوا فقولوا اشهدوا بأنا مسلمون“۔

(بسم اللہ الرحمٰن الرحیم محمد کی جانب سے جو خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہے، مقوقس کے جانب جو قوم قبط کا بڑا ہے، سلام اس پر جو راہ راست کی پیروی کرے، اما بعد۔ میں تم کو اسلام کے کلمہ کی طرف بلاتا ہوں، اسلام قبول کرو سلامت رہوگے، اسلام قبول کرو خدا تم کو دوہرا اجر دے گا، اور اگر تم نے روگردانی کی تو سارے اہل قبط کا گناہ تم پر ہوگا اور اے اہل کتاب اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے تمہارے درمیان متفق علیہ ہے کہ خدا کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کریں، خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں، ہم میں سے کوئی کسی دوسرے کو خدا کے سوا اپنا مالک نہ بنالے، اگر تم نہیں مانتے تو گواہ رہو کہ ہم مانتے ہیں (۲)۔

---

(۱) تاریخ طبری: ۳/۶۵۲، زاد المعاد: ۳/۶۸۹۔ (۲) زاد المعاد: ۳/۶۹۱۔

کسریٰ کے نام خط

"بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم من محمد رسول اللّٰہ إلی کسریٰ عظیم فارس، سلام علی من اتبع الھدیٰ وآمن باللّٰہ ورسولہ وشھد أن لا إلہ إلا اللّٰہ وحدہ لاشریك لہ وأن محمداً عبدہ ورسولہ أدعوك بدعایة اللّٰہ فإنی أنا رسول اللّٰہ إلی الناس کافة لینذر من کان حیاً ویحق القول علی الکافرین أسلم تسلم فإن أبیت فعلیك إثم المجوس"۔

(بسم اللہ الرحمٰن الرحیم محمد رسول اللہ کی جانب سے کسریٰ کو جو قوم فارس کا بڑا ہے سلام ہو اس پر جو راہ راست کی پیروی کرے اور ایمان لائے خدا پر اور خدا کے رسول پر اور گواہی دے کہ خدا ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد خدا کے بندہ ہیں اور رسول، میں تم کو اسلام کی طرف بلاتا ہوں، میں خدا کا فرستادہ ہوں سارے انسان کی طرف تا کہ وہ ان کو خوف دلائے اور کافروں پر حجت قائم ہو جائے، اسلام قبول کرو سلامت رہو گے اور اگر تم نے انکار کیا تو ساری قوم مجوس کا وبال تم پر ہوگا)(۱)۔

قیصر روم ہرقل کو دعوت اسلام

"بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم من محمد رسول اللّٰہ إلی ھرقل عظیم الروم، سلام علی من اتبع الھدیٰ أما بعد، فإنی أدعوك بدعایة الإسلام، أسلم تسلم، یؤتك اللّٰہ أجرك مرتین، فإن تولیت فإن علیك إثم الأریسیین، ویا أھل الکتاب تعالوا إلی کلمة سواء بیننا وبینکم ألا نعبد إلا اللّٰہ ولانشرك بہ شیئاً، ولایتخذ بعضنا بعضاً أرباباً من دون اللّٰہ فإن تولوا فقولوا اشھدوا بأنا مسلمون"۔

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب کتاب النبی ﷺ إلی کسری وقیصر، زاد المعاد: ۳/ ۶۸۸۔

(بسم اللہ الرحمٰن الرحیم محمد رسول اللہ کی طرف سے ہرقل کی جانب جوروم کا عظیم ہے، سلام ہو اس پہ جو راہ راست کی پیروی کرے، امابعد، میں تم کو اسلام کے کلمہ کی دعوت دیتا ہوں مسلمان ہو جاؤ سلامت رہو گے اور خدا تم کو دوہرا اجر دے گا، لیکن اگر تم نے روگردانی کی تو تمام اریسیین کا گناہ تم پر ہوگا، اور اے اہل کتاب تم ایک ایسی بات کو قبول کرلو جو ہم میں اور تم میں یکساں ہے، وہ یہ کہ ہم خدا کے سوا کسی کو نہ پوجیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کو چھوڑ کر خدا نہ بنائے، اور اگر تم نہیں مانتے تو گواہ رہو کہ ہم مانتے ہیں)(۱)۔

ہرقل کی تحقیقات

حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ ان سے ابوسفیان نے بیان کیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط شام میں گیا تھا تو ہم وہیں تھے، دحیہ کلبی وہ خط لائے تھے، انہوں نے بصریٰ کے امیر کو دیا تھا اور امیر بصری نے ہرقل کو دیا، ہرقل نے پوچھا کہ جو شخص نبوت کا دعویٰ کرتا ہے کیا اس کی قوم کا کوئی آدمی یہاں ہے، لوگوں نے کہا کہ ہاں، اس لیے وہ لوگ مجھ کو اور میرے چند ساتھیوں کو ہرقل کے پاس لے گئے، ہرقل نے پوچھا کہ ان کا سب سے قریبی رشتہ دار کون ہے، ابوسفیان نے کہا کہ میں ہوں، اس لیے ابوسفیان کو ہرقل کے سامنے بٹھایا اور اس کے ساتھیوں کو اس کے پیچھے، پھر ہرقل نے ترجمان کے ذریعے کہا کہ مدعی نبوت کے بارہ میں ہم کچھ ان سے پوچھنا چاہتے ہیں، اگر ہم سے یہ کوئی بات غلط کہیں تو تم لوگ اسکو ظاہر کر دینا، ابوسفیان کا بیان ہے کہ اگر ہم کو ہمارا جھوٹ بولنا ظاہر ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ضرور اس روز ہم بہت سی بات لگا کر کہتے۔

ابوسفیان اور ہرقل کا مکالمہ

ہرقل: ان کا نسب کیا ہے؟

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب دعاء النبی ﷺ الی الاسلام والنبوۃ، زاد المعاد: ۳/ ۶۸۸۔

ابوسفیان: وہ ہم میں عالی نسب سمجھے جاتے ہیں۔

ہرقل: کیا جو بات وہ کہتے ہیں ان سے پہلے بھی کسی نے کہی ہے؟

ابوسفیان: نہیں۔

ہرقل: اس خاندان میں کوئی بادشاہ گذرا ہے؟

ابوسفیان: نہیں۔

ہرقل: کیا صاحب اثر لوگوں نے ان کا اتباع کیا ہے یا کمزوروں نے؟

ابوسفیان: کمزور لوگوں نے۔

ہرقل: ان کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں؟

ابوسفیان: بڑھتے جاتے ہیں۔

ہرقل: کیا کوئی ان کے دین میں داخل ہونے کے بعد دین کو ناپسند کر کے پھر بھی جاتا ہے؟

ابوسفیان: نہیں۔

ہرقل: کیا ان کے اس دعوے سے پہلے بھی تم نے کبھی ان پر جھوٹ کا تجربہ کیا ہے؟

ابوسفیان: نہیں۔

ہرقل: کیا وہ عہد و قرار کی خلاف ورزی بھی کرتے ہیں؟

ابوسفیان: ابھی تک تو نہیں کی، لیکن اب جو نیا معاہدہ صلح ہے اس میں دیکھیں وہ عہد پر قائم رہتے ہیں یا نہیں؟

ہرقل: تم لوگوں نے کبھی ان سے جنگ کی؟

ابوسفیان: ہاں۔

ہرقل: نتیجۂ جنگ کیا رہا؟

ابوسفیان: جنگ کا پانسہ ہمارے اور ان کے درمیان پلٹتا رہتا ہے، کبھی ہم

غالب آتے ہیں کبھی وہ۔

ہرقل: وہ کیا تعلیم دیتے ہیں؟

ابوسفیان: وہ کہتے ہیں کہ ایک خدا کی عبادت کرو، کسی اور کو خدا کا شریک نہ بناؤ، نماز پڑھو، پاکدامنی اختیار کرو، سچ بولو، صلہ رحمی کرو۔

ہرقل نے مترجم سے کہا کہ ان سے کہو کہ ہم نے تم سے ان کے نسب کے بابت دریافت کیا، تو تم نے بتایا کہ وہ تم میں شریف النسب ہیں، پیغمبر ہمیشہ اچھے ہی خاندانوں میں پیدا ہوتے ہیں، میں نے تم سے دریافت کیا کہ کیا اس خاندان میں کسی اور نے بھی نبوت کا دعوی کیا تھا، تو تم نے کہا کہ نہیں، اگر ان سے پہلے کسی نے یہ دعوی کیا ہوتا تو میں کہتا کہ وہ اسی کی نقل کررہے ہیں، میں نے تم سے پوچھا کہ کیا ان کے خاندان میں کوئی بادشاہ گذرا ہے تم نے کہا نہیں، اگر کوئی بادشاہ گذرا ہوتا تو میں کہتا کہ اپنے خاندان کی بادشاہت کے طالب ہیں، میں نے دریافت کیا کہ کیا تم ان کو اس دعوی سے پہلے بھی کبھی جھوٹا کہتے تھے، تم نے کہا نہیں، میں جانتا ہوں کہ یہ ناممکن تھا کہ وہ لوگوں سے تو جھوٹ نہ بولیں اور اللہ پر جھوٹ باندھیں، میں نے تم سے دریافت کیا کہ شرفاء اور بااثر لوگ ان کے متبع ہیں یا غریب اور کمزور، تم نے کہا کمزوروں نے ہی ان کی پیروی کی ہے، پیغمبروں کے ابتدائی پیرو ہمیشہ غریب ہی لوگ ہوتے ہیں، میں نے تم سے دریافت کیا کہ ان کے پیرو بڑھتے جاتے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں، تم نے کہا کہ بڑھتے جاتے ہیں، ایمان کا یہی معاملہ ہے کہ بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کمال کو پہونچ جائے، میں نے تم سے پوچھا کہ کوئی ان کے دین سے ناراض ہوکر مرتد بھی ہوجاتا ہے، تم نے کہا نہیں، ایمان کا حال یہی ہوتا ہے، جب دلوں کو اس کی چاشنی حاصل ہوجاتی ہے تو وہ نکلتا نہیں ہے، میں نے تم سے پوچھا کہ کیا وہ عہد و پیمان کی خلاف ورزی بھی کرتے ہیں، تم نے کہا نہیں، پیغمبر اسی طرح خلاف ورزی

نہیں کرتے، اور میں نے تم سے دریافت کیا کہ وہ کیا سکھاتے ہیں، تم نے بتایا کہ وہ تم کو یہ سکھاتے ہیں کہ تم اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو، اور تم کو بتوں کی پوجا سے روکتے ہیں، نماز، سچائی، پاکدامنی کی تعلیم دیتے ہیں، اگر تمہارا کہنا سچ ہے تو عنقریب اس وقت جہاں میرے قدم ہیں وہاں تک ان کا قبضہ ہو جائیگا، مجھ کو یہ ضرور خیال تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے، لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا اگر میں وہاں جا سکتا تو ضرور ان کی ملاقات کے لئے جاتا، اور اگر میں ان کے پاس ہوتا تو ان کے پاؤں دھوتا۔

ہرقل نے ارکان سلطنت اور اعیان قوم کو محل میں طلب کیا اور دروازے بند کرادئے، پھر حاضرین کی جانب متوجہ ہو کر اس نے کہا: اے اہل روم! کیا تم خیر و فلاح چاہتے ہو؟ اور چاہتے ہو کہ تمہارا ملک باقی رہے؟ اگر ایسا ہے تو تم اس نبی کے ہاتھ پر ایمان لے آؤ، حاضرین تیزی سے دروازوں کی طرف بھاگے، تو ان کو بند پایا، جب ہرقل نے ان کی برہمی دیکھی اور ان کے ایمان لانے سے مایوس ہو گیا تو اس نے حکم دیا کہ ان کو واپس لاؤ، اور کہا کہ میں نے ابھی جو بات کہی تھی وہ اس لئے کہی کہ اپنے دین پر تمہاری مضبوطی کا امتحان لوں، میں نے یہ دیکھ لیا، تو سب نے اس کے سامنے پیشانی ٹیک دی، اور اس سے خوش ہو گئے (۱)۔

لیکن مسند امام احمد بن حنبل میں ہے کہ ہرقل نے حضور ﷺ کو خط لکھا کہ میں مسلمان ہوں، تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ غلط کہتے ہیں، وہ تو اپنی نصرانیت پر قائم ہیں، اس کے علاوہ غزوۂ موتہ میں خود ہرقل نے مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔ (۲)۔

---

(۱) بحوالہ صحیح بخاری، کیف کان بدء الوحی۔ وصحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر، باب کتاب النبی ﷺ إلی هرقل، السیرۃ النبویۃ للإمام الذھبی: ۲/۵۰۲-۵۰۵۔

(۲) اصح السیر، ص ۳۸۹-۳۹۱، ونبی رحمت، از سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، ص: ۴۰۲-۴۰۵، طبع چہارم ۱۹۹۷ء

خیبر کا واقعہ

محرم ۷ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کا رخ کیا، اس کا مقصد صرف یہودیوں کی اس قوت پر بند لگانا تھا جو مدینہ سے نکل نکل کر خیبر میں جمع ہوگئی تھی، اس کے علاوہ حجاز ونجد کے درمیان شمال اور جزیرۃ العرب کے وسط میں رہنے والے ایک بڑے طاقتور قبیلہ غطفان کی طرف سے بھی اطمینان حاصل کر لینا تھا جو عربی قبائل کا ایک نہایت جنگجو اور طاقتور مجموعہ تھا، اس کی طرف سے اطمینان کئے بغیر مکہ کے دشمنوں کے خطرات پر پورا قابو پانا دشوار تھا، خیبر یہود کا جنگی مستقر بن رہا تھا اور اب جزیرۃ العرب میں ان کا یہ آخری قلعہ بن گیا تھا، اس میں مدینہ سے نکل کر یہودی رہنما اسلام دشمن لوگوں کو مشوروں اور تعاون سے فائدہ پہونچانے کے لئے برابر کوشاں رہتے تھے اور یہاں قائم کردہ اپنے مرکز سے برابر سازشوں میں مصروف تھے اور ان کے ساتھ غطفان قبیلہ کے لوگ بھی مدینہ پر حملہ کی سازش کر رہے تھے، اور یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سخت کینہ رکھتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر پہونچ کر ایک ایک قلعہ کو زیر کیا، آخری قلعہ جس کو زیر کرنا آسان نہ تھا اس کے لیے آپ ﷺ نے حضرت علی بن ابی طالب کا انتخاب کیا اور ان کی قیادت میں مسلمانوں نے اس قلعہ کو فتح کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پرچم دینے سے پہلے یہ وصیت کی تھی کہ ان کے سامنے پڑاؤ ڈالنا، پھر ان کو اسلام کی دعوت دینا اور اللہ تعالیٰ کا اس سلسلہ میں ان پر جو حق ہے اس سے ان کو آگاہ کرنا، خدا کی قسم اگر تمہارے ذریعہ اللہ تعالیٰ ایک آدمی کو بھی ہدایت دے دے، تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ بہتر ہے۔

بالآخر یکے بعد دیگرے قلعہ پر قلعہ فتح ہوتا گیا، اور کئی کئی دن ٹکراؤ اور محاصرے میں گذرے، یہاں تک کہ اس صورت حال سے عاجز ہوکر یہودیوں نے

آپ ﷺ کے سامنے صلح کی پیش کش کی، آپ ﷺ نے یہودیوں کو خیبر میں قیام کی اجازت دیدی، اس شرط پر کہ وہاں کی پیداوار غلہ اور پھلوں کا آدھا حصہ مسلمانوں کا ہو گا اور رسول اللہ ﷺ جب تک چاہیں گے یہ معاہدہ برقرار رکھیں گے۔

رسول اللہ ﷺ پیداوار کی تقسیم کے لئے ان کے پاس عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا کرتے تھے، وہ وہاں کی پیداوار کی مقدار کا اندازہ کر کے اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتے، پھر ان سے کہتے کہ ان میں سے جو حصہ چاہیں لے لیں، وہ لوگ یہ دیکھ کر کہتے کہ اسی ادا (انصاف) پر آسمان اور زمین تھمے ہوئے ہیں۔

اسی موقع کے دوران آپ ﷺ کو زہر دیا گیا، ہوا یہ کہ سلام بن مشکم یہودی کی بیوی زینب بنت حارث نے آپ ﷺ کو زہر ملا کر ایک بھنی ہوئی بکری کا تحفہ بھیجا، اس میں زہر ملا ہوا تھا، آپ نے چکھتے ہی معلوم کر لیا اور پھر نہیں کھایا مگر اس کا کچھ اثر آپ پر ایسا پڑا کہ کچھ مدت بعد اس کا اثر ظاہر ہوا (۱)۔

جب رسول اللہ ﷺ فتح خیبر سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے فدک کی طرف توجہ فرمائی، وہاں بھی یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ سے نصف نصف پر مصالحت کرنی چاہی آپ ﷺ نے ان کی پیش کش قبول کر لی، اس سے جو حاصل ہوتا تھا آپ ﷺ اس کو اپنے اور مسلمانوں کے مفاد میں جہاں مناسب سمجھتے تقسیم فرما دیتے، اس لئے کہ بلا مقابلہ اور ٹکراؤ کے صرف رسول اللہ ﷺ سے بات کر لینے پر جو مال غنیمت حاصل ہوتا اس کے لئے اسلام کا حکم یہ تھا کہ اس پر رسول اللہ ﷺ کا ہی مالکانہ اختیار ہوگا۔

اس کے بعد آپ ﷺ وادی القری تشریف لے گئے، یہ خیبر اور تیماء کے

---

(۱) غزوۂ خیبر کی تفصیل کے لئے دیکھیں: صحیح بخاری: باب غزوۃ الخیبر، وباب الشاۃ التی سمت للنبی ﷺ، وصحیح مسلم: باب غزوۃ الخیبر، کتاب الجہاد والسیر، سنن ابی داود: باب المساقاۃ، سیرت ابن کثیر، جلد دوم وسوم، سیرت ابن ہشام: جلد دوم، زاد المعاد: جلد سوم، فتوح البلدان از بلاذری۔

درمیان ایک نو آبادی تھی، لڑنا مقصود نہ تھا، آپ ﷺ نے ان کو دعوت اسلام دی، اور ان سے ارشاد فرمایا کہ اگر وہ اسلام قبول کرلیں گے تو ان کا مال و جان سب محفوظ رہے گا، اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہوگا، مگر یہود پہلے سے لڑنے کے لئے تیار تھے، انہوں نے فوراً تیراندازی شروع کردی، اور جنگ شروع ہوگئی، لیکن تھوڑے مقابلہ کے بعد یہود نے سپر ڈال دی، اور خیبر کے شرائط کے مطابق صلح ہوگئی۔

جب تیماء کے یہودیوں کو معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل خیبر، اہل فدک اور وادی القری سے یہ معاملہ فرمایا ہے، تو انہوں نے آپ ﷺ سے مصالحت کرلی، اور ان کا مال و جائداد انہی کے قبضہ میں رہی، اور رسول اللہ ﷺ مدینہ واپس تشریف لے آئے (۱)۔

حضرت صفیہ سے نکاح

فتح خیبر کے بعد شکست خوردہ یہودیوں کی دلداری بھی حضور ﷺ نے کی، جس طرح بنوقینقاع کی کی تھی، کہ یہودی قائد کی صاحبزادی حضرت صفیہ کو باندی سے آزاد فرمایا، پھر اپنی زوجیت میں لے لیا جس کا خاطر خواہ اثر پڑا (۲)۔

عمرۃ القضاء

صلح حدیبیہ میں قریش سے معاہدہ ہوا تھا کہ اگلے سال رسول اللہ ﷺ مکہ میں آکر عمرہ ادا کریں گے، چنانچہ دوسرے سال ۷ھ میں رسول اللہ ﷺ اور مسلمان عمرۃ القضاء کی نیت سے تشریف لے چلے، قریش نے کوئی مزاحمت نہیں کی، آپ کو مکہ جانے دیا، اور اپنے گھروں میں تالے ڈال کر جبل قعیقعان پر چلے گئے، آپ ﷺ نے تین روز وہاں قیام فرمایا، اور عمرہ سے فراغت کی (۳)۔

---

(۱) زاد المعاد: ۳/ ۳۵۵۔ (۲) سیرت ابن ہشام: ۲/ ۳۳۶، زاد المعاد: ۳/ ۳۳۹۔
(۳) صحیح بخاری: باب عمرۃ القضاء، سیرت ابن ہشام: ۲/ ۳۷۰، الکامل فی التاریخ: ۲/ ۲۲۷۔

اسی موقع پر حضور ﷺ نے قریش کی بنو علال شاخ کی خاتون میمونہ بنت حارث سے بھی نکاح کیا اور ولیمہ کیا۔

غزوۂ موتہ ۸ھ

محمد رسول اللہ ﷺ نے حارث بن عمیر اُزدی کو اپنے دعوتی مکتوب کے ساتھ بصری کے حاکم شرحبیل بن عمرو غسانی کے پاس بھیجا تھا جو رومی سلطنت کے تابع تھا، شرحبیل نے حکم دیا کہ ان کو باندھ دیا جائے، اس کے بعد ان کو سامنے بلا کر شہید کر دیا، جب رسول اللہ ﷺ کو یہ خبر پہونچی تو آپ ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ کی قیادت میں تین ہزار مجاہدوں پر مشتمل ایک فوج جمادی الأولی ۸ھ کو بُصریٰ کی طرف روانہ کی، اور آپ ﷺ نے ہدایت دی کہ اگر زید بن حارثہ راہ حق میں جہاد کرتے ہوئے شہید ہو جائیں تو جعفر طیار اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبد اللہ بن رواحہ سپہ سالار ہونگے، اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ پہلے ان کو دعوت اسلام دی جائے، اگر وہ اسلام قبول کرلیں تو جنگ کی ضرورت نہیں، یہ پہلا اسلامی لشکر تھا جو رومی قلمرو میں داخل ہوا۔

جب اسلامی لشکر مقام ''معان'' پر پہونچا تو مسلمانوں کو اطلاع ملی کہ ہرقل ''بلقاء'' کے قریب ایک لاکھ رومی لشکر کے ساتھ خیمہ زن ہے، حضرت زید نے یہ حالات سن کر چاہا کہ اس صورت حال سے دربار رسالت کو اطلاع دی جائے اور حکم کا انتظار کیا جائے، لیکن حضرت عبد اللہ بن رواحہ نے کہا کہ ہمارا اصل مقصد فتح نہیں، بلکہ دولت شہادت ہے، جو ہر وقت حاصل ہو سکتی ہے، چنانچہ یہ سن کر مسلمانوں کا یہ مختصر گروہ آگے بڑھا اور مقام موتہ میں مورچہ سنبھال لیا اور جنگ کا آغاز ہو گیا، حضرت زید برچھیاں کھا کر شہید ہوئے، ان کے بعد حضرت جعفر نے علم ہاتھ میں لیا، لیکن کافی دیر نہایت بے جگری اور جوانمردی سے دشمن کا مقابلہ کرنے کے بعد تلواروں کے زخموں سے چور ہو کر گر پڑے اور شہید ہو گئے، حضرت جعفر کی شہادت کے بعد عبد اللہ بن رواحہ

نے پرچم ہاتھ میں لیا، اور وہ دادِ شجاعت دیکر شہید ہوئے، اب حضرت خالد مسلمانوں کے مشورے سے لشکر کے سردار بنے، حضرت خالد اپنی فوجی اور جنگی فہم وبصیرت کی بنیاد پر اسلامی لشکر کو شکست سے بچا کر بسلامت مدینہ لے آئے (۱)۔

قریش کی طرف سے معاہدہ صلح کی خلاف ورزی

اور حضور ﷺ کا مظلوموں کی مدد کرنے کا فیصلہ

صلح حدیبیہ کے نتیجہ میں مسلمانوں اور ان کے اصل حریف قریش اور قریش کے ساتھ دینے والے دشمنان اسلام کے درمیان امن کی فضاء قائم ہوگئی تھی اس سے ایک دوسرے سے ملنے جلنے اور دیکھنے سے ربط پیدا ہوا تھا، اسلام کے مخالفوں کو اسلام اور مسلمانوں کو قریب سے دیکھنے اور اچھا محسوس کرنے پر اسلام کو قبول کرنے کا بھرپور موقع ملا، لیکن قریش اس معاہدہ کے شرائط پر زیادہ عمل نہ کر سکے، دو سال ہی گذرے تھے کہ قریش نے معاہدہ کی کھل کر خلاف ورزی کی اور وہ اس طرح ہوا کہ ان کے ساتھ شریک ہونے والا قبیلہ بنو بکر مسلمانوں کے ساتھ شریک ہونے والے قبیلہ بنوخزاعہ پر بلاوجہ حملہ آور ہوا اور قریش نے کھل کر اس کا ساتھ دیا اور اس کا خیال نہیں کیا کہ معاہدہ صلح کی یہ کھلی خلاف ورزی ہے، ان کو اس کے لیے ہتھیار دیئے اور ان کے ساتھ شریک ہو کر خزاعہ والوں سے جنگ کی جن سے مسلمانوں کا معاہدہ تھا اور مزید غلط کام یہ کیا کہ جنگ کی یہ کارروائی حرم کے اندر جا کر کی، جہاں جنگ کرنا سب کے نزدیک ناجائز کام تھا، خزاعہ والوں کو اس حملہ سے بڑا نقصان پہونچا، ان کے ساتھ ظلم ہوا، وہ مسلمانوں کے حلیف تھے، ان پر حملہ کی صورت میں مسلمانوں کی طرف سے مدد ملنے کا حق حاصل تھا۔

---

(۱) غزوۂ موتہ کی تفصیل کے لیے دیکھیں۔ صحیح بخاری، باب غزوۃ الموتہ، زاد المعاد: ۳/۳۸۱-۳۸۵، "سیرت ابن ہشام: ۲/۳۷۳-۳۸۳، البدایۃ والنھایۃ: ۴/۲۴۱-۲۵۹، الکامل فی التاریخ: ۲/۲۳۴-۲۳۸۔

چنانچہ ان کے نمائندے عمرو بن سالم مدینہ پہونچے، اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف رکھتے تھے، اور آپ ﷺ کے کچھ اصحاب بھی موجود تھے، عمرو بن سالم نے اپنے قبیلہ کی مصیبت کا تذکرہ بہت مؤثر انداز میں کیا، اور یہ کہا کہ قریش نے آپ سے اور آپ کے حلیف قبیلہ سے جنگ نہ کرنے کا جو معاہدہ کیا تھا اس کو توڑ دیا اور حرم کے اندر ہم پر حملہ آور ہو گئے اور ہمیں حرم کے اندر اور عبادت کی حالت تک میں مارا، آپ کی دہائی ہے (۱)، عمرو بن سالم کے پہونچنے کے بعد بنی خزاعہ کے نمائندے بدیل بن ورقاء الخزاعی بھی کئی افراد کے ساتھ پہونچے اور انہوں نے اور تفصیل سے واقعہ بیان کیا، کہ کس کس طرح ان کے لوگ مارے گئے، اور اس جارحانہ حرکت میں قریش نے بھرپور مدد کی اور جنگ میں شرکت کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعہ کو ہمدردی سے سنا اور مدد کے ان کے حق کو محسوس کیا اور حلیف ہونے کے تعلق سے مدد کرنے کا اشارہ دیا اور واقعہ معلوم ہونے پر اپنا یہ اندازہ بھی ظاہر کیا کہ ان کے مدینہ آکر مدد چاہنے کا علم قریش کو ہونے پر ان کے لیڈر ابوسفیان ان لوگوں کے آنے کے نتیجہ کو محسوس کرتے ہوئے معاہدہ کو بحال کرنے کے لیے آنا چاہیں گے اور قریش ان کو واقعہ کا ردعمل روکنے کی کوشش میں بھیجیں گے (۲)۔

قریش کے لیڈر ابوسفیان کی مصالحت کی کوشش

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ابوسفیان بن حرب بن ربیعہ پہونچے، ان کی ایک صاحبزادی حضرت ام حبیبہ آنحضور ﷺ کی اہلیہ بھی تھیں، اس طرح وہ ام المومنین تھیں اور حضور ﷺ کے ہی گھر میں تھیں، ابوسفیان پہلے ان کے پاس پہونچے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر بیٹھنے لگے، اس پر ان کی صاحبزادی ام المومنین ام حبیبہ نے فوراً بستر کو پلٹ دیا، اس پر وہ تعجب سے بولے کہ بیٹی! یہ نہیں سمجھ پایا کہ تم نے اس

(۱) سیرت ابن ہشام: ۲/۳۹۴-۳۹۶۔ (۲) زاد المعاد: ۳/۳۹۶

بستر کو میرے لیے مناسب نہیں سمجھا، یا یہ کہ تم نے مجھ کو اس بستر کے لائق نہیں سمجھا، انہوں نے جواب دیا کہ یہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر ہے اور آپ شرک کرنے والے ہیں، لہذا شرک میں گندگی ہے، انہوں نے کہا کہ بخدا!! تم میں مجھ سے رخصت ہونے کے بعد خرابی آگئی اور وہ وہاں سے نکل کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہونچے اور صلح بحال کرنے کے سلسلہ میں بات کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے، کہ وہ حضور ﷺ کے سب سے زیادہ قربت رکھنے والے فرد ہیں، ان سے بات کی، کہ معاہدہ کو حسب سابق قائم رکھنے کی سفارش کر دیں کہ اس کو ختم نہ قرار دیا جائے، انہوں نے کہا میں کچھ نہیں کر سکتا پھر وہ مایوس ہو کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، ان کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قربت کا مقام حاصل تھا، لیکن انہوں نے جواب میں (سخت لہجہ اختیار کرتے ہوئے) کہا کہ بھلا میں تم لوگوں کی سفارش کروں گا؟، بخدا میں تو ایسا ہوں کہ مجھ کو کوئی ساتھی نہ ملے سوائے چیونٹیوں کے تو میں چیونٹیوں کو بھی لے کر تم سے مقابلہ کروں (۱)۔

پھر ابوسفیان حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، وہیں ان کی اہلیہ صاحبہ حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہ بھی بیٹھی ہوئی تھیں اور ان کے صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ بھی تھے، جو سامنے کھیل رہے تھے، انہوں نے کہا کہ بھائی علی! خاندانی طور پر تم سے ہماری قرابت بھی ہے، اور میں ایک ضرورت سے آیا ہوں دیکھو! ناکام واپس نہ جاؤں، میرے لیے سفارش کر دو، محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے، انہوں نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بھی عزم کر لیا ہو گا اس میں ہم ان سے بات نہیں کر سکتے، اس پر ابوسفیان نے حضرت فاطمہؓ سے کہا کہ کیا

---

(۱) زاد المعاد: ۳/ ۳۹۷

تم اپنے اس چھوٹے بچہ سے کہہ سکتی ہو کہ وہ ہم لوگوں کے درمیان تعلقات بحال کرادے، اس طرح وہ ہمیشہ کے لیے عربوں کا سردار قرار پاجائے گا، انہوں نے کہا: میرے بیٹے کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ سے ایسے کسی معاملہ میں کوئی سفارش کرے، اس پر ابوسفیان نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اے بھائی علی! معاملات کو میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے لیے دشوار بن گئے ہیں، تم مجھ کو ہمدردی کا مشورہ دو، انہوں نے کہا کہ بخدا میرے ذہن میں کوئی ایسی صورت نہیں جس سے تمہارا کام چل سکے، لیکن تم قریش و کنانہ کے سردار ہو، اپنی بات کا لوگوں میں اعلان کردو اور وطن لوٹ جاؤ، انہوں نے کہا کہ کیا اس سے کام چل جائے گا؟ انہوں نے کہا کہ مجھے امید تو نہیں ہے، لیکن تمہارے لیے اس کے علاوہ اور کیا بات کہہ سکتا ہوں (۱)۔

ابوسفیان کا اعلان

ابوسفیان مسجد میں آئے اور اعلان کیا کہ اے لوگو! حدیبیہ میں ہونے والے معاہدہ سے جو تعلقات قائم ہوئے تھے میں ان کو بحال کیے دیتا ہوں، اور اپنے اونٹ پر بیٹھ کر مکہ واپس چلے گئے، جب وہ قریش کے پاس پہونچے تو انہوں نے پوچھا: کیا کرکے آئے ہو؟، انہوں نے کہا کہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس گیا تھا، انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا، پھر میں ابوبکر کے پاس گیا، ان سے بھی مجھے کوئی بھلائی نہ ملی، پھر میں عمر کے پاس گیا، تو ان کو بڑا دشمن پایا، پھر علی کے پاس گیا، دیگر لوگوں کے مقابلہ میں ان میں نرمی پائی، انہوں نے مجھے یہ مشورہ دیا، چنانچہ میں نے اس پر عمل کیا، لوگوں نے کہا کہ کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کو قابل عمل قرار دیا؟، انہوں نے کہا: نہیں، لوگوں نے کہا: تمہاری خرابی ہو، بخدا علی نے تمہارے ساتھ کھیل کیا (۲)۔

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۲/ ۳۹۶-۳۹۷۔ (۲) سیرت ابن ہشام: ۲/ ۳۹۷، الکامل فی التاریخ: ۲/ ۲۴۱

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمت عملی

ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر کی تیاری کا حکم فرما دیا، لیکن یہ بھی فرمایا کہ اخفاء رکھا جائے، قریش کو ہماری اس تیاری کی خبر نہ پہونچے، تا کہ ہم بلا اطلاع وہاں پہونچ سکیں، چنانچہ مسلمانوں نے اس کا پورا اخفاء رکھا، البتہ ایک مسلمان حاطب بن ابی بلتعہ نے قریش کو ایک خط کے ذریعہ خطرہ سے آگاہ کرنے کی کوشش کی، اور ایک مسافر عورت کے ذریعہ خط بھیجا، حضور ﷺ کو وحی کے ذریعہ معلوم ہو گیا، آپ نے حضرت علی، حضرت زبیر، حضرت مقداد اور حضرت ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہم کو اس عورت کے تعاقب کے لئے بھیجا، کہ خط اس سے لے لیا جائے، چنانچہ حضرت علی اپنے ساتھیوں کے ساتھ فوراً روانہ ہو گئے اور کچھ فاصلہ پر اس عورت تک پہونچ گئے، اور خط طلب کیا، اس نے لاعلمی کا اظہار کیا، حضرت علی نے کہا کہ اللہ کے رسول کی بات غلط نہیں ہو سکتی، خط حوالہ کرو، ورنہ تمہارے جسم کی تلاشی لی جائے گی، چنانچہ اس نے اپنے سر کے بالوں کے جوڑے سے خط نکال کر دیا، خط حضور ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا، خط بھیجنے والے صحابی حاطب بن ابی بلتعہ کو طلب کیا گیا، اور ان سے جواب طلب کیا گیا، کہ یہ اسلام دشمنی کیوں؟ انہوں نے اپنی صفائی دی، کہ میں نے بدنیتی سے نہیں کیا، اس میں ایک ذاتی ضرورت تھی، لوگوں نے عرض کیا کہ یہ اسلام دشمنی کا کام ہے، ان کو قتل کر دیا جائے، حضور ﷺ نے فرمایا: یہ بدر کے جہاد میں شریک تھے اور بدر میں شریک شخص کی بات دوسروں سے مختلف ہے، اس لئے ان کو چھوڑ دیا، اور اس طرح یہ اخفاء قائم رہا(۱)۔

ایسے سنگین جرم پر چھوڑ دینے میں ایک طرف تو آپ کی رعایت اور حسن اخلاق

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب فضل من شهد بدراً، سیرت ابن ہشام: ۲/ ۳۹۸، البدایۃ والنھایۃ: ۴/ ۲۸۴، زاد المعاد: ۳/ ۳۹۹، زرقانی علی المواہب: ۱/ ۱۴۹۔

تھا کہ حتی الوسع ذرا بھی گنجائش ہو تو رعایت فرماتے تھے، دوسری طرف ایک اچھی حکمت عملی تھی، خطا کار کے مسلمان ہونے اور عذر بیان کرنے پر رعایت کر دینے سے اس شخص کا دل جیت لیتے تھے جس سے دشمنوں کو اسلام کی رواداری کا اچھا پیغام جاتا تھا۔

مکہ مکرمہ روانگی

بہر حال مخفی طریقہ سے مسلمانوں نے تیاری کی اور تیاری ہو جانے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں کو لے کر مکہ مکرمہ کے لیے روانہ ہوئے اور اللہ تعالی نے یہ مدد فرمائی کہ قریش کو آپ کی روانگی کی اطلاع نہیں ملی، لیکن وہ ڈر رہے تھے اور ابو سفیان معلومات حاصل کرنے کی فکر میں رہتے تھے، ان کے ساتھ حکیم بن حزام، بدیل بن ورقاء بھی معلومات کے چکر میں رہ رہے تھے (۱) اس واقعہ سے قبل ہی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت عباس بن عبد المطلب جو اب تک مکہ میں تھے اور ظاہر میں قریش کے ساتھ تھے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا تعلق رکھتے تھے گویا اندر سے مسلمان تھے، مکہ سے سفر کر کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پہونچے اور باقاعدہ مسلمان ہو گئے (۲) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت مقام جُحفہ تک جو رابغ کے پاس ہے پہونچ گئے تھے، حضرت عباس وہاں ان سے ملے اور ساتھ ہو گئے، قریش کو اس وقت تک اس کی خبر نہ تھی، پھر مسلمانوں کا لشکر جب مکہ سے دس پندرہ کیلومیٹر کے فاصلہ پر عشاء کے وقت مقام مرّ الظہر ان پہونچا، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ لشکر میں ہر طرف روشنی کرنے کے لیے آگ جلائی جائے (۳) مقصد یہ تھا کہ اب دشمن کے قریب پہونچ چکے ہیں، دشمن مسلمانوں کی کثرت اور طاقت کو محسوس کر کے مقابلہ سے خود ہی باز آ جائے، چنانچہ لشکر میں ہر طرف آگ جلائی گئی، اس طرح تقریباً دس ہزار جگہوں پر آگ نظر آنے لگی، اسی کے

(۱) سیرت ابن ہشام: ۲/۴۰۰۔ (۲) زاد المعاد: ۳/۴۰۰۔ (۳) زاد المعاد: ۳/۴۰۰

ساتھ حضرت عباس رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خچر پر بیٹھ کر نکلے کہ کوئی چرواہا یا کوئی آدمی مل جائے تو اس کو بھیج کر اب قریش کو باخبر کردیا جائے کہ مسلمانوں کا لشکر عظیم آرہا ہے اور صورت حال کو سمجھ لیں اور آکر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت قبول کرلیں، قبل اس کے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی طاقت کے ساتھ مکہ میں داخل ہوں، اس طرح وہ تباہی سے بچ جائیں گے(۱)۔

قریش کے قائد جنگ ابوسفیان کا اسلام لانا

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں اسی فکر میں جارہا تھا کہ مجھے ابوسفیان اور بُدیل کی آواز سننے کو ملی، انہوں نے دور سے آگ دیکھ لی تھی، اور آپس میں کہہ رہے تھے کہ اتنی زیادہ آگ پھیلی ہوئی میں نے آج تک نہیں دیکھی تھی، اور اتنا بڑا لشکر نہیں دیکھا تھا، بُدیل کہنے لگے، یہ قبیلہ خزاعہ معلوم ہوتا ہے، جس سے ہماری لڑائی ہوئی ہے، ابوسفیان نے کہا کہ خُزاعہ کا قبیلہ اتنا بڑا نہیں ہے کہ اس کی آگ اتنی پھیلی ہوئی ہوسکتی ہو، اس پر میں نے ابوسفیان کو پکارا، انہوں نے میری آواز پہچان لی، اور کہا کہ تم ابوالفضل ہو یعنی عباس، میں نے کہا: ہاں! انہوں نے کہا کہ اللہ تم کو سلامت رکھے تم یہاں کیسے؟ میں نے کہا کہ اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لوگوں کے ساتھ آگئے ہیں، اور قریش کو بخدا اب بہت بڑی مصیبت کا سامنا ہے، اس پر ابوسفیان نے کہا کہ تو اب کیا تدبیر کی جائے، میں نے کہا بخدا تم اگر کسی کو مل گئے تو تمہاری تو گردن ہی اڑادی جائے گی، تم یہ کرو کہ اس خچر پر میرے پیچھے بیٹھ جاؤ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تم کو پہونچادوں، تم اپنے بچاؤ کا انتظام ان سے کرالو، چنانچہ وہ میرے پیچھے بیٹھ گئے اور میں ان کو لے آیا، لیکن مسلمانوں کے فوج کی جگہوں سے جہاں جہاں سے گزرتا تھا وہ کہتے تھے کہ یہ کون جارہا ہے؟ اور جب ہم کو دیکھتے

(۱) زادالمعاد: ۳/۴۰۱

تھے کہ اللہ کے رسول کے چچا ہیں، اور انہی کے خچر پر ہیں، تو پھر کچھ نہیں بولتے تھے، یہاں تک کہ میں عمر کی جگہ سے گزرا، انہوں نے کہا: یہ کون ہے؟ اور لپک کر میری طرف آئے اور جب ابوسفیان کو دیکھا تو کہا کہ یہ اللہ کا دشمن، اللہ کا شکر ہے کہ یہ مل گیا، اب مجھے اس کو مارنے کا موقع مل رہا ہے اور معاہدہ کی پابندی اب تو باقی رہی نہیں اور تیزی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دوڑے کہ وہاں جا کر ابوسفیان کو مارنے کی اجازت لیں، لیکن میں نے خچر کو تیز بھگایا اور حضور ﷺ کے پاس پہونچ گیا، اسی وقت حضرت عمر پہونچ گئے اور کہنے لگے کہ اے اللہ کے رسول! یہ ابوسفیان ہیں، اور اللہ نے موقع دے دیا ہے ان کا خاتمہ کر دینے کا، معاہدہ کی رکاوٹ بھی اب نہیں، مجھے موقع دیجئے میں ان کی گردن اڑاؤں، میں نے کہا: اے اللہ کے رسول میں نے ان کو اپنی حفاظت میں لے لیا ہے، لیکن حضرت عمر نے بار بار اپنی بات کہی تو میں نے عمر سے صبر کرنے کو کہا، حضرت عمر نے کہا کہ اے عباس! میں تم سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ تمہارا جو تعلق رسول اللہ ﷺ سے ہے اس کی بنا پر تمہارا اسلام لانا میرے باپ خطاب کے اسلام لانے سے زیادہ مجھ کو عزیز رہا ہے، کاش کہ میرا باپ بھی مسلمان ہوا ہوتا، اور یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ تمہارا اسلام لانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میرے باپ خطاب کے اسلام لانے سے زیادہ عزیز رہا ہوگا، بہرحال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلہ میں جلد فیصلہ کرنے میں تاخیر مناسب سمجھتے ہوئے یہ فرمایا کہ عباس ان کو تم لے جاؤ اور صبح ان کو لے کر آنا تو دیکھیں گے، چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا، اور صبح ہونے پر ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ابوسفیان کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ تم اس بات کو مانو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔

ابوسفیان نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، آپ بڑے نرم دل اور بڑے شرافت والے ہیں اور خاندانی تعلق کا بھی خیال رکھنے والے ہیں، بخدا میں

یہ تو سمجھ گیا ہوں کہ اگر اللہ کے علاوہ کوئی اور خدا ہوتا تو اس وقت میرے کام آیا ہوتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ارے ابوسفیان کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ تم اس بات کو سمجھو کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟

ابوسفیان نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں کہ کتنے زیادہ آپ نرم دل اور شریفانہ اخلاق کے ہیں اور خاندانی تعلق کا بھی بڑا لحاظ کرنے والے ہیں، آپ کی یہ بات ایسی ہے کہ میرے دل میں اب تک اس کے سلسلہ میں کچھ کمی ہے، اس پر حضرت عباس فوراً بولے: ارے تمہاری خرابی ہو، اسلام قبول کرلو، قبل اس کے کہ کوئی تمہاری گردن اڑادے، اس پر انہوں نے کلمہ شہادت پڑھ لیا اور پڑھ کر مسلمان ہو گئے، حضرت عباسؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یہ ابوسفیان (جو کہ قریش کے سردار اور قائد جنگ رہے ہیں) ایسے آدمی ہیں جو فخر وعزت کے خواہشمند رہتے ہیں، آپ ان کے لیے کچھ ایسا بھی کردیجئے کہ ان کے دل میں اچھا ہو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ اعلان ہے کہ جو ابوسفیان کے گھر میں اپنے بچاؤ کے لیے داخل ہوجائیگا اس کو امان ہے، اسی طرح جو اپنی حفاظت کے لیے خود اپنے گھر کا دروازہ بند کرلیگا وہ بھی امان میں ہے اور جو اپنے بچاؤ کے لیے مسجد میں داخل ہوجائیگا اس کو بھی امان ہے، جب ابوسفیان جانے لگے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ سے کہا کہ ان کو راستہ کے تنگ حصہ پر پہاڑ کے اوپر ذرا کھڑا رکھو، کہ اللہ کی فوجیں جب گزریں گی تو یہ ان کو دیکھ لیں، مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی عظمت اور برتری اچھی طرح ان کو معلوم ہوجائے۔ حضرت عباس کہتے ہیں: میں نکلا اور ابوسفیان کو وہاں پر روکا، مسلمانوں کی فوجیں، اپنے اپنے قبیلوں کے اعتبار سے اپنے جھنڈے لئے ہوئے گزر رہی تھیں (۱)۔

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۲/۴۰۲-۴۰۴، زاد المعاد: ۳/۴۰۱-۴۰۳۔

معافی کی صدائے عام

رسول اللہ ﷺ نے معافی اور امن دیئے جانے کا دائرہ اس روز وسیع فرما دیا کہ اہل مکہ میں سے صرف وہی شخص ہلاک ہوسکتا تھا جو خود ہی معافی اور سلامتی کا خواہشمند نہ ہو اور اپنی زندگی کو بچانا نہ چاہتا ہو، رسول اللہ ﷺ نے اہل لشکر کو ہدایت فرمادی کہ مکہ میں داخل ہوتے وقت صرف اور صرف اس شخص پر ہاتھ اٹھائیں جوان کی راہ میں حائل ہو اور ان کی مزاحمت کرے، آپ ﷺ نے اس کا بھی حکم فرمایا کہ اہل مکہ کی املاک و اموال کے بارے میں احتیاط برتی جائے اس میں دست درازی نہ کی جائے (۱)۔

منظر یہ تھا کہ مسلمانوں کے فاتحانہ دستے سمندر کی موجوں کی طرح بڑھتے نظر آرہے تھے، ان میں کے مختلف قبائل اپنے اپنے گروہوں کے ساتھ گزر رہے تھے، جب کوئی قبیلہ گزرتا تو ابوسفیان عباسؓ سے اس کا نام دریافت کرتے اور نام سنتے تو کہتے کہ مجھے اس قبیلہ سے کیا سروکار (۲)۔

یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس اپنے رفقاء کے گروہ عظیم میں تشریف لائے جو اسلحہ کی کثرت سے سبز نظر آرہا تھا، یہ مہاجرین اور انصار کا آہن پوش دستہ تھا جو حضور ﷺ کو اپنے گھیرے میں لئے چل رہا تھا، ابوسفیان نے یہ منظر دیکھ کر کہا کہ خدا کی شان! عباس یہ کون لوگ ہیں، انھوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو مہاجرین اور انصار کے جلوس میں تشریف لے جارہے ہیں، انھوں نے یہ سن کر کہا کہ یہ بڑی طاقت اور شان وشوکت! اس سے پہلے حاصل نہیں رہی، خدا کی قسم اے ابوالفضل! تمہارے بھتیجے کا اقتدار آج کی صبح کتنا عظیم ہے، انھوں نے کہا: ابوسفیان یہ نبوت کا معجزہ ہے (۳)۔

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۲/ ۴۰۹۔ (۲) زاد المعاد: ۳/ ۴۰۳۔ (۳) سیرت ابن ہشام: ۲/ ۴۰۴۔

مکہ میں داخل ہوکر ابوسفیان نے بلند آواز سے اعلان کیا کہ اے قریش کے لوگو! یہ محمد (ﷺ) اتنی طاقت کے ساتھ تمہارے پاس آئے ہیں جس کا تم کو کبھی تجربہ نہ ہوا ہوگا، اور اس اعلان کا حوالہ دیا کہ اب جو ابوسفیان کے گھر میں آجائے گا اس کو امان حاصل ہو جائے گی، لوگ یہ سن کر کہنے لگے، اللہ تم سے سمجھے تمہارے گھر کی حقیقت ہی کیا ہے کہ ہم سب کو اس گھر میں پناہ مل سکے؟ پھر انھوں نے اس اعلان کا بھی حوالہ دیا کہ جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے گا اس کو امان ملے گی، جو مسجد (مسجد حرام) میں چلا جائے گا اس کو بھی امان ملے گی، چنانچہ لوگ منتشر ہو گئے اور اپنے اپنے گھروں اور مسجد حرام میں پناہ گیر ہو گئے (۱)۔

داخلہ کا نیازمندانہ انداز

رسول اللہ ﷺ مکہ میں اس شان سے داخل ہوئے کہ سر مبارک عبدیت وتواضع کے غلبہ سے بالکل جھک گیا تھا، قریب تھا کہ آپ ﷺ کی تھوڑی اونٹ کے کجاوے سے لگ جائے، آپ ﷺ داخل ہوتے وقت سورۂ فتح پڑھ رہے تھے (۲)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کی اس عظیم جمعیت کے ساتھ مکہ میں داخل ہو رہے تھے، آپ ﷺ کے سامنے گذشتہ بیس سال کی وہ تاریخ تھی جس میں آپ کے مکی ہم وطنوں نے آپ ﷺ اور آپ کے ماننے والوں کے لیے وطن کی سرزمین کو تنگ بنا رکھا تھا اور ہر طرح کی اذیتوں میں مبتلا کر رکھا تھا، آپ اور آپ کے اصحاب کو ختم کر دینے کی ہر تدبیر اختیار کر چکے تھے، جس کے نتیجہ میں آپ ﷺ کو اور آپ سے قبل آپ کے ساتھیوں کو اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا تھا اور وطن میں آنا اور وہاں اللہ کے مقدس گھر کی زیارت اور اس میں عبادت کرنا بھی ناممکن بنا دیا تھا، اور وہ عبادت جس کی عرب کے ہر خطہ کے باشندوں کے لیے مکہ آکر کرنے

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۲/ ۴۰۵۔ (۲) سیرت ابن ہشام: ۲/ ۴۰۵

کی عام اجازت تھی اور آپ ﷺ کے رفقاء کے لیے ممنوع بنا رکھی گئی تھی، آج آپ ﷺ اس شہر میں فاتحانہ داخل ہو رہے ہیں اور آپ ﷺ کے اور آپ کے ساتھیوں کے یہ سب جانی دشمن اب بے بسی کے ساتھ آپ ﷺ کے فاتحانہ داخلہ کو برداشت کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

مکہ جو جزیرۃ العرب کا مرکزی اور پر عظمت اور روحانی اور سیاسی لحاظ سے قلب و جگر کی حیثیت رکھتا تھا، اور وہ جس کے اقتدار میں آجائے تو اس کو اس بات پر کس قدر احساس عظمت ہوگا اور وہ اس پر کس قدر فخر کرے گا اور بڑائی کی شان سے داخل ہوگا، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس کے برعکس رویہ اختیار کیا، عدل و مساوات تواضع اور اظہار عبدیت کا کوئی انداز ایسا نہ تھا جس کو آپ ﷺ نے اختیار نہ فرمایا ہو، اپنے کسی عزیز قریب یا عزیز ساتھی کو نہیں بلکہ حضرت اسامہ کو جو آپ ﷺ کے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) حضرت زیدؓ کے صاحبزادے تھے، آپ ﷺ نے اپنی سواری کے پیچھے جگہ دی، بنی ہاشم اور اشراف قریش میں سے جن کی بڑی تعداد وہاں موجود تھی یہ شرف کسی کو نہیں عطا فرمایا (۱)۔

اسی طرح اسی فتح مکہ کے روز ایک شخص نے آپ ﷺ سے اپنے کسی مسئلہ میں گفتگو کی تو آپ کی عظمت کے احساس سے اس پر کپکپی طاری ہو رہی تھی، آپ ﷺ نے فرمایا ڈرو نہیں، اطمینان رکھو، میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں، میں تو قریش کی ایک ایسی عورت کا لڑکا ہوں جسکو سوکھے گوشت کے ٹکڑوں پر گزارا کرنا پڑتا تھا (۲)۔

معافی اور رحم کا دن ہے خونریزی کا نہیں

جب حضرت سعد بن عبادہؓ جو انصار دستہ کے امیر تھے، اس جگہ سے جہاں ابوسفیان اسلامی لشکر کو دیکھنے کے لئے کھڑے کئے گئے تھے گزرے اور ان کی نظر

(۱) صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب دخول النبی ﷺ من أعلیٰ مکہ۔ (۲) مستدرک حاکم: ۵۰/۳۔

کافروں پر پڑی جنھوں نے اسلام دشمنی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور انہوں نے خدا کے نیک بندوں کو ظلم وستم کا ایسا نشانہ بنایا تھا جس کے نتیجہ میں وہ اپنے مال ومتاع اور وطن سے دست برادر ہوکر مدینہ میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے تھے، اور اب ان کے مرکزی شہر مکہ میں انہی مظلوم مسلمانوں کا داخلہ فاتحانہ شان سے ہورہا ہے، اس پر انھوں نے کہا"اليوم يوم الملحمة، اليوم تستحل الكعبة، اليوم أذل الله قريشاً" (آج اظہار طاقت اور خونریزی کا دن ہے، آج کعبہ میں یہ سب جائز ہوگا، آج اللہ تعالیٰ نے قریش کو ذلیل کیا ہے) جب رسول اللہ ﷺ اپنے دستے میں ابوسفیان کے پاس سے گزرے تو انھوں نے آپ ﷺ سے اس کی شکایت کی اور کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ نے سنا سعد نے ابھی کیا کہا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کیا کہا ہے؟ انھوں نے وہ سب دہرادیا، سعد کے جملے کو آپ ﷺ نے اپنے مشفقانہ جملہ سے بدلتے ہوئے فرمایا:"اليوم يوم المرحمة، اليوم يعز الله قريشاً، ويعظم الله الكعبة" (نہیں! آج رحم ومعافی کا دن ہے، آج اللہ تعالیٰ قریش کو عزت عطا فرمائے گا اور کعبہ کی عظمت بڑھائے گا)(۱)۔

آپ ﷺ نے حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلوا بھیجا اور مکہ والوں کو اچھا تاثر دینے کے لئے ان کے گروہ کا پرچم ان سے لیکر ان کے صاحبزادے قیسؓ کی طرف منتقل کردیا(۲) آپ ﷺ نے یہ بظاہر اس مصلحت سے کیا کہ حضرت سعد کے جملہ سے قریشیوں میں قبائلی عصبیت کا احساس نہ ابھرے کیونکہ یہ جملہ مدینہ کے ایک قبیلہ کے امیر کے منہ سے نکلا تھا اور عربوں میں کسی تحقیری جملہ سے جلد عصبیت اور غصہ پیدا ہوجاتا تھا اور کشمکش شروع ہوجاتی تھی اور ابھی یہ قریشی اسلامی روح کے پوری طرح حامل نہیں بن سکے تھے، کہ یہ خطرہ نہ سمجھا جاتا، لیکن آپ نے پرچم ان سے لیکر ان کے صاحبزادے

---

(۱) زاد المعاد: ۳/۴۰۴۔ (۲) صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الفتح۔

کو دیا اس طرح گویا انہی کے پاس رہا اور ان کو اس کا احساس بھی نہیں ہوا ہوگا کہ ان کا پرچم ان سے لیا گیا ہے۔

اس طرح ایک حرف کی تبدیلی (الملحمۃ کے بجائے المرحمۃ فرمادینے) اور ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے تبدیل کر دینے سے (جن میں سے ایک باپ کا ہاتھ تھا دوسرا بیٹے کا) آپ ﷺ نے سعد بن عبادہؓ (جن کے ایمانی اور مجاہدانہ کارنامے اظہر من الشمس تھے) کی ادنیٰ دل شکنی کے بغیر ابو سفیان کی جو قریش کے قبیلہ کے جو کہ پورے عرب میں محترم سمجھا جاتا تھا، نمائندے اور سردار تھے (جن کی تالیف قلب کی ضرورت تھی) دل جوئی کا سامان حکیمانہ بلکہ معجزانہ طریقہ پر انجام دے دیا جس سے بہتر طریقے پر تصور میں آنا مشکل ہے، اس طرح ایک طرف قریش کے تاحال سردار کے برے تاثر سے قریش کے لوگوں کے برا تاثر قائم کرنے سے بچالیا اور دوسری طرف آپ ﷺ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو آزردہ خاطر کرنے سے گریز کیا، جنھوں نے اسلام کے لیے بڑی خدمات انجام دی تھیں۔ اس لئے ان سے پرچم لیکر بیٹے کو دینے سے گویا پرچم ان ہی کے پاس رہا، اور ان کو یہ احساس بھی دلا دیا گیا کہ آپ ﷺ دشمنوں کے ساتھ بھی رحمدلی اور رواداری کا رویہ پسند کرتے ہیں۔

ادھر مسلمانوں کا فاتحانہ داخلہ ہو رہا تھا اور دوسری طرف قریش کے کچھ ٹیڑھے اور باغی قسم کے لوگ مکہ کے خندمہ محلّہ میں جمع ہو رہے تھے، تاکہ اپنا زور دکھانے کی کوشش کر سکیں، ان میں اس مقصد سے حماس بن قیس جب ہتھیار سنبھالنے گئے، تو ان کی بیوی نے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مقابلہ میں آج کوئی ٹھہر نہ سکے گا، اس نے کہا کہ مجھے تو یہ امید ہے کہ ہم ان میں سے کچھ لوگوں کو پکڑ کر تمہارا نوکر بنا کر لے آئیں گے، چنانچہ ان لوگوں کا سامنا مسلمانوں کے مقابلہ میں آنے پر مقام خندمہ میں حضرت خالدؓ کے فوجیوں سے ہوا، مقابلہ پر آنے کے نتیجہ

میں ان میں کچھ لوگ تو مارے گئے اور کچھ لوگ شکست کھا کر بھاگے، حماس اپنی بیوی کے پاس پہنچے اور گھبرا کر کہنے لگے کہ جلدی سے دروازہ بند کرو، انہوں نے کہا کہ تم جو کہہ رہے تھے کہ ایسا کر لائیں گے کیا ہوا؟

حماس نے کہا: ہمارے سب ساتھی بھاگ گئے، مسلمانوں کی تلواریں ایسی چلیں کہ گردنیں کٹ گئیں (۱)۔

حق کے غلبہ کا اعلان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جھنڈا محلّہ حجون میں لگایا گیا اور مہاجر و انصار آپ کے سامنے آپ کے ارد گرد جمع ہو گئے، یہاں تک کہ آپ مسجد میں داخل ہوئے، آپ نے حجر اسود کو بوسہ دیا، پھر بیت اللہ شریف کا طواف کیا، آپ ﷺ کے ہاتھ میں کمان تھی اور کعبہ کے اندر اور کعبہ کے ارد گرد ۳۶۰ بُت لگے ہوئے تھے، آپ ﷺ کمان سے ان کو مارتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے:

﴿جاء الحق وزهق الباطل إن الباطل كان زهوقا﴾ — حق آیا اور باطل پسپا ہوا اور باطل تو پسپا ہونے والی چیز ہے

[سورہ بنی اسرائیل:۱۸]

اور ﴿جاء الحق ومايبدئ الباطل ومايعيد﴾ [سورۃ سبا:۴۹] — حق آ گیا اور باطل اب کچھ کرنے کے قابل نہیں رہا

آپ ﷺ کہتے جاتے تھے اور بُت گرتے جاتے تھے (۲)۔

آپ ﷺ نے سواری پر بیٹھ کر کعبہ کا طواف فرمایا، آپ ﷺ احرام میں نہیں تھے، کیوں کہ عمرہ کی نیت سے داخل نہیں ہوئے تھے، جب آپ ﷺ طواف کر چکے، تو کعبہ کے کلید بردار حضرت عثمان بن طلحہ کو بلایا اور ان سے کعبہ کی چابی حاصل کی اور

---

(۱) زاد المعاد، ج ۳، ص: ۴۰۵۔ (۲) صحیح البخاری کتاب المغازی، باب أین رکز النبی ﷺ الرایة یوم الفتح۔

کعبہ کا دروازہ کھلوایا، آپ ﷺ اس میں داخل ہوئے، وہاں بھی اندر تصویریں بنی ہوئی تھیں، آپ ﷺ نے دیکھا کہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ کی تصویریں بنی ہوئی ہیں، اور وہ تیروں سے فال نکال رہے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ ان لوگوں کو سمجھے، خدا کی قسم ان نبیوں نے تیروں سے فال کبھی نہیں لی، آپ ﷺ نے حکم دیا اور یہ تصویریں تیروں سے نکالی گئیں، آپ ﷺ نے دروازہ اندر سے بند کر دیا اور وہاں اندر نماز پڑھی اور اندر ہی کئی جگہوں پر گئے اور وہاں پر تکبیر اور وحدانیت کے الفاظ کہے، پھر دروازہ کھولا، سامنے قریش کے لوگ مسجد میں بھرے ہوئے تھے، صفیں لگائے ہوئے تھے اور انتظار میں تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ کیا معاملہ کریں گے، آپ ﷺ نے دروازہ کے دونوں حصوں پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ کوئی معبود نہیں سوائے خدا کے وہ تنہا ہے، کوئی اس کا شریک نہیں، اس نے اپنے وعدہ کو سچ کر دکھایا اور اپنے بندہ کی مدد کی اور اپنی فوج کو غالب کیا اور دشمن کی جماعتوں کو تنہا اس نے شکست دی اور فرمایا:

سن لو! ہر غلط بات اور غلط مال اور ناجائز خون میرے پیروں کے نیچے ہے یعنی ختم کیا جاتا ہے، سوائے بیت اللہ کی کلید برداری اور حاجیوں کو پانی پلانے کی ذمہ داری کے کہ وہ جس کے پاس تھی ان کے پاس رہے گی، باقی ذمہ داریوں کو آپ نے ان کے سابقہ لوگوں سے ہٹا دیا، اور مسلمانوں کے حاکم کی ذمہ داری میں دیدیا، آپ نے قتل اور انتقام لینے کے سلسلہ میں کچھ قوانین کا اعلان کیا اور قریش کو مخاطب کر کے کہا کہ اے قریشیو!

''تم میں جو جاہلی غرور تھا بیشک اللہ نے اس کو ختم کر دیا، اور تم لوگ اپنے آباء واجداد کی بڑائی پر فخر کرتے تھے اللہ نے اس (اونچ نیچ) کو ختم کر دیا، سن لو! سب لوگ آدم کے بیٹے ہیں، اور آدم مٹی سے بنائے گئے۔ پھر یہ آیت پڑھی:

﴿وجعلنكم شعوباً وقبائل لتعارفوا إن أكرمكم عندالله أتقاكم﴾ [حجرات:۱۳]

بیشک ہم نے تم کو قوموں اور قبیلوں کی شکل میں رکھا ہے تاکہ ایک دوسرے کی تم پہچان کرسکو، تم میں معزز وہی ہوگا جو اللہ تعالی کے یہاں زیادہ نیک ثابت ہوگا۔

پھر فرمایا:

اے قریش کے لوگو! تمہارا کیا خیال ہے، ہم آج تمہارے ساتھ کیا معاملہ کریں گے؟ قریش مکہ نے کہا: ہم امید اچھی ہی رکھتے ہیں، جو ایک شریف بھائی دوسرے شریف بھائی کے ساتھ کرتا ہے (۱)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر یہ نہیں فرمایا کہ آج سے پہلے شریف بھائی شریف بھائی کے ساتھ کیا کر رہا تھا، بلکہ اس کے برعکس یہ فرمایا: میں تم سے آج وہی کہتا ہوں جو حضرت یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا، آپ ﷺ کا اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ حضرت یوسف کو ان کے بھائیوں نے کنویں میں پھینک دیا تھا، اور سمجھتے تھے کہ وہ ختم ہو جائیں گے پھر اللہ نے ان کو عزت دی، بادشاہت دی، اور یہ لوگ اپنی اقتصادی پریشانی کی وجہ سے ان کے پاس مدد کے لیے آئے، وہ اس وقت تک ان کو ایک غیر شخص سمجھتے تھے، ان کو جب وہی بھائی معلوم ہوئے جن کو وہ اپنے نزدیک موت کے منہ میں ڈال چکے تھے، تو شرمندہ ہوئے اور معافی مانگی، تو انہوں نے یہ کہا کہ جاؤ تم پر اب کوئی الزام نہیں، تم آزاد ہو، آپ ﷺ نے بھی اپنے ان ظالم عزیزوں پر غالب آجانے پر کہا: جاؤ تم لوگوں کو کوئی الزام نہیں دیتے، تم سب آزاد ہو (۲)۔

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں بیٹھ گئے، اور کعبہ کے کلید بردار حضرت عثمان بن طلحہ کو بلایا، ان کو چابی واپس کردی، اور کہا کہ آج احسان اور وفا کا دن ہے، اس میں اس بات کا بھی اشارہ تھا کہ ہجرت سے پہلے آپ ﷺ نے حضرت عثمان بن

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۲/ ۴۱۱-۴۱۲، زاد المعاد: ۳/ ۴۰۷۔ (۲) زاد المعاد: ۳/ ۴۰۸۔

طلحہ سے کعبہ کھولنے کی درخواست کی تھی، انہوں نے آپ کے دین اسلام کی ناپسندیدگی کے طور پر انکار کر دیا تھا، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ ایک دن وہ آئے گا جب کنجی ہمارے ہاتھ میں ہوگی، ہم جس کو چاہیں گے دیں گے، اس کو عثمان بن طلحہ نے بے مطلب بات سمجھتے ہوئے کہا تھا، کہ کیا ایسا بھی دن آئے گا اور کیا اس وقت سب قریشی مر چکے ہوں گے؟۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کنجی ان کو واپس کی، جب کہ حضرت علی اور دوسرے حضرات چاہ رہے تھے کہ اب کلید برداری کی ذمہ داری ان کو دے دی جائے، آپ ﷺ نے ان سے کہا کہ آج احسان ووفا کا دن ہے اور حضرت عثمان بن طلحہ سے کہا کہ کنجی تمہارے پاس ہی رہے گی (یعنی نسلاً بعد نسل) اور تم سے کوئی چھینے گا، تو وہ ظالم ہوگا۔

عثمان بن طلحہؓ کہتے ہیں کہ جب میں کنجی لے کر خوشی خوشی چلنے لگا تو آپ ﷺ نے پھر مجھے آواز دی اور فرمایا: کیوں عثمان! جو بات میں نے کہی تھی وہ پوری ہوئی یا نہیں؟ اب مجھے وہ بات یاد آ گئی جو حضور ﷺ نے ہجرت سے پہلے فرمائی تھی کہ ایک روز تم یہ کنجی میرے ہاتھ میں دیکھو گے، میں نے کہا کہ بیشک آپ کا ارشاد پورا ہوا اور اس وقت میں کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا، حضور ﷺ نے ان کو یہ کنجی یہ کہہ کر دی تھی کہ میں یہ امانت آپ کے سپرد کرتا ہوں کیوں کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی کا حکم ہے، اسی موقع پر اس آیت "ان اللہ یأمرکم ان تؤدوا الأمانات الیٰ أھلھا" کا نزول ہوا تھا، چنانچہ آج ۱۴سو سال بعد تک کعبہ کی کلید برداری ان ہی کے پاس ہے(۱)۔

آپ ﷺ نے حضرت بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر اذان دیں، اس وقت قریش کے بڑے بڑے لوگ وہاں تھے، ان میں سے ایک نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ جن کے غلام حضرت بلال رہ چکے تھے، یعنی اُسید اگر یہ منظر دیکھتے کہ غلام کو سب سے معزز مقام کی معزز اور بلند جگہ پر کھڑا کیا گیا تو اپنی کتنی بے عزتی محسوس کرتے (۲) پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی رشتہ کی بہن حضرت ام ہانی کے گھر تشریف لے گئے، وہاں غسل فرمایا اور آٹھ رکعتیں شکرانہ کی پڑھیں (۳)

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۲/۴۱۲۔ (۲) سیرت ابن ہشام: ۲/۴۱۳۔ (۳) زاد المعاد: ۳/۴۱۰۔

اور جب مکہ کی فتح کی یہ کارروائی مکمل ہوگئی، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو امان دینے کا اعلان کردیا اور صرف چند آدمی جو بہت ہی قابل سزا تھے ان کو مستثنیٰ کیا، کہ ان کو قتل کیا جاسکتا ہے، لیکن ان میں سے اکثر نے جاکر معافی مانگ لی اور ان کو بھی پروانۂ معافی مل گیا، آپ ﷺ کی عادت شریفہ بھی یہی تھی کہ اگر جانی دشمن بھی آپ ﷺ سے معذرت کرکے معافی مانگ لے تو معاف ہی کردیتے تھے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چند گروپ بھیجے کہ مکہ کے اردگرد جگہ جگہ بتوں کے جو اڈے بنالئے گئے تھے ان کو ختم کردیا جائے، اور آپ کی طرف سے مکہ میں یہ اعلان کیا گیا کہ جو بھی اللہ اور اس کے رسول پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، وہ بت نہ رکھے، اور اگر بت ہوں تو ان بتوں کو توڑ دے۔

اس طرح پورے جزیرۃ العرب کے کفار کا مرکزی محاذ جنگ ختم ہوگیا، اور ۲۰-۲۱ سال سے جو عداوت اور ظلم وزیادتی مسلمانوں کو مکہ والوں سے جھیلنی پڑ رہی تھی اس کا خاتمہ ہوگیا، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی کے ساتھ کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی، سب ہی کو معاف کردیا۔

اسلام کی طرف رجوع عام

فتح مکہ کے بعد عربوں کا اسلام کی طرف رجوع عام ہوا، بڑے بڑے وفود اور جماعتیں آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوتیں اور اور حلقۂ بگوش اسلام ہوجاتیں، اسی موقع کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿إذا جاء نصر اللّٰه و الفتح ٥ و رأيت الناس يدخلون في دين اللّٰه أفواجاً﴾

جب اللہ کی مدد آپہونچی اور فتح حاصل ہوگئی اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ غول کے غول اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔ [سورۃ النصر: ۱-۲]

فتح مکہ کا موقع عجیب موقع تھا کہ تقریباً ۲۰ سال بعد مسلسل دشمنی اور ظلم وزیادتی کرنے والوں پر قابو ملا ہے اور انتقام لینے سے کوئی چیز روکنے والی نہیں تھی، پھر بھی محض شرافت نفس کی بنا پر بدترین دشمنوں تک کو معاف کردیا گیا، اور انتقام کی پوزیشن میں ہوتے ہوئے بھی کسی سے انتقام نہیں لیا، بلکہ اس روز معافی کا دائرہ مزید وسیع کردیا، روئے زمین پر آپ کے بدترین دشمن ابوجہل کے لڑکے عکرمہ، محبوب

چچا حضرت حمزہ کے قاتل جبیر بن مطعم کے وحشی غلام، ہبّار بن الاسود اور عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح جیسے بدترین دشمنوں کو اپنے دامن عفوو درگذر میں پناہ دی (۱)۔

آپ کا رویہ اس قدر رواداراًنہ اور کریمانہ تھا کہ بعض ایسے افراد کو بھی معاف کر دیا جنھوں نے اپنی مؤثر شاعری کے ذریعہ آپ ﷺ کے خلاف بہت ہی اہانت آمیز اور نقصان رساں پروپیگنڈے کو اپنا وطیرہ بنا رکھا تھا جس سے آپ ﷺ کو نقصان پہونچا جس پر آپ ﷺ نے ان کو نا قابلِ معافی قرار دینے کا اعلان بھی کر دیا تھا لیکن وہ اچانک آپ کے سامنے معافی طلب کرتے ہوئے آگئے تو آپ نے معاف کر دیا، آپ کا یہ کریمانہ رویہ آپ کی نہایت رحم دلی اور اعلیٰ ظرفی کی علامت بنا۔

غزوۂ حنین، اوطاس اور طائف

قبیلۂ ہوازن جو مکہ اور طائف کے درمیان میں رہتا تھا، اور قبیلۂ ثقیف جو طائف میں رہتا تھا، اور یہ دونوں قبیلے اس علاقہ کے معزز اور مضبوط قبیلے تھے اور اپنی طاقت اور قوت میں قریش ہی کے سطح کے سمجھے جاتے تھے اور ان کے قریش سے قریبی تعلقات تھے، مکہ جیسا مرکزی اور اہم شہر جو ان کے پڑوس کا شہر تھا مسلمانوں کے قبضہ میں آجانے سے اپنے اپنے سلسلہ میں فکر مند ہوگئے، اور مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کے لیے فوجی تیاری کرنے لگے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اسکی اطلاع ملی تو آپ نے مناسب سمجھا کہ ان کے ارادوں کو نظر انداز نہ کریں، اور اس وقت جب کہ مسلمانوں کی فوجی جمعیت فوجی تیاری کی حالت میں ہے، ان کا سامنا کر لیا جائے۔ آپ ﷺ مکہ سے نکل کر قبیلہ ہوازن کے علاقہ وادیٔ حنین میں تشریف لے گئے، یہ مکہ سے ۳۰-۳۵ میل کے فاصلہ پر شمالی جانب واقع ہے، قبیلہ ہوازن نے ایک ترکیب یہ کی کہ اپنی فوج کے ساتھ ان کی بیویوں اور ان کے مال ومتاع وجانوروں کو بھی میدان جنگ میں ساتھ لائے تاکہ سب کے دل میدان جنگ سے ہی وابستہ رہیں، اپنے اپنے گھروں کی طرف ان کی توجہ نہ رہے۔

عرب میں بعض قبائل کو ایک بڑے اور سرسبز درخت سے جس کا نام ''ذات انواط'' تھا خاص عقیدت تھی، وہ اس میں اپنے ہتھیار لٹکاتے تھے، قربانیاں کرتے تھے اور ایک دن اس کے نیچے قیام کرتے تھے، اس لشکر میں آپ ﷺ کے ساتھ کچھ ایسے

(۱) زاد المعاد: ۳/ ۴۱۱۔

افراد بھی تھے جو ابھی ابھی تازہ تازہ جاہلی زندگی کو ترک کر کے اسلام میں داخل ہوئے تھے، چنانچہ جب دوران سفر میں یہ درخت انہیں نظر آیا تو جاہلیت کی ان قدیم رسموں اور باتوں کو یاد کر کے اور زیارت گاہوں کو دیکھ کر ان کے منہ میں پانی بھر آیا اور بے ساختہ کہنے لگے: یا رسول اللہ ﷺ جیسا ان لوگوں کا ذات انواط تھا ویسا ہی ایک ہمارے لئے بھی مرکز عقیدت تجویز فرما دیجئے، رسول اللہ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا اللہ أکبر، اس کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے، تم نے مجھ سے ایسی فرمائش کی ہے جیسے موسیٰ کی قوم (یہود) نے موسیٰ علیہ السلام سے کی تھی اور کہا تھا:

﴿اجعل لنا إلهاً كما لهم آلهة، قال إنكم قوم تجهلون﴾ [سورہ اعراف:۱۳۸]

آپ ہمارے لئے بھی ایک معبود بنا دیجئے جیسے ان کے بہت سے معبود ہیں، انہوں نے جواب دیا کہ تم بڑی جہالت کی باتیں کرنے والی قوم ہو۔

پھر آپ ﷺ نے فرمایا: بیشک تم اپنی پیش رو قوموں کی ایک ایک بات اور طریقہ کی پیروی کرو گے(۱)۔

بہرحال دونوں فوجوں کی آمنے سامنے صف بندی ہوئی، اور جنگ ہوئی، اس جنگ میں قبیلہ ہوازن کے ساتھ قبیلہ ثقیف اور قبائل نصر وجشم اور سعد بن بکر بھی شریک تھے، مالک بن عوف چار ہزار افراد پر مشتمل فوج لیکر وادی حنین پہونچے تھے، اسلامی لشکر کی مجموعی تعداد بارہ ہزار تھی، جس میں نو مسلم بھی شامل تھے، اور وہ مشرک لوگ جن سے معاہدہ تھا وہ بھی شریک تھے، فوج کی تعداد جو خاطر خواہ معلوم ہوتی تھی اس کی وجہ سے مسلمانوں کو اطمئنان سا ہو گیا تھا، کہ ہماری تعداد ایسی ہے کہ شکست کا خطرہ نہیں، لیکن مسلمانوں کا یہی اطمئنان ان کے لئے نقصان رساں ثابت ہوا، کیونکہ یہ بات اللہ تعالی کو پسند نہیں آئی، کہ ایمان والوں کی یہ منتخب جماعت اپنے کسی بھی مسئلہ میں اپنے کو کچھ سمجھے، اس کو تو یہ سکھایا گیا تھا کہ ہر بات اللہ تعالی کے

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۴۴۲/۲۔

اختیار میں ہے، چاہے معاملہ اپنے اختیار ہی کا معلوم ہوتا ہو، ان کا بھروسہ ہر حال میں اپنے خدا پر ہونا چاہئے، سامان و انتظام کو اصل نہ سمجھنا چاہیئے۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے تھوڑی دیر کے لئے اپنی مدد ہٹالی، ادھر کفار نے پہاڑوں کے پیچھے بڑے تیر انداز بٹھادئے تھے، وہ مسلمانوں پر اچانک تیر برسانے لگے، مسلمانوں کو اس کا پہلے سے اندازہ نہ تھا، اس اچانک حملہ سے گھبرا گئے، چنانچہ اس دوران ان کو سخت مراحل سے گزرنا پڑا، دشمنوں کا یہ حملہ بہت سخت ثابت ہوا، ابھی آغاز جنگ ہی تھا کہ مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے، لیکن جب مسلمانوں کو جس قدر تادیب اور تنبیہ اللہ تعالیٰ کو منظور تھی وہ ہوگئی اور کثرت تعداد پر خوش ہونے کی وجہ سے اللہ نے ان کو شکست کی تلخی کا مزہ بھی چکھادیا کہ وہ پروردگار کی مدد کو اصلی ذریعہ محسوس نہ کرنے سے کس قدر زحمت میں پڑے اور یہ اس لئے کہ ان کا ایمان مضبوط ہو اور جب فتح ہوا کرے تو ان کے اندر کوئی اتراہٹ اور ہزیمت ہو تو کسی قسم کی مایوسی پیدا نہ ہو اور وہ اولاً خدا ہی کو مددگار سمجھیں، لہٰذا یہ سبق مل جانے کے فوراً بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو غلبہ کی پوزیشن میں پہونچا دیا اور بالآخر مسلمانوں کو ہی فتح نصیب ہوئی، یہ معرکہ غزوۂ حنین کہلاتا ہے، اس کا تذکرہ قرآن مجید میں اس طرح آیا ہے:۔

﴿لقد نصركم الله في مواطن كثيرة و يوم حنين إذ أعجبتكم كثرتكم فلم تغن عنكم شيئاً و ضاقت عليكم الأرض بما رحبت، ثم ولّيتم مدبرين، ثم أنزل الله سكينته على رسوله و على المؤمنين، و أنزل جنوداً لم تروها، و عذّب الذين كفروا، و ذلك جزاء الكافرين﴾
[سورة التوبة: ٢٥- ٢٦]

(خدا نے بہت سے موقعوں پر تم کو مدد دی ہے اور جنگ حنین کے دن جب کہ تم کو اپنی جماعت کی تعداد پر اعتماد ہوگیا تھا، وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی، اور زمین باوجود اپنی کشادگی کے تم پر تنگ ہوگئی، پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگنے لگے، پھر خدا نے اپنے پیغمبر اور مومنوں پر اپنی طرف سے تسکین نازل فرمائی اور تمہاری مدد کو لشکر جو تمہیں نظر نہیں آئے تھے آسمان سے اتارے اور کافروں کو عذاب دیا، اور کفر کرنے والوں کی یہی سزا ہے)۔

اس جنگ میں کامیابی کے بعد آپ ﷺ نے طائف کے قلعہ کا محاصرہ کا فیصلہ کیا جہاں قبیلہ ہوازن کا سردار مالک بن عوف جس نے حنین میں دشمن کی فوجوں کی قیادت کی تھی، شکست کھا کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ پناہ گزیں ہوگیا تھا، تاکہ دشمن کے کسی اگلے اقدام سے بچنے کے لئے اس کی سرکوبی کی جائے، اسی طرح اوطاس کی طرف بھی جہاں ہوازن کا دوسرا گروہ چھپا تھا، ابوعامر الاشعری کی سرکردگی میں مسلمان مجاہدین کا ایک دستہ روانہ فرمایا، اس دستہ نے ہوازن کی اس فوجی ٹکڑی سے جہاد کیا اور شکست دی، البتہ طائف کا محاصرہ طویل ہوتا چلا گیا، دیر لگنے پر آپ ﷺ نے کچھ ضروری اقدامات کرنے کے بعد محاصرہ اٹھالینا مناسب سمجھا، اور واپس تشریف لے آئے، کئی ماہ توقف کے بعد قبیلۂ ثقیف کے لوگوں نے خود حضور ﷺ کی خدمت میں آکر اسلام کی اطاعت قبول کرلی اور اس طرح اس پورے علاقہ میں کوئی خطرہ ہوسکتا تھا وہ ختم ہوگیا(۱)۔

انصار سے ایک معجزانہ خطاب

غزوۂ حنین میں قبیلہ ہوازن کے لوگوں نے اپنی مضبوطی اور جنگ کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے سارے مال ومتاع اور اہل وعیال کے ساتھ شرکت کی تھی، تاکہ ان کے فوجیوں کو اپنے گھر اور اہل وعیال یاد نہ آئیں اور یکسو ہوکر میدان جنگ میں ہی متوجہ رہیں، اور مال ومتاع کی موجودگی سے ان کو وہیں جمے رہنے کی تقویت حاصل ہو، یہ فائدہ ان کو تو حاصل نہیں ہوا، البتہ ان کو جب شکست ہوئی تو ان کا وہ مال ومتاع بھی ان کے ہاتھ سے جاتا رہا جو بکثرت تھا اور عام طور پر مویشیوں کی شکل میں تھا، وہ سب مسلمانوں کو مال غنیمت کے طور پر حاصل ہوگیا، جس کی غیر معمولی تعداد

(۱) غزوہ حنین کی تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں: ''سیرت ابن ہشام'' ج ۲/ ۴۳۷-۴۹۹۔ ''تفسیر طبری'' ج ۱۰ ''زادالمعاد'' ۳/ ۴۶۵-۴۸۵۔ ''صحیح بخاری، باب قولہ تعالیٰ: اذ اعجبتکم کثرتکم''۔ ''صحیح مسلم، کتاب الجہاد و السیر، باب غزوۃ حنین''۔

تھی، اس جنگ کے علاوہ کسی جنگ میں اتنا نہیں حاصل ہوا تھا، مال غنیمت عام طور پر مسلمان شرکاء جنگ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیاری مدوں میں تقسیم کیا جاتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اختیار سے قریش کے ان لوگوں میں جو اب اسلامی اقتدار میں آچکے تھے اور مسلمانوں میں داخل ہو چکے تھے، اگرچہ ان میں سے خاصی تعداد نے اوپری دل سے اسلام کو اختیار کیا تھا، اسلام سے تعلق بڑھانے اور اسلام کی تابعداری میں پختگی پیدا کرنے کے لیے حضور ﷺ نے ان کی دلداری مناسب سمجھی اور ان کو بھرپور طریقہ سے مال غنیمت میں حاصل شدہ مویشی عنایت فرمائے اور پختہ ایمان والے مسلمان جو شریک جنگ رہے تھے، ان کو عام طور پر نہ دینے کے برابر مال عنایت فرمایا، اس پر انصار کرام کہ جو اصل اہل مدینہ تھے، ان میں سے بعض کو یہ خیال ہوا کہ مکہ کے حالات ناسازگار ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ مدینہ آئے تھے اب حالات وہاں کے صحیح ہو جانے پر شاید آپ ﷺ مدینہ سے مکہ منتقل ہو جائیں، شاید اسی لیے آپ ﷺ نے وہاں کے لوگوں کی بڑی دلداری کی، حالانکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہر فعل وحی الٰہی کے مطابق ہوتا تھا، ان کے متعلق شخصی اور ذاتی منفعت کو ترجیح دینے کا خیال صحیح بھی نہیں تھا اور مناسب بھی نہ تھا، آپ ﷺ کو جب اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے انصار کو جمع کرایا اور ان کے آپ پر شبہ کرنے پر کوئی ناگواری ظاہر نہیں فرمائی، بلکہ بڑی دلداری اور محبت کے اسلوب میں اپنی بات کی وضاحت فرمائی۔

یہ واقعہ حضرت ابوسعید خدری کے بیان کردہ الفاظ میں درج ذیل ہے، وہ فرماتے ہیں:

"جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مال غنیمت میں جو بکثرت حاصل ہوا تھا بڑے عطیے قریش کے لوگوں کو عطا فرمائے اور بعض دوسرے عرب کے قبائل کے لوگوں کو بھی عطا فرمایا، اور حضرات انصار کا اس میں کوئی خاص حصہ نہیں

رکھا تو بعض حضرات انصار کے دلوں میں اس سلسلہ میں کچھ شکایت آئی حتی کہ ان میں آپس میں تذکرہ بھی ہوا اور بات کہی گئی، بعض نے یہ کہا کہ یہ سمجھ میں آرہا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سابق ہم وطنوں میں چلے گئے تو حضرت سعد بن عبادہ (سردار خزرج) جو حضرات انصار کے سربراہوں میں ایک سربراہ تھے وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! انصار کے ان لوگوں نے آپ ﷺ کے سلسلہ میں اپنے دلوں میں اس بات سے شکایت محسوس کی ہے جو آپ ﷺ نے جنگ سے حاصل شدہ مال کی تقسیم میں اختیار کی ہے، وہ یہ کہ آپ نے مال غنیمت زیادہ سے زیادہ اپنی قوم میں تقسیم کیا، اور بہت عطیے دیئے، اور دیگر قبائل کو بھی دیئے، البتہ انصار کا حصہ نہیں رکھا، اور انصار کے اس قبیلہ کو کچھ نہیں ملا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس سلسلہ میں خود تمہارا خیال کیا ہے؟ انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول میں بھی اپنی قوم کا فرد ہوں، فرمایا کہ تم اپنی قوم کو اس احاطہ میں جمع کرو، راوی کہتے ہیں کہ مہاجرین کے کچھ لوگ آئے تو ان کو انہوں نے آنے دیا، پھر مہاجرین میں سے دوسرے لوگ آئے، ان کو لوٹا دیا، بہر حال سب جمع ہو گئے، تو حضرت سعد آئے اور عرض کیا کہ انصار کے یہ افراد قبیلہ آپ ﷺ کے لیے جمع ہو گئے تو ان کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے۔

حضور ﷺ نے اس موقع پر حضرات انصار کو جو خطاب فرمایا اس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ آپ ﷺ اپنے اصحاب کا اسلام سے تعلق مضبوط کرنے کے لئے کس محبت اور حکمت سے معاملہ فرماتے تھے، کہ کسی مسئلہ میں ان کے دلوں میں کسی طرح کی شکایت محسوس ہوتی تو محبت اور دلداری کے تقاضوں کا لحاظ کرتے ہوئے ایسا اسلوب کلام اختیار فرماتے جو دلوں کو متاثر اور پوری طرح ہم نوا بنا دیتا، چنانچہ آپ ﷺ نے پہلے اللہ کی حمد بیان کی اور اس کے لائق جو ثنا ہے وہ بیان کی، پھر فرمایا:

اے حضرات انصار! یہ کیا باتیں ہیں؟ جو آپ لوگوں کی نسبت سے مجھ تک پہونچی ہیں، اور وہ کیا احساس ہے جو آپ لوگوں نے اپنے دلوں میں محسوس کیا ہے، کیا ایسا نہیں ہے کہ میں آپ لوگوں کے پاس آیا، اور حالت یہ تھی کہ آپ سب لوگ راستہ سے بھٹکے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ آپ کو راستہ دکھلایا اور آپ لوگ مالی تقویت کے معاملہ میں دوسروں کے دست نگر تھے اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ آپ لوگوں کی یہ محتاجی ختم کی اور آپ ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے تھے، اللہ نے آپ کے دلوں میں آپس کی الفت پیدا کی، یہ سُن کر حضرات انصار نے کہا کہ واقعی اللہ اور اس کے رسول کا بڑا احسان ہے اور وہ برتر ہیں پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے انصار بھائیو! کیا تم مجھ سے اس کے جواب میں کچھ نہیں کہتے، انہوں نے کہا اے اللہ کے رسول ہم آپ ﷺ کو کیا جواب دے سکتے ہیں، احسان وکرم سب اللہ اور رسول ہی کا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: بخدا تم اگر چاہو تو تم یہ کہہ سکتے ہو اور تم یہ کہو گے تو سچ کہو گے اور میں تمہاری تصدیق بھی کروں گا کہ آپ ہمارے پاس اس حالت میں آئے تھے کہ آپ کو جھٹلایا جا چکا تھا، اس وقت ہم نے آپ کی تصدیق کی، لوگوں نے آپ کو چھوڑ دیا تھا اس وقت ہم نے آپ کی مدد کی، اور آپ اپنی جگہ سے نکالے ہوئے تھے ہم نے آپ کو جگہ دی، اور آپ دوسروں کے سہارے کے محتاج تھے، ہم نے آپ کے ساتھ ہمدردی کی، پھر آپ نے فرمایا: اے انصار بھائیو! کیا تمہارے دلوں میں میرے متعلق شکایت پیدا ہوئی اور یہ شکایت دنیا کی کچھ تھوڑی سی مزیدار چیز کے سلسلہ میں ہوئی کہ جس کو دے کر میں نے کچھ لوگوں کو مانوس کرنے کی کوشش کی ہے، کہ وہ اسلام لے آئیں، اور میں نے تم کو تمہارے اسلام کے سہارے کے سپرد کر دیا، اے انصار بھائیو! کیا تم اس پر راضی اور خوش نہیں کہ دیگر لوگ یہاں سے بکریاں اور اونٹ لے کر لوٹیں اور تم اللہ کے رسول کو لے کر اپنے گھروں کی طرف لوٹو۔

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے تم جو لے کر لوٹو گے یقیناً اس سے بہتر ہے جس کو لے کر یہ لوگ لوٹیں گے، میں تو اگر ہجرت کرنے کا عمل ضروری نہ ہوتا تو انصار ہی کے اندر کا شخص ہوتا اور میرا طرز عمل تو یہ ہے کہ لوگ کسی ایک گھاٹی یا وادی میں چلیں اور انصار کسی دوسری گھاٹی اور وادی میں چلیں تو میں انصار ہی والی گھاٹی اور وادی میں چلوں گا، انصار تو شعار ہیں (یعنی اس لباس کی طرح ہیں جو ہر وقت جسم سے لگا رہتا ہے)، اور دیگر لوگ اوپری کپڑوں کی طرح ہیں (یعنی ایسے کپڑے جن کی ضرورت ہر وقت نہیں پڑتی)۔

پھر آپ نے اس دعاء پر خطاب پورا کیا کہ اے اللہ انصار پر رحم فرما اور انصار کی اولاد پر رحم فرما، اور انصار کی اولاد کی اولاد پر رحم فرما، راوی کہتے ہیں کہ یہ سننا تھا کہ لوگ رونے لگے، اور اتنا روئے کہ داڑھیاں ان کی آنسوؤں سے تر ہو گئیں، اور انہوں نے کہا کہ ہم بالکل راضی اور خوش ہیں کہ ہمارے حصہ میں اللہ کے رسول آئیں، اس طرح ہم زیادہ فائدے میں ہوں گے" (۱)۔

غزوۂ حنین میں مال غنیمت کی بہتات ہوئی تھی، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ والوں کو مانوس کرنے کے لیے جو ۲۲ سال سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اصحاب سے مخالفت اور دشمنی میں گزار رہے تھے، اور مجبور ہو کر اطاعت قبول کر لی تھی، ان کی اس اطاعت کو ظاہری کے بجائے دل سے کرانے کی ایک تدبیر کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو بہت ممنون کرنے کی تدبیر کی اور حضرات انصار کو وہ مال نہ دے کر ان کے جذبۂ ایمان کو کافی سمجھا، اور وہ واقعی ایسے ہی جذبۂ ایمانی کے تھے کہ اللہ کی رضا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے مقابلہ میں اس کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے تھے، لیکن ان کو چونکہ یہ شبہ ہوا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

(۱) سیرت ابن ہشام: ۲/۴۹۹۔

اپنے قبیلہ اور وطن کے لوگوں سے مانوس ومطیع ہوجانے سے اپنے وطن واپس ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں، یہ ان کے لیے صدمہ کی بات تھی اور اس صدمہ کی وجہ آپ ﷺ کا اپنے قبیلہ اور ہم وطنوں کے ساتھ بہت سلوک کرنا ان کو ایک علامت محسوس ہوا تھا، لہٰذا ان میں آپس میں تھوڑا چرچا ہوا اور پھر انہی میں سے ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دل کی بات ظاہر کردی تاکہ بات صاف ہوجائے، اور ان کا یہ شبہ صحیح نہیں ہوا اور وہ صحیح تھا بھی نہیں، کیوں کہ اللہ کا رسول ایمان اور رضائے الٰہی کی ہی بنیاد پر عمل کرتا ہے، اور اس کی رہنمائی وحی سے ہوتی رہتی ہے، اپنی ذاتی مصلحت اور خواہش سے نہیں کرتا، لیکن یہ بہت اچھا ہوا کہ بات کہی گئی اور آپ ﷺ نے اس الجھن کو صاف کردیا، اور ایسے الفاظ میں صاف کیا جو پتھر جیسے دلوں کو بھی پگھلا دے چنانچہ حضرات انصار یہ سنکر تڑپ اٹھے اور خوشی کے آنسوؤں سے اس کا اظہار کیا۔

عمرۂ جعرانہ

ان مہمات سے فارغ ہونے کے بعد آپ ﷺ نے عمرہ کیا جو مکہ میں اپنے داخلہ کے وقت نہ کرسکے تھے، اب اس کا موقع تھا، اس لئے آپ نے اختیار فرمایا، یہ عمرۂ جعرانہ کے نام سے ذکر کیا جاتا ہے، عمرہ سے فراغت کے بعد آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے، یہ ماہ ذی قعدہ ۸ھ کا واقعہ ہے(۱)۔

تبوک کی مہم ۹ھ

رجب ۹ھ کو آپ ﷺ کو یہ خبر ملی کہ رومی فوجیں عرب کی شمالی سرحدوں پر حملہ کی تیاری کررہی ہیں، اور عربوں میں سے ان کے ہم مذہب عیسائی قبائل لخم، جذام، عاملہ، غسان وغیرہ ان کے ساتھ ہیں، رومی بادشاہ ہرقل نے جنگ کی ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے سپاہیوں کی ایک سال کی خوراک کا انتظام بھی

---

(۱) سیرت ابن ہشام، ج:۲/ ۵۰۰۔

کرلیا ہے، اور فوج کو سال بھر کی تنخواہیں بھی دے دی ہیں اور ان کا ہراول دستہ ''بلقاء'' تک آگیا ہے (۱) گویا وہ اس ناکامی کا بدلہ لینا چاہتے تھے جو بمقام موتہ قیصر روم اور اس کی فوج کو ہوئی تھی۔

غرض آپ ﷺ تیس ہزار فوج کے ساتھ مدینہ سے تبوک کے لئے روانہ ہوئے، موسم سخت گرم تھا اور مدینہ کے کھجوروں کے باغات کے پھل لانے کا بھی زمانہ تھا، مدینہ کے باشندوں کا عموماً اسی پر اقتصادی سہارا تھا اور ان میں علی العموم غربت تھی، لہذا ان کے لئے سب سے سخت مرحلہ تھا، کہ اس سب کو چھوڑ کر چلے جائیں، لیکن ایمان کی طاقت غالب تھی، لہذا وہ سب تیار ہو گئے، لشکر اسلام کے پاس مال کی کمی تھی، لہذا جنگ کی ضرورتوں کے لئے چندہ کیا گیا، جس سے جو بن پایا اس نے دیا، حضرت عمر کے پاس جو کچھ تھا، اس کا آدھا لے آئے اور آدھا گھر والوں کی ضرورت کے لئے چھوڑ آئے، حضرت ابوبکر سے حضور ﷺ نے دریافت کیا کہ گھر میں کیا چھوڑ کر آئے ہو، انہوں نے کہا: ''صرف اللہ ورسول کا نام'' بہر حال ان سخت حالات میں مسلمان رومیوں کے مقابلہ کے لئے نکلے، لشکر اسلام میں سواریوں کی بڑی قلت تھی، ۱۸ شخصوں کے لئے ایک اونٹ مقرر تھا، رسد کے نہ ہونے سے اکثر جگہوں پر درختوں کے پتے کھانے پڑے، جس سے ہونٹ سوج گئے تھے، پانی بعض جگہ ملا ہی نہیں، اونٹوں کو جو سواری کے لئے پہلے ہی سے کم تھے، ذبح کر کے ان کی امعاء کا پانی پیا کرتے تھے، راہ میں وہ عبرتناک مقامات تھے جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے، یعنی قوم ثمود کے مکانات جو پہاڑوں میں تراش کر بنائے گئے تھے، چونکہ اس مقام پر عذاب الٰہی نازل ہو چکا تھا آپ ﷺ نے حکم دیا کہ کوئی شخص یہاں قیام نہ کرے، نہ پانی پئے اور نہ کسی کام میں لائے، الغرض صبر و استقلال سے ساری تکلیفوں کو

---

(۱) زاد المعاد: ۳/ ۵۲۷۔

برداشت کرتے ہوئے تبوک تک پہونچ گئے۔

تبوک پہونچ کر حضورﷺ نے بیس دن تک قیام کیا، ایلہ کے حاکم یوحنہ بن روبہ نے جو سرحدی علاقوں کے حکام میں سے تھا، حاضر خدمت ہو کر آپﷺ سے صلح کرلی اور جزیہ دینا منظور کیا (۱) جرباء اور اذرح کے عیسائی بھی حاضر ہوئے اور جزیہ پر رضامندی ظاہر کی، رومیوں پر مسلمانوں کی اس پیش قدمی کا یہ اثر ہوا کہ انہوں نے اس کا جواب کسی جوابی حملہ اور پیش قدمی، فوجی نقل وحرکت اور سرگرمی سے نہیں دیا، بلکہ انہوں نے عرب پر حملہ آور ہونے کا ارادہ ہی ترک کردیا اور ایک طرح کی پسپائی اور خاموشی اختیار کرلی اور مسلمانوں کی طاقت کا جتنا اندازہ انہیں اس وقت ہوا اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا، البتہ دومۃ الجندل کے حاکم اکیدر بن عبدالملک الکندی نصرانی کی طرف سے جو رومی فوجوں کا پشت پناہ تھا، حملہ کی ضرور اطلاع ملی، آپﷺ نے اس کی سرکوبی کے لئے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو پانچ سو سواروں کے ساتھ روانہ فرمایا، حضرت خالدؓ نے اس کو گرفتار کرکے آپﷺ کی خدمت میں بھیجا، آپﷺ نے اس کا خون معاف کردیا، اور جزیہ پر اس سے مصالحت کرلی اور اس کو آزاد کردیا (۲) اور آپ پورا ایک ماہ مدینہ سے باہر رہکر مدینہ واپس تشریف لائے۔

سچائی اور اعتراف قصور کی برکت

تبوک کا یہ واقعہ جو باقاعدہ کسی جنگ کے بغیر انجام پایا، متعدد قسم کے حالات اور خصوصیات کا حامل رہا، ایک تو یہ کہ بڑے سخت گرمی کے موسم میں پیش آیا، جس میں شہر کے باغات کے اندر کے خوشگوار موسم اور گھروں کے آرام سے نکل کر خشک اور گرم صحراؤں سے گذرنا تھا اور مدینہ منورہ کے باغات کے پھلنے کا وقت بھی یہی تھا، ایک طرف ان کی دیکھ بھال اور سب چھوڑ کر طویل فاصلہ کی مہم پر جانا بڑے ایمان کی بات

(۱) زادالمعاد: ۳/ ۵۳۷۔ (۲) سیرت ابن ہشام: ۲/ ۵۲۵-۵۲۷۔

تھی، وہ لوگ جو اپنے کو ظاہراً مسلمان پیش کرتے تھے اور اپنے کفر کو چھپاتے تھے، ان کا نفاق اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اس وقت کھلے طور پر ظاہر فرمادیا کہ انہوں نے مختلف بہانے کرکے ساتھ جانے سے اپنے کو بچالیا، چنانچہ قرآن مجید میں اس موقع کے سلسلہ میں جب آیات نازل ہوئیں تو ان کی کھلی ہوئی مذمت کی گئی ان کے ساتھ ساتھ چند افراد ایسے بھی تھے کہ جو منافق تو نہ تھے، لیکن بعض موانع کی وجہ سے بلا کسی برے ارادہ کے جانے سے رہ گئے تھے، ان کا امتحان دوسرے طریقہ سے ہوا، یعنی شہر کے اندر ان کے بائی کاٹ کا حکم دیا گیا اور وہ لوگ پورے چالیس روز اپنے ساتھیوں، عزیزوں وغیرہ سے ربط وتعلق اور عورتوں سے محروم رہے اور اس درمیان میں ان کو بتایا بھی نہیں گیا کہ یہ بائیکاٹ کب تک کے لئے ہے، چنانچہ وہ نفسیاتی کرب میں بھی رہے۔

دراصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کو ان کے ایمان ویقین کو مضبوط کرنے کے لئے اس طرح کے امتحانات سے گزارتے تھے، ان سے گزر جانے والا اس خالص سونے کی طرح نکھر جاتا ہے جو کہ بھٹی میں سے گزر کر خالص بنتا ہے، اس طرح کا واقعہ حضرت کعب بن مالک کی ہی زبان سے سنئے:۔

''حضرت عبداللہ بن کعب بن مالکؓ سے روایت ہے (جب کعب بن مالک نابینا ہوگئے تو یہی بیٹے ان کے ساتھ چلتے تھے) کہ میں نے کعب بن مالک سے سنا ہے، وہ غزوۂ تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہ جانے کا قصہ یوں بیان کرتے تھے کہ میں کسی غزوہ میں کبھی بھی غیر حاضر نہیں رہا سوائے غزوۂ تبوک اور غزوۂ بدر کے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر کی عدم شرکت پر کسی پر عتاب نہیں فرمایا تھا، کیونکہ بات یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان قریش کے شام سے آنے والے قافلہ (کی رکاوٹ کرنے) کے ارادہ سے نکلے تھے (وہ قافلہ تو آپ کے پہونچنے سے قبل آگے نکل گیا لیکن اس بہانہ) اللہ تعالیٰ نے ان کو اور ان کے اصل دشمنوں کو بغیر کسی وقت مقررہ کے

جمع کردیا (اس لئے اس میں متعدد مسلمان شرکت نہ کر سکے کیونکہ اس موقع پر باقاعدہ جنگ کا منصوبہ نہ تھا) البتہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عقبہ واقع منیٰ میں بوقت حج شریک ہوا تھا جب کہ ہم نے اسلام پر عہد کیا تھا اور میں عقبہ کی اس شرکت پر بدر کی شرکت کو ترجیح نہیں دیتا، اگرچہ بدر لوگوں میں زیادہ مشہور ہے۔

میرا قصہ یہ ہے کہ میں جب غزوۂ تبوک میں رسول اللہ ﷺ سے پیچھے رہا، اس وقت مجھ میں قوت بھی تھی اور فراغت بھی، خدا کی قسم میرے پاس اکٹھا دو اونٹ کبھی بھی نہیں ہوئے تھے، لیکن اس غزوہ میں میرے پاس ایک چھوڑ دو دو سواریاں تھیں اور رسول اللہ ﷺ جب کسی غزوہ کا ارادہ کرتے تھے تو کسی اور سمت کے متعلق دریافت فرماتے تھے لوگ سمجھتے تھے کہ آپ کو اسی کی طرف جانا ہے، دفعتہً آپ ﷺ دوسری طرف کا رخ فرمالیتے، لیکن (اس موقع پر اپنی اختیار کردہ سمت) کو ظاہر کردیا (کہ تبوک جانا ہے) کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس غزوہ کی تیاری سخت گرمی میں کی، دور کا سفر تھا، خشک وسخت مسافت تھی اور دشمنوں کی بڑی تعداد کا مقابلہ، اس لیے اس مہم کا اظہار کردیا تھا اور ان کو اس سمت کی خبر دے دی تھی تاکہ پورے طور پر تیاری کرلیں، اس وقت مسلمانوں کی تعداد بہت ہو چکی تھی اور ان کی کوئی فہرست نہ تھی اگر آدمی چھپنا چاہتا تو چھپ جاتا اور کسی کو گمان بھی نہ ہوتا جب تک کہ اس کے بارے میں اللہ کی طرف سے وحی نہ نازل ہوتی۔

آپ ﷺ نے یہ غزوہ اس وقت کیا جب کھجور پک گئے تھے اور سایہ بڑا خوشگوار ہو گیا تھا اور مجھے اس میں بڑا مزا آتا تھا، رسول اللہ ﷺ نے اور مسلمانوں نے سامان سفر شروع کردیا، میں ہر روز صبح کو اسی ارادہ سے آتا کہ میں بھی آپ ﷺ کے ساتھ جانے کی تیاری کروں، لیکن یونہی پلٹ جاتا اور کوئی فیصلہ نہ کرپاتا تھا، میں اپنے دل میں کہتا تھا کہ جلدی کیا ہے، جب بھی ارادہ کروں گا چلا جاؤں گا کیونکہ مجھ میں اس

کی استطاعت ہے، لیکن برابر میرا یہی (لیت ولعل) رہا، یہاں تک کہ سفر کی ہماہمی اور سرگرمی پوری ہوگئی اور رسول اللہ ﷺ اور مسلمان بالآخر روانہ ہوگئے اور اس وقت تک میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کرسکا، صبح کو آتا اور کچھ انتظام کیے بغیر پلٹ جاتا، روزانہ یہی کیفیت رہتی، یہاں تک کہ حضور ﷺ اور مجاہدین بہت آگے تک گئے اور میرے لیے جہاد میں شرکت کرسکنے کا وقت نکل گیا، پھر بھی میں نے ارادہ کیا کہ اب بھی چلا جاؤں اور آپ ﷺ کو پالوں، کاش میں یہی کرتا، لیکن یہ بھی نہ کیا، رسول اللہ ﷺ کے جانے کے بعد جب میں گھر سے باہر نکلتا تھا تو مجھے رنج ہوتا تھا، کہ اس معاملہ میں میرے شریک حال وہی لوگ تھے جو منافق تھے یا معذور، اور مجھے رسول اللہ ﷺ نے اثناء سفر میں یاد نہیں فرمایا، تبوک پہنچ کر آپ ﷺ نے لوگوں سے دریافت فرمایا کہ کعب بن مالک کو کیا ہوا، بنی سلمہ کے ایک آدمی نے کہا یا رسول اللہ ﷺ ان کو اپنی (خوشنما) چادر اور جھک جھک کر اس کے کناروں کو دیکھنے نے اس کی فرصت ہی کہاں دی کہ وہ ہمارے ساتھ آتے، معاذ بن جبلؓ نے کہا: بری بات تم نے کہی، اللہ کی قسم یا رسول اللہ ﷺ! ان میں سوائے بھلائی کے ہم کچھ نہیں پاتے، پھر آپ ﷺ خاموش ہوگئے اور آپ ﷺ اسی حال میں تھے کہ ایک سفید پوش آدمی گرد اڑاتا ہوا آرہا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا ابوخثیمہ! تو وہ ابوخثیمہ ہی تھے، یہ وہی تھے جنہوں نے ایک صاع کھجوروں کا صدقہ کیا، تو ان پر منافقین نے طنز کیا تھا۔

حضرت کعب کہتے ہیں کہ جب مجھے خبر پہنچی کہ رسول اللہ ﷺ تبوک سے پلٹنے والے ہیں تو مجھے فکر شروع ہوگئی اور میں اپنے دل ہی دل میں ترکیبیں سوچنے لگا اور میں اصلاً یہ سوچتا تھا کہ میں کل آپ ﷺ کی ناراضی سے کیسے بچوں گا، میں اپنے گھر والوں میں ہر صاحب رائے سے اس بارے میں مدد چاہتا، جب یہ خبر ملی کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے تو میرا سب سوچا ہوا ذہن سے نکل گیا اور میں نے سمجھ لیا

کہ میں جھوٹی بات بتا کر نجات نہ پاؤں گا، لہٰذا میں نے سچ بولنے کی ٹھان لی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح صبح تشریف لائے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ جب کسی سفر سے پلٹتے تھے تو پہلے مسجد میں آتے تھے، اس میں دو رکعتیں پڑھ کر پھر لوگوں کے پاس بیٹھتے تھے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم فارغ ہوئے تو پیچھے رہ جانے والے آ آ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عذر کرنے لگے اور قسمیں کھانے لگے، وہ کچھ اوپر اسّی آدمی تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ظاہری دعوے قبول کئے، ان سے بیعت لی، ان کے لیے بخشش کی دعا کی اور ان کے دلی بھیدوں کو اللہ کے سپرد کیا، پھر میں آیا، جب میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم غصہ کے انداز میں مسکرائے اور فرمایا آؤ، میں آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیٹھ گیا، آپ نے فرمایا کس سبب سے تم شریک نہیں ہو سکے، کیا تمہارے پاس سواری نہ تھی؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اللہ کی قسم اگر میں کسی دنیا والے کے پاس بیٹھا ہوتا تو اس کی ناراضگی سے عذر کر کے نکل جاتا اس لیے کہ مجھ میں عمدہ طریقہ سے بات کرنے کا سلیقہ ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر آج میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جھوٹ بات کہہ دوں گا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہو جائیں گے مگر قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مجھ سے ناراض کر دے اور اگر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی بات کہہ دوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض تو ضرور ہوں گے لیکن میں اس میں اللہ عزوجل کے انعام کی امید رکھتا ہوں، سچی بات یہ ہے کہ میرے لیے کوئی عذر نہیں تھا، واللہ میں کبھی اتنا فارغ البال نہیں تھا جتنا کہ اس موقع پر تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انہوں نے تو سچی بات کہہ دی، جاؤ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمہارے حق میں کوئی فیصلہ کرے۔

میں اٹھا اور میرے ساتھ ہی بنی سلمہ کے کچھ لوگ بھی اٹھ کر آئے اور کہنے لگے، ہم کو معلوم نہیں کہ اس سے پہلے تم نے کوئی گناہ کیا ہو، تم (اس موقع پر کیسے) عاجز ہو گئے اور کوئی عذر نہ کر سکے، جیسے دوسرے عذر خواہوں نے عذر پیش کئے، اگر تم بھی

کوئی عذر کر دیتے تو رسول اللہ ﷺ کا تمہارے لیے بخشش چاہنا تمہارے گناہ کی معافی کے لیے کافی ہو جاتا، اسی طرح وہ برابر ملامت کرتے رہے، یہاں تک کہ میں نے ارادہ کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف پلٹ جاؤں اور جھوٹ بول دوں، پھر میں نے ان سے کہا: کیا میری طرح کوئی اور بھی ہے، بولے ہاں دو آدمی ہیں، انہوں نے بھی وہی کہا جو تم نے کہا اور ان سے بھی وہی کہا گیا جو تم سے کہا گیا، میں نے کہا وہ کون ہیں؟ بولے ایک تو مرارۃ بن ربیعہ ہیں اور دوسرے ہلال بن امیہ ہیں اور جب میں نے ان دونوں کا ذکر سنا تو گھر چلا آیا، کیونکہ انہوں نے ایسے دو نیک آدمیوں کا ذکر کیا جو بدر میں شریک تھے، وہ دونوں میرے لیے اچھا نمونہ تھے۔

اب رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا کہ ہم تینوں سے کوئی بات نہ کرے تو لوگ کنارہ کش ہو گئے اور ایسا رخ بدلا گویا کبھی جان پہچان تھی ہی نہیں، یہاں تک کہ میرا دل تنگ ہو گیا اور زمین وہ زمین ہی معلوم نہیں ہوتی تھی جس کو میں پہچانتا تھا، اس حالت میں ہم پر پچاس راتیں گزر گئیں، میرے دونوں ساتھی تو اپنے گھروں میں تھک کر بیٹھ گئے اور روتے رہے، لیکن میں جوان آدمی تھا، نکلتا تھا، نماز میں شریک ہوتا تھا، بازاروں میں پھرتا تھا، لیکن ہم سے کوئی بات نہ کرتا تھا، میں مسجد میں آتا تھا، نماز کے بعد رسول اللہ ﷺ جب اپنی مجلس میں تشریف رکھتے میں سلام کرتا اور ان کو دیکھکر دل میں کہتا کیا آپ ﷺ کے ہونٹوں کو جواب دینے میں حرکت ہوئی؟ پھر میں آپ ﷺ کے قریب نماز پڑھتا اور چھپی نظر سے آپ ﷺ کو دیکھتا، جب نماز کی طرف متوجہ ہوتا تو آپ ﷺ مجھ کو دیکھتے اور جب میں آپ ﷺ کی طرف متوجہ ہوتا تو آپ ﷺ مجھ سے بے رخی کرتے۔

مسلمانوں کی بے رخی کو مدت ہو گئی تھی، ایک دن میں ابو قتادہؓ کی طرف گیا وہ

میرے چچازاد بھائی ہوتے تھے اور مجھے بہت محبوب تھے، میں ان کے باغ کی دیوار پھاند کر اندر پہنچا اور ان کو سلام کیا، واللہ انہوں نے میرے سلام کا جواب تک نہ دیا، میں نے کہا: اے ابوقتادہؓ! میں تم سے اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم نہیں جانتے ہو کہ مجھے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت ہے، وہ خاموش رہے، میں نے دوبارہ قسم دی مگر وہ خاموش رہے، پھر میں نے ان کو قسم دی، انہوں نے کہا اللہ اور اس کے رسول ﷺ زیادہ جانتے ہیں، اس وقت میری دونوں آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور میں چلا آیا۔

میں مدینہ کے بازار میں پھر رہا تھا کہ ایک نبطی شام کے نبطیوں میں سے تجارت کا غلہ لے کر آیا، کہتا تھا کہ کوئی شخص مجھے کعب بن مالکؓ کا پتہ دے سکتا ہے؟ لوگ میری طرف اشارہ کرنے لگے، وہ میرے پاس آیا اور غسان کے بادشاہ کا ایک خط دیا، میں نے اس کو پڑھا، اس میں لکھا تھا ''مجھے خبر ملی ہے کہ تمہارے آقا تم سے ناراض ہیں، تم ذلت و ناقدری کی جگہ رہنے پر مجبور نہیں ہو، تم ہمارے پاس آؤ، ہم تمہاری غمخواری کریں گے''، جب میں اس کو پڑھ چکا تو میرے رنج کی کوئی حد نہ رہی، میں نے کہا یہ اور بڑی مصیبت ہے اور میں نے اس خط کو تنور میں جھونک دیا۔

اسی حالت پر چالیس راتیں گزریں، وحی عرصہ سے نہیں آئی تھی، ناگاہ رسول اللہ ﷺ کا ایک قاصد میرے پاس آیا اور کہا: رسول اللہ ﷺ تم کو حکم دیتے ہیں کہ اپنی بیوی سے الگ ہو جاؤ، اور ان کے قریب نہ جاؤ، اسی طرح میرے دونوں ساتھیوں کو حکم پہنچا، میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ تم اپنے میکہ چلی جاؤ اور وہیں رہو جب تک کہ اللہ تعالیٰ اس معاملہ کا فیصلہ نہ کرے، ہلال بن امیہ کی بیوی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں اور کہا: یارسول اللہ ابن امیہ بوڑھے ہیں اور کوئی خادم نہیں، کیا آپ ﷺ ناپسند

کرتے ہیں کہ میں ان کی خدمت کروں، آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، لیکن وہ تم سے قریب نہ ہوں، انہوں نے کہا: خدا کی قسم ان میں کوئی حس وحرکت نہیں، جب سے یہ قصہ ہوا ہے وہ برابر روتے ہی رہتے ہیں۔

مجھ سے میرے گھر والوں نے کہا تم بھی رسول اللہ ﷺ سے اپنی بیوی کے بارے میں اجازت طلب کرو جیسے ہلال بن امیہ کی بیوی نے اپنے شوہر کی خدمت کی اجازت لی ہے، میں نے کہا کہ میں اجازت نہ مانگوں گا، میں نہیں جانتا کہ آپ ﷺ کیا جواب دیں گے، اس لیے کہ میں جوان آدمی ہوں۔

اسی حالت پر ہم نے مزید دس راتیں گزاریں، وہ پوری پچاس راتیں ہوگئیں، میں نے پچاسویں رات کی صبح کو اپنے گھر کی چھت پر نماز پڑھی، میں اسی حالت میں بیٹھا تھا جس کا نقشہ اللہ نے کھینچا ہے، مجھ پر میرا دل تنگ ہوگیا تھا اور زمین وسعت کے باوجود مجھ پر تنگ ہوگئی تھی کہ میں نے کوہ سلع سے ایک پکار سنی، کوئی بلند آواز سے کہہ رہا تھا ''اے کعب بن مالک تم کو بشارت ہو'' یہ سنتے ہی میں سجدہ میں گر پڑا اور میں نے سمجھ لیا کہ مسرت کی گھڑی آگئی۔

صبح کی نماز پڑھ کر رسول اللہ ﷺ نے اللہ عزوجل کی طرف سے ہماری توبہ کی قبولیت کا اعلان کیا، لوگ ہم کو بشارت دینے لگے اور کچھ لوگ میرے دونوں ساتھیوں کی طرف بشارت دینے کے لیے چلے گئے، ایک گھوڑ سوار دوڑتا ہوا آیا اور قبیلۂ اسلم کا ایک آدمی پیدل آیا اور پہاڑ پر چڑھا، اس کی آواز گھوڑے سے بھی زیادہ تیز تھی، جب وہ میرے پاس آیا اور مجھ کو بشارت سنانے لگا تو (خوشی میں) میں نے اپنے دونوں کپڑے اتار کر اس کو پہنا دیئے، واللہ میں اس وقت ان ہی دو کپڑوں کا مالک تھا، پھر میں نے دو کپڑے مستعار لئے اور ان کو پہن کر رسول اللہ ﷺ کے

پاس جانے کے ارادہ سے چلا، لوگ مجھ سے جوق در جوق ملتے تھے اور توبہ کی مبارکباد دیتے تھے اور کہتے تھے توبہ کی قبولیت مبارک ہو، یہاں تک کہ میں مسجد میں آیا، رسول اللہ ﷺ بیٹھے تھے اور لوگ آپ ﷺ کے گرد جمع تھے، طلحہؓ بن عبید اللہ مجھ کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا اور مبارکباد دی، واللہ مہاجرین میں ان کے سوا کوئی نہیں کھڑا ہوا، میں طلحہؓ کا یہ احسان نہیں بھول سکتا، جب میں نے رسول اللہ ﷺ کو سلام کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا (اور آپ ﷺ کا چہرہ مبارک خوشی سے دمک رہا تھا) ''زندگی کا مبارک ترین دن تم کو مبارک ہو'' میں نے کہا یہ آپ ﷺ کی طرف سے ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے، فرمایا: نہیں، بلکہ یہ اللہ عزوجل کی طرف سے ہے۔

جب آپ ﷺ خوش ہوتے تھے تو آپ ﷺ کا چہرۂ مبارک ایسا چمکتا تھا گویا چاند کا ایک ٹکڑا ہے، ہم اس کیفیت کو پہچانتے تھے، میں جب آپ ﷺ کے پاس بیٹھا تو میں نے کہا: یا رسول اللہ میں اس خوشی میں اپنا مال صدقہ کے طور پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے چھوڑتا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا کچھ مال اپنے لیے روک لو تو تمہارے لیے بہتر ہے، میں نے کہا خیبر کا حصہ میں نے اپنے لیے رکھ چھوڑا ہے اور میں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ، اللہ تعالیٰ نے مجھ کو سچائی کے سبب نجات دی ہے، اب میری توبہ کا یہ نتیجہ ہونا چاہئے کہ جب تک زندہ رہوں سچ ہی بولوں اور اللہ کی قسم جب سے میں نے رسول اللہ ﷺ سے سچ سچ کہہ دیا، آج کے دن تک جھوٹ بولنے کا کبھی ارادہ نہیں کیا اور میرے علم میں سچ بولنے میں کسی پر اللہ تعالیٰ نے ایسا فضل نہیں کیا جیسا مجھ پر فرمایا ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ جب تک میں زندہ رہوں گا اللہ تعالیٰ میری حفاظت کرے گا۔

سورہ توبہ کا نزول

جو آیت ہم لوگوں کے متعلق نازل ہوئی تھی وہ یہ تھی:

﴿لقد تاب اللّٰه على النبي والمهاجرين والأنصار الذين اتبعوه في ساعة العسرة من بعد ما كاد يزيغ قلوب فريق منهم ثم تاب عليهم انه بهم رؤوف رحيم، وعلى الثلثة الذين خلفوا حتى إذا ضاقت عليهم الأرض بما رحبت وضاقت عليهم أنفسهم وظنوا أن لا ملجأ من الله إلا إليه، ثم تاب عليهم ليتوبوا إن الله هو التواب الرحيم، يا يهاالذين آمنوا اتقوا الله وكونوا مع الصادقين﴾

(سورۂ توبہ، آیات/ ۱۱۷-۱۱۹)

''اللہ تعالیٰ نے توبہ کی نعمت اتاری نبی پر اورمہاجرین اور انصار پر اوران لوگوں پر جنہوں نے تنگی کے وقت میں آپ کی پیروی کی، قریب تھا کہ ان میں سے ایک جماعت کے دل ثابت قدم نہ رہ جائیں، پھر وہ ان پر مہربان ہوا، بیشک وہ مہربان ہے رحم والا، اوران تین شخصوں پر جن کا معاملہ مؤخر کردیا گیا تھا، یہاں تک کہ زمین باوجود وسعت کے ان پر تنگ ہوگئی تھی اوران پر ان کا نفس تنگ ہوگیا تھا اور انہوں نے جان لیا کہ نہیں پناہ مگر اللہ کی طرف، پھر وہ ان کی طرف متوجہ ہوا تا کہ وہ توبہ کریں، بیشک اللہ توبہ قبول کرنے والا رحمت والا ہے، اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور سچوں کے ساتھ رہو''۔

واللہ اسلام کے بعد سب سے بڑا انعام اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو مجھ سے سچی بات کہلا دی، اگر میں جھوٹ بولتا تو میرا بھی وہی حشر ہوتا جو جھوٹ بولنے والوں کا ہوا، اللہ تعالیٰ نے جھوٹوں کے حق میں بہت ہی سخت وعید فرمائی ہے:

﴿سيحلفون بالله لكم إذانقلبتم إليهم لتعرضوا عنهم فأعرضوا عنهم إنهم رجس وماوٰهم جهنم جزاء بما كانوا يكسبون، يحلفون لكم لترضوا عنهم فان ترضوا عنهم فان الله لا يرضى عن القوم الفٰسقين﴾

(سورۂ توبہ، آیت/ ۹۵-۹۶)

''عنقریب وہ لوگ تم سے اللہ کی قسمیں کھائیں گے جب ان کی طرف پلٹوگے تا کہ ان کو درگزر کرو، پس تم ان سے اعراض کرو، بیشک وہ ناپاک ہیں، ان کا ٹھکانا دوزخ ہے، اس کا بدلہ جوانہوں نے کمایا، قسمیں کھائیں گے تمہارے سامنے تا کہ تم راضی ہو، اگر تم راضی بھی ہوئے تو اللہ فاسق لوگوں سے راضی نہیں ہوتا''۔

حضرت کعبؓ کہتے ہیں کہ پیچھے کردیئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا معاملہ کچھ دنوں کے لیے اٹھا رکھا گیا تھا، ان لوگوں کی نسبت جن کے ظاہری حال پر رسول اللہ ﷺ نے اکتفا کیا، جب انہوں نے قسم کھائی تو ان سے بیعت لی اور ان کے لیے بخشش چاہی اور ہمارے کام کو موخر کردیا، تا آنکہ اللہ تعالیٰ اس میں فیصلہ کرے" (۱)۔

حضرت کعب کے واقعہ میں حضور ﷺ نے جو معاملہ اختیار فرمایا وہ اس معاملہ سے بالکل مختلف تھا جو آپ ﷺ نے منافقین کے ساتھ کیا، آپ ﷺ جانتے تھے کہ وہ لوگ دل سے آپ کے ساتھ نہیں ہیں، لہذا ان کے ساتھ تنبیہ اور سزا کا معاملہ کرنا بے فائدہ ہے، ان کو تو اپنے اعمال کی سزا آخرت میں ملے گی، دنیا میں سزا دینے سے ان کی اصلاح نہیں ہوگی، لیکن حضرت کعب بن مالک اور ان کے دیگر ساتھیوں کے ایمان پر آپ کو اعتماد تھا، ان کی کوتاہی کسی حد تک لاپرواہی اور غفلت کا انداز رکھتی تھی، لہذا ان کی اس کمزوری کی اصلاح کے لئے ذرا سخت رویہ اختیار کرنا مناسب تھا، لہذا پچاس دن تک ان کو نفسیاتی تکلیف سے گذارا اور یہ وحی الٰہی کے مطابق کیا، آپ کے اس عمل سے یہ بات بھی عیاں ہوجاتی ہے۔

غزوہ تبوک کے اثرات

غزوہ تبوک کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ رومی سلطنت جس کا اقبال بام عروج پر تھا اور عربوں پر ان کا بڑا رعب اور خوف تھا، مسلمانوں کے ایمان ویقین اور ان کے عزم و جرأت اور حوصلہ وشجاعت کے سامنے شکستہ دل اور محتاط ہوگئی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:۔

"جزیرۃ العرب کے ان قبائل نیز ان فاتح اور با اقتدار قبائل (جو رومی

---

(۱) صحیح البخاری کتاب المغازی باب غزوہ تبوک، صحیح مسلم، سیرت ابن ہشام: ۲/۵۳۱-۵۳۷، زاد المعاد: ۳/۵۵۲-۵۵۷ ترجمہ اردو از سیدہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ مرحومہ ہمشیرہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔

شہنشاہ سے متعلق اوراس کے ماتحت تھے) کے دلوں پر مسلمانوں کا رعب وداب قائم ہوگیا اوراس کے ذریعہ ان کو یہ موقع ملا کہ وہ دین اسلام کے مسئلے پر سنجیدگی سے غور کریں، اور یہ محسوس کریں کہ وہ کوئی پانی کا بلبلہ نہیں ہے جو تھوڑی دیر کے لئے سطح آب پر ابھرتا ہے، اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہوجاتا ہے۔

مختصر یہ کہ یہ غزوہ سیرت نبوی اور دعوت اسلامی کی تاریخ میں خصوصی اہمیت کا حامل رہا ہے، اوراس سے ان مقاصد کی تکمیل ہوئی جو مسلمانوں اور عربوں کے حق میں بہت دوررس ہے۔ اور جن کا تاریخ اسلام کے تسلسل اور آئندہ پیش آنے والے واقعات پر گہرا پڑا''۔(۱)

حضورﷺ کو مدینہ پہونچ کر مسلمانوں کے تحفظ کے لئے جو تدبیریں اور دشمنوں سے جو مقابلے کرنے پڑے جن کا آغاز ۲ھ میں معرکہ بدر سے ہوا، وہ ۹ھ میں تبوک کے واقعہ پر ختم ہوے، اس طرح آپﷺ نے نبوت کی پوری ۲۳ سالہ مدت میں صرف آٹھ سال کی مدت دشمنوں سے جنگ کرنے کے معاملات میں گذاری، شروع کے ۱۴ سال کی مدت صرف صبر وبرداشت میں گذاری، اور صرف پیغام حق پہونچانے اوراس حق کی پیشکش کرنے پر اکتفا کی، پھر جب باقاعدہ مقابلہ کی ضرورت سامنے آئی تو اس کی ذمہ داری انجام دی، جو صرف ۸ سال کی مدت تک رہی اور کامیابی ملی اور مکمل سربلندی پر ختم ہوئی۔

غزوات کا سلسلہ اس پر ختم ہوا اور مسلمانوں کو اسلامی اصولوں کے مطابق اجتماعی زندگی کا نظام عمل قائم کرنے میں دشمنوں کی ریشہ دوانیوں سے جو رکاوٹ ہوتی تھی ختم ہوئی۔

---

(۱) نبی رحمت، ص: ۴۹۰۔

مسجد ضرار

منافقین ہمیشہ اس فکر میں رہتے تھے کہ مسلمانوں میں کسی طرح پھوٹ ڈال دو ،ایک مدت سے وہ اس خیال میں تھے کہ مسجد قبا کے توڑ پر وہیں ایک اور مسجد اس حیلہ سے بنائیں کہ جو لوگ ضعف یا کسی اور وجہ سے مسجد نبوی میں نہ پہونچ سکیں، یہاں آ کر نماز ادا کرلیا کریں، ابو عامر جو انصار میں سے عیسائی ہوگیا تھا، اس نے منافقین سے کہا کہ تم سامان کرو، میں قیصر کے پاس جا کر وہاں سے فوجیں لاتا ہوں کہ اس ملک کو اسلام سے پاک کردوں، حضور ﷺ جب تبوک تشریف لے جانے لگے تو منافقین نے حضور ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کی کہ ہم نے بیماروں اور معذوروں کے لئے ایک مسجد تیار کی ہے، آپ چل کر اس میں ایک دفعہ نماز پڑھادیں، تو مقبول ہوجائے، حضور ﷺ نے فرمایا: اس وقت میں مہم پر جارہا ہوں، جب تبوک سے واپس پھرے تو مالک بن معن بن عدی کو حکم دیا کہ جا کر مسجد میں آگ لگادیں، اسی مسجد کے بارے میں یہ آیتیں اتری ہیں:

﴿والذين اتخذوا مسجداً ضراراً وكفراً وتفريقاً بين المؤمنين وإرصاداً لمن حارب الله ورسوله من قبل، وليحلفن إن أردنا إلا الحسنى والله يشهد انهم لكاذبون لا تقم فيه أبداً لمسجد أسس على التقوى من أول يوم أحق أن تقوم فيه، فيه رجال يحبون أن يتطهروا والله يحب المطهرين﴾

[سورہ توبہ:۱۰۹]

اور وہ لوگ جنہوں نے ایک مسجد ضرار اور پھوٹ ڈالنے اور کفر کی غرض سے تیار کی اور اس غرض سے کہ جو لوگ پہلے سے خدا اور رسول سے لڑتے ہیں ان کو ایک کمین گاہ ہاتھ آئے ،اور وہ قسم کھاتے ہیں کہ ہم نے صرف بھلائی کے لحاظ سے ایسا کیا اور خدا گواہی دیتا ہے کہ یہ جھوٹ کہتے ہیں، محمد تو کبھی اس مسجد میں جا کر نہ کھڑا ہو، وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن سے پرہیز گاری پر رکھی گئی ہے وہ اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ تو اس میں نماز پڑھے، وہاں ایسے لوگ ہیں جن کو صفائی محبوب ہے، اور خدا صفائی پسند کرنے والوں کو چاہتا ہے۔(۱)

---

(۱) سیرۃ النبی: ۱/ ۳۳۸۔

زکوۃ کی فرضیت

اسی سال (۹ھ میں) زکوۃ کا حکم نازل ہوا، زکوۃ کا مطلب یہ تھا کہ خوشحال شخص جب اسکی خوش حالی ایک خاص حد تک پہونچ جائے تو وہ اپنے مال میں سے ایک حصہ نکال کر غریبوں کی مدد کرے اور اس کو دیگر فرائض کی طرح ایک فرض قرار دیا گیا اور اسلام کے پانچ ارکان میں سے چوتھا رکن قرار پایا، پہلا رکن عقیدۂ توحید، دوسرا رکن نماز، تیسرا رکن رمضان کے روزے، چوتھا رکن زکوۃ اور پانچواں رکن حج کی استطاعت ہو تو عمر بھر میں ایک مرتبہ حج کرنا۔

زکوۃ کی فرضیت کے لئے خوش حالی کی ایک حد مقرر کی گئی، اس حد تک خوشحالی نہ ہونے پر زکوۃ فرض نہیں ہوتی اور اس قدر خوش حالی ہو تو غریبوں کے لئے اپنے اس بڑھے ہوئے مال سے ڈھائی فیصدی کے قریب رقم نکالنا اور غریبوں میں بانٹنا ضروری اور فرض ہو جاتا ہے، اس طرح اسلام غریبوں کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کرنے کی خصوصیت رکھنے والا مذہب قرار پاتا ہے، اس میں دیگر انسانوں کو اپنا بھائی سمجھتے ہوئے ہمدردی کرنے کی خصوصیت کے علاوہ یہ خصوصیت بھی ہے کہ اپنے پروردگار کی عطاء کردہ نعمتوں پر اسکا شکر کیا جائے اور اس کی مخلوق کے ساتھ ہمدردی کی جائے اور اس کو اس کی عبادت قرار دیا گیا۔

اصلاح ودعوت کے کام میں سخت حالات کا اختتام

حضور ﷺ کی حیات طیبہ کا یہ ۶۲ واں سال تھا، آپ ﷺ نے عمر کی ۴۰ سالہ مدت میں جو نبوت ملنے سے قبل کی تھی ایسی ستھری اور بے داغ اور اعلی صفات کی زندگی گزاری کہ آپ کے اعزہ اور اہل وطن پوری طرح مداح اور پسند کرنے والے تھے، پھر نبوت ملی تو آپ ﷺ نے دوسروں کی اصلاح کا کام شروع کیا، اس میں لوگوں کی

مخالفت سے سابقہ پڑا اور بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑیں، اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ۲۳ سال گزرے، ان میں ۱۴ سال صبر و برداشت کے ساتھ دین کی تبلیغ اور دعوت میں گذرے، اور اس دوران جو جو تکلیفیں دی گئیں ان کو برداشت کیا اور جواب نہیں دیا اور صبر کرتے رہے اور جب قتل کردئے جانے کی سازش ہوئی تو وطن چھوڑ کر دوسرے شہر میں چلے گئے اور جب وہاں دشمن کے حملہ کا خطرہ ہوا، تو حملہ کا جواب دینے کی اجازت ملی اور دشمن کی طرف سے کارروائی مزید خطرناک ہوئی تو کھل کر جنگ کرنے کی اجازت ملی اور مدینہ منتقل ہونے کے بعد دس سالہ مدت میں سے آخری ۸ سال میں سے صرف ۷ سال کی مدت ایسی گزری کہ مسلح طریقہ سے مقابلہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا، اس میں بھی دو سال معاہدۂ امن اور صلح کے گزرے، اس اعتبار سے صرف ٦ سال دشمنوں سے مقابلہ میں گزرے، اور ان مقابلوں میں مسلمانوں کو عموماً کامیابی ملتی رہی اور آپ کی دعوت حق کا کام بڑھتا اور کامیاب ہوتا رہا حتی کہ آپ کو پوری طرح غلبہ حاصل ہوگیا اور مخالفوں کی طاقت ٹوٹ گئی، جنگوں کے چھ برسوں میں آپ کا جو رویہ رہا وہ آپ کی امن پسندی اور رحمدلی کی اعلی مثال ہے، اس پوری مدت میں انسانی جان کے نقصان کے لحاظ سے جو نقشہ سامنے آتا ہے وہ امن کے مغربی دعویداروں کے لئے یقیناً ایک عجیب و غریب انکشاف بن سکتا ہے۔

وہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں دشمنوں سے مقابلہ کرنے کی ۸۲ کوششوں میں (جن میں ۲۸ میں آپ نے خود قیادت کی) صرف ۲۵۹ مسلمان اور ۷۵۹ مخالفین کام آئے، ان تمام مقابلوں میں صرف ۱۱ مسلمان قید ہوئے البتہ مخالفین کے ۶۵۶۴ افراد قیدی بنائے گئے، جو فدیہ سے یا فدیہ کے بغیر آزاد کردیے گئے اور ان میں سے جو بلا کسی شرط کے چھوڑے گئے ان کی تعداد [illegible] ہے اور ان کے ساتھ کوئی انتقامی کاروائی نہیں کی گئی، زخمیوں کی تعداد بھی

فریقین کو ملا کر ۳۰۰ کے قریب ہوئی (۱) شدت پسند دشمن قیدیوں کے ساتھ بھی آپ کی طرف سے بہت نرم معاملہ کیا گیا اور یہ اسلام کی خصوصیت ہے کہ اس میں جنگ کی کارروائی محض اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے نہیں، بلکہ حق وصداقت کی زندگی قائم کرنے کے لئے ہوتی ہے، اس میں دشمن اگر خود حق کو نافذ کرنا قبول کر لے تو پھر مسلمان اس سے مزاحمت نہیں کرتے، اور اس کو اس کام کا موقع دیکرا الگ ہو جاتے ہیں اور صرف اس سے ایک فدیہ لیتے ہیں، بصورت دیگرا اگر دشمن حق کو قبول نہ کرے اور اصلاح وحق کو نافذ کرنے کو روکے تو اس کے لئے مسلمانوں کو جبر اور ضرورت پڑے تو جنگ کی حکمت عملی اختیار کرنا ہوتی ہے، قرآن مجید میں آتا ہے:

﴿الذین إن مكناهم فى الأرض أقاموا الصلوٰة و آتوا الزكوٰة، و أمروا بالمعروف و نهوا عن المنكر، و لله عاقبة الأمور﴾ [سورہ حج:۴۱]

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم زمین میں ان کے پاؤں جمادیں (یعنی اقتدار عطاء کریں) تو یہ (اپنے رب کی عبادت یعنی) نمازیں قائم کرینگے، اور (اورغریبوں کی مالی مدد میں) زکوۃ دینگے اور اچھے کاموں کا حکم کرینگے اور برے کاموں سے منع کرینگے، تمام کاموں کا انجام اللہ تعالی کے اختیار میں ہے۔

اور جنگ کی اجازت اور حکم دینے کے سلسلہ میں اس طرح فرمایا گیا ہے:

﴿وقاتلوهم حتى لاتكون فتنة، و يكون الدين لله، فإن انتهوا فلا عدوان إلا على الظالمين﴾

[سورہ بقرہ:۱۹۳]

ان سے لڑو حتی کہ فتنہ یعنی دین حق پر عمل کرنے میں جو رکاوٹ ڈالی جارہی ہے وہ دور ہو جائے، اور دین کا وہ طریقہ جو اللہ تعالی کا ہے قائم ہو جائے، اگر یہ رکاوٹ ڈالنے سے رک جائیں (تو تم بھی رک جاؤ) اقدام کے لئے آگے بڑھنا تو صرف ظالموں ہی کے خلاف کیا جائے گا۔

---

(۱) مجلہ صفا ٹائمس، نئی دہلی، جلد نمبر:۲، شمارہ نمبر:۵، اپریل - جون ۲۰۰۶ء ص

آخری نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جامع کمالات شریعت اور جامع صفات انسانی زندگی کو پیش نظر رکھتے ہوئے پیغام الٰہی پہونچایا اور رہنمائی کی اور جب آپ کو طاقت کے استعمال پر مجبور کردیا گیا تو اس پر بھی عمل کیا، جس کی ضرورت اور اہمیت خود اللہ تعالی نے اپنے کلام میں اس طرح بیان کی:

﴿ولولا دفع اللّٰہ الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع وبيع وصلوٰت ومساجد يذكر فيها اسم اللّٰہ كثيراً﴾

اور اگر خدا لوگوں کو ایک فریق کو اس کے بالمقابل دوسرے فریق سے رفع نہ کرتا تو دیگر لوگوں کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں خدا کا بہت سا ذکر کیا جاتا ہے ویران ہو چکی ہوتیں [سورہ حج: ۴۰]

اور آپ نے اپنے بعد والوں پر بھی اسی کی ذمہ داری ڈالی ہے کہ وہ انسانوں کو خیر کے کاموں اور خیر خواہانہ انسانی زندگی کی طرف لانے کا کام برابر جاری رکھیں اور اس کو وہی کام بتایا جس کے لئے انبیاء مبعوث کئے جاتے رہے ہیں اور دین کا وہ نقشہ پیش کیا جو قیامت تک آنے والے انسانوں کے لئے صرف باعث نجات ہی نہیں بلکہ ان کی سہولت کے لحاظ سے لائق عمل بھی ہے، اور اس کی ہدایت آپ کو آخری اور جامع ومانع نبی کے ذریعہ دی۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں کی جنگوں کے درمیان موازنہ

مسلمانوں کی جنگوں کو مسلمانوں کا ظالمانہ عمل کہنے والوں کے سامنے یہ حقیقت واضح کرنے کی ہے کہ تمام جنگوں میں جو انسانی رواداری اور حسن اخلاق کا معاملہ رہا اس کا دوسرے مذھبوں اور تمدنوں کے درمیان ہونے والی جنگوں میں پیش آنے والے حالات سے موازنہ کیا جائے تو حیرت ناک نمونہ سامنے آتا ہے، اسلام

کے علاوہ کوئی بھی مذہب، کوئی بھی قوم، کوئی بھی معاشرہ، سوسائٹی اور امن کے لئے کوشاں کوئی ادارہ آج تک اس طرح کا امن پسندی اور حق طلبی کا انقلاب برپا نہیں کرسکا، اور یہ انقلاب بھی ایسا انسانی انقلاب تھا کہ اس کے نتیجہ میں حضورﷺ نے ایسے نظام کی بنیاد رکھ دی جس کی برکات صدیاں گزر جانے کے بعد بھی انسانی سینوں میں محسوس کی جاسکتی ہیں۔

جنگ بدر کے ۷۲ قیدیوں میں سے ۷۰ کو حضورﷺ نے جرمانہ لیکر آزاد کردیا، ان قیدیوں کو مہمانوں کی طرح رکھا گیا، بہت سے قیدیوں کا اعتراف موجود ہے کہ مسلمان اپنے بچوں سے بڑھ کر ان کے آرام وراحت کا اہتمام کرتے تھے۔

جنگ بدر کے بعد غزوۂ بنی المصطلق میں سو سے زائد مرد وعورت قید ہوئے، وہ سب بلا کسی معاوضہ کے آزاد کردئے گئے۔

حدیبیہ کے میدان میں ۸۰ حملہ آور گرفتار ہوئے، ان کو آپﷺ نے بلا کسی شرط وبلا کسی جرمانہ کے آزاد کردیا۔

جنگ حنین میں چھ ہزار زن ومرد بلا کسی شرط وبلا کسی معاوضہ کے آپﷺ نے آزاد فرمادیا، بعض اسیروں کی آزادی کا معاوضہ حضورﷺ نے اپنی طرف سے اسیر کنندگان کو ادا کیا تھا، اور پھر اکثر قیدیوں کو خلعت وانعام دیکر رخصت کیا۔

حضورﷺ کا قاعدہ تھا کہ عورت، لڑکے، اور بوڑھوں کو قتل کرنے سے منع فرماتے تھے، جب سریہ بھیجتے تو ان لوگوں کو تاکید کردیتے کہ منکرین خدا کو قتل کرنا ہو، تو مثلہ نہ کرو، یعنی ان کے جسم کے اعضاء کو نہ بگاڑو، کفار سے جب کچھ معاہدہ کرو تو بد عہدی نہ کرو، عورت، بچے اور بوڑھوں کو قتل نہ کرو۔

جس بستی یا قبیلہ سے اذان کی آواز سنی جائے یا اسلام کی کوئی علامت معلوم ہو، وہاں حملہ کرنے کی اجازت نہ تھی، اور جو شخص کلمہ پڑھ لیتا گو اس نے تلوار کے خوف

ہی سے پڑھا ہو اس کو قتل کرنے سے منع فرماتے تھے، صحابہ کہتے تھے کہ یا رسول اللہ اس نے موت کے ڈر سے کلمہ پڑھا تھا، آپ ﷺ فرماتے کہ کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا؟ حضرت اسامہ بن زید اور محلم بن جثامہ پر حضور ﷺ اسی بنا پر ناراض ہوئے، اور آپ ﷺ نے اسامہ بن زید سے وعدہ لیا کہ میرے سامنے یا میرے بعد کبھی کسی ایسے دشمن شخص کو قتل نہ کرنا جو کلمہ پڑھ لے، حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے اس بارے میں بد احتیاطی ہو گئی تو آپ ﷺ ان سے سخت ناراض ہوئے (۱)۔

سیرت ابن کثیر میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ حنین میں اپنے اصحاب و رفقاء کو حکم دیا کہ کسی بچہ، عورت، مرد یا غلام جو کام کاج کے لئے ہو ہاتھ نہ اٹھایا جائے، آپ ﷺ نے ایک عورت کے قتل پر جو حنین میں ماری گئی افسوس کا اظہار کیا (۲)۔

رسول اللہ ﷺ کی اس اعلیٰ ترین تعلیم و تربیت ہی کا اثر تھا کہ خلفاء راشدین کے عہد میں اگرچہ عراق و شام، مصر و عرب، اور ایران و خراسان کے سیکڑوں شہر فتح کئے گئے مگر کسی جگہ بھی حملہ آوروں، جنگ آزماؤں، یا رعایا کے ساتھ اس طرح کی سختی اور زیادتی کا برتاؤ نہیں ملتا، جو اس زمانہ کی جنگوں میں رائج تھا، مغلوب دشمن سے تاوان جنگ لینے کا بھی کہیں اندراج نہیں ملتا۔

ذرا ایک طرف اسلام کی ان جنگوں کے حالات سامنے رکھتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں پر دہشت گردی کا الزام لگانے والی اقوام کی تاریخ ملاحظہ کریں تو زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوگا۔

فرانس میں جمہوری انقلاب برپا ہوا اور جب فرداً فرداً انسانوں کو قتل کرنا وہاں ممکن نہ رہا تو گلوٹیں ایجاد کرنا پڑیں جو بیک وقت بیسیوں انسانوں کے سروں کو ناریلوں کی طرح اڑا دیتی تھیں، اس جمہوری انقلاب نے مورخین کے اندازے کے

---

(۱) اصح السیر، ص: ۳۴۵-۳۴۶۔ (۲) سیرت ابن کثیر، ۳/ ۶۳۸۔

مطابق ۲۶ لاکھ انسانوں کو گلوٹوں کی بھینٹ چڑھادیا، اسی طرح روس میں اشتراکی انقلاب نے ایک کروڑ سے زائد انسانوں کو قتل وغارت گری اور برفانی قید خانوں کے حوالے کردیا۔

۱۹۱۴ء کی ہولناک جنگ عظیم میں یورپی ممالک نے جرمنی سے اپنے علاقوں کی آزادی کے لئے قتل وغارت گری کا بازار گرم کیا، اس میں روس کے ۱۷ لاکھ، فرانس کے ۱۳ لاکھ ۷۰ ہزار، اٹلی کے ۴ لاکھ ۲۰ ہزار، آسٹریلیا کے ۸ لاکھ، برطانیہ کے ۷ لاکھ ۲۰ ہزار، بلغاریہ کے ایک لاکھ، رومانیہ کے ایک لاکھ، آسٹریا کے ایک لاکھ، ترکی کے ۲ لاکھ پانچ ہزار، بلجیم کے ایک لاکھ ۲ ہزار، سرو ماہ نٹی نیگرو کے ایک لاکھ، اور امریکہ کے ۵۰ ہزار انسان قتل ہوئے، مجموعی تعداد ۷۳ لاکھ ۳۸ ہزار بنتی ہے، یہ جنگ چار سال چلی، اور مذکورہ تعداد یعنی ۷۳ لاکھ سے زیادہ لوگ مارے گئے، دوسری طرف اسلام کی ۸ سالہ جنگوں کا نقشہ دیکھئے تو نظر آئیگا کہ ان میں صرف ایک ہزار سے کچھ زیادہ افراد اس میں کام آئے، جن میں مسلمان اور ان کے دشمن کے افراد شامل ہیں، پھر بھی نبی اسلام اور اسلام پر ظلم کا الزام وہ لوگ لگاتے ہیں جنہوں نے لاکھوں انسانوں کو محض غیر علاقہ پر قبضہ کرنے یا اپنے علاقہ سے دشمن کو ہٹانے کے لئے موت کی بھینٹ چڑھادیا، اور گزشتہ صدی کی پہلی جنگ میں جو ۱۹۱۴ء میں ہوئی اور اسی صدی کی دوسری جنگ میں جو ۱۹۳۸ء ۱۹۴۲ء تک رہی طاقت کے نشہ میں مست ان عالمی طاقتوں نے علاقہ پر قبضہ جمانے کے لئے اربوں اور کھربوں پاونڈ اور ڈالر کا بھاری نقصان کیا، اور اس میں مختلف ملکوں کے جو انسان صفحۂ ہستی سے مٹ گئے، ان سب کی مجموعی تعداد ایک کروڑ ۲۶ لاکھ بنتی ہے، مالی طور پر صرف امریکہ کا ۵۰۰ بلین ڈالر خرچ ہوا، جب کہ ایک کروڑ سے زائد شہری گھروں سے بے گھر ہو گئے، لاکھوں انسان معذور ہو گئے اور لاکھوں بچے سمی جراثیم کے اثرات کی وجہ سے آج بھی معذور پیدا ہو رہے ہیں، پھر مزید یہ کہ

آمنے سامنے کی جنگ تو بہادری کی جنگ سمجھی جاتی ہے، مگر امریکہ نے اس جنگ عظیم دوم میں بغیر مقابلہ کے ہیروشیما اور ناگاساکی کی پرامن آبادی پر ایٹم بم گرا کے ۲لاکھ ۵۷ ہزار انسانوں کو لمحہ بھر میں ہوا میں تحلیل کر دیا، ۱۲ ہزار ٹن وزنی بم شہری آبادیوں پر برسائے گئے جن کی وجہ سے درجہ حرارت ۵لاکھ ڈگری فارن ہائیٹ سے زیادہ ہوگیا، ایسے میں انسانیت کا کیا حال ہوا ہوگا، تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، اس کے بعد بھی یہ مار دھاڑ کا سلسلہ جاری رکھا۔

اور یہ سب کسی انسانی خیر خواہی یا کسی اعلی مقصد سے نہیں بلکہ صرف علاقہ پر غیر کا قبضہ ہٹانے اور اپنا قبضہ جمانے کے لئے کیا گیا، دوسری جنگ کی ان سب ہولناکیوں کے بعد جو علاقائی قبضہ کے لئے جنگیں ہوئیں، ان میں ۱۹۵۵ء میں کورین وار میں جو امریکہ کے کوریا پر قبضہ کرنے کے سلسلہ میں ہوئی ۱۵لاکھ انسان قتل ہوئے، ۱۹۹۰ء کی گلف وار میں جو سپر پاور کی سرپرستی میں لڑی گئی ایک لاکھ انسانی جانوں کا ضیاع ہوا، عالمی سپر پاور روس کی مسلط کردہ افغان وار میں جو ۲۵ دسمبر ۱۹۷۹ء سے ۱۹۹۹ء تک ہوئی ۱۰لاکھ سے زائد انسان مارے گئے، اور کروڑوں ڈالر کا نقصان ہوا جب کہ لاکھوں لوگوں کو ابھی تک اپنے گھر کی چھت نصیب نہیں ہوئی (۱)۔

مولانا عبدالماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اخبار ''صدق جدید'' (۱۹؍جون ۱۹۳۱ء) میں برطانیہ وجرمن فوجوں کے طرز عمل کے جو خونریزی اور سفاکی کی عجیب وغریب مثالیں پیش کرتی ہے، خود ان کے جرنل کے حوالہ سے کچھ اقتباسات لئے ہیں جو برائے ملاحظہ پیش ہیں۔

''برطانیہ کے فوجی افسروں کی نگاہ میں اپنے سپاہیوں کی وقعت بس محض ''غذائے توپ'' کی ہے۔ (تحریر جنرل ایلٹ ڈی، اس، او، آسٹریلیا)۔

---

(۱) مجلہ صفا ٹائمس، نئی دہلی، جلد نمبر:۲، شمارہ نمبر:۵، اپریل-جون ۲۰۰۶ء ص:۱۰-۱۱۔

یہ الفاظ برطانیہ کے کسی دشمن کے نہیں، ایک دوست کے، کسی حریف کے نہیں، ایک حلیف کے، زبان سے ابھی کچھ ہی عرصہ ہوا ادا ہوئے ہیں۔

برطانیہ ہی کے ایک فرزند رشید نے فوج کے ایک نامور افسر، برطانیہ کے ایک دلاور سالار عسکر نے کچا چٹھا اپنے قلم سے چھاپ کر شائع کر دیا!

کتاب ''جگ بیتی''، نہیں ''آپ بیتی'' ہے۔ مسموعات کا نہیں، مشاہدات کا مجموعہ ہے۔ کتاب کا مصنف وہ نہیں، جس نے دور بیٹھے سنی سنائی حکایتوں اور روایتوں کو مرتب کر دیا، وہ وہ ہے جو خود جنگ عمومی میں اول سے آخر تک، شروع میں چھوٹے افسر اور آخر میں بڑے افسر کی حیثیت سے شریک رہا۔ پلٹنیں بھرتی کیں، خندقوں میں لڑا، معرکے سر کیے، قلعے فتح کیے، تمغے پائے، خطابات سے سرفراز ہوا۔ کپتان تھا، میجر ہوا، اور بالآخر بریگیڈیر جنرل کے عہدہ پر پہونچا۔ نام ایف. پی گرومیر ہے، اور سی بی سی ایم جی ڈی ایس او کے جنگی خطابات سے ممتاز۔ کتاب کا نام A Brass Nation no man's Land ہے، جو بجائے خود ایک جنگی محاورہ ہے۔ لندن کے پبلشر، جو میتھن کپ نے اول بار اپریل ۱۹۳۰ء میں شائع کیا، مہینوں اور ہفتوں میں نہیں، دنوں میں پہلا ایڈیشن ختم تھا، دوسرا ایڈیشن اور پھر تیسرا ایڈیشن بھی ختم تھے! اس وقت سے لے کر اب تک خدا معلوم کتنے ایڈیشن اور نکل چکے ہیں! اس آئینہ کو ہاتھ میں لیجیے، اور اس میں جنگ فرنگ کا نقشہ ہو بہو ملاحظہ کرتے چلیے، لکھتے ہیں۔

''جنگ کا مقصد، ایسکویتھ اور گرے کی زبان پر ''رفع شر'' تھا، ٹائمس اور ڈیلی میل کے صفحات میں ''اصلاح'' اور محض اصلاح تھا، لیکن خود سپاہیوں کے نام ان کے افسر جو تقریریں کرتے تھے، ان کا نمونہ یہ ہے:

''اپنی انسانیت و شرافت کو بھلا دو، دلوں کو پتھر بنا لو، موت و زندگی کی طرف سے

گونگے بہرے بن جاؤ، یہ جنگ ہے جنگ"۔ (ص:۴۰)

"میرا کام اس وقت یہ ہے کہ ایک ہزار نفوس سے زائد کی ذہنیت، تربیت، سیرت، جلد سے جلد مدت میں بدل کر رکھ دوں۔ دست بدست لڑائی کے لیے خون کا ذوق مجھے پیدا کرنا ہے، اور پروپیگنڈہ کے زہر سے دلوں کو ماؤف کر دینا ہے۔ جرمنوں کی سفاکیاں (حالانکہ میں دل ہی دل میں بہت سی روایتوں کو جھوٹ سمجھ رہا ہوں) ان کا زہریلی گیس استعمال کرنا، فرنچ عورتوں کی عصمت دری کرنا، نرس کیول کا سرکاری قتل، یہ ساری چیزیں اس درندگی کے نشو ونما میں ہو رہی ہیں، جو حصول کامیابی کے لیے لازمی ہے۔ بات بات پر اور بلا وجہ مشتعل ہو جانے کی عادت پیدا کرنی ہے، کہ بغیر اس کے خاطر خواہ نتائج نکل نہیں سکتے، نرم دلوں اور نیک مزاجوں سب پر یہ زہر اتارنا ہے، اور اس کے لیے فوجی گانے اور فوجی باجے سب کام میں لائے جا رہے ہیں۔ لطیف اور مذہبی راگوں کی ممانعت ہے، بجز گرجوں کے اور وہاں بھی جنگی سروں میں اجازت ہے، گرجے تو خوں آشامی کا ذوق پیدا کرنے میں سب سے بڑھے ہوئے ہیں، اور ہم نے ان سے پورا کام بھی لیا"۔ (ص۴۲-۴۳)

"برطانوی سپاہی سے پوری طرح کام لینے کے لیے کہ منافرت کا زہر اس کی رگ رگ میں پوری طرح اتار دیا جائے۔ ہلاک ہونے والوں کی تعداد اس کے سامنے درد و تعلق کے لہجہ میں نہیں، بے التفاتی و بیدردی کے ساتھ بیان کی جاتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ زمانہ آجانے والا ہے اور عنقریب ہی، جب سپاہیوں کے دل میں موت اور سخت سے سخت تڑپا دینے والے زخموں، اور گیس زدہ اعضائے جسم کی کوئی اہمیت ہی نہ رہ جائے گی، بلکہ آپس میں ہنس ہنس کر ان چیزوں کا ذکر کرتے رہیں گے، اور مسرور و مطمئن اس پر رہیں گے، کہ جتنا اپنا نقصان ہوا ہے، اس سے کہیں زیادہ دوسروں کے جسم چیر پھاڑ چکے ہیں، دوسروں کے ہاتھ پیر توڑ چکے

ہیں۔ ستمبر ۱۵ء تک، یہ حالت ہوگئی تھی، کہ جو کچھ بھی ہم کر رہے ہیں سب بجا اور درست ہے، اور جرمنی جو کچھ کر رہا ہے، سب نفرت انگیز ہے، جنگ میں اس کے سوا مفر نہیں، اور دونوں فریق اسی پر عامل ہیں"۔ (ص: ۴۳-۴۴)

"جس طرح ریل کے ڈبہ کو ٹھنڈا اور گرم رکھا جاتا ہے، اسی طرح اس وقت تک میں بھی اپنے جذبات اور اپنے احساسات کو تمام تر اپنے قابو اور تصرف میں لے آیا ہوں۔ خوں ریزی کے وقت خوب گرما گرم ہوں، تدابیر حرب کے وقت بالکل سرد، اور سیر و تفریح کے وقت نیم گرم! اس وقت تک میں رنگ بدلنے میں کامل و ماہر ہو چکا ہوں، اور تمام تر ایک پیداوار جنگ بن کر رہ گیا ہوں!" (ص ۹۲)

لشکری غریب، اتنی ذہانت کہاں سے لا سکتے ہیں۔ وہ جو کچھ سنتے ہیں، اسے مان بھی لیتے ہیں۔ ان سے جو کچھ کہا گیا ہے، اس کا وہ یقین بھی کر چکے ہیں۔ ان کی زبان اور دل ایک ہے۔ وہ پوری طرح اس کے قائل و معتقد ہیں کہ ان کا کام مرنا اور مارنا، کٹنا اور کاٹنا ہے۔ وہ اپنے لیے بھی یہی سمجھتے ہیں، اور اپنے حریف کے لیے بھی یہی! (ص ۲۴)

"مردوں کی طرف کوئی رخ بھی نہیں کرتا۔ جنگ میں آخر لاشیں کس کام آسکتی ہیں؟ اگر قسمت یاوری کر گئی، تو خیر، بعد کو اطمینان ہونے پر کہیں دفنا دیے جائیں گے۔ زخمی گھسل گھسل کر اپنے کو خط سیاہ تک لانے کی کوشش میں ہیں، کتنے ایسے ہیں، جو اسی حال میں پھر گولی کھاتے ہیں، لیکن زیادہ تر تو وہی ہیں، جو دن بھر بے بس و بے کس، کانٹے پڑے ہوئے حلقوموں کے ساتھ، چلچلاتی دھوپ میں، ہذیاں زدہ اور انتہائی کرب کی حالت میں پڑے لوٹتے رہیں گے! میرا اصلی فرض منصبی، جنگ کو سنبھالنا ہے، نہ کہ زخمیوں کی دیکھ بھال کرنا"۔ (ص ۱۰۶)

سفید چمڑے کے مہذبوں کا بے نقاب چہرہ آپ نے دیکھا! نقاب ہٹنے سے پیشتر آپ تصور بھی کر سکتے تھے، کہ اس کے اندر جو چہرہ ہے، وہ اتنا کریہہ، اتنا بد منظر، اتنا ہیبتناک ہوگا؟ ظاہر کے اجالے سے باطن کی تاریکیوں کا آپ خیال بھی کر سکتے

ہیں؟ ''جہاد'' کے ایک دو نہیں، دس بیس، سو، پچاس، جتنے واقعات چاہیے، گن کر ایک طرف رکھیے اور دوسرے پلہ میں صرف ایک جنگ عمومی اور پھر عقیدہ کو نہیں، علم کو، نقل کو نہیں، عقل کو، حکم لگانے دیجئے، کہ شرافت، تہذیب، انسانیت، کس کی، دوڑ دوڑ کر بلائیں لیتی ہے، اور شقاوت، قساوت، درندگی، قتل وغارت، کشت وخون، سنگ دلی اور بیدردی کے منظروں سے طبیعت اُکتا چلی ہو، تو پردہ الٹ کر دیکھئے، رزم میں بزم کے سامان، اور گرجتی ہوئی توپوں کے سایہ میں مے وشاہد کے جلووں کی بھی کمی نہیں! خیال ہوتا ہوگا کہ گولیوں کی بوچھار، سنگینوں کی جھنکار، توپوں کی گرج، کراہتے ہوئے زخمیوں کی آہ وفریاد، سڑے ہوئے، جسموں کی عفونت، اور تڑپتی ہوئی لاشوں کی بھیانک فضا کے درمیان عیش وعشرت کرنے کی فرصت، اور رنگ رلیاں منانے کی فراغت کسے؟ لیکن اقبال فرنگ ہر ناممکن کو ممکن کر دکھاتا ہے، وہ ایک ہی وقت میں تاریخ کا چنگیز بھی ہوسکتا ہے، اور افسانہ کا راجہ اندر بھی!'' (۱)

ہندوستانی مورخ پروفیسر امریش مشرا نے اپنی تازہ تحقیقی کتاب ''War of Civilisation India The Road to Delhi A.D 1857'' میں تاریخی شواہد ودستاویزات اور سرکاری اعداد وشمار کی بنیاد پر لکھا ہے کہ ''انگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں دس ملین (ایک کروڑ) ہندوستانیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، اور یہ سب کے سب بے گناہ تھے، ان کا قصور صرف یہ تھا کہ انہوں نے ملک کی آزادی کی خاطر برطانوی سامراج کے ظلم وتشدد کے خلاف تحریک شروع کی تھی، لیکن سفاک انگریزوں نے اپنے اقتدار کی حفاظت وبقا کی خاطر بے گناہ ہندوستانیوں (ہندوؤں ومسلمانوں) کو بے رحمی سے قتل کر دیا اور یہ خونی سلسلہ ۱۸۵۷ سے ۱۸۶۷ء تک جاری رہا''۔

حضور ﷺ اور مسلمانوں نے اپنی دعوتی اور دینی مہم میں جو ۲۳ سال رہی، آخری ۸ سال کی مدت میں جو مقابلے کئے اس میں صرف ایک ہزار آدمی کام آئے، اور اسلام پر الزام لگانے والے جمہوریت اور آزادی کے دعوے کرنے کے باوجود اپنی

(۱) ماخوذ ''سچ'' ۱۹؍ جون ۱۹۳۱ء

جنگوں میں لاکھوں سے زیادہ انسانوں کو مار دیتے ہیں، اور اس کے نتیجہ میں قوموں اور ملکوں میں سخت انتشار و بے چینی کی فضا بنا دیتے ہیں اور مسلمانوں نے اپنے رسول اللہ ﷺ کی سرکردگی میں صرف ۸ سال کے مقابلوں میں پورے جزیرۃ العرب کو امن کا گہوارہ بنا دیا۔

اس سب کے بعد مغربی میڈیا اسلامی دنیا کے کسی حصہ میں دو چار آدمیوں کے غیر معلوم ہاتھوں سے مارے جانے پر ایسا واویلا مچاتا ہے کہ یورپ میں لاکھوں انسانوں کے مارے جانے سے زیادہ ظلم برپا ہوا، اور کوئی بھی دہشت گردی کا واقعہ دنیا میں کہیں ہوتا ہے تو تحقیق سے قبل ہی فوراً کہا جاتا ہے کہ مسلمان نے کیا ہوگا، اور مسلمان کون ہے؟ مسلمان وہ ہے جو اپنے نبی ﷺ کا ماننے والا اور ان کے حکموں پر اپنی جان قربان کرنے والا، اور نبی کی شخصیت وہ شخصیت ہے جس نے خود رحم و ہمدردی اپنے دشمنوں تک سے انتہائی غیر معمولی طریقہ سے روا رکھی اور اپنے ماننے والوں کو اس کو اختیار کرنے کی تلقین کی اور مسلمانوں نے ساری کمزوریوں کے باوجود بہت کچھ اسی پر عمل کیا، مسلمانوں کی بعد کی جنگوں کا مطالعہ کیجئے یہی بات نظر آئیگی جس کا اعتراف غیر مسلم مورخوں نے بھی کیا ہے اور مسلمانوں پر الزام لگانے والے اس مغربی میڈیا نے اس بات کو دبایا اور چھپایا کہ ان کے مغربی ممالک میں اب بھی محض سیاسی اغراض کے لئے لاکھوں کا خون بآسانی کرا دیا جاتا ہے، سچ کہا عربی شاعر نے:

وقتل امرئ في غابة جريمة لا تغتفر

وقتل شعب آمن قضية فيها نظر

(ترجمہ) اگر ان کا ایک آدمی بھی کسی نامعلوم جگہ جنگل میں مار دیا جاتا ہے، تو کہتے ہیں کہ یہ بہت بڑا جرم ہوا جو کسی طرح لائق معافی نہیں اور دوسروں کی پوری پوری قوم کو اس کے پر امن ہونے کے باوجود ختم کر دیں تو اس پر اعتراض کرنے پر صرف اتنا کہیں گے کہ ہاں یہ مسئلہ غور کرنے کے قابل ہوسکتا ہے۔

☆☆☆

وفود کی آمد اور اسلام کا قبول عام ۹ھ

حضور ﷺ اور مسلمانوں کو ۲ھ سے ۹ھ تک دشمنوں کی کارروائیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے پورے عرب قبائل کے سامنے آپ کی تابعداری کے علاوہ دوسرا حل باقی نہیں چھوڑا، حتی کہ ۹ھ میں مقام تبوک میں رومی امپائر کے بھی مقابلہ سے دست بردار ہو جانے پر مسلمانوں کے لئے جنگ کے خطرات ختم ہوگئے اور آپ کی دعوت کو اور ہدایت عام کرنے کے عمل کو روکنے کی آپ کے مخالفوں کی طرف سے جو مسلح کاروائیاں ہو رہی تھیں ختم ہوگئیں، تو پورے جزیرۃ العرب میں آپ کی رہبرانہ حیثیت اور مصلح کا مقام کھل کر سامنے آگیا، تو جو عرب قبائل اسلام کو سمجھنے اور ماننے میں رکاوٹ محسوس کر رہے تھے ان کے وفود دین اسلام کو سمجھنے کے لئے آنا شروع ہوئے۔

چنانچہ ابن اسحاق کی روایت کے مطابق بنو تمیم کا وفد، بنو عامر کا وفد، بنی سعد بن بکر کا وفد، بنی عبد القیس کا وفد، بنی حنیفہ کا وفد، بنی طے کا وفد، بنی زبید کا وفد، کندہ کا وفد بنو حمیر کا وفد، بنو حارث بن کعب کا وفد، ہمدان کا وفد، عدی بن حاتم کا وفد، فروہ بن عمرو الجذامی کا وفد، اور ازد کا وفد، الگ الگ اوقات میں مدینہ آئے اور آپ سے ملاقات کی، ان میں سے اکثر نے آپ کی بات کو قبول کیا، اور اس میں داخل ہو گئے یا مصالحت اختیار کر لی (۱)۔

بنی حنیفہ کے وفد میں مسیلمہ کذاب بھی تھا، یہ اسلام لایا آیا اور بعد میں مرتد ہو گیا اور خود نبوت کا دعویدار بن بیٹھا، اسی نے فتنۂ ارتداد برپا کیا اور اسی میں مارا گیا۔

ان وفود کے علاقوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان وفود کے آنے اور بات ماننے سے جزیرۃ العرب کے تقریباً ہر حصہ سے عربوں کی تابعداری مکمل ہو گئی، اور اس طریقہ سے آپ کی دعوت سارے جزیرۃ العرب میں صرف یہی نہیں کہ پہونچ

---

(۱) سیرت ابن اسحاق: ۲/ ۳۰۹-۳۱۰۔

گئی، بلکہ اس کو قبول بھی کرلیا گیا، ان وفود کے آنے پر ان کے نمائندوں کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو مکالمے ہوئے، وہ تفصیلی طور پر سیرت کی کتابوں میں ملتے ہیں، ان مکالموں کے نتیجہ میں وفود کے نمائندوں کو عام طور پر اطمینان حاصل ہوتا تھا اور وہ اسلام کو قبول کر لیتے تھے یا تابعداری کا وعدہ کر کے واپس جاتے تھے اور اس طریقہ سے جزیرۃ العرب جو اب تک قبائلی اور حکومتی سطح پر بہت سے علاقوں میں بٹا ہوا تھا اور ان میں مقامی اور علاقائی سطح پر آزادانہ مشرکانہ نظام تھا اور وہ عموماً خاندانی عصبیت پر مبنی تھا، اسلام کے تحت آنے پر ایک متحدہ پیغام اور نظام کے تحت آ گیا اور ایک مرکز پر جمع ہو گیا(۱)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان علاقوں اور خطوں میں جہاں آپ کی دعوت دین نہیں پہونچ سکی تھی وہاں تک پہونچائی جو بتدریج مان لی گئی، اور اس طریقہ سے سنہ ۹ ہجری میں آپ کا دعوتی پیغام تکمیل کو پہونچ گیا اور مکہ مکرمہ جو پہلے سے پورے جزیرۃ العرب کے تمام باشندوں کا دینی مرکز چلا آ رہا تھا، اور قریش میزبان کی حیثیت سے ان کا نظام سنبھالے ہوئے تھے، وہ بھی اسلامی نظام کے ماتحت آ گیا(۲)۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قیادت میں سنہ ۹ ہجری کے اختتام پر حج کے نظام کی رہنمائی کے لیے انتظام فرمایا، اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ کے نمائندہ کی حیثیت سے اسلامی طریقہ پر حج کرایا اور اسی کے ساتھ ساتھ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذریعہ یہ اعلان عام بھی کرا دیا کہ اب شرک کا نظام ختم ہو چکا اور اب مکہ میں شرک کے ساتھ رہنے کی اجازت نہیں، اب توحید ہی کے ساتھ رہنا ہوگا اور مکہ اور تمام متعلقہ عرب علاقے اس طرح شرک اور اس کی ساری علامتوں سے آزاد کرا لئے گئے اور وہاں صرف توحید کا ہی نظام طے ہو گیا۔(۳)

---

(۱) مجمع بحار الأنوار: ۵/۲۷۲۔ (۲) زاد المعاد: ۳/۵۹۳-۵۹۴۔

(۳) وفود کی آمد، ان کے مکالموں اور ان کے قبول اسلام کی تفصیل کے لئے دیکھیں: سیرت ابن ہشام: ۲/۵۶۰-۶۰۰، البدایۃ والنہایۃ: ۶/۴۰-۹۶، زاد المعاد: ۳/۵۹۵-۶۸۶، طبقات ابن سعد: ۱/۲۹۱-۳۵۹، السیرۃ النبویۃ للإمام الذہبی: ۲/۶۶۷-۶۹۵۔

باب ہفتم

حجۃ الوداع

عربوں کے مرکزی شہر مکہ مسلمانوں کی زیر سرکردگی آجانے اور پڑوس کے قبائل ہوازن اور ثقیف کی کوشش کے بھی ناکام ہوجانے اور سارے عرب کی طرف سے اسلام کو غالب مان لینے کے بعد مسلمانوں کو کسی لڑائی کا خطرہ باقی نہ رہا اور یہ رکاوٹیں ختم ہوجانے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ماننے والوں کی بڑی تعداد کو مکہ میں جو سارے عرب کا دینی مرکز کی حیثیت مانا جاتا تھا، حج کے موقع پر اکٹھا کرنا مناسب سمجھا کہ فریضہ حج بھی ادا کریں اور ایک جگہ جمع ہونے پر ان سے خطاب عام بھی ہوجائے۔

چنانچہ آپ ﷺ کے اس حج کے موقع پر ایک لاکھ ۱۴ ہزار کی تعداد میں آپ کے ماننے والے جمع ہوئے اور حج ادا کیا، آپ کا یہ حج دعوت اسلامی کی تکمیل اور نظام اسلامی کے باقاعدہ قیام کا اعلان عام تھا، اور یہ آپ کی مدنی زندگی کا پہلا اور آخری حج تھا، اسی میں امت مسلمہ کے عمل کے لئے عمومی ہدایات دی گئیں اور دین کی تکمیل جو آپ ﷺ سے قبل نہیں ہوئی تھی اب اس کا بھی اعلان کر دیا گیا، آپ ﷺ نے حج کا جو خطبہ دیا اس میں آئندہ کے لیے ہدایات اور ضابطۂ اخلاق کا واضح اعلان اور انسانی خوبیوں کی حامل زندگی کا جامع اور مفصل تصور کے اصول ظاہر فرمادئے، اسی موقع پر قرآن مجید کی وہ آیات جس میں دین کی تکمیل کی اطلاع دی گئی، نازل ہوئیں:

﴿اليوم أكملت لكم دينكم وأتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الإسلام دينا﴾ [سورہ مائدہ:۳]

آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین (جس کو سابق انبیاء کے ذریعہ انسانوں تک پہونچانے کا سلسلہ چلا آرہا تھا) مکمل کردیا، اور اپنی یہ نعمت تم پر پوری کردی اور تمہارے لئے اسلام کو ہی بحیثیت دین کے پسند کیا۔

اس قرآنی اعلان میں تین بنیادی باتیں بتائی گئیں ایک تو یہ کہ انسانی زندگی کا اس کرۂ ارض پر آغاز ہونے کے وقت سے انسانوں کی اصلاح اور کردار سازی کی جو ہدایات نبیوں کے ذریعہ سے برابر آتی رہیں، اب وہ مکمل ہوگئیں اور دین کے احکام اس سطح تک پہنچادیئے گئے جس میں کسی بدلاؤ اور کمی وبیشی واضافہ وغیرہ کی ضرورت پیش نہ آئیگی، اس کے لیے یہ بات فرمائی کہ ''میں نے دین تمہارا مکمل کردیا'' دین کی وہ خوبیاں جو انسانی زندگی کے لئے ضروری اور موزوں اور جتنی ہونا چاہئیں وہ پوری کردی گئیں، دوسری بات یہ فرمائی کہ میں نے دین واخلاق کی اپنی نعمت تم سب پر پوری کردی، وأتممت عليكم نعمتي یعنی انسانیت اور فرد انسانی کے صلاح وفلاح کا جو درجۂ کمال ونمونۂ اعلی ہے وہ تمہارے لئے مہیا کردیا گیا، اور تم کو اس مقام بلند تک پہونچادیا گیا، پھر اسی سے تعلق رکھنے والی بات کے طور پر یہ واضح کردیا گیا کہ مقام بلند کے لئے جس طریقہ کار وصفات حسنہ کی ضرورت ہے وہ طریقہ کار وصفات حسنہ دین اسلام کی صورت میں عطا کی گئی ہیں، اور اللہ رب العالمین کی رضامندی کا انحصار اب اسی پر ہے، اللہ تعالی اسی کے مطابق انسانی عمل کو منظور کرے گا، جس کو فرمایا گیا ﴿ورضيت لكم الإسلام دينا﴾ کہ دین اسلام ہی میرے لیے پسندیدہ اور قابل قبول ہے، اس طریقہ سے آپ ﷺ کی رسالت کو اور دین کے پیغام کو اس زمین پر انسانی آبادی کے قائم رہنے تک کے لئے طے کردیا گیا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع سے انسان کے اعلی انسانی اقدار اور عدل ومساوات اور

انسانی جان کی سلامتی اور انصاف کی اہم ضروری ہدایات عنایت فرمائیں، اور حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ جو یہاں موجود ہیں وہ ان کو یاد رہے، دل ودماغ میں محفوظ کرلیں اور جو موجود نہیں ہیں موجود لوگ ان کو یہ ہدایات پہونچائیں، کیونکہ بعض وقت براہ راست سننے والے سے زیادہ بالواسطہ سننے والا بات کو زیادہ اہمیت کے ساتھ اختیار کرتا ہے۔

آپ کا آخری حج اور حج کی فرضیت

ہجرت کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف یہی ایک حج کیا، اور یہی آپ کا اول اور آخری حج یعنی اپنی رسالت کے کام کی تکمیل پر اور امت سے آپ کی رخصتی کی ملاقات تھی، اس سے قبل حج کی فرضیت بھی نہیں ہوئی تھی، یہ فرضیت آپ کی وفات سے ایک سال قبل یعنی سن ۹ یا ۱۰ ہجری میں ہوئی (۱)، یہ حج حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات اور دینی ارشادات کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے، اسلام کو غالب کرنے کی کوششوں کی کامیابی اور اسلامی پیغام کی تکمیل کے اعلان اور امت اسلامیہ کو تا قیامت ہدایات دینے کا یہ بہترین موقع تھا، جس میں مسلمانوں کا غیر معمولی اجتماع تھا، چنانچہ جب یہ موقع آیا جو اللہ تعالیٰ کے آخری رسول اور امت اسلامیہ کے ابدی رہبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا آخری سال تھا، اس میں آپ ﷺ نے اپنے ماننے والوں کو تا قیامت عمل کرنے کی واضح تاکید کی اور اسی کے ساتھ تبلیغ حق کی ذمہ داری بھی سپرد کی، آپ کے اس حج میں عبادت حج کی ادائیگی کے لئے صحیح نمونہ بھی دکھایا گیا، علامہ ابن قیم کی کتاب زاد المعاد سے اس حج کی تفصیل کا اقتباس درج ذیل کیا جارہا ہے:۔

---

(۱) زاد المعاد: ۲/ ۱۰۱

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کا عزم فرمایا اور لوگوں کو معلوم ہوا تو سب نے تیاریاں شروع کر دیں تا کہ آپ کا شرف معیت حاصل کریں، مدینہ کے مضافاتی علاقے کے لوگوں کو جب یہ خبر پہنچی تو وہ بھی گروہ در گروہ اسی مقصد سے آنا شروع ہو گئے۔ راستے میں بھی لوگوں کی جماعتیں جو حد شمار سے خارج تھیں، شریک قافلہ ہوتی گئیں، آگے پیچھے، دائیں، بائیں، حد نظر تک خلقت نظر آ رہی تھی۔

مدینہ سے آپ ۲۴/ذی القعدہ کو ظہر کی چار رکعت نماز پڑھ کر روانہ ہوئے، روانگی سے قبل ایک خطبہ دیا، جس میں احرام اور اس کے واجبات وسنن کی تعلیم دی، پھر اندر تشریف لے گئے، تیل لگایا، کنگھی کی، لنگی باندھی، چادر اوڑھی اور مقام ذوالحلیفہ (جو اس رخ سے حج میں جانے والے کے لئے احرام باندھنے کی جگہ ہے) پہونچ کر عصر کی دو رکعت نماز پڑھی، پھر رات بھر یہیں قیام فرمایا، یہاں آپ نے پوری پانچ نمازیں پڑھیں، عصر، مغرب، عشاء اور دوسرے دن فجر اور ظہر، تمام ازواج مطہرات ہمراہ اور رفیق سفر تھیں، ایک ایک کر کے آپ سب کے یہاں تشریف لے گئے، جب احرام باندھنے کا ارادہ کیا تو دوسرا غسل کیا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن اور سر پر خوشبو لگائی، پھر آپ نے چادر اور لنگی سے احرام باندھا، پھر ظہر کی دو رکعتیں پڑھنے کے بعد مصلے پر بیٹھے ہی حج وعمرہ کے لیے بآواز بلند تکبیر کہی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت حج قران کا احرام باندھا تھا۔ (حج تین قسم کا ہوتا ہے، ایک تو صرف حج کی نیت کی جائے وہ حج افراد کہلاتا ہے، دوسری قسم عمرہ اور حج دونوں کے کرنے کی نیت کی جائے اور پہلے عمرہ کر کے فارغ ہو جایا جائے اور پھر ۸ ذی الحجہ کو حج کا احرام باندھ کر حج کیا جائے یہ حج تمتع کہلاتا ہے، تیسری قسم دونوں یعنی عمرہ اور حج کو ایک ہی احرام سے بلا علیحدہ کئے ہوئے کیا جائے، یہ قران ہے)

پھر آپ نے ان الفاظ سے تلبیہ کہا: (تلبیہ کہنے سے حج یا عمرہ جو ہو اس کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور یہ احرام باندھے رہنے تک ہوتا ہے)

"لبيك اللّٰهم لبيك، لبيك لاشريك لك لبيك، إن الحمد و النعمة لك، و الملك، لاشريك لك"۔

اے اللہ حاضر ہوں، حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں، ہر طرح کی تعریف اور نعمتیں تیرے ہی لئے ہیں، حکومت بھی تیری ہی ہے، تیرا کوئی ساجھی نہیں۔

یہ تلبیہ آپ نے بآواز بلند کہا یہاں تک کہ تمام صحابہ نے اسے سن لیا، آپ نے حسب فرمان باری تعالیٰ انہیں یہ حکم دیا کہ وہ بھی بلند آواز سے تلبیہ کہیں۔

پھر آپ لبیک کا مذکورہ ترانہ پڑھتے ہوئے آگے بڑھے اور صحابہ کرام بھی قدرے کمی و زیادتی کے ساتھ اس کو دہراتے رہے لیکن آپ نے کسی پر نکیر نہ فرمائی۔

پھر جب آپ وادی عسفان کے پاس سے گزرے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت فرمایا یہ کون سی وادی ہے؟ تو انہوں نے عرض کیا، وادی عسفان ہے تو آپ نے فرمایا اس وادی سے حضرت ہود (نبی) اور حضرت صالح (نبی) سرخ اونٹوں پر بیٹھ کر گزرے ہیں تاکہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوں (۱)، پھر آپ مقام سرف پر پہنچے۔ (یہ مکہ سے ۶ کیلومیٹر پر مکہ کے راستہ پر واقع ہے)

پھر آپ مقام ذی طویٰ (جو زاہر کے کنووں سے مشہور ہے، مکہ شہر شروع ہونے پر ملتا ہے) پر پہنچے، وہاں چار ذی الحجہ اتوار کی شب گزاری اور فجر کی نماز ادا کر کے غسل فرمایا اور مکہ مکرمہ کے لیے روانہ ہو گئے، مکہ میں آپ حجون سے متصل بلند کھائی میں دن کے وقت داخل ہوئے، اس سے قبل عمرہ کے موقع پر آپ نشیبی علاقہ سے داخل ہوئے تھے، پھر آپ آگے بڑھے اور چاشت کے وقت مسجد میں داخل ہوئے۔

---

(۱) امام احمد نے اسے روایت کیا ہے۔

امام طبری نے ذکر کیا ہے کہ آپ باب عبد مناف سے جسے باب بنی شیبہ کہا جاتا ہے، داخل ہوئے تھے، امام احمد فرماتے ہیں کہ آپ جب دار علی سے داخل ہوئے تو بیت اللہ کو سامنے کر کے دعا فرمائی، امام طبری نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ جب آپ بیت اللہ کو دیکھتے تو یہ دعاء پڑھتے تھے:

"اللّٰهم زد هذا البيت تشريفاً، وتعظيماً، وتكريماً، ومهابة"

اے اللہ اس گھر کو اور زیادہ عزت وعظمت اور بزرگی اور رعب عطا فرما۔

ایک اور مرسل روایت میں یہ مذکور ہے کہ آپ بیت اللہ کو دیکھ کر ہاتھ اٹھاتے، اللہ اکبر کہتے اور یہ دعا پڑھتے تھے:

"اللّٰهم أنت السلام ومنك السلام، حينا ربنا بالسلام، اللّٰهم زدهذا البيت تشريفاً وتعظيماً وتكريماً ومهابة وزد من حجه، أو اعتمره تكريماً وتشريفاً وتعظيماً وبراً"

اے اللہ تو سلام ہے اور تجھی سے سلامتی ہے، ہمیں سلامتی دے، اے اللہ اس گھر کو اور زیادہ عزت، عظمت، کرامت اور رعب دے، اور جو اس کا حج یا عمرہ کرے اسے بھی عزت، کرامت، عظمت اور نیکی عطا کر۔

جب آپ مسجد حرام میں داخل ہوئے تو بیت اللہ کے پاس تشریف لائے اور تحیۃ المسجد نہیں پڑھی کیونکہ یہاں طواف ہی تحیۃ المسجد ہے، حجر اسود کے بالمقابل ہوئے تو اسے بوسہ دیا اور کوئی مزاحمت نہ فرمائی، پھر دائیں جانب چلے، کوئی مخصوص دعا نہیں فرمائی، البتہ دونوں رکن کے درمیان آپ سے یہ دعا پڑھنا ثابت ہے:

ربنا آتنا في الدنيا حسنة وفي الآخرة حسنة وقنا عذاب النار (البقرة: ۲۰۱)	اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف کے تین چکروں میں رمل کیا یعنی چھوٹے قدم رکھتے ہوئے چلے اور اضطباع کیا یعنی داہنا مونڈھا کھول کر بائیں مونڈھے پر چادر ڈالدی، اسی طرح داہنا کندھا کھلا ہوا تھا اور بایاں ڈھکا ہوا، آپ جب حجر اسود کے سامنے ہوتے تو اس کی طرف اشارہ کرتے اور اسے خمدار عصا سے چھو کر اسے بوسہ دیتے تھے۔

جب آپ طواف سے فارغ ہوئے تو مقام ابراہیم کے پیچھے آئے اور یہ آیت پڑھی۔

"واتخذوا من مقام إبراهيم مصلیٰ"(البقرة:١٢٥)

مقام ابراہیم کو مصلی بنالیجئے۔

پھر دو رکعت نماز پڑھی، نماز سے فارغ ہونے کے بعد حجر اسود کے پاس تشریف لائے اور اس کا بوسہ لیا، پھر سامنے کے دروازے سے صفا کی طرف نکل آئے اور قریب ہو کر یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

"إن الصفاء والمروة من شعائر اللّٰه"(البقرة: ١٥٨)

صفا اور مروہ اللہ کی نشانیاں ہیں۔

پھر فرمایا:

"أبدأ بما بدأ اللّٰه به"

میں بھی اس سے شروع کرتا ہوں جس سے اللہ نے شروع کیا۔

پھر کوہ صفا پر چڑھ کر بیت اللہ کی طرف رخ کیا اور اللہ اکبر کہہ کر یہ دعا پڑھی:

"لا إلٰه إلا اللّٰه وحده لاشريك له، له الملك وله الحمد وهو على كل شيء قدير، لا إلٰه إلا اللّٰه وحده، أنجز وعده، ونصر عبده، وهزم الأحزاب وحده"۔

اللہ واحد کے سوا کوئی خدا نہیں، اس کی عملداری ہے، اسی کے لیے ستائش ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے، اللہ واحد کے سوا کوئی خدا نہیں، اس نے اپنا وعدہ پورا کیا، اپنے بندہ کو فتح یاب کیا اور تمام جماعتوں کو تنہا شکست دی۔

اس طرح تین مرتبہ یہ دعائیں فرمائیں پھر سعی کرتے ہوئے مروہ کی طرف چلے، نشیب میں پہنچ کر دوڑنے لگے جب وادی سے نکل آئے تو معمول کے مطابق چلنے لگے۔

جب مروہ پہنچے تو اس پر چڑھ کر بیت اللہ کا رخ کر کے اللہ تعالیٰ کی تکبیر وتوحید بیان کی اور جو صفا پر دعائیں کی تھیں، یہاں پر بھی کیں۔

جب صفا مروہ کی سعی سے فارغ ہو گئے تو ان تمام لوگوں کو جن کے ہمراہ قربانی کے جانور نہ تھے، ہدایت کی کہ اب احرام اتار دیں اور پوری طرح سے حلال ہو جائیں کیونکہ عمرہ کے ارکان پورے ہو گئے اور آٹھویں ذی الحجہ تک اسی طرح رہیں اور چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قربانی کا جانور تھا اس لیے اپنی نسبت فرمایا اگر پہلے سے یہ معلوم ہوتا تو قربانی کا جانور ساتھ ہرگز نہ لاتا اور صرف عمرہ کا احرام باندھتا، اسی جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بال منڈوانے والوں کے لیے تین مرتبہ اور بال چھوٹے کرنے والوں کے لیے ایک مرتبہ دعاء مغفرت فرمائی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں چار دن قیام کے دوران نماز قصر ادا فرماتے رہے اور جمعرات کے دن چاشت کے وقت مسلمانوں کے ساتھ منیٰ تشریف لے گئے جنہوں نے احرام کھول دیا تھا وہ اپنے گھروں سے حج کا احرام باندھ کر نکلے، اس وقت وہ مسجد حرام نہیں گئے، جب آپ منیٰ پہنچے تو وہاں ظہر وعصر کی نماز ادا کی اور وہیں شب گزاری، جب صبح ہوئی تو عرفات کو روانہ ہوئے اور ضب کا راستہ اختیار فرمایا، صحابہ کرام میں سے بعض تلبیہ کہہ رہے تھے اور بعض تکبیر آپ دونوں کو سن رہے

تھے مگر کچھ نہ کہتے تھے۔

عرفات کے مشرقی حصہ میں مقام نمرہ کے پاس آگئے تھے، خیمہ نصب کردیا گیا، اس میں آپ نے قیام فرمایا، سورج ڈھلنے کے بعد قصواء اونٹنی پر سوار ہوکر وادی عرنہ کے نشیبی حصہ تک گئے۔

اسی مقام سے سواری ہی پر بیٹھے ایک عظیم الشان خطبہ دیا، اس میں آپ نے اسلامی اصول وقواعد کی وضاحت کی اور جاہلی رسم ورواج کی تردید فرمائی، جان ومال، عزت وآبرو کی حرمت کا اعلان فرمایا، جسے دوسرے اہل مذاہب نے بھی تسلیم کیا تھا۔

جب آپ نے خطبہ ختم کیا تو حضرت بلال کو اذان دینے کا حکم دیا، چنانچہ اذان اور اقامت ہوئی پھر آپ نے سری قراءت سے ظہر کی دو رکعت ادا کی۔

جب آپ نماز سے فارغ ہوگئے تو میدان عرفات ہی میں پہاڑ کے دامن میں چٹانوں کے پاس قبلہ رخ سواری ہی پر اس طرح کھڑے ہوئے کہ جبل مشاۃ آپ کے سامنے تھا اور سورج غروب ہونے تک دعا وگریہ زاری میں مصروف رہے اور لوگوں کو حکم دیا کہ وادی عرنہ سے ہٹ جائیں، اور مزید فرمایا کہ عرفات پورے کا پورا جائے وقوف ہے اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے مشاعر میں ٹھہرے رہیں اور وہیں وقوف کریں کیونکہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی میراث ہے۔

دعاؤں میں آپ اپنا ہاتھ سینے تک اٹھا لیتے تھے جس طرح کوئی مسکین کھانا مانگ رہا ہو، اس موقع پر ارشاد فرمایا کہ ''بہترین دعا عرفات کی دعا ہے''۔

عرفات میں آپ کی دعاؤں میں سے یہ دعائیں منقول ہیں:

''اللّٰهم إنك تسمع كلامي، وترى مكاني، وتعلم سري، وعلانيتي ولايخفى عليك شئي من أمري أنا البائس الفقير، المستغيث المستجير، الوجل المشفق، المقر المعترف بذنوبه أسئالك مسألة المسكين، وأبتهل إليك ابتهال

المذنب الذليل، وأدعوك دعاء الخائف الضرير دعاء من خضعت لك رقبته، وفاضت لك عيناه وذل جسده، ورغم لك أنفه ، اللّٰهم لاتجعلني بدعائك شقيا، وكن بي رؤفا رحيماً يا خير المسئولين ويا خير المعطين".

اللہ تو ہی میری بات سنتا ہے، میرے مقام کو دیکھتا ہے، میرے ظاہر و باطن کو جانتا ہے، تجھ سے میرا کوئی معاملہ پوشیدہ نہیں، میں محتاج مدد اور پناہ کا طالب، ڈرنے والا اور گناہوں کا اعتراف کرنے والا ہوں، تجھ سے مسکین کی طرح مانگتا ہوں اور ذلیل و گنہگار کی طرح عاجزی کرتا ہوں، ڈرنے والے کی طرح تجھے پکارتا ہوں، جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہے، آنکھیں بہ رہی ہیں، جسم جھکا ہوا ہے اور ناک خاک آلودہ ہے، مجھے دعا کے بعد محروم نہ فرما، اور میرے ساتھ شفقت ورحمت کا معاملہ فرما، اے وہ بہتر وبرتر ذات جس سے ہی اپنی حاجت مانگی جاتی ہے اور جو بہترین دینے والا ہے(۱)۔

نیز آپ کی دعاؤں میں یہ بھی ثابت ہے:

"اللّٰهم لك الحمد كالذي نقول، وخيراً مما نقول، اللّٰهم لك صلاتي ونسكي ومحياي ومماتي، وإليك مآبي، ولك ربي تراثي، اللّٰهم إني أعوذبك من عذاب القبر، ووسوسة الصدر، وشتات الأمر، اللّٰهم إني أعوذبك من شرما تجئي به الريح"

اے اللہ تو ہی حمد کے لائق ہے جو ہم کہہ سکتے ہیں اور ہم جو کہہ سکتے ہیں اس سے بھی بہتر ہے، اے اللہ میری نماز، میری قربانی اور میرا جینا مرنا سب تیرے ہی لیے ہے، اور تیری طرف ہی لوٹنا ہے، اور یہ سب حاصل کردہ تیرے ہی لیے ہے، اے اللہ عذاب قبر سے اور دل کے وسوسوں اور پراگندہ امور سے بھی تیری پناہ چاہتا ہوں، اے اللہ میں اس شر سے جو آندھی لے کر آئے اس سے تیری پناہ چاہتا ہوں (۲)

---

(۲) اسے طبرانی نے ذکر کیا ہے۔ (۲) اسے ترمذی نے ذکر کیا ہے۔

امام احمد نے حضرت عمرو بن شعیب کی حدیث سے نقل کیا ہے کہ عرفہ کے دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ تر یہ دعا تھی:

"لا إلـه إلا الله وحده لاشريك له، له الملك وله الحمد بيده الخير وهو على كل شئى قدير"۔

اے خدائے واحد جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کی بادشاہی ہے اور اس کی حمد ہے، اسی کے ہاتھ میں بھلائی ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اس موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

اليوم أكملت لكم دينكم وأتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الإسلام ديناً (المائده:۳)

آج ہم نے آپ کا دین مکمل کر دیا اور آپ پر اپنی نعمت پوری کر دی اور دین اسلام آپ کے لیے پسند کر لیا۔

جب آفتاب غروب ہو گیا اور زردی بھی ختم ہو گئی اور غروب آفتاب میں کوئی شبہ نہیں رہا تو آپ عرفات سے چل پڑے اور حضرت اسامہ ابن زید کو اپنے پیچھے بیٹھا لیا اور سکینت وخاموشی سے چلتے رہے، ناقہ کی لگام اپنی طرف کھینچ لی یہاں تک کہ آپ کی تھوڑی کجاوے سے چھونے لگی، اس موقع پر آپ فرما رہے تھے "اے لوگو! سکون واطمینان سے چلو کیونکہ تیز چلنا نیکی نہیں ہے" آپ صلی اللہ علیہ وسلم مازمین کے راستے سے واپس ہوئے اور ضب کے راستے سے عرفات تشریف لائے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سارے راستہ میں مسلسل تلبیہ کہتے رہتے تھے، راستہ میں ایک جگہ آپ نے پیشاب کر کے وضو فرمایا، حضرت اسامہ نے عرض کیا نماز پڑھنا ہے تو آپ نے فرمایا کہ "جائے نماز آگے ہے"۔ پھر آپ مزدلفہ پہنچے اور نماز کے لیے وضو کیا اور موذن کو اذان دینے کا حکم فرمایا اور اقامت کہلوائی پھر مغرب کی نماز ادا کی،

نماز کے بعد لوگوں نے سامان اتارا اور سواریوں کو بٹھایا، پھر دوبارہ اقامت کہی گئی اور عشاء کی نماز ادا فرمائی، عشاء کے لیے اذان نہیں کہی، مغرب وعشاء کے درمیان آپ نے کوئی نماز نہیں پڑھی، پھر آپ سو گئے یہاں تک صبح ہوگئی۔

طلوع فجر کے بعد اول وقت میں نماز فجر ادا فرمائی اور اس کے لیے اذان واقامت کہی گئی، پھر سوار ہو کر مشعر حرام کے پاس آئے اور قبلہ رخ ہو کر دعا وتضرع، تکبیر وتہلیل وذکر الٰہی میں مشغول ہو گئے حتیٰ کہ کافی روشنی ہوئی اور مزدلفہ کی اسی جگہ کھڑے ہو کر یہ فرمایا کہ پورا مزدلفہ وقوف کی جگہ ہے۔

پھر آپ مزدلفہ سے حضرت فضل بن عباس کو پیچھے سواری پر بیٹھا کر چلے اور راستہ بھر تلبیہ کہتے رہے، اور حضرت اسامہ بن زید قریش کی جماعت کے ساتھ ساتھ پیدل جا رہے تھے۔

یہیں راستے میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ رمی الجمار کے لیے سات کنکریاں چن لیں، چنانچہ آپ انہیں اپنے ہاتھ میں اچھالنے لگے اور فرمانے لگے، ایسی ہی کنکریوں سے رمی کرو اور دین میں غلو کرنے سے بچو اور پچھلی قومیں دین میں غلو کرنے کی وجہ سے ہلاک ہوئیں۔

جب آپ وادی محسر میں پہنچے تو اونٹنی کی رفتار تیز کر دی، آپ کا طریقہ یہی تھا کہ جب ان مقامات میں پہنچتے جہاں قوموں پر عذاب نازل ہوا ہے تو آپ تیزی سے نکل جاتے، اس جگہ اصحاب فیل پر عذاب نازل ہوا تھا جس کا واقعہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ذکر کیا ہے، اسی وجہ سے اس جگہ کا نام وادی محسر رکھا گیا محسر یعنی روک دینا اور اس جگہ ہاتھی مکہ میں داخل ہونے سے رک گئے تھے۔

اسی طرح مقام حجر سے گزرتے ہوئے بھی آپ نے کیا تھا۔ محسر، منیٰ اور مزدلفہ کے درمیان حد فاصل ہے اور دونوں میں سے کسی میں سے نہیں ہے، اس

طرح ''عرنہ'' عرفات اور مشعر حرام کے درمیان حد فاصل ہے، اس طرح دو مشاعر کے درمیان ایک حد فاصل ہے جو نہ اس میں داخل ہے اور نہ اس میں۔

چنانچہ منیٰ حرم میں داخل ہے اور مشعر بھی ہے، اور محسر حرم میں داخل تو ہے لیکن مشعر نہیں، اور مزدلفہ حرم بھی ہے اور مشعر بھی ہے، اور عرنہ حل میں ہے اور مشعر نہیں ہے، اور عرفات حل میں داخل ہے اور مشعر بھی ہے۔

آپ جب منیٰ پہنچے تو درمیانی راستہ سے جمرہ عقبہ کے پاس آئے اور جمرہ کے سامنے وادی میں اس طرح کھڑے ہوئے کہ مکہ آپ کے بائیں اور منیٰ آپ کے دائیں ہاتھ تھا، پھر طلوع آفتاب کے بعد سواری پر سے یکے بعد دیگرے سات کنکریاں پھینکیں، ہر کنکری پر تکبیر کہتے تھے اور لبیک کہنا بند کر دیا تھا، پھر آپ منیٰ واپس آئے اور ایک فصیح و بلیغ خطبہ دیا، جس میں لوگوں کو قربانی کے دن کی حرمت وعظمت اور فضیلت بیان فرمائی اور مکہ مکرمہ کی تمام شہروں پر فضیلت سے آگاہ کیا اور حکم فرمایا کہ کتاب اللہ کے مطابق جو حکمرانی کرنے والے ہوں ان کی اطاعت کریں، مزید ارشاد فرمایا کہ مجھ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم) سے مناسک حج سیکھ لیں، ممکن ہے کہ یہ آخری حج ہو، پھر لوگوں کو حج کے مسائل کی تعلیم دی اور مہاجرین اور انصار کو اپنے مرتبوں پر رکھا اور یہ حکم دیا کہ آپ کے بعد کفر کی طرف نہ لوٹیں اور ایک دوسرے کو قتل نہ کریں، آپ نے تبلیغ احکام کا حکم دیا اور بتایا کہ ''بہت سے سننے والے بھول جاتے ہیں اور ان سے سیکھنے والوں کو یاد رہتا ہے'' خطبہ میں آپ نے فرمایا کہ ''مجرم خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہے''۔

مہاجرین کو آپ نے قبلہ کے دائیں طرف اور انصار کو بائیں طرف اتارا، دوسرے لوگ ان کے اردگرد تھے، اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے اندر اتنی قوت سماعت پیدا کر دی تھی کہ اہل منیٰ نے بھی اپنے اپنے گھروں میں آپ کا خطبہ سنا۔

آپ نے خطبہ میں مزید فرمایا کہ ''اپنے رب کی عبادت کرو اور پانچوں نمازیں پڑھو اور مہینے کے روزے رکھو، جب حکم دیا جائے تو اطاعت کرو اور اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ''۔

پھر آپ نے لوگوں کو الوداع کیا تو لوگ کہنے لگے یہ حجۃ الوداع ہے، پھر آپ منی میں قربانی کے مقام پر تشریف لے گئے چنانچہ وہاں تریسٹھ اونٹ ذبح کئے، زندگی کے سال کے مطابق تریسٹھ اونٹ ذبح کرنے کے بعد سو میں سے بقیہ اونٹوں کو ذبح کرنے کے لیے آپ نے حضرت علی کو حکم دیا اور ان کے جھول، کھال اور گوشت کو مسکینوں میں تقسیم کر دیا، قصاب کو اجرت میں قربانی کی کوئی چیز دینے سے منع فرما دیا اور بتایا کہ ہم اسے اپنے پاس سے اجرت دیں گے، پھر فرمایا کہ جو چاہے قربانی میں سے گوشت کاٹ کر لے جائے۔

آپ نے منیٰ کے مذبح میں جانور ذبح کیا اور یہ فرمایا کہ پورا منیٰ کا علاقہ جائے قربانی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منیٰ میں عرض کیا گیا کہ کیا یہاں آپ کے لیے پہلے سے کوئی خیمہ وغیرہ لگا دیا جائے تاکہ گرمی سے حفاظت ہو سکے تو آپ نے اجازت نہ دی اور فرمایا کہ منیٰ میں جو پہلے جہاں پہنچ گیا، وہ اس جگہ کا حقدار ہو گیا۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجام سے فرمایا کہ شروع کرو، جب وہ فارغ ہوا تو آپ نے اپنے پاس والوں پر وہ بال تقسیم فرما دیئے۔

پھر منیٰ واپس آ کر وہیں رات گزاری، جب صبح ہوئی تو زوال آفتاب تک انتظار کیا، جب سورج ڈھل گیا تو جمرات کی طرف پیدل تشریف لے گئے اور جمرہ اولیٰ سے شروع کیا، جو مسجد خیف سے متصل ہے، تیسرے جمرہ تک ہر ایک پر سات سات کنکریاں پھینکیں، ہر کنکری پر تکبیر کہتے اور جب سات پوری ہو جاتیں تو ہاتھ اٹھا

کر دعا کرتے تھے، دعا اتنی طویل کرتے جتنی سورہ البقرہ پڑھی جاسکے لیکن تیسرے جمرہ پر دعا نہیں فرمائی اور کنکریاں پھینکنے کے بعد ہی واپس آگئے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حج کے دوران چھ مقامات پر دعا کے لیے ٹھہرے، کوہ صفا پر، کوہ مروہ پر، میدان عرفات میں، مزدلفہ میں، جمرہ اولیٰ کے قریب اور جمرہ ثانیہ کے قریب۔

آپ نے منیٰ میں دو خطبے دیئے، ایک قربانی کے دن جس کا ذکر ہو چکا ہے، دوسرا ایام تشریق کے درمیانی دن میں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دن میں کنکری مار کر جانے میں جلدی نہیں کی بلکہ تیسرے دن بھی رک کر پورے تین دن کنکری ماری اور منگل کے دن ظہر کے بعد وادی محصب کی طرف روانہ ہوئے، وہاں ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں ادا فرمائی اور سو گئے پھر اٹھ کر مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور سحری کے وقت طواف وداع فرمایا(۱)

ہدایات اور وصیتیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو ہدایات اس حج کے دوران اپنے خطبوں میں دیں ان میں ایک بڑی ہدایت اور وصیت یہ کی کہ انسانی برادری میں مساوات رہے، آپ نے انسانی برادری میں ایک کو دوسرے کے مساوی قرار دینے کا اعلان فرمایا اور یہ فرمایا کسی ایک کی برتری دوسرے کے مقابلہ میں اسی قدر ہوگی جتنا کہ وہ اپنے پروردگار یعنی اللہ تعالی کے حکموں کا زیادہ پاس ولحاظ رکھنے والا ہو، اس کے احکامات میں احتیاط سے زندگی بسر کرنے والا ہو۔ ارشاد فرمایا:

---

(۱) زاد المعاد: ۲/۱۰۲-۲۹۴، نیز حج کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: صحیح بخاری، باب حجۃ الوداع، کتاب المناسک، صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجۃ الوداع، حجۃ الوداع وجزء عمرات النبی ﷺ مؤلفہ: حضرت شیخ محمد زکریا کاندھلوی۔

"يـايها الناس !هل تدرون في أى شهر أنتم وفي أى يوم أنتم، وفي أى بـلد أنتم؟ فقالوا: في يوم حرام، وبلد حرام، وشهر حرام، قال: فـإن دماء كم وأموالكم وأعراضكم عليكم حرام كحرمة يومكم هـذا فـي شهـركم هذا وفي بلدكم هذا، إلى يوم تلقونه ، ثم قال: اسـمعوا مني تعيشوا، ألا لا تظلموا، ألا لا تظلموا، ألا لا تظلموا، أنـه لا يحل مال امرى مسلم إلا بطيب نفس منه، ألا! وإن كل دم ومـال ومـأثـرة كـانـت فـي الـجاهلية تحت قدمى هذه إلى يوم الـقيـامة،وإن أول دم يوضع دم ربيعة بن الحارث بن عبدالمطلب كـان مستـرضـعـاً فـي بنى ليث فقتلته هذيل، ألا! وإن كل ربا في الـجاهلية موضوع، و إن الله عزوجل قضى أن أول ربا يوضع ربا الـعبـاس بـن عبـدالـمطلب، لكم رؤوس أموالكم لا تظلمون ولا تـظـلـمـون، ألا! لا تـرجـعوا بعدى كفاراً يضرب بعضكم رقاب بـعـض، ألا إن الشيـطـان قـد أيس أن يعبده المصلون، ولكنه في التـحـريـش بينـكـم، واتقوا الله في النساء فإنهن عندكم عوان لا يملكن لأنفسهن شيئا،وإن لهن عليكم حقاً، ولكم عليهن حقاً أن لايـوطـئـن فـرشـكـم أحـداً غيـركـم، ولايأذن في بيوتكم لأحد تكرهونه، فإن خفتم نشوزهن فعظوهن واهجروهن في المضاجع واضربوهن ضرباً غير مبرح، ولهن رزقهن وكسوتهن بالمعروف، وإنـمـا اخـذتـمـوهن بأمانة الله، واستحللتم فروجهن بكلمة الله عـزوجـل، ألا ومن كانت عنده أمانة فليؤدها إلى من ائتمنه عليها وقـد تـركـت فيكـم مـالـم تـضـلوا بعده إن اعتصمتم به، كتاب

اللّٰـه،وأنتـم تسـئلون عني فما ذا أنتم قائلون؟قالو: نشهد أنك قد بلغت وأديت ونصحت، فقال باصبعه السبابة يرفعها إلى السماء وينـكبهـا إلـى النـاس اللّٰهـم اشهـد ثـلاث مـرات(مسـلـم، ابـوداود)وبسـط يـديـه، وقال ألا! هل بلغت؟ ألا ! هل بلغت، ثم. قال! ليبلغ الشاهد الغائب، فانه رب مبلغ أسعد من سامع"(۱)۔

(اے لوگو! تم جانتے ہو کہ یہ کون سا مہینہ اور کون سا دن ہے؟ اور تم کس شہر میں ہو؟ لوگوں نے جواب دیا: یہ دن بڑا باحرمت، اور یہ مہینہ بڑا قابل احترام ہے، اور یہ شہر بڑے احترام والا ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کسی ایک کی جان اور مال اور عزت دوسرے کے لئے اسی طرح قیامت تک قابل حرمت واحترام والی ہیں جس طرح آج کا یہ دن، یہ مہینہ اور یہ شہر، پھر فرمایا، سنو مجھ سے وہ باتیں سنو جن سے تم صحیح زندگی گذار سکو گے، خبردار ظلم نہ کرنا، خبردار ظلم نہ کرنا، خبردار ظلم نہ کرنا، کسی مسلمان شخص کے مال میں سے کچھ لینا جائز نہیں، ہاں اگر وہ راضی ہو (تو کوئی حرج نہیں) ہر ایک کی جان، ہر ایک کا مال، جو جاہلیت کے عہد میں جائز سمجھا جارہا تھا اب قیامت تک اس کو جائز سمجھا جانا ختم کیا جارہا ہے، سب سے پہلا خون جو ختم کیا جاتا ہے، وہ ربیعہ بن الحارث بن عبدالمطلب کا خون تھا، اس نے بنی لیث میں پرورش پائی تھی، اور ہذیل نے اس کو قتل کردیا تھا، جاہلیت کے تمام سود بھی باطل کردیئے گئے، یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے اور سب سے پہلا سود جو ختم کیا جاتا ہے، وہ عباس بن عبدالمطلب کا سود ہے، ہاں سودی معاملات میں تمہارا جو راس المال ہو وہ محفوظ ہے، اس سلسلہ میں نہ تم کسی پر ظلم کرو، نہ

(۱)رواه الإمام أحمد عن أبي حرة الرقاشي عن عمه

تمہارے اوپر ظلم کیا جائے، اور دیکھو! میرے بعد میرے حکموں کے خلاف نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو، اور دیکھو! اب شیطان بھی مایوس ہو چکا ہے کہ نماز پڑھنے والے اس کی پرستش کرنے لگیں، لیکن وہ تمہارے درمیان رخنہ اندازی کرتا رہے گا، اور دیکھو! عورتوں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو، کیونکہ وہ تمہارے زیر اثر ہیں، وہ اپنے معاملہ میں اختیار نہیں رکھتیں، لہذا ان کا تم پر حق ہے، اور تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ وہ تمہارے علاوہ تمہارے بستر پر کسی کو آنے نہ دیں اور نہ ایسے شخص کو تمہارے گھر آنے دیں جسے تم ناپسند کرتے ہو، اور اگر تم ان کی نافرمانی (غلط رویہ) سے خطرہ محسوس کرو تو انھیں نصیحت کرو، اور ان کی خوابگاہوں کو الگ کر دو، اور ہلکے طریقہ سے مارو اور دیکھو! انھیں کھانے کپڑے کا حق پوری طرح حاصل ہے، تم نے انھیں خدا کی امانت کے طور پر اپنی رفاقت میں لیا ہے، اور ان سے جنسی تعلق کو اللہ کے نام سے اپنے لئے جائز کیا ہے، اور دیکھو! کسی کے پاس کسی کی امانت ہو تو وہ صاحبِ امانت کو واپس کرے، اور دیکھو میں اپنے بعد تمہارے لئے ایک ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں کہ اگر تم نے اس کو مضبوط پکڑے رکھا تو تم گمراہ نہ ہوگے وہ چیز کیا ہے؟ وہ ہے کتاب اللہ، یعنی قرآنی دستور العمل، اور دیکھو تم سے خدا کے ہاں میری نسبت پوچھا جائے گا بتاؤ تم کیا جواب دو گے؟ صحابہ نے عرض کیا ہم کہیں گے کہ آپ نے خدا کا پیغام پہونچا دیا، اپنا فرض ادا کر دیا، اس جواب پر آپ نے شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اٹھائی اور تین مرتبہ فرمایا ''اے خدا تو گواہ رہنا''۔ اتنا فرمانے کے بعد آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اور فرمایا کہ کیا میں نے پیغام پہنچا دیا کیا میں نے پیغام پہنچا دیا؟ پھر فرمایا جو حاضر ہیں وہ غیر حاضر

لوگوں تک یہ بات پہونچادیں کیونکہ بہت سے غیر حاضر سننے والوں سے زیادہ خوش بخت ہوتے ہیں''۔

یہ وہ اعلان تھا جو انسانی تاریخ میں سب سے پہلے آپ ﷺ کی طرف سے کیا گیا، اور جو اسلام کے اصولوں میں سے ایک اہم اصول قرار پایا، چنانچہ اسی کی بنا پر آپس کے اجتماع کے موقع پر چاہے عبادت کا ہو یا عام زندگی کا، کالا، گورا اور غلام آقا، حاکم محکوم ایک ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر کھڑے ہوتے ہیں۔

مساوات واحترام انسانی کا یہ پہلا اعلان تھا اس سے ملتا جلتا اعلان بھی اس کے ۱۳سو سال بعد دنیا کی موجودہ متحدہ کونسل یعنی متحدہ اقوام نے اختیار کیا، اسلامی اعلان سے قبل رنگ ونسل کی بنیاد پر جو ظلم غیر مسلمان قوموں میں جاری تھا، اس کو روکنے کی یہ کوشش کی گئی جس پر اسلامی سوسائٹی چودہ سو سال سے خاصی حد تک عمل کر رہی ہے۔

دوسرا اہم ترین اعلان آپ ﷺ نے سود کو ناجائز قرار دینے کا فرمایا کہ جس کو دولت مند شخصیات نے بلا محنت حاصل ہونے والی منفعت کا ذریعہ بنا رکھا تھا، اور اس کے ذریعہ غریبوں کی غریبی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی خاطر دنیا میں بڑے ظلم وزیادتی کا ذریعہ بنا رکھا تھا، حضور ﷺ نے اس کا سلسلہ ختم فرمایا اور اس کی پہل اپنے محبت کرنے والے چچا حضرت عباس کے سودی منافع کو یک لخت بند کرنے سے کی۔

تیسرا اعلان یہ کیا کہ انسانوں کے رنگ ونسل کے فرق کی بنا پر جو ظلم اور تفریق چل رہی تھی اس کو ختم کیا اور اس سلسلہ میں خود اپنے خاندان قریش کو عربوں میں قبائلی سطح پر جو برتری حاصل تھی اس کی بھی پرواہ نہیں کی اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ آپس میں بھائیوں کی طرح زندگی گزاریں اور آپس میں ہمدردی اور تعاون کا ربط رکھیں، کوئی کسی کی جان کو پامال اور بے آبرو نہ کرے، اس کو اسی طرح ممنوع فرمایا جس طرح حج کے

موقع پر متعدد چیزیں ممنوع کی گئیں، کہ اس کی حیثیت بھی عبادت جیسی ہے کہ جس میں کوتاہی کرنے سے خدا کی طرف سے سزا ملتی ہے، اس طریقہ سے اسلام کے دائمی دستور میں انسانی مساوات اور عقیدہ و دین میں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے بنیادی حقوق میں بھی ایک دوسرے کے حق کو تسلیم کرنے اور ادا کرنے کا ذمہ دار بنایا، اور اس کے لئے کعبہ کے اردگرد جمع ہوکر رنگ ونسل و زبان کے فرق کو نظر انداز کرتے ہوئے آپسی مساوات و وحدت کا اظہار کر کے اسی طریقہ کو زندہ اور پائدار کیا جس کی آواز ان کے جد اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب کے حکم سے لگائی تھی ﴿و أذن في الناس بالحج يأتوك رجالاً﴾ اور یہ اعلان فرمایا کہ عرب ہو یا غیر عرب، سفید فام ہو یا سرخ فام، یا سیاہ فام، سب برابر ہیں، اگر کسی کو برتری حاصل ہے تو اس کی نیک صفات کی بنا پر ہی ہوگی۔

منیٰ و عرفات میں پوری انسانیت کے نام پیغام

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پروردگار عالم اور اللہ رب العالمین کی طرف سے پوری انسانیت کو صلاح وفلاح کے راستے پر لانے کے لئے نبی بنائے گئے، جن وانس کا جو بھی فرد جس جگہ اور جہاں کہیں تا قیامت ہوگا وہ آپ ﷺ کی نبوت کی رہنمائی کا محتاج ہے، اس کے لیے کامیابی اور سرخروئی کا راستہ وسامان اسی میں ہے کہ وہ آپ ﷺ کی نبوی تعلیمات پر عمل پیرا ہوکر زندگی بسر کرے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے تین ماہ پہلے عرفات کے میدان میں اور منیٰ کے قیام میں پوری انسانیت کو جینے کا طریقہ سکھلایا، ایسا طریقہ جس میں کوئی انسان دوسرے انسان کے لیے کانٹا نہ بنے، خون خرابے سے دور رہا جائے، بالادستی اسلامی تعلیمات کی رہے، عرفات کے خطبہ کے متعلق مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:۔

”اس میں آپ ﷺ نے اسلامی بنیادوں کو واضح کیا، اور شرک وجہالت کی

بنیادیں منہدم کردیں، اس میں ان تمام حرام چیزوں کی آپ ﷺ نے تحریم فرمائی جن کے حرام ہونے پر تمام مذاہب واقوام متفق ہیں، اور وہ ہیں ناحق خون کرنا، مال غصب کرنا، اور آبروریزی کرنا، جاہلیت کی تمام باتوں اور مروّجہ کاموں کو اپنے قدموں کے نیچے پامال کردیا، جاہلیت کا سود کل کا کل آپ ﷺ نے ختم فرمادیا اور اس کو بالکل باطل قرار دیا، عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کی اور ان کے جو حقوق ہیں نیز ان کے ذمہ جو حقوق ہیں ان کی توضیح کی، اور یہ بتایا کہ دستور کے مطابق خوراک اور لباس نان نفقہ ان کا حق ہے، امت کو آپ ﷺ نے کتاب اللہ کے ساتھ مضبوطی سے وابستہ رہنے کی وصیت کی اور ارشاد فرمایا کہ جب تک وہ اس کے ساتھ اپنے کو اچھی طرح وابستہ رکھیں گے، گمراہ نہ ہوں گے"۔

"منیٰ کے خطبہ میں آپ ﷺ نے یوم النحر کی حرمت سے آگاہ کیا، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس دن کی جو فضیلت ہے اس کو بیان کیا، دوسرے تمام شہروں پر مکہ کی افضیلت و برتری کا ذکر کیا، اور جو کتاب اللہ کی روشنی میں ان کی قیادت کرے اس کی اطاعت وفرمانبرداری ان پر واجب قرار دی۔

آپ ﷺ نے یہ بھی تلقین فرمائی کہ دیکھو میرے بعد کافروں کی طرح نہ ہوجانا جو ایک دوسرے کی گردن مارتے رہتے ہیں، آپ ﷺ نے یہ بھی حکم دیا کہ یہ سب باتیں دوسروں تک پہنچادی جائیں، آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا اپنے رب کی عبادت کرو، پانچ وقت کی نماز پڑھو، ایک مہینہ (رمضان) کا روزہ رکھو، اور اپنے اولی الامر کی اطاعت کرو اپنے رب کی جنت میں داخل ہوجاؤ گے، اس وقت آپ ﷺ نے لوگوں کے سامنے الوداعیہ کلمات بھی کہے اور اسی وجہ سے اس حج کا نام حجۃ الوداع پڑا" (۱)۔

---

(۱) نبی رحمت، ص: ۵۲۷-۵۲۸

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان انسانیت نواز باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی سکھایا کہ سب انسان خدائے واحد کے بندے ہیں، اور خدا ان سب کا رب اور پالن ہار ہے، اس کو راضی کر کے ہی زندگی کا چین وسکون ملتا ہے، اس لئے اس کے بندوں کے لئے ضروری ہے کہ اپنی ضرورت اور تکلیف میں اسی کو پکاریں، اور صرف اسی سے التجا کریں، اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر موقع پر دعا کر کے دعا کا طریقہ بھی دکھایا۔

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کعبہ کی مرکزیت اور وہاں عمل میں آنے والی عالمی انسانی وحدت اور اس کے لامحدود پیغام امن وسلامتی پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''خانہ کعبہ اس دنیا میں عرش الٰہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا نقطۂ قدم ہے، یہ وہ آئینہ ہے جس میں اس کی رحمت وغفاری کی صفتیں اپنا عکس ڈال کر تمام کرۂ ارض کو اپنی شعاعوں سے منور کرتی ہیں، یہ وہ منبع ہے جہاں سے حق پرستی کا چشمہ اُبلا، اور اسی نے تمام دنیا کو سیراب کیا، یہ روحانی علم ومعرفت کا وہ مطلع ہے جن کی کرنوں نے زمین کے ذرہ ذرہ کو درخشاں کیا، اور یہ وہ جغرافی شیرازہ ہے جس میں ملت کے وہ تمام افراد بندھے ہوئے ہیں جو مختلف ملکوں اور اقلیموں میں بستے ہیں، مختلف زبانیں بولتے ہیں، مختلف لباس پہنتے ہیں، مختلف تمدنوں میں زندگی بسر کرتے ہیں، مگر وہ سب کے سب باوجود ان فطری اختلافات اور طبعی امتیازات کے ایک ہی خانہ کعبہ کے گرد چکر لگاتے ہیں، اور ایک ہی قبلہ کو اپنا مرکز سمجھتے ہیں، اور ایک ہی مقام کو ام القریٰ مان کر وطنیت، قومیت، تمدن ومعاشرت، رنگ وروپ اور دوسرے تمام امتیازات کو مٹا کر ایک ہی وطن ایک ہی قومیت (آل ابراہیم) ایک ہی تمدن ومعاشرت (ملت ابراہیمی) اور ایک ہی زبان (عربی) میں متحد ہو جاتے ہیں، اور یہ وہ برادری ہے جس میں دنیا کی تمام قومیں اور مختلف ملکوں کے بسنے والے جو وطنیت

اور قومیت کے لفظوں میں گرفتار ہیں ایک لمحہ اور ایک آن میں داخل ہوتے ہیں، جس سے انسانوں کی بنائی ہوئی تمام زنجیریں اور قیدیں اور بیڑیاں کٹ جاتی ہیں، اور تھوڑے دن کے لیے عرصۂ حج میں تمام قومیں ایک ملک میں، ایک لباس احرام میں، ایک موضع میں دوش بدوش ایک قوم بلکہ ایک خانوادہ کی برادری بن کر کھڑی ہوتی ہیں، اور ایک ہی بولی میں خدا سے باتیں کرتی ہیں، یہی وحدت کا وہ رنگ ہے جو ان تمام مادّی امتیازات کو مٹا دیتا ہے جو انسانوں میں جنگ وجدل اور فتنہ وفساد کے اسباب ہیں، اس لیے یہ حرم ربانی نہ صرف اسی معنی میں امن کا گھر ہے، کہ یہاں ہر قسم کی خونریزی اور ظلم وستم ناروا ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی امن کا گھر ہے کہ تمام دنیا کی قوموں کی ایک برادری قائم کر کے ان کے تمام ظاہری امتیازات کو جو دنیا کی بدامنی کا سبب ہیں، مٹا دیتا ہے۔

لوگ آج یہ خواب دیکھتے ہیں کہ قومیت ووطنیت کی تنگنائیوں سے نکل کر وہ انسانی برادری کے وسعت آباد میں داخل ہوں مگر ملت ابراہیمی کی ابتدائی دعوت اور ملت محمدی کی تجدیدی پکار نے سینکڑوں، ہزاروں برس پہلے اس خواب کو دیکھا اور دنیا کے سامنے اس کی تعبیر پیش کی، لوگ آج تمام دنیا کے لیے ایک واحد زبان (اسپرنٹو) کی ایجاد وکوشش میں مصروف ہیں، مگر خانۂ کعبہ کی مرکزیت کے فیصلہ نے آل ابراہیم کے لیے مدت دراز سے اس مشکل کو حل کر دیا ہے‘‘(۱)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اس حج میں جو دعائیں کیں وہ بہت مؤثر اور دل کی گہرائیوں سے نکلیں، وہ ایک طرف ادب وبلاغت کا شاہکار ہیں دوسری طرف ان سے ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان تعلق کی کیفیت پوری طرح دوسروں پر عیاں ہو جاتی ہے، وہ باوجود اپنے پروردگار کے منتخب ومحبوب بندہ اور اس

---

(۱) سیرت النبی، ۵/۲۸۱-۲۸۳م از: سید سلیمان ندوی

کے عظیم المرتبت پیغامبر ہونے کے اپنے کو کس قدر حقیر اور ناتواں، بیکس اور محتاج سمجھتے ہیں اور مشکل کشا و حاجت روا صرف اللہ تعالیٰ کو ہی جان کر اس پر کیسا یقین کامل وغیر متزلزل اعتماد رکھتے ہیں۔

خاص طور پر وقوف عرفہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو دعائیں فرمائیں وہ بڑی اثر انگیز ہیں، وہ جمعہ کا دن تھا، اول وقت نماز جمعہ ادا کی اور اس سے عصر کی نماز بھی ملائی، اس طرح آپ ﷺ عرفات میں ظہر وعصر کی نمازیں ملا کر پڑھنا سنت فرمایا، پھر حضور ﷺ کئی گھنٹے مسلسل مصروف بہ دعا رہے، یہ سلسلہ غروب آفتاب یعنی مغرب تک دعاء ومناجات، تضرع وابتہال اور عاجزی، بے بسی، درماندگی و بے چارگی کے اظہار میں منہمک رہے، ہاتھ اٹھائے اپنے رب، رب العالمین سے اس طرح مانگ رہے تھے جیسے بھکاری مانگتا ہے، صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

☆☆☆

باب ہشتم

علالت ووفات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حج کا سفر آخری سفر تھا، اور وہ بھی آپ کی وفات سے دو ڈھائی ماہ قبل انجام پایا تھا، اس کے بعد آپ نے اور کوئی سفر کہیں اور کا نہیں کیا، اس سفر حج سے واپسی ہی سے ایسی باتیں ظاہر ہونے لگیں جن سے اشارہ ملنے لگا تھا کہ اب آپ ﷺ کو دنیا میں زیادہ دن نہیں رہنا ہے، آیت کریمہ ﴿الیوم أکملت لکم دینکم﴾ آج تمہارے لئے میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا، اور سورہ شریفہ ﴿إذا جاء نصر اللہ والفتح﴾ جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح کامل حاصل ہو جائے۔۔۔ الخ، کا بھی نزول ہو چکا تھا جس سے صحابہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا زمانہ قریب تر ہے، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل بھی اس بات کے اشارے دے رہا تھا، جیسے کہ ایک موقع پر آپ ﷺ منبر پر تشریف لائے اور فرمانے لگے: اب تم لوگوں سے ملاقات حوض کوثر پر ہوگی، آپ ﷺ کا یہ بلیغ جملہ ایک طرف تو صحابہ کو جنت ورضوان کی بشارت دے رہا تھا، دوسری طرف آنے والے چند دنوں کو صحبت نبوی سے استفادہ کے لیے زیادہ سے زیادہ کارآمد بنانے کا واضح اشارہ دے رہا تھا۔

حج سے دو ماہ بعد ماہ صفر کے آخر میں بظاہر دوشنبہ کے دن طبیعت ناساز ہوئی، مرض الوفات کا آغاز درد سر سے ہوا(۱)، سر مبارک پر پٹی باندھنی پڑی، اور یہ

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۶۴۲/۲، صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب مرض النبی ﷺ ووفاتہ

اثرات تھے اس وقت کے جب خیبر میں ایک یہودی نے کھانے میں زہر ملا کر آپ کی حیات طیبہ ختم کرنے کی سازش کی تھی، جس کا پتہ آپ کو پہلے لقمہ میں چل گیا تھا، اس پر آپ نے کھانے سے ہاتھ روک لیا تھا لیکن ایک لقمہ نے بھی اتنا اثر کر دیا تھا جو باقاعدہ طور پر اب اثر انداز ہوا اور آپ کو سر کی تکلیف پیدا ہو گئی، مگر اس تکلیف میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انسانیت کو صحیح راستہ پر لانے اور اسلامی تعلیمات کو فروغ دینے کے لیے فکر مند رہے۔

آپ ﷺ نے انہی ایام میں جب آپ کو یہ اطلاع ملی کہ رومی حکومت کی طرف سے حملہ کا خطرہ ہے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں ایک لشکر تشکیل دیا، حضرت اُسامہ کے والد آپ ﷺ کے غلام رہ چکے تھے، آپ نے ان کو آزاد کر کے اپنے بیٹے کی طرح ساتھ رکھا تھا، اسامہ جو گویا غلام کی حیثیت رکھے جانے والے کے بیٹے تھے، ان کو ان لوگوں پر جو مروجہ اصول سے ان کے آقاؤں کا درجہ رکھتے تھے، امیر بنا کر آپ نے ہر انسان کو دوسرے انسان کے برابر قرار دینے کا وہ اعلیٰ نمونہ پیش کیا جس کی نظیر پیش کرنے سے دنیا قاصر رہی تھی، اور بعد میں بھی دنیا کی غیر اسلامی انسانی سوسائٹی میں آج سے پہلے کی صدی تک انسان کو انسان سے رنگ او رنسل اور آزاد اور غلام کا فرق جاری رکھتے ہوئے اونچ نیچ کا سلسلہ سخت طریقہ سے رائج رہا اور صرف ابھی تھوڑی مدت پہلے اقوام متحدہ نے انسان کے مساویانہ حقوق کی تجویز پاس کی اور جمہوری نظام کے لئے اس کو اساسی حیثیت دی اس کے باوجود خود مغرب کے نعرہ مساوات انسانی وجمہوریت اور اس کے مہذب کہلانے والوں کے تحت حکومتوں میں کئی جگہ یہ نسلی اور قومی اونچ نیچ کا طریقہ رائج ہے، اور مغربی نسلیں مشرقی نسلوں کو برابر اپنے سے کمزور اور حقیر سمجھتی ہیں۔ لیکن اسلام جس نے انسانیت کی بھلائی اور بہبودی کا پیغام دیا، کے فرزندوں نے حضور ﷺ کے اس انسانی

مساوات کے نمونہ کو بعد تک سامنے رکھا، چنانچہ تاریخ اسلام میں کئی بار غلاموں کو بادشاہت کے درجہ تک پہونچنے کا موقع ملا، مشرق وسطی میں ایک مدت تک غلاموں کی حکومت رہی اور ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں بھی ایسا ہوا۔

حضورﷺ نے تنہا اللہ تعالی کی عبادت کی تلقین کے ساتھ ساتھ انسانی مساوات انصاف، کمزوروں کے ساتھ ہمدردی اور سب کے ساتھ خیر خواہی کی بھی پوری تاکید کی، زمانہ علالت میں کچھ صحابہ عیادت کے لیے آئے، آپﷺ نے ان کا استقبال کیا اور یہ نصیحت فرمائی کہ اللہ کی بندیوں اور اس کے بندوں میں تکبر اور برتری کو اختیار نہ کرنا (۱)۔

آپ کو یہ فکر بھی دامن گیر رہی کہ مال ومتاع کا ذخیرہ نہ ہونے پائے، جو آئے راہ خدا میں دیا جاتا رہے، آپ نے پروردگار کی نعمتوں کی شکر گذاری اور عبادت کی خصوصی طور پر تلقین فرمائی، آپ کو نماز کی بڑی فکر رہتی تھی، آپ کو اس کے لئے جماعت کے اہتمام کا بڑا خیال رہا، چنانچہ جب علالت شدیدہ کی وجہ سے خود مسجد تشریف نہیں لے جا پا رہے تھے، تو حضرت ابوبکر کو تاکید فرمائی کہ وہ لوگوں کی امامت کریں، گویا یہ اشارہ تھا بعد کی امامت وخلافت کا جسے صحابہ نے سمجھا اور آپ کی امامت وخلافت پر صحابہ کا اجماع ہوا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بات بھی فرمائی کہ بلاشبہ کوئی شخص ایسا نہیں جس نے اپنی جان اور مال سے مجھ پر اتنا احسان کیا ہے جتنا ابوبکر (رضی اللہ عنہ) نے کیا ہے (۲)۔

مہاجرین کو انصار کے سلسلہ میں وصیت فرمائی کہ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ رکھیں (۳)۔

وفات کے قریب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے لیے بڑا سخت لہجہ

---

(۱) السیرۃ النبویۃ لابن کثیر ۴/۵۰۲۔ (۲) صحیح البخاری کتاب الصلوٰۃ
(۳) صحیح البخاری

اختیار کیا جو اپنے نبیوں کی قبروں کو ان کی وفات کے بعد سجدہ گاہ بنالیتے ہیں، چونکہ یہود ونصاری کے لوگ ایسا کر چکے تھے اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا"قاتل اللہ الیھود والنصاری اتخذوا قبور أنبیائھم مساجد"اللہ تعالیٰ یہود ونصاری سے قتال کرے انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا(۱)۔

آپ ﷺ کی آخری وصیت نماز اور ماتحتوں کے ساتھ حسن سلوک کی تھی، فرماتے " الصلاۃ وما ملکت أیمانکم" (دیکھو نماز کا اہتمام رکھنا اور اپنے ماتحتوں اور غلاموں کا) روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری عمل آپ ﷺ کا مسواک کرنا تھا اور آخری الفاظ جو فرمائے ان میں "لا إلہ إلا اللّٰہ إن للموت لسکرات" (کہ اللہ کے علاوہ کوئی اور لائق عبادت وحمد نہیں بیشک موت کے ساتھ سکرات ہوتے ہیں) پھر" فی الرفیق الاعلیٰ، فی الرفیق الاعلیٰ" (اعلیٰ وبرتر رفیق کے پاس) فرمایا اور روح مبارک کا رُخ عالم بالا کی طرف ہو گیا(۲) انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ "جس وقت جدائی کی گھڑی قریب آئی تو اس وقت آپ کا سر میری ران پر تھا، ایک گھڑی کے لئے آپؐ پر غشی طاری ہوئی، پھر آپؐ کو ہوش آ گیا، اور آپ ﷺ نے گھر کی چھت کی طرف اپنی نظر اٹھائی اور فرمایا "اللّٰھم الرفیق الاعلیٰ" (بے شک سب سے اعلیٰ اور برتر رفیق کے پاس) یہ وہ آخری الفاظ تھے، جو رحلت کے وقت آپ کی زبان مبارک سے نکلے"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس دنیا سے پردہ فرمایا تو اس وقت پورا جزیرۃ العرب آپؐ کے زیر نگیں تھا، دنیا کے سلاطین وامراء پر آپ کا جلال ورعب

(۱) مؤطا امام مالک۔ (۲) ملاحظہ ہو، صحیح البخاری باب مرض النبی ووفاتہ

تھا، آپؐ کے اصحاب کرام آپؐ پر اپنی جان واولاد اور مال ومتاع سب نثار کرنے پر تیار رہتے تھے، اس سب کے باوجود آپؐ دنیا سے اس حال میں تشریف لے گئے کہ آپؐ نے ایک دینار یا درہم، ایک غلام یا لونڈی اور کوئی چیز بھی اپنے پیچھے نہیں چھوڑی، صرف آپؐ کا ایک سفید خچر تھا، آپؐ کے ہتھیار تھے، اور ایک قطعۂ زمین جس کو آپؐ نے صدقہ کر دیا تھا(۱)۔

آپؐ کی وفات اس حالت میں ہوئی کہ آپؐ کی زرہ ایک یہودی کے پاس تیس صاع جو پر رہن رکھی ہوئی تھی، (صحیح بخاری، باب مرض النبی ﷺ ووفاتہ)۔ اور آپؐ کے پاس کوئی چیز نہ تھی کہ آپؐ اسے دے کر زرہ کو چھڑا سکتے یہاں تک کہ آپؐ دنیا سے تشریف لے گئے۔ (بیہقی، ۵۶۲)

آپؐ نے اپنے مرض وفات میں چالیس غلاموں کو آزاد فرمایا، آپؐ کے پاس سات یا چھ دینار تھے، حضرت عائشہؓ کو حکم ہوا کہ ان کو بھی صدقہ کر دیں (۲)۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اس حالت میں ہوئی کہ میرے گھر میں کوئی ایسی چیز نہ تھی، جس کو کوئی جاندار کھا سکتا، البتہ ذرا سا جو میری الماری پر رکھا ہوا تھا، میں نے اسی میں سے کچھ کھایا وہ بہت دن چلا یہاں تک کہ میں نے ایک دن اس کی ناپ تول کی، بس اسی کے بعد وہ ختم ہو گیا (۳)۔

وفات کا صحابۂ کرام پر اثر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر صحابۂ کرامؓ پر بجلی بن کر گری، اس

(۱) صحیح بخاری، باب مرض النبی ﷺ ووفاتہ۔ (۲) السیرۃ الحلبیہ: ۳۸۱/۳۔
(۳) بخاری، کتاب الرقاق باب فضل الفقر، ومسلم کتاب الزہد۔

کی وجہ ان کا وہ عاشقانہ تعلق تھا، جس کی انسانی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی، وہ آپ ﷺ کے سایۂ شفقت میں اس طرح رہنے کے عادی ہو گئے تھے، جس طرح بچے ماں باپ کے آغوش محبت میں رہتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ، اس لحاظ سے ان پر آپ کی وفات کا جتنا بھی اثر پڑتا کم تھا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لقد جاء کم رسول من أنفسکم عزیز علیه ماعنتم حریص علیکم بالمؤمنین رؤوف رحیم﴾.
(سورۂ توبہ۔ ۱۲۸)

(لوگو) تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں تمہاری تکلیف ان کو گراں معلوم ہوتی ہے، اور تمہاری بھلائی کے بہت خواہشمند ہیں (اور) مومنوں پر نہایت شفقت کرنے والے (اور) مہربان ہیں۔

عقیدت مندوں کو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ حضور ﷺ جو کہ رب العالمین کے برگزیدہ نبی ہیں اس دنیا سے یوں ہی چلے جائینگے، ان میں پیش پیش حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے، چنانچہ انہوں نے تلوار کھینچ لی کہ جو یہ کہے گا کہ اللہ کے رسول کی وفات ہو چکی ہے میں اس کا سر اڑادوں گا، وہ مسجد نبوی میں آئے اور لوگوں کے سامنے خطبہ دیا اور کہا کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اس وقت تک نہ ہوگی جب تک اللہ تعالیٰ منافقوں کو ختم نہ کردے گا'' (۱)۔

لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف لائے (۲) اور مسجد نبوی کے دروازے پر ایک لمحہ کے لئے رُکے اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں سے خطاب کررہے تھے، پھر وہ کسی طرف ملتفت ہوئے بغیر سیدھے حضرت عائشہؓ کے گھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہونچے، آپ پر ایک چادر اڑھائی ہوئی تھی، انھوں نے چہرہ مبارک سے چادر سرکائی اور جھک کر روئے مبارک کا بوسہ لیا اور کہا، میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان! موت کا جوذائقہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے لئے مقدر

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ: ۲۴۲/۵۔ (۲) بخاری، ص ۶۴۰

کیا تھا، آپ ﷺ نے اسے چکھ لیا، اب اس کے بعد آپ ﷺ کو دوبارہ موت کے مرحلہ سے گزرنا نہ ہوگا، پھر آپ باہر آئے اور یہ دیکھا کہ لوگ پریشانی کے عالم میں حقیقت واقعہ کو سمجھ نہیں پا رہے ہیں، اور ان کا دھیان وحی الٰہی کی اس آیت کی طرف نہیں جا رہا ہے جس میں آپ ﷺ کو بھی وفات کے مرحلہ سے گزرنے کو بیان کر دیا گیا ہے چنانچہ آپ منبر پر آئے اور قرآن شریف کی وہ آیتیں پڑھ کر سنائیں تو لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور اس ناگزیر واقعہ کا یقین آیا(۱)۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے بعد کہا:۔

''لوگو! اگر کوئی محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا تو اس کو معلوم ہو جائے کہ بلاشبہ ان کی وفات ہوگئی، اور اگر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا تو اطمئنان رکھے کہ اللہ تعالیٰ زندہ ہے، اس کے لئے موت نہیں، پھر انہوں نے یہ آیت تلاوت کی:

﴿وما محمد إلا رسول الله، قد خلت من قبله الرسل، أفإين مات أو قتل انقلبتم على آعقابكم، ومن ينقلب على عقبيه فلن يضر الله شيئاً، وسيجزي الله الشاكرين﴾

[سورہ آل عمران:۱۴۴]

اور محمد ﷺ تو صرف خدا کے پیغمبر ہیں، ان سے پہلے بہت سے پیغمبر گزرے ہیں، بھلا اگر ان کی وفات ہو جائے یا شہید کر دئے جائیں، تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ (یعنی مرتد ہو جاؤ) اور جو الٹے پاؤں پھر جائے گا تو خدا کا کچھ نقصان نہیں کر سکے گا اور خدا شکر گزاروں کو بڑا ثواب دے گا۔

جو لوگ اس موقع پر حاضر تھے، اور یہ منظر دیکھ رہے تھے، ان کا بیان ہے کہ ''خدا کی قسم جب حضرت ابوبکرؓ نے یہ آیت تلاوت کی تو ایسا محسوس ہوا کہ یہ آیت ابھی نازل ہوئی ہے، اور حضرت ابوبکرؓ نے ان کے منھ کی بات کہدی'' حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ ''میں نے جب ابوبکرؓ کو آیت تلاوت کرتے سنا تو حیرت زدہ ہو کر بے

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۲/ ۶۵۵

ساختہ زمین پر گر گیا، میرے پیروں کی طاقت ختم ہو چکی تھی، اس وقت گویا مجھے یہ علم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا ہے"۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

"آپ ﷺ کی وفات دوشنبہ کے روز ۱۲/ربیع الاول ۱۱ھ کو زوال کے بعد ہوئی، اس وقت عمر شریف قمری سنہ سے ترسٹھ سال تھی، یہ مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ تاریک اور وحشت ناک دن، سب سے بڑا صدمہ اور ابتلاء اور پوری انسانیت کے لیے سب سے بڑا سانحہ تھا، جبکہ آپ ﷺ کی ولادت باسعادت کا دن انسانیت کا سب سے مبارک روشن اور تابناک دن تھا، حضرت انس وابوسعید خدری رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ "جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تھے، تو مدینہ کی ہر چیز آپ ﷺ کی آمد سے روشن اور منور ہو گئی تھی، جس دن آپ ﷺ کی وفات ہوئی اس دن اس کی ہر چیز تاریک ہو گئی، آپ ﷺ کو بچپن میں کھلانے والی خاتون ام ایمن بھی رو رہی تھیں، لوگوں نے سبب پوچھا، تو انہوں نے جواب دیا کہ بے شک مجھے معلوم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے جائیں گے، لیکن میں اس بات پر رو رہی ہوں کہ اب وحی کا سلسلہ بھی ہم سے ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا" (۱)۔

جس مقام پر آپ ﷺ کی وفات ہوئی ام المؤمنین حضرت عائشہ کے حجرہ میں اسی مقام پر اگلے روز منگل کو تدفین عمل میں آئی، اور یہ خود حضور ﷺ کے اس اشارہ کی بنا پر ہوا کہ انبیاء کی وفات جس جگہ ہوتی ہے وہیں تدفین ہوتی ہے، غسل اور تجہیز و تکفین کا کام اہل بیت کرام نے انجام دیا، قبر ایک انصاری صحابی حضرت ابوطلحہ نے کھودی، جنازہ اسی جگہ رکھا رہا، ایک ایک جماعت آتی گئی اور نماز ادا کرتی گئی،

---

(۱) نبی رحمت، ص: ۵۵۴-۵۵۵۔

سانحہ وفات کا صدمہ اتنا سخت تھا جس کی تصویر نہیں کھینچی جاسکتی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک جملہ اس کیفیت کو بے کم وکاست بیان کر دیتا ہے، کہ فرمایا اے لوگو! تم میں سے (یا اہل ایمان میں سے) کسی کو بھی کوئی مصیبت پیش آئے تو وہ اس مصیبت کے لیے جو اس کو دوسرے کے انتقال سے پیش آرہی ہے، اس مصیبت سے تسلی حاصل کرے جو میری وفات سے اس کو پیش آئیگی، اس لیے کہ میری امت میں کسی شخص کو میری وفات کے صدمہ سے بڑھ کر کوئی مصیبت پیش نہ آئے گی (۱)۔

اور صاجبزادی رسول جگر گوشہ نبی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے جبکہ وہ آپ کی تدفین میں شرکت کر کے لوٹے فرمایا: "یا أنس! أطابت أنفسكم أن تحثوا على رسول الله ﷺ التراب؟" کہ انس! تمہارے دل اس بات پر کیسے راضی ہوئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاک کے اندر رکھو اور مٹی ڈالو (۲)۔

آپ ﷺ کی خلافت کا مسئلہ

حضور ﷺ کی وفات کو خدا کی طرف سے حقیقت سمجھ لینے پر آپ کو آپ کی قبر مبارک میں پہونچانے سے قبل حضرات انصار اپنے ایک سائبان میں جمع ہو کر آگے کے مرحلہ پر غور کرنے لگے، حضرات مہاجرین کو علم ہوا تو وہ بھی وہاں آگئے، اور مشورہ ہونے لگا، حضرات انصار نے کہا کہ حضور ﷺ ہمارے یہاں منتقل ہو گئے تھے، لہذا ہمارا کوئی اہم شخص حضور ﷺ کا نائب بنے، مہاجرین نے کہا کہ عربوں میں قریش کو جو اہمیت حاصل ہے کہ ان میں سے کسی کے امیر بننے پر عربوں میں سے کوئی اختلاف نہیں کریگا، لہذا ان میں ہی سے کسی آدمی کا انتخاب ہو، یہ بات خاص طور پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام پیش کیا، حضرت عمر

---

(۱) ملاحظہ ہو سنن ابن ماجہ۔ (۲) بخاری، باب مرض النبی ووفاتہ۔

نے کہا: آپ حضور ﷺ سے سب سے زیادہ قریب رہے ہیں، اور آپ ﷺ نے علالت میں آپ ہی سے نمازیں پڑھوائیں، اس لئے آپ کے علاوہ دوسرا کوئی مناسب نہیں، اور فوراً ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر بیعت کرلی، اس کو دیکھکر حاضرین نے بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرنا شروع کردیا اور مشورہ کی یہ نشست بآسانی مناسب نتیجہ تک پہونچ گئی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفۂ رسول ﷺ اور امیر المؤمنین قرار پائے، پھر جو مسلمان اس نشست میں پہونچ نہیں سکے تھے انہوں نے بھی آآ کر ان کے ہاتھ پر بیعت کرکے ان کی اطاعت کا اعلان کردیا، اس طرح آپ ﷺ کو آپ کی زمینی آرام گاہ تک پہونچنے سے قبل مسلمانوں کو امیر حاصل ہونے میں کوئی وقفہ نہیں ہوا، اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سرپرستی اور رہنمائی میں اسلام کا قافلہ خدا اور اس کے رسول ﷺ کے واضح کردہ راستہ پر جاری وساری رہا(۱)۔

حضور ﷺ نے اپنے مالی ورثہ کے متعلق پہلے سے فرمادیا تھا کہ ان کے اہل وعیال کے بجائے تمام مسلمانوں کا ہوگا، لہذا وہ بیت المال کے سپرد ہوا، آپ ﷺ کی اولاد میں صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حیات تھیں، باقی اولاد وبنات طیبات نے آپ ﷺ کی حیات کے دوران ہی انتقال کیا تھا، اس طرح اللہ تعالی نے مسلمانوں کے لئے یہ اسوہ بھی ظاہر کردیا کہ اولاد کے انتقال سے صدمہ پیش آنے پر ایک مسلمان کے لئے کیا نمونہ ہے۔

☆☆☆

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ: ۵/ ۲۴۵-۲۴۷

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں دو کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں ہی انتقال ہوگیا تھا، وہ بھی مسلمانوں کے لئے بیوی کے انتقال کی صورت پیش آنے پر نمونہ بنا، آپ کی اولین زوجۂ مطہرہ ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا جو آپ کی زندگی کے شروع کے ۲۵ سال تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تنہا اہلیہ تھیں، اور بہت انس اور باہمی محبت کا تعلق رکھتی تھیں، ۲۵ سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہ کر مکی زندگی کے مرحلہ میں ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جدا ہوگئیں تھیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی میں حضرت زینب بنت خزیمہ ام المساکین رضی اللہ عنھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جدا ہوئیں، باقی ازواج مطہرات آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیوہ ہوئیں اور انہوں نے بیوہ ہونے پر مسلمان خاتون کا جو اسوہ ہونا چاہئے اس کا نمونہ پیش کیا اور شاید اسی لئے ان کو کسی دوسرے سے نکاح کرنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی، کہ آپ سے حاصل کردہ طرز و اخلاق میں دوسرے سے حاصل کردہ طرز و اخلاق کی ملاوٹ نہ ہوجائے، قرآن مجید میں یہ حکم آیا کہ مسلمانوں کے لئے یہ صحیح نہیں ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی زوجہ مطہرہ سے عقد کریں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حیات رہنے والی ازواج مطہرات کے نام حسب ذیل ہیں۔

حضرت عائشہ، حضرت حفصہ، حضرت سودہ، حضرت ام سلمہ، حضرت زینب، حضرت جویریہ، حضرت ام حبیبہ، حضرت میمونہ، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہن۔

تعدد ازواج کی حکمت و مصلحت

اسلام سے قبل اور اسلام کے علاوہ دیگر نظامہائے حیات میں اپنی اپنی مرضی

کے مطابق تعداد میں بیویاں رکھنے کا رواج رہا ہے، اسلام نے آکر ان کی تعداد پر پابندی لگائی اور ایک سے زیادہ بیوی کرنے کی ضرورت پڑنے پر اس کی اجازت دی ہے، لیکن اس کو مساوات اور عدل کی شرط کے ساتھ مشروط کرتے ہوئے چار تک محدود کر دیا ہے۔

حضور ﷺ نے ۲۵ سال کی عمر ہونے پر جو نبوت ملنے سے ۱۵ سال قبل تھی، نکاح کیا اور وہ بھی اپنے سے ۱۵ سال بڑی عمر کی ایک بیوہ خاتون سے کیا اور اسی پر ۲۵ سال تک اکتفاء کیا اور جب آپ کی ان اہلیہ کا انتقال ہو گیا اور ضرورت پڑی تو ان ہی کی طرح ایک دوسری بیوہ خاتون سے نکاح کیا، اس طرح نبوت کے ۱۳ سال بعد جب کہ آپ کی عمر ۵۳ سال سے زیادہ ہو گئی تھی اور نبوت کے اجتماعی وانتظامی امور کے تقاضوں کی وجہ سے مختلف جگہوں اور مختلف النوع شخصیتوں سے آپ کو رابطے قائم کرنے پڑ رہے تھے جو اسلام کی ترویج اور اسلام کے انتظامی امور اور اس کے تحت اجتماع تعلقات کے سلسلہ میں ضروری تھے، تو آپ کو ایسی مصلحتوں کی بنا پر متعدد شادیاں کرنے کی ضرورت پڑی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اس کی اجازت دی گئی، چنانچہ عمر کے ۵۴ ویں سال گذرنے کے بعد سے آپ ﷺ نے اس صورت کو اختیار کیا اور آپ کی عمر کا مرحلہ بھی اب ایسا تھا کہ اس میں نئی شادی کسی شوق ولطف کے لئے نہیں کی جاتی، صرف ضرورت کے لیے ہی کی جاتی ہے، جیسے جیسے ضرورت محسوس کرتے گئے مزید بیویاں اختیار کیں، اور آپ کا یہ طریقہ آپ کی اپنی عمر کے آخری نو سالہ مدت کے اندر رہا، اور تعداد بیک وقت ۹ سے زیادہ نہیں ہوئی اور ہر نئی شادی اپنے لئے پوری انتظامی واجتماعی ضرورت رکھتی تھی، اس طرح آپ نے یہ خود خواہش سے نہیں کیا، بلکہ باقاعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے لئے اس کی گنجائش دی گئی تا کہ نبوت کے کاموں اور امت کے لئے مختلف نوعیّتوں کا نمونہ پیش کرنے کی صورت سامنے آئے اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے پابندی بھی ایسی لگا دی جس سے ان کی زندگی محنت وقربانی اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور دین کے تابع ہو:

يـأيهـا الـنبـى قل لأزواجك ان كنتن
تـردن الحيوة الـدنيـا وزيـنتها فتعالين
أمتـعـكن وأسرحكن سراحاً جميلاo
وان كـنتـن تـردن اللّـه ورسولـه
والـدارالآخرة فان الله اعد للمحسنٰت
مـنـكـن اجراً عظيماًo ينسآء النبى من
يّـات منكن بفاحشة مبينة يضٰعف لها
الـعذاب ضعفين، وكان ذٰلك على الله
يسيـراًo ومن يقنت منكن لله ورسوله
وتـعـمـل صـالحاً نؤتها أجرها مرتين،
واعتـدنـا لها رزقاً كريماo ينسآء النبى
لستـن كـاحد من النسآء ان اتقيتن فلا
تـخضعن بالقول فيطمع الذى فى قلبه
مـرض وقـلـن قولاً معروفاًo وقرن فى
بيـوتـكـن ولاتبـرجـن تبـرج الجاهلية
الاولـىٰ واقـمـن الصلوٰة واتين الزكوٰة
واطـعـن الـلّـه ورسـوله، انما يريد الله
لـيـذهـب عـنـكم الرجس اهل البيت
ويـطهـركـم تطهيراًo واذكرن ما يتلىٰ
في بيوتكن من ايٰت الله والحكمة، ان
الله كان لطيفاً خبيراًo

(احزاب:۲۸-۳٤)

اے پیغمبرؐ اپنی بیویوں سے کہدو کہ اگر تم دنیا کی زندگی اوراس کی زینت وآرائش کی خواستگار ہوتو آؤ میں تمہیں کچھ مال دوں اوراچھی طرح سے رخصت کردوں اوراگر تم خدا اوراس کے پیغمبرؐ اور عاقبت کے گھر (یعنی بہشت) کی طلبگار ہوتو تم میں نیکوکاری کرنے والی ہیں ان کے لیے خدا نے اجرعظیم تیار کررکھا ہے۔اے پیغمبر کی بیویو تم میں سے جوکوئی صریح ناشائستہ (الفاظ کہہ کر رسول اللہ کوایذاء دینے کی) حرکت کرے گی اس کو دونی سزا دی جائے گی۔اور یہ بات خدا کوآسان ہے اور جوتم میں سے خدا اوراس کے رسول کی فرمانبردار رہے گی اورعمل نیک کرے گی اس کوہم دونا ثواب دیں گے اوراس کے لیےہم نےعزت کی روزی تیار کررکھی ہے۔اے پیغمبر کی بیویو تم اورعورتوں کی طرح نہیں ہواگر تم پرہیزگار رہنا چاہتی ہوتوکسی اجنبی شخص سے نرم نرم باتیں نہ کروتا کہ وہ شخص جس کے دل میں کسی طرح کا مرض ہےکوئی امید نہ پیدا کرے اوردستور کے مطابق بات کیا کرواوراپنے گھروں میں ٹھہری رہواورجس طرح (پہلے) جاہلیت (کے دنوں میں)اظہار تجمل کرتی تھیں اس طرح زینت نہ دکھاؤ اورنماز پڑھتی رہو اورزکوٰۃ دیتی رہو اورخدا اوراس کے رسول کی فرمانبرداری کرتی رہو۔اے پیغمبر کے اہل بیت خدا چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی (کا میل کچیل) دورکردے اورتمہیں بالکل پاک صاف کردے اورتمہارے گھروں میں جوخدا کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اورحکمت (کی باتیں سنائی جاتی ہیں) ان کو یاد رکھو، بےشک خدا باریک بیں اور باخبر ہے۔

زیادہ بیویوں کا رواج یوں بھی اس زمانہ کے عربوں میں عام تھا اور اس میں خواہش و پسند کے علاوہ اور عائلی ضرورت کے ساتھ ساتھ بعض دیگر مصلحتیں بھی ہوا کرتی تھیں، ان میں سے ایک بات اولاد کی تعداد بڑھانا تھا تا کہ قبیلہ کی عددی طاقت میں اضافہ ہو کیونکہ وقتاً فوقتاً قبائل کے درمیان آپسی جنگوں کا سلسلہ چلتا رہتا تھا، اور دیگر خاندانوں میں اپنے رشتہ بنانے کے ذریعہ اپنے خاندانی حامیوں کی تعداد بڑھانے کے لئے بھی ہوتا تھا، اس مقصد کے لئے وہ مختلف باحیثیت خاندانوں سے رشتے کرتے تھے، تا کہ دوسرے خاندانوں میں رشتہ قائم ہونے پر ان کو ضرورت پڑنے پر تائید اور معاونت حاصل ہو جائے، کسی خاندان کے فرد کا دوسرے خاندان کے فرد سے ازدواجی تعلق ہو جانا اس خاندان سے تعاون اور حمایت کا ذریعہ بنتا تھا، اور یہ کام من مانے طریقہ سے کیا جاتا تھا، اسلام کے آنے کے بعد اس کو ایسا کنٹرول کیا گیا کہ اس میں من مانی اور بیجا طرزِ عمل اختیار نہ کیا جا سکے۔ آپ کے نبوی ذمہ داریوں کو انجام دینے اور دشمنوں کی دشمنی پر روک لگانے کی مصلحت نے بھی آپ کے لئے متعدد نکاح کی ضرورت پیدا کی۔

اسلام سے قبل عربوں کے گمراہ شدہ اور جاہلیت کی زندگی میں ازدواجی تعلق تقریباً چار مختلف طریقوں سے قائم کیا جاتا تھا، ان میں سے کئی طریقے زیادہ آزادروی کے بلکہ فحاشی کے حامل تھے، اسلام نے آ کر اس میں سے صرف ایک طریقہ جو شریفانہ، معتدل اور باحیا طریقہ تھا اس کو لازمی کر دیا، باقی طریقوں کو ممنوع قرار دیا(۱)، اور اسکے ساتھ ضرورت پڑنے پر صرف چار بیویوں تک کی گنجائش رکھی اور اپنے آخری نبی کے لئے دعوتی، انتظامی مصلحت کی خاطر اس میں اضافہ کی گنجائش دی لیکن اس کو بھی ۱۱ تک محدود کر دیا۔

---

(۱) تفسیر طبری: ۱۸/ ۱۰۱، صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب من قال لا نکاح إلا بولی

آپ ﷺ کی ازدواجی زندگی کا جائزہ لینے پر یہ خصوصیت پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ آپ ﷺ کی پوری ازدواجی زندگی نہایت محتاط اور جوانی کی خواہش اور من مانی زندگی کی بے احتیاطیوں سے بالکل محفوظ تھی، آپ ﷺ نبوت ملنے سے پہلے بھی خاندان میں خیر خواہی اور خیر پسندی کے جو کوئی کام ہوتے اس میں بھرپور حصہ لیتے، ازدواجی زندگی شروع کرنے میں آپ نے کوئی جلد بازی بھی نہیں کی، بلکہ سنجیدہ انداز میں اور احتیاط کے ساتھ وقت گذرا، اور جب اچھا رشتہ ملا، تو ازدواجی زندگی اختیار کی۔

آپ کی پہلی بیوی خدیجہ بنت خویلد ہوئیں، جو آپ سے ۱۵ سال بڑی تھیں اور جو پورے قبیلے میں باوقار اور خوش خصال سمجھی جاتی تھیں اور ایک شوہر کے انتقال کے بعد بیوہ بھی ہوگئی تھیں (۱)۔

نبوت کی ذمہ داری ملنے سے قبل جب کہ آپ پر کوئی مذہبی پابندی عائد نہیں ہوئی تھی، آپ ﷺ نے ان کے ساتھ باہمی انس والفت اور ایک دوسرے سے موانست کے انداز سے، سنجیدہ اور باوقار زندگی گذاری اور جب آپ ﷺ کو نبوت کی ذمہ داری سپرد ہوئی تو بھی ان کا معاملہ آپ کے ساتھ تائید اور موافقت کا رہا اور آپ جب بھی اس کی عظیم ذمہ داری کے احساس سے ذہنی دباؤ محسوس کرتے تو آپ کو آپ کی اہلیہ کی طرف سے تسکین و ہمدردی حاصل ہوتی تھی، چنانچہ جب آپ پر پہلی وحی آئی اور آپ نے اس کا بہت بوجھ محسوس کیا تو وہ آپ کے دل کی تقویت کے لیے اپنے عزیز ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں اور ان سے تسکین کی بات کہلوائی، وہ سابقہ انبیاء کے حالات کا علم رکھتے تھے اور ان کو گذشتہ انبیاء کے اقوال سے ایسی صورت کے وجود میں آنے کا علم حاصل ہو چکا تھا، لہذا انہوں نے تسکین دی اور نبوت کی تصدیق کی (۲)، اس کے بعد جب نبوت کی ذمہ داری آپ انجام دینے لگے اور اس کی وجہ

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ: ۲/۲۹۴-۲۹۵۔ (۲) سیرت ابن ہشام: ۱/۲۳۶-۲۴۱

سے لوگوں کی طرف سے آپ کو تکلیفیں پہونچائی جانے لگیں تو آپ اس کے تاثر کے ساتھ جب گھر لوٹتے تو آپ کی اہلیہ تسکین وہمدردی کے الفاظ استعمال کرتیں، آپ ﷺ نے بھی ان کی حیات میں ان کے علاوہ کسی دوسری خاتون سے نکاح نہیں کیا، انہیں پر اکتفاء کیا حتی کہ ان کیساتھ ۲۵ سال رفاقت کے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔

آپ نے اپنی پہلی رفیقۂ حیات کے انتقال کے بعد جو کہ آپ کی پچاس سال کی عمر ہونے پر وفات پا گئی تھیں، اولاً توقف کیا، پھر اہل تعلق کے مشورہ پر جن خاتون سے نکاح کیا وہ بھی خاصی معمر تھیں اور ان میں ظاہری کشش بھی کم تھی، یہ حضرت سودہ بنت زمعہ قرشیہ عامریہ تھیں، ان کا رشتہ قبول کرنے میں اپنی ان صاحبزادیوں کی جو ابھی کم عمر تھیں، دیکھ بھال اور سرپرستی کی ضرورت کی مصلحت تھی، اسی لئے معمر اور سنجیدہ طبیعت خاتون کو رفیقۂ حیات بنانے کو اختیار کیا (۱)۔

عمر کے ترپن سال گذر جانے پر جب اپنے ماننے والوں کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ آگئے، اور وہاں کے مسلمانوں کی اجتماعی اور دینی مصلحتوں کے مناسب طریقے اختیار کرتے ہوئے جنگوں سے سابقہ پڑا تو آپ کو مختلف خاندانوں اور قبیلوں کو ان میں رشتہ ازدواج قائم کر کے قریب کرنے اور اپنا ہمدرد بنانے کی ضرورت سے مختلف سرکردہ افراد اور سرداروں کے یہاں کے رشتے کئے اور اس کے ذریعہ انسانی ہمدردی اور مساوات کی بھی بعض مثالیں قائم کیں، چنانچہ قریش کے سردار اور قائد جنگ کی صاحبزادی ام حبیبہ بنت ابی سفیان الاموی کو آپ نے اپنی رفاقت حیات کے لئے قبول کیا، جنہوں نے اسلام کو اپنے شوہر کے ساتھ قبول کر کے حبشہ ہجرت کی تھی، اور وہاں ان کے شوہر اسلام چھوڑ کر عیسائی ہوگئے تھے اور وہ تنہا پڑ گئی تھیں (۲)، اور یہودی قبیلہ بنو نضیر کے سردار حی بن اخطب کی بیٹی صفیہ نضریہ یہودیہ کو رفیقہ حیات بنایا (۳) جو

---

(۱) الکامل فی التاریخ: ۲/ ۳۰۷، زاد المعاد: ۱/ ۱۰۵۔ (۲) تاریخ طبری: ۳/ ۱۶۵، الکامل فی التاریخ: ۲/ ۳۰۷
(۳) سیرت ابن ہشام: ۲/ ۶۴۶

کہ جنگ میں گرفتار ہوکر باندی قرار پائی تھیں، آپ نے یہودی قبیلہ پر احسان رکھنے کی خاطر ان کو آزاد کر کے اپنی زوجیت میں لے لیا، اور ایک دوسرے یہودی قبیلہ بنی المصطلق کے سردار حارث بن ضرار کی بیٹی جویریہ بھی باندی ہوکر مسلمانوں کو حاصل ہوئی تھیں، ان کو بھی آپ نے سردار قبیلہ کو ممنوں بنانے کے لئے آزاد کیا اور ان کو بھی رفیقۂ حیات بنالیا(۱) جس کے اثر سے پورا قبیلہ ممنون ہوا اور مسلمان ہوگیا، دوسری طرف اپنے قریب ترین صحابی حضرت ابوبکر کی صاحبزادی حضرت عائشہ کو اور دوسرے قریب ترین صحابی حضرت عمر کی صاحبزادی حضرت حفصہ کو رفیقۂ حیات بنایا(۲)، تیسرے قریب ترین صحابی حضرت عثمان بن عفان جو کہ قبیلہ قریش کے خاندان اموی کے اہم فرد تھے جس کے سردار ابوسفیان آپ سے جنگ کے سربراہ ہوتے تھے آپ ﷺ نے اپنی دو صاحبزادیوں کو ان کی زوجیت میں دیا(۳)۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے زینب بنت خزیمہ ہلالیہ کو اپنی زوجیت میں قبول کیا، جو شادی کے دو ماہ بعد وفات پا گئیں(۴) پھر ام سلمہ ہند بنت امیہ قرشیہ مخزومیہ کو آپ ﷺ نے اپنی زوجیت میں لیا(۵)، جنہوں نے اپنے شوہر کے ہجرت مدینہ کے موقع پر اپنے خاندان کی طرف سے ایذارسانی کا سلسلہ سال بھر تک برداشت کیا تھا، اور اسلام کی وفاداری میں فرق نہیں آنے دیا تھا، اور سال بھر کے مجاہدہ کے بعد مدینہ اپنے شوہر کے پاس آئیں، لیکن جلد ہی ایک جنگ میں ان کے شوہر شہید ہوگئے اور وہ تنہا رہ گئیں، آپ ﷺ نے ان کو زوجیت میں لیکر ہمدردی کا ثبوت دیا، آپ ﷺ نے اپنی پھوپھی زاد بہن زینب بنت جحش جو خاندانی عزت کا بڑا مقام رکھتی تھیں، جمہوریت ومساوات کی مثال قائم کرنے کے لئے اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کی

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۲/ ۶۴۵۔ (۲) تاریخ طبری: ۳/ ۱۶۱-۱۶۲، زادالمعاد: ۱/ ۱۰۶

(۳) البدایۃ والنھایۃ: ۵/ ۲۹۳۔ (۴) زادالمعاد: ۱/ ۱۰۶، سیرت ابن ہشام: ۲/ ۶۴۷

(۵) تاریخ طبری: ۳/ ۱۶۴، زادالمعاد: ۱/ ۱۰۶

زوجیت میں دیا، انہوں نے بھی اس نکاح کو اپنی طبیعت پر جبر کر کے اپنے ماموں زاد بھائی جو نبیؐ تھے ان کی مرضی کو اپنی مرضی پر ترجیح دیتے ہوئے قبول کیا، بعد میں دونوں کے تعلقات سازگار نہ ہو سکے اور حضرت زید نے طلاق دے دی، جس سے ان معزز خاندان کی خاتون کی ایک آزاد کردہ غلام سے طلاق ملنے پر دل شکنی ہوئی، آپ ﷺ نے اس کی تلافی میں ان مطلقہ کو اپنے نکاح میں قبول فرمالیا(۱)، اس طرح ایک دوسری مثال یہ قائم کی کہ اللہ تعالی کے اس حکم پر سرعام اعلان ہوگیا کہ حضرت زید جو آزاد کردہ غلام ہونے کے ساتھ حضور ﷺ کی طرف سے متبنی بنائے گئے تھے متبنی کی مطلقہ سے شادی جاہلیت میں عیب سمجھی جاتی تھی، آپ ﷺ نے ان مطلقہ کا اعزاز کرتے ہوئے اللہ تعالی کے حکم سے یہ بات بھی ظاہر فرمادی کہ متبنی بنانے سے کوئی بیٹے کی طرح نہیں ہو جاتا، اور اسکی وضاحت قرآن مجید میں بھی آگئی:

﴿فلما قضی زید منها وطراً زوجناكها﴾ [سورہ احزاب: ۳۷] پھر جب زید نے اس سے (کوئی) حاجت (متعلق) نہ رکھی (یعنی اس کو طلاق دیدی) تو ہم نے تم سے اس کا نکاح کر دیا۔ (۲)

آپ ﷺ نے حاکم مصر مقوقس کی طرف سے بھیجی ہوئی ایک باندی ماریہ بنت شمعون قبطیہ سے جو عرب نہ تھیں آزاد کر کے اپنی زوجیت میں لیا، اسی طرح ایک دوسری باندی ریحانہ بنت زید جو قبیلہ بنی النضیر سے تھیں اسلام قبول کرنے کے بعد ان کو آزاد فرمایا اور پھر ان کو اپنی زوجیت میں قبول کیا (۳)، اور اس طرح انسانی مساوات کی مثالیں قائم کیں کہ کوئی خاتون باندی رہی ہو تو آزاد کر دینے کے بعد آزاد خاتون کے رتبے میں آجاتی ہے، آپ ﷺ نے یہ سب اس صورت میں کیا کہ دستور کے مطابق آپ ان سب کو باندی رکھتے ہوئے زوجیت والا فائدہ اٹھا سکتے تھے، لیکن

---

(۱) تاریخ طبری: ۳/ ۱۶۵۔ (۲) زاد المعاد: ۱/ ۱۰۸۔

(۳) الکامل فی التاریخ: ۲/ ۳۱۱، البدایۃ والنھایۃ: ۵/ ۳۰۳-۳۰۶

آپ نے اونچ نیچ ختم کرنے کے لئے ایسا کیا۔

ازواج مطہرات میں سب سے آخر میں آپ ﷺ کی رفیقۂ حیات بننے کا شرف میمونہ بنت الحارث الہلالیہ کو حاصل ہوا۔

بہرحال آپ ﷺ نے مختلف خواتین سے شادیاں قبول فرمائیں، جو کہ سب کے سب آپ کی عمر کے ۵۳ سال گذر جانے کے بعد کے دور میں ہوئیں، ان میں کئی کی رفاقت آپ ﷺ کے ساتھ دو تین سال کی رہی، کسی کے ساتھ اس سے کم، کسی کے ساتھ اس سے زیادہ، لیکن سب صرف حیات طیبہ کے آخری ۸-۱۰ سال کے اندر عمل میں آیا، جو کہ آپ ﷺ کی عمر کے ۵۳ سال سے ۶۳ سال کے درمیان کی مدت ہے۔

آپ اپنی ان متعدد ازواج کے معاملہ میں قیام مدینہ کی صورت میں مساوات اور انصاف سے کام لیتے اور اس کے لئے تقسیمِ وقت کا طریقہ اختیار کرتے، اور جب سفر کا موقع آتا تو اپنی ازواج مطہرات کے درمیان قرعہ ڈال کر جس کا نام قرعہ میں آتا اسی کو ساتھ لے جاتے، اس طرح ہر ایک کو سفر کی رفاقت کا موقع ملتا، اور یہ سب اللہ تعالیٰ کی وحی کے مطابق ہوتا تھا، کیونکہ حضور ﷺ کا یہ اور دوسرا کوئی بھی عمل ہوتا تھا وحی کے مطابق ہی ہوتا تھا، خالص اپنی مرضی سے نہیں ہوتا تھا، اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتایا گیا جو عمل بھی آپ کرتے تھے اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حکمت رکھی گئی ہوتی تھی۔

آپ ﷺ کی ہر رفیقۂ حیات کی اپنی الگ خصوصیت اور اہمیت تھی، جس میں کوئی افادیت اور حکمت رکھی گئی ہوتی، وہ آپ ﷺ کو حاصل ہوتی تھی، آپ کو امت کی رہنمائی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے کی گئی زندگی کے لئے قابل اتباع نمونہ ہونا تھا، شوہر و بیوی کے درمیان مختلف النوع جو مسائل اٹھتے ہیں ان کے سلسلہ میں شریعت کا جو حل ہوتا اس کے لئے آپ ﷺ کی زندگی سے نمونہ حاصل ہونا تھا، اور آپ ﷺ کی

ازدواجی زندگی کے اندرونی حالات کے سلسلہ میں ان ہی ازواج مطہرات سے نبوی نمونہ کا علم بطور شرعی حکم کے سامنے آتا تھا، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ذریعہ متعدد حالات میں اسوۂ نبوی کی وضاحت ہوئی، نیز رفیقۂ حیات سے شوہر کو انسانی سطح پر جو تقویت اور تسکین خاطر ملنا انسان کی فطری ضرورت ہے، وہ بھی آپ ﷺ کو اپنی مختلف رفیقات حیات سے مختلف موقعوں پر حاصل ہوتی رہی۔

حضور ﷺ کو نبوت ملنے پر جس تقویت اور تسکین خاطر کی انسانی ضرورت تھی، وہ حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا سے ملی، جس کا تذکرہ آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کیا، اس طرح صلح حدیبیہ کے موقع پر جب آپ ﷺ کو شبہ ہوا کہ آپ ﷺ کے اصحاب آپ ﷺ کے کہنے پر عمل نہیں کر رہے ہیں، تو آپ ﷺ کی رفیقۂ حیات حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کو ایسا مشورہ دیا جس سے مسئلہ حل ہوگیا، اور سب نے آپ ﷺ کے ارشاد کے مطابق قربانی کے جانوروں کی قربانی کردی اور بال بنوائے گئے (۱)۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا (حضرت سودہ بنت زمعہ کے ایک سال بعد نبوت کے گیارہویں سال شوال میں آپ کی زوجیت میں آئیں) سے دوسرے پہلوؤں میں تعاون ملا، اور آپ ﷺ کی نجی زندگی کے معاملات میں احکام معلوم ہوئے، انہوں نے حضور ﷺ کے اعمال واقوال کے سلسلہ میں دو ہزار دس حدیثیں روایت کیں، جن سے شریعت کے بہت سے مسائل ماخوذ ہیں، اس کے علاوہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد اڑتالیس سال تک آپ حیات رہیں، اور اس مدت میں عورتوں کی دینی تربیت اور دوسری تربیتی کوششوں کو انجام دیا۔ ۱۷ر شعبان ۵۷ یا ۵۸ھ میں انتقال کیا، اور بقیع میں مدفون ہوئیں۔

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الشروط، فی الجہاد والمصالحۃ، مع أہل الحرب، ابوداؤد: ۲۷۲۵، مسند امام احمد: ۴/۳۲۳، ۳۲۶، ۳۲۸، ۳۳۱، زاد المعاد: ۳/۲۹۵

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بھی اپنی نیک عملی کے ساتھ دین کی تقویت کا ذریعہ بنیں، اور ان سے دوسودس حدیثیں مروی ہیں۔ شعبان ۳ھ میں آپ ﷺ کی زوجیت میں آئیں، شعبان ۴۵ھ میں مدینہ منورہ میں ۶۰ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

ام المساکین زینب بنت خزیمۃ سے حضور ﷺ نے ۴ھ میں نکاح کیا، شادی کے تین مہینے بعد ربیع الثانی ۴ھ میں وفات پاگئیں اور بقیع میں مدفون ہوئیں۔

ام سلمہ ہند بنت ابی امیہ شوال ۴ھ میں آپ ﷺ کی زوجیت میں آئیں اور ۸۴ سال کی عمر میں ۵۹ھ میں انتقال کیا اور بقیع میں مدفون ہوئیں۔

حضرت زینب بنت جحش کے ذریعہ متبنٰی بنانے اور اس کے اثر سے جو رسم قائم تھی اس کو توڑنے اور آزادشدہ اور باندی اور شریف زادی کے درمیان فرق کئے جانے کو ختم کرنے کی مثال قائم ہوئی۔ ذوالقعدۃ ۵ھ میں حضور ﷺ کی زوجیت میں آئیں اور ۵۳ سال کی عمر میں ۲۰ھ میں وفات پاگئیں، بقیع میں مدفون ہوئیں۔

جویریہ بنت الحارث ۵ یا ۶ھ میں آپ ﷺ کی زوجیت میں آئیں، ۶۵ سال کی عمر میں ۵۶ھ میں انتقال کیا اور بقیع میں مدفون ہوئیں۔

حضرت ام حبیبہ رملہ بنت ابی سفیان اور ان کے شوہر عبداللہ بن جحش دونوں نے اسلام پر مکہ والوں کی طرف سے جو تکلیفیں اٹھائیں تھیں، ان سے مجبور ہوکر حبشہ ہجرت کی تھی، حبشہ میں عبداللہ بن جحش عیسائی عورتوں کے فتنہ میں پڑ کر مرتد ہوکر عیسائی ہوگئے تھے، ان سے حضرت رملہ کی زوجیت ختم ہوجانے پر جو صدمہ ان کو ہوا اس کی تلافی حضور ﷺ نے ان کو اپنی زوجیت میں لیکر فرمائی، حضرت رملہ نے حضور ﷺ کی بہتر رفیقۂ حیات کے طور پر زندگی گذاری۔

صفیہ بنت حیی بن اخطب کو حضور ﷺ نے واقعہ خیبر کے بعد ۷ھ میں اپنی

زوجیت میں لیا، ۵۰ھ میں انتقال کیا اور بقیع میں مدفون ہوئیں۔

میمونہ بنت الحارث عمرۃ القضاء کے سال (ذوالقعدۃ ۷ھ) آپ ﷺ کی زوجیت میں آئیں، مقام سرف میں ۶۱ھ میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئیں۔

تمام زوجات النبی ﷺ نے اپنی اپنی جگہ حضور ﷺ کو اپنی رفاقت سے تقویت اور تسکین کا فرض انجام دیا، اور نبوت کے وسیع اور متنوع کاموں کی انجام دہی میں حضور ﷺ کی زندگی کے نجی دائرہ میں مدد پہونچائی۔ ازواج مطہرات میں سے دو حضرت خدیجہ اور ام المساکین زینب کا انتقال حضور ﷺ کی زندگی میں ہوا، بقیہ آپ ﷺ کی وفات کے بعد حیات رہیں۔

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے طور طریق کو قیامت تک آنے والوں کے لئے آپ ﷺ کی شریعت اور دین کی تابعداری کے لئے نمونہ قرار دیا، اس لئے آپ ﷺ کے مختلف انداز اور طریقے انسانی زندگی میں پیش آنے والے حالات میں رہبری کا ذریعہ رکھتے ہیں، کسی کو زوجیت میں لینے کے سلسلہ میں کس طرح کی صورتیں پیش آسکتی ہیں، ان صورتوں میں کیا کیا جاسکتا ہے، وہ آپ ﷺ کے نمونوں سے حاصل ہوگا۔

عام انسان کے لئے اگر ایک سے زیادہ بیوی ہے تو دونوں کے درمیان پورا انصاف برتنا کتنا مشکل ہوتا ہے چہ جائیکہ کسی کے ساتھ مساوات کا معاملہ ہو، تنہا یہ بات نبی ﷺ کا بہت بڑا مجاہدہ تھا، جس کو دیکھ کر آدمی کے لئے جس کی ایک سے زائد بیویاں ہوں نبی ﷺ کا اسوہ کس قدر ہمت اور حوصلہ دلانے والا ہے، اس طریقہ سے بیوی کے معاملہ میں جو منصفانہ اور انسانی جذبہ کو اختیار کرنے کی تلقین ہے اس کے لئے وہ رہنمائی کرنے والا نمونہ ہے۔

آپ ﷺ نے زاہدانہ زندگی اور محتاط سیرت واخلاق اور دنیاوی راحت

وآرام سے بے رغبتی کا طریقہ اختیار کر رکھا تھا، اس میں اپنی بیویوں کو بھی شریک رکھا، ان سے فرمایا کہ اگر وہ آرام چاہتی ہیں، تو آپ ان کو اس کے لئے اپنی زوجیت سے آزاد کر سکتے ہیں، اور اس کے لئے ان کو غور کرنے کا موقع دیا، لیکن انہوں نے آپ کے ساتھ رہکر تکلیف میں زندگی گزارنے کو ترجیح دی اور آپ کے ساتھ پورے اتفاق وتعاون کے ساتھ وقت گزارا اور اعلیٰ ترین اخلاق رکھنے والے کنبہ کا ثبوت دیا۔

☆☆☆

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد

حضور ﷺ کے ساتھ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی رفاقت ۲۵ سال رہی، ۱۵ سال نبوت سے پہلے اور دس سال نبوت ملنے کے بعد، اس درمیان میں ان سے آپ ﷺ کی کئی اولاد ہوئیں، صاحبزادہ حضرت القاسم الطیب الطاہر اور حضرت عبد اللہ ہوئے، جو اپنے زمانۂ طفلی ہی میں انتقال کر گئے (۱) اور چار صاحبزادیاں ہوئیں، جن میں سب سے بڑی حضرت زینب رضی اللہ عنہا ہوئیں، جو بعثت سے دس سال قبل پیدا ہوئیں، ان کی شادی ابوالعاص بن ربیع بن لقیط سے ہوئی اور حضور ﷺ کی حیات ہی میں ۸ھ میں انتقال کیا، ان سے ایک بیٹی امامہ ہوئیں اور ایک بیٹے علی ہوئے (۲)۔

آپ ﷺ کی دوسری صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا ہوئیں، جو بعثت سے ۹ سال قبل پیدا ہوئیں اور ان کی شادی ابولہب کے بیٹے عتبہ سے ہوئی، آپ ﷺ کو نبوت ملنے پر ابولہب نے جو دشمنی اختیار کی اسی ضمن میں اس نے زبردستی طلاق دلوادی، پھر ان کی شادی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ہوئی اور ان کا بھی انتقال آپ ﷺ کی حیات ہی میں ہجرت کے دوسرے سال ہوا (۳)۔

آپ ﷺ کی تیسری صاحبزادی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا ہوئیں، ان کی پیدائش بھی نبوت سے قبل ہوئی اور ان کی شادی ابولہب کے دوسرے بیٹے عتیبہ سے ہوئی اور ان سے بھی ابولہب نے اپنے بیٹے سے طلاق دلوادی اور جب ہجرت کے

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ: ۳۰۴/۵۔
(۲) سبل الھدی والرشاد فی سیرۃ خیر العباد، از: محمد بن یوسف صالحی شامی، ۲۹/۱۱-۳۲۔
(۳) أیضاً: ۳۳-۳۵، انساب الأشراف، از: احمد بن یحیی بلاذری: ۴۰۱۔

دوسرے سال حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے یہاں گنجائش نکل آئی تو حضور ﷺ نے ان کی شادی بھی ان سے کرادی، اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی دو صاحبزادیوں کے شوہر ہوئے، اسی بنا پر ان کو ''ذوالنورین'' کا خطاب حاصل ہوا، ان صاحبزادی کا بھی انتقال حضور ﷺ کی حیات طیبہ میں ہی ہوگیا، یہ ۹ھ کا واقعہ ہے(۱)۔

حضور ﷺ کی چوتھی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہوئیں، یہ نبوت سے ۵ سال قبل پیدا ہوئیں اور ان کی شادی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہوئی، یہ حضور ﷺ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں اور ان سے ہی حضور ﷺ کی نسل چلی، دو بیٹے حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما ہوئے، یہ حضور ﷺ کی حیات طیبہ میں رہیں، البتہ آپ ﷺ کی وفات کے چھ ماہ بعد انتقال کرگئیں (۲)، ان کا ساتھ حضور ﷺ کے ساتھ تمام عمر رہا، کیونکہ شادی سے قبل تو ساتھ رہا ہی تھا، شادی کے بعد بھی رہا کیونکہ حضرت علی آپ ﷺ کے ساتھ ہی رہتے تھے، اس لئے آپ ﷺ کا بھی ساتھ رہا، اس کی وجہ سے حضور ﷺ کی محبت وشفقت ان کو بہت ملی اور خصوصی تربیت ہوئی، پھر اسی تعلق سے ان کے صاحبزادوں حضرت حسن وحضرت حسین رضی اللہ عنہما نے بھی حضور ﷺ کی شفقت وتربیت کا حصہ وافر پایا، اور اسی کے ساتھ آپ ﷺ نے ان کو آخرت کی فکر اور دنیا سے بے نیازی کا عادی بنایا اور اس تعلق سے بھی آپ ﷺ نے حضرت فاطمہ اور دونوں صاحبزدگان کو بہت محبت کے الفاظ سے نوازا (۳) آپ ﷺ ان سے محبت صرف نواسوں کی طرح ہی نہیں بلکہ پوتوں کی طرح کرتے تھے اور وہ دونوں بھی بہت سعادت مند اور صالح ترین سیرت واخلاق کے ہوئے اور ان سے وہی اسوہ ظاہر ہوا جو ایک

---

(۱) البدایۃ والنھایۃ: ۵/ ۳۰۸، سبل الھدی والرشاد فی سیرۃ خیر العباد، از: محمد بن یوسف صالحی شامی، ۱۱/ ۳۶

(۲) البدایۃ والنھایۃ: ۵/ ۳۰۹، سبل الھدی والرشاد فی سیرۃ خیر العباد، از: محمد بن یوسف صالحی شامی، ۱۱/ ۳۷-۵۴۔ (۳) سبل الھدی والرشاد فی سیرۃ خیر العباد، از: محمد بن یوسف صالحی شامی، ۱۱/ ۵۵-۸۲

برگزیدہ نبی کے نواسوں اور پوتوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

حضورﷺ کی یہ سب صاحبزادیاں اور صاحبزادے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطن شریف سے تھے(۱)، سوائے ایک صاحبزادہ حضرت ابراہیم کے جو ہجرت کے کئی سال بعد حضرت ماریہ قبطیہ کے آپ کی زوجیت میں آنے پر پیدا ہوئے، لیکن وہ بھی بچپنے ہی میں انتقال کر گئے یہ حضرت خدیجہ کی وفات کے کئی سال بعد پیدا ہوئے تھے(۲)۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی زندگی بھی زیادہ دراز نہیں ہوئی، وہ اپنے والدﷺ کی حیات کے صرف ۶ ماہ بعد انتقال کر گئیں اور اپنے دونوں بیٹوں کو یتیم چھوڑ گئیں، جن میں ایک کی عمر اس وقت صرف ۷ سال اور دوسرے کی صرف ۸ سال تھی، وہ اپنے والد نامدار کی زیر سرپرستی بڑھے اور جوان ہوئے، ان کے والد حضرت علی رضی اللہ عنہ حضورﷺ کے خلیفۂ اول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے عمر میں ۲۷ سال چھوٹے تھے اور خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ۱۷ سال اور خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بھی عمر میں چھوٹے تھے اور حضورﷺ کے داماد ہونے کی صفت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان کے شریک تھے بایں طور کہ حضورﷺ کی دیگر دو صاحبزادیاں یکے بعد دیگرے ان کے عقد میں آئی تھیں، اس طرح وہ حضورﷺ کے دوہرے داماد ہوئے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے بعد خلیفہ ہوئے، اس طرح یہ چار خلفاء، خلفائے راشدین کہلائے اور ان چاروں نے حضورﷺ سے سیکھا ہوا طریقہ حکومت و امارت بطریق احسن اختیار کیا اور دنیا کے سامنے اس کو بطور نمونہ پیش کیا، ان چاروں کی مدت خلافت تقریباً ۳۰ سال رہی۔

☆☆☆

---

(۱) البدایۃ والنھایۃ: ۵/۳۰۶۔ (۲) البدایۃ والنھایۃ: ۵/۳۰۹، أنساب الأشراف: ۴۴۸-۴۵۳

باب نہم

خصوصیات اور شمائل و خصائل نبوی

جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کی اصلاح کے لئے کسی کو نبی کی حیثیت سے مبعوث فرماتا ہے تو قوم کے ایسے شخص کو انتخاب فرماتا ہے جو فہم و فراست، سیرت و کردار اور حوصلہ و ہمت کے لحاظ سے سب میں ممتاز ہوتا ہے، اور یہ امتیاز دراصل خدا کا ہی عطا کردہ ہوتا ہے تاکہ وہ اصلاح و ارشاد کے مفوضہ کام کو انجام دے سکے، اسکے لئے اس کو آسمانی احکام دیئے جاتے ہیں، انہی کے مطابق وہ اپنی قوم کو رشد و ہدایت کی طرف بلاتا ہے، اللہ تعالی کی طرف سے کسی کو منصب نبوت کے ملنے سے پہلے اس کی زندگی کی جو مدت گذرتی ہے اس میں اس کے رب کیطرف سے انسانی خوبیاں انسانی فطرت کے دائرہ میں رکھی گئی ہوتی ہیں اور وہ اعلی خصوصیات ہوتی ہیں، ان خصوصیات کو ان کی قوم دیکھتی اور پسند کرتی ہے اور قوم کے اندر رہنے کی وجہ سے قوم اس کی اعلی اور نیک انسانی خصلتوں سے واقف ہو چکی ہوتی ہے۔

لہذا جب وہ نبوت ملنے پر رشد و ہدایت کی دعوت دیتا ہے، تو اس کی دعوت کو اس کی قوم کے ضدی اور نفس پرست افراد صرف یہ کہہ کر رد کر دیا کرتے ہیں کہ یہ شخص اب ایسی باتیں کرنے لگا ہے جو ہمارے بڑوں نے نہیں کیں، یہ ہمارے بڑوں کے طریقہ سے ہٹ گیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ اس کی نیک اور انسانی خصلتوں سے انکار نہیں کر پاتے، لہذا وہ لوگ اپنی ان مذہبی عادات و اطوار کو جن کو اپنی

پیدائش کے وقت سے اختیار کئے ہوتے ، محض تعصب اور ہٹ دھرمی میں ان عادات واطوار کے خلاف کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے ، اسی کے ساتھ وہ نبی کی اخلاقی اور انسانی خصوصیات سے انکار بھی نہیں کرتے ۔ نبی ان سے کہتا کہ بھائی تم ہم کو اچھی طرح جانتے ہو، کتنے عرصہ سے تم مجھ کو دیکھ رہے ہو اور میرا تجربہ کرر ہے ہو، پھر بھی میری بات کی طرف دھیان نہیں دیتے ،اسی کی طرف قرآن مجید کی یہ آیت اشارہ کرتی ہے:

﴿فقد لبثت فيكم عمراً من قبله أفلا تعقلون﴾ (يونس:١٦)

میں نے تم میں اس سے پہلے ایک عمر گزاری ہے، تعجب ہے تب بھی تم نہیں سمجھتے ۔

نیک نیتی ، شرافت ، عزم وہمت صبر واستقامت ، حُسن معاملہ ، ہمدردی و اخلاق نبی کی وہ خصوصیات ہیں جن کو جو بھی ذرا غیر جانبدار ہو کر ان کی بات سنتا تو ماننے پر مجبور ہو جاتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی معاملہ تھا کہ آپ چالیس سال ان میں محبوب اور پسندیدہ رہے تھے، اس کے بعد جب آپ ان کے غلط رواج اور بگڑے ہوئے مذہب سے روکنے اور اچھے اخلاق اور مذہب کی طرف دعوت دینے لگے تو وہ سب ان سے ناراض ہوئے ،لیکن اس بات سے شدید مذہبی دشمنی رکھنے کے باوجود بھی ان میں سے کچھ نہ کچھ لوگ ان کی بات پر غور کرتے اور آپ ﷺ کی دعوت قبول کرتے ، کیونکہ آپ ﷺ کی انسانی ہمدردی ، سچائی اور پاکدامنی اور حسن کردار سے خوب واقف تھے، لہذا جو شخص بھی خالی الذہن ہو کر آپ ﷺ کی بات سنتا آپ ﷺ کا گرویدہ ہو جاتا، حتی کہ آپ ﷺ کو نقصان پہونچانے کی نیت سے آنے والا بھی آتا، آپ ﷺ کے حسن معاملہ کو دیکھتا تو اس میں اچانک تبدیلی آجاتی ۔ پھر بھی قوم کی بڑی تعداد آپ کی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتی تھی ، اپنے کانوں میں روئی ڈال لیتے ، کہ نہ سنیں گے،

اور پھر آپ کو اس پیغام سے روکنے کے لئے سخت رویہ اختیار کرتے اور ظلم کرتے۔

آپ ﷺ پر جب نبوت کی ذمہ داری پڑی تو آپ ﷺ نے اس کی گرانباری محسوس کرتے ہوئے فکرمندی کا اظہار اپنی زوجہ محترمہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے کیا تو انہوں نے یہ کہہ کر تسلی دی اور اطمینان دلایا کہ "آپ پریشان نہ ہوں، خدا کی قسم اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی ذلیل ورسوانہ کریگا، آپ ﷺ صلہ رحمی اور رشتہ داری کا پاس ولحاظ کرتے ہیں، دوسروں کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں، محتاجوں کے کام آتے ہیں، مہمان کی ضیافت اور خاطر مدارات کرتے ہیں، راہ حق کی تکلیفوں اور مصیبتوں میں مدد کرتے ہیں" (۱)۔

اُم المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے یہ بات عقل سلیم اور فطرت صحیحہ نیز اپنی زندگی کے تجربوں اور لوگوں سے واقفیت کی بنیاد پر کہی تھی، آپ ﷺ کو آپ کی نیک خصلتوں اور سچائی اور امانت شعاری کے کردار کی بنا پر الصادق الأمین کا قوم کی طرف سے خطاب ملا تھا، کہ آپ ﷺ نہایت سچے اور نہایت امانتدار تھے، چنانچہ باوجود آپ ﷺ سے عداوت رکھنے کے آپ ﷺ کی دیگر بات کا سب اعتبار بھی کرتے تھے، اور آپ ﷺ کے پاس امانتیں رکھاتے تھے، آپ ﷺ بھی تعاون وہمدردی کے موقعوں پر سب کا خیال رکھتے تھے، حتی کہ کعبہ کی تعمیر جدید کے موقع پر آپ ﷺ نے بھی سب کے ساتھ ملکر پتھر اٹھائے اور کسی اچھے مقصد کے لیے مشورہ ہوتا، تو اس میں شریک ہوتے، کسی کو مصیبت وافتاد پڑتی تو مدد کرتے، اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک شخص جس سے ابوجہل نے اونٹ خریدے تھے، اور اس کی قیمت ادا کرنے میں بہت ٹال مٹول کا رویہ اختیار کر رکھا تھا جب بھی وہ قیمت لینے آتا، تو اس کو وہ ٹال جاتا، قریش کے نوجوانوں کی ایک نشست میں اس نے یہ بات رکھی، لوگوں کو مذاق سوجھا کہ ابوجہل کا معاملہ ہے وہ آپ ﷺ کا بہت دشمن بنا ہوا ہے، آپ ﷺ کو اس سے

(۱) صحیح بخاری، باب کیف کان بدء الوحی إلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

بھڑا دیا جائے اور تماشا دیکھا جائے، اس شخص سے کہا کہ فلاں صاحب جو سامنے بیٹھے ہیں، ان سے جا کر مدد لو، وہ شخص گیا، اور آپ ﷺ سے ابوجہل کی بدمعاملگی کا شکوہ کیا اور مدد چاہی، آپ ﷺ کے لیے اگرچہ یہ بات دشوار تھی کہ ابوجہل سے جا کر فریاد کریں یا فرمائش کریں کہ اس کی قیمت ادا کردے، مگر آپ ﷺ نے اس کی ہمدردی کے جذبہ کے تحت خطرہ کی پرواہ نہیں کی، اور اس سے کہا کہ چلو ہم تمہارے لیے کوشش کرتے ہیں، اور ابوجہل کے مکان پر دستک دی، اس کے نکلنے پر اس سے کہا کہ ان کی قیمت ادا کردو، اس پر آپ ﷺ کی جرأت کا ایسا رعب بیٹھا کہ اس نے کہا کہ اچھا ادا کرتے ہیں، اور گھر کے اندر جا کر قیمت لا کر ادا کردی، ابوجہل اس کے بعد اپنے ساتھیوں میں آیا تو ان ساتھیوں نے ابوجہل کا مذاق اڑایا اور کہا کہ تم یوں تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف بہت زور دکھاتے ہو، یہاں دب گئے، اس نے اعتراف کیا کہ میں مرعوب ہوگیا، اور ایسا کرنے پر مجبور ہوگیا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس طرح کا رویہ اپنے ذاتی فائدہ کے لیے نہیں ہوتا تھا، تکلیف اٹھاتے تھے، اور انتقام لینے کا خیال بھی نہیں آتا تھا، لیکن کسی کو ضرورت پڑ جائے تو اس کی مدد کرتے تھے، سب کے ساتھ نرم رویہ رکھتے تھے، اس کا اظہار خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا گیا ہے:

﴿فبما رحمة من الله لنت لهم، ولو كنت فظاً غليظ القلب لانفضوا من حولك فاعف عنهم و استغفر لهم و شاورهم في الأمر، فإذا عزمت فتوكل على الله إن الله يحب المتوكلين﴾

[آل عمران: ۱۵۹]

اللہ تعالیٰ کی رحمت کے باعث آپ ان پر رحم دل ہیں، اور اگر آپ سخت زبان اور سخت دل ہوتے تو یہ سب آپ کے پاس سے چھٹ جاتے، سو آپ ان سے درگذر کریں، اور ان کے لئے استغفار کریں، پھر جب آپ کا پختہ ارادہ ہوجایا کرے تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کریں، بیشک اللہ تعالیٰ توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

آپ ﷺ کے ساتھ اگر کسی کی ذاتی دشمنی ہوتی تو اس سے بالکل انتقامی معاملہ نہ کرتے، لیکن اصولی اور دینی مصلحت ہوتی تو پھر آپ ﷺ کا رویہ سخت ہوتا، آپ ﷺ کے وصف میں جو بات بیان کی گئی ہے اس کے الفاظ یوں آئے ہیں:۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ آپ ﷺ کے اخلاق عالیہ بتاتے ہوئے کہتے ہیں:۔

''میں نے آپ کو کسی سے اس کے ظلم وزیادتی کا انتقام لیتے ہوئے نہیں دیکھا، جب تک معاملہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کی خلاف ورزی کا نہ ہو اور اس کے حکموں کی عزت پر آنچ نہ آئے، ہاں اگر اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کو پامال کیا جاتا اور اس کے ناموس پر حرف آتا تو آپ اس پر ہر شخص سے زیادہ غصہ ہوتے''۔

حضرت انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بہت رحم دل تھے، آپ ﷺ کے پاس کوئی ضرورت مند آتا تو آپ ﷺ اس سے وعدہ ضرور کرتے، اور اگر کچھ ہوتا تو اسی وقت اس کی حاجت پوری فرماتے، ایک بار نماز کھڑی ہو چکی تھی کہ ایک اعرابی آگے بڑھا اور آپ ﷺ کا کپڑا پکڑ کر کہنے لگا: میری ایک معمولی سی ضرورت باقی رہ گئی ہے، مجھے ڈر ہے کہ کہیں بھول نہ جاؤں، آپ ﷺ اس کے ساتھ تشریف لے گئے، جب اس نے اپنا کام کرلیا تو آپ ﷺ واپس تشریف لائے، اور نماز ادا فرمائی۔

آپ ﷺ کے تحمل، قوت برداشت، کشادہ قلبی اور صبر وعزیمت کے واقعات میں آپ ﷺ کے خادم حضرت انس کی وہ شہادت ہے جو انہوں نے اس سلسلہ میں دی ہے، اس وقت وہ بہت کم سن تھے، انہوں نے کہا: میں نے نبی اکرم ﷺ کی دس سال خدمت کی، آپ ﷺ نے میری کسی بات پر کبھی نہ ٹوکا، اور نہ یہ فرمایا کہ فلاں کام تم نے کیوں کیا؟ اور فلاں کام تم نے کیوں نہ کیا؟ (۱)

---

(۱) صحیح مسلم، باب حسن خلقہ ﷺ۔

حضرت عمرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میری اس طرح آگے بڑھکر تعریف وتوصیف نہ کرو، جس طرح نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے ساتھ کیا تھا، میں تو صرف ایک بندہ ہوں، تم مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو(۱)۔

حضرت عبداللہ بن أبي اوفیٰؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو اس میں کوئی تکلف اور عار نہ ہوتا تھا کہ آپ ﷺ کسی غلام یا کسی بیوہ کے ہمراہ چلیں، یہاں تک کہ اس کی ضرورت پوری ہو جائے (۲)۔

حضرت انسؓ کہتے ہیں: ''مدینہ کی لونڈیوں اور باندیوں میں سے کوئی آپ ﷺ کا ہاتھ پکڑ لیتی اور جو کچھ کہنا ہوتا کہتی اور جتنی دور چاہتی لے جاتی'' (۳)۔

عدی بن حاتم الطائیؓ جب آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے ان کو اپنے گھر بلایا، باندی نے تکیہ ٹیک لگانے کے لئے پیش کیا، آپ ﷺ نے اس کو اپنے اور عدی کے درمیان رکھ دیا، اور خود زمین پر بیٹھ گئے، حضرت عدیؓ کہتے ہیں: ''اس سے میں سمجھ گیا کہ آپ ﷺ بادشاہ جیسے کروفر والے نہیں ہیں'' (۴)

حضرت انسؓ بیان فرماتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ بیمار کی عیادت فرماتے تھے، جنازہ میں شریک ہوتے تھے، اور غلام کی دعوت قبول فرماتے تھے'' (۵)۔

حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ کمزور کے خیال سے اپنی رفتار سست فرمادیتے تھے، اور اس کے لئے دعا فرماتے تھے'' (۶)۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں بندہ ہوں، بندہ کی طرح کھاتا ہوں، اور بندہ کی طرح بیٹھتا ہوں (۷)۔

---

(۱) صحیح البخاري، کتاب الأنبیاء. (۲) البیهقي، باب تواضع رسول الله ﷺ.
(۳) مسند أحمد: ۳/ ۱۹۸ – ۲۱۵، و جمع الفوائد، کتاب المناقب، باب صفاته و أخلاقه ﷺ. (۴) زاد المعاد: ۱/ ۴۳. (۵) شمائل الترمذي، باب تواضع النبي ﷺ
(۶) الترغیب و الترهیب للمنذري. (۷) کتاب الشفاء، ص: ۱۰۱

رسول اللہ ﷺ خود گھر کی صفائی فرما لیتے، اونٹ کو باندھ لیتے، اور اپنے جانور کو چارہ بھی دیتے، اپنے خدمت گار کے ساتھ کھانا تناول فرماتے اور آٹا گوندھنے میں اس کا ہاتھ بٹاتے، اور بازار سے سودا بھی لے آتے (۱)۔

رسول اللہ ﷺ کے اخلاق عالیہ اور اوصاف کریمہ کا جامع بیان:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ، اوصاف کریمہ اور خصائل شریفہ کا ذکر ہند بن ابی ہالہؓ نے (جو ام المومنین حضرت خدیجہؓ کے فرزند اور حضرت حسنؓ وحسینؓ کے ماموں ہیں)، بہت جامع اور بلیغ انداز میں کیا ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت آخرت کی فکر میں اور امور آخرت کی سوچ میں رہتے جو عموماً تسلسل کے ساتھ قائم تھا جیسے کہ کسی وقت بھی آپ ﷺ کو چین حاصل نہیں، اکثر طویل سکوت میں رہتے، بلا ضرورت کلام نہ فرماتے، گفتگو کا آغاز فرماتے تو دہن مبارک سے اچھی طرح الفاظ ادا فرماتے، اور اچھی طرح اختتام فرماتے، آپ ﷺ کی گفتگو اور بیان بہت صاف، واضح اور دوٹوک ہوتا، نہ اس میں غیر ضروری طوالت ہوتی نہ زیادہ اختصار، آپ ﷺ نرم مزاج و نرم گفتار تھے، درشت خو اور بے مروّت نہ تھے، نہ کسی کی اہانت کرتے تھے، اور نہ اپنے لئے اہانت پسند کرتے تھے،، نعمت کی بڑی قدر کرتے اور اس کو بہت زیادہ جانتے، خواہ کتنی ہی قلیل ہو (کہ آسانی سے نظر بھی نہ آئے) اور اس کی برائی نہ فرماتے، کھانے پینے کی چیزوں کی نہ برائی کرتے نہ تعریف، دنیا اور دنیا سے متعلق جو چیز ہوتی، اس پر آپ ﷺ کو کبھی غصہ نہ آتا، لیکن جب خدا کے کسی حق کو پامال کیا جاتا تو اس وقت آپ ﷺ کے جلال کے سامنے کوئی چیز ٹھہر نہ سکتی تھی، یہاں تک کہ آپ ﷺ اس کا بدلہ لے لیتے، آپ ﷺ کو اپنی ذات کے لئے نہ غصہ آتا نہ اس کے لئے انتقام لیتے، جب اشارہ

(۱) کتاب الشفاء، ص:۱۰۱، بروایت بخاری۔

فرماتے تو پورے ہاتھ کے ساتھ اشارہ فرماتے، جب کسی امر پر تعجب فرماتے تو ہاتھ کو پلٹ دیتے، گفتگو کرتے وقت داہنے ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے ملاتے، غصہ اور ناگواری کی بات ہوتی تو روئے انور اس طرف سے بالکل پھیر لیتے اور اعراض فرمالیتے، خوش ہوتے تو نظریں جھکا لیتے، آپ ﷺ کا ہنسنا زیادہ تر تبسم تھا، جس سے صرف آپ ﷺ کے دندان مبارک جو بارش کے اولوں کی طرح پاک وشفاف تھے، ظاہر ہوتے''۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ جو فرد خاندان تھے، اور جن کو علم وواقفیت کے بہترین ذرائع اور مواقع حاصل تھے، اور جن کی نظر نفسیات انسانی اور اخلاق کی باریکیوں پر بہت گہری تھی، قریب ترین اشخاص میں سے تھے، اور اسی کے ساتھ وصف وبیان اور منظر کشی میں بھی آپ کو سب سے زیادہ قدرت تھی، آپ ﷺ کے ''اخلاق عالیہ'' کے متعلق یہ کہتے ہیں:۔

''آپ ﷺ کی طبیعت ومزاج میں یہ بات تھی کہ آپ بدکلامی اور بے حیائی وبے شرمی سے دور تھے، اور تکلفاً بھی ایسی کوئی بات آپ ﷺ سے سرزد نہیں ہوتی تھی، بازاروں میں آپ ﷺ کبھی آواز بلند نہ فرماتے، برائی کا بدلہ برائی سے نہ دیتے، بلکہ عفو ودرگذر کا معاملہ فرماتے، آپ ﷺ نے کسی پر کبھی دست درازی نہ فرمائی، سوائے اس کے کہ جہاد فی سبیل اللہ کا موقع ہو، کسی خادم یا عورت پر آپ ﷺ نے کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا، میں نے آپ ﷺ کو کسی ظلم وزیادتی کا انتقام لیتے ہوئے بھی نہیں دیکھا، جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کی خلاف ورزی نہ ہو اور اس کی حرمت وناموس پر آنچ نہ آئے، ہاں اگر اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کو پامال کیا جاتا، اور اس کے ناموس پر حرف آتا تو آپ ﷺ اس کے لئے ہر شخص سے زیادہ غصہ ہوتے، دو چیزیں سامنے ہوتیں، تو ہمیشہ آسان چیز کا آپ ﷺ انتخاب فرماتے، جب اپنے

دولت خانہ پر تشریف لاتے تو عام انسانوں کی طرح نظر آتے، اپنے کپڑوں کو صاف کرتے، بکری کا دودھ دوہتے، اور اپنی سب ضرورتیں خود انجام دیتے۔

اپنی زبان مبارک محفوظ رکھتے، اور صرف اسی چیز کے لئے کھولتے، جس سے آپ ﷺ کو کچھ سروکار ہوتا، لوگوں کی دلداری فرماتے، اور ان کو متنفر نہ کرتے، کسی قوم و برادری کا معزز شخص آتا تو اس کے ساتھ اکرام و اعزاز کا معاملہ فرماتے اور اس کو اچھے اور اعلیٰ عہدہ پر مقرر کرتے، لوگوں کے بارے میں محتاط تبصرہ کرتے، بغیر اس کے کہ اپنی بشاشت اور اخلاق سے ان کو محروم فرمائیں، اپنے اصحاب کے حالات میں برابر خبر رکھتے، لوگوں سے لوگوں کے معاملات کے بارے میں دریافت کرتے رہتے۔

اچھی بات کی اچھائی بیان کرتے اور اس کو قوت پہونچاتے، بری بات کی برائی کرتے اور اس کو کمزور کرتے، آپ ﷺ کا معاملہ معتدل اور یکساں تھا، اس میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا تھا، آپ ﷺ کسی بات سے غفلت نہ فرماتے تھے، یہ اس احتیاط میں کرتے کہ کہیں دوسرے لوگ بھی غافل نہ ہونے لگیں اور اکتا جائیں، ہر حال اور ہر موقع کے لئے آپ ﷺ کے پاس اس حال کے مطابق ضروری سامان تھا، حق کے معاملہ میں نہ کمی فرماتے نہ حد سے آگے بڑھتے، آپ ﷺ کے قریب جو لوگ رہتے تھے، وہ سب سے اچھے اور منتخب افراد قوم ہوتے تھے، آپ ﷺ کی نگاہ میں سب سے زیادہ افضل وہ تھا جس کی خیر خواہی اور اخلاق عام ہو، سب سے زیادہ قدر و منزلت اس کی تھی، جو غمخواری و ہمدردی اور دوسروں کی مدد اور معاونت میں سب سے آگے ہو، کھڑے ہوتے تو خدا کا ذکر کرتے اور بیٹھتے تو خدا کا ذکر کرتے، جب کہیں تشریف لے جاتے تو وہاں بیٹھنے والے جہاں تک بیٹھے ہوتے وہیں بیٹھ جاتے اندر نہیں گھستے، اور اسی بات کا حکم بھی فرماتے، اپنے حاضرین مجلس اور ہمنشینوں میں ہر شخص کو (اپنی توجہ اور التفات) میں پورا حصہ دیتے، آپ ﷺ کا شریک مجلس یہ سمجھتا کہ اس سے

بڑھ کر آپ ﷺ کی نگاہ میں کوئی اور نہیں ہے، اگر کوئی شخص آپ ﷺ کو کسی غرض سے بٹھا لیتا یا کسی ضرورت میں آپ ﷺ سے گفتگو کرتا تو نہایت صبر وسکون سے اس کی پوری بات سنتے یہاں تک کہ وہ خود ہی اپنی بات کر کے رخصت ہوتا، اگر کوئی شخص آپ ﷺ سے کچھ سوال کرتا اور کچھ مدد چاہتا تو بلا اس کی ضرورت پوری کئے واپس نہ فرماتے، یا کم ازکم نرم وشیریں لہجہ میں جواب دیتے، آپ ﷺ کا حسن اخلاق تمام لوگوں کے لئے وسیع اور عام تھا، اور آپ ﷺ ان کے حق میں باپ ہوگئے تھے، تمام لوگ حق کے معاملہ میں آپ ﷺ کی نظر میں برابر تھے، آپ ﷺ کی مجلس علم ومعرفت، حیاء وشرم اور صبر اور امانت داری کی مجلس تھی، نہ اس میں آوازیں بلند ہوتی تھیں، نہ کسی کے عیوب بیان کئے جاتے تھے، نہ کسی کی عزت وناموس پر حملہ ہوتا نہ کمزوریوں کی تشہیر کی جاتی تھی، سب ایک دوسرے کے مساوی تھے، اور صرف تقویٰ کے لحاظ سے ان کو ایک دوسرے پر فضیلت حاصل ہوتی تھی اس میں لوگ بڑوں کا احترام اور چھوٹوں کے ساتھ رحمدلی وشفقت کا معاملہ کرتے تھے، حاجتمندوں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے تھے، مسافر اور نو وارد کی حفاظت کرتے اور اس کا خیال رکھتے تھے"۔

حضرت علیؓ مزید فرماتے ہیں:۔

"آپ ﷺ ہمہ وقت کشادہ رو اور انبساط وبشاشت کے ساتھ رہتے تھے، بہت نرم اخلاق اور نرم پہلو تھے، نہ سخت طبیعت کے تھے، نہ سخت بات کہنے کے عادی، نہ چلا کر بولنے والے، نہ عامیانہ اور مبتذل بات کرنے والے، نہ کسی کو عیب لگانے والے نہ تنگ دل، بخیل، جو بات آپ ﷺ کو پسند نہ ہوتی اس سے تغافل فرماتے، اور اس کا جواب بھی نہ دیتے، تین باتوں سے آپ ﷺ نے اپنے آپ کو بالکل بچا رکھا تھا، ایک جھگڑا، دوسرے تکبّر اور تیسرے غیر ضروری اور لایعنی کام، لوگوں کو بھی تین باتوں سے آپ ﷺ نے بچا رکھا تھا، نہ کسی کی برائی کرتے تھے، نہ اس کو عیب لگاتے

تھے، اور نہ اسکی کمزوریوں اور پوشیدہ باتوں کے پیچھے پڑتے تھے، صرف وہ کلام فرماتے تھے، جس پر ثواب کی امید ہوتی تھی، جب گفتگو کرتے تھے تو شرکائے مجلس ادب سے اس طرح سر جھکا لیتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ان سب کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہوئی ہیں، جب آپ ﷺ خاموش ہوتے تب یہ لوگ بات کرتے، آپ ﷺ کے سامنے کبھی نزاع نہ کرتے، اگر آپ ﷺ کی مجلس میں کوئی شخص گفتگو کرتا تو بقیہ سب لوگ خاموشی سے سنتے یہاں تک کہ وہ اپنی بات ختم کر لیتا، آپ ﷺ کے سامنے ہر شخص کی گفتگو کا وہی درجہ ہوتا، جو ان کے پہلے آدمی کا ہوتا (کہ پورے اطمینان سے اپنی بات کہنے کا موقع ملتا، اور اسی قدر دانی اور اطمینان کے ساتھ اسے سنا جاتا) جس بات سے سب لوگ ہنستے اس پر آپ ﷺ بھی ہنستے، جس سے سب تعجب کا اظہار کرتے آپ ﷺ بھی تعجب فرماتے، مسافر اور پردیسی کی بے تمیزی اور ہر طرح کے سوال کو صبر و تحمل کے ساتھ سنتے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کے اصحاب کرامؓ ایسے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے (تا کہ آپ ﷺ پر کوئی بار نہ ہو) آپ ﷺ فرماتے تھے کہ "تم کسی حاجتمند کو پاؤ تو اس کی مدد کرو" آپ ﷺ مدح و تعریف اسی شخص کی قبول فرماتے جو حد اعتدال میں رہتا، کسی کی گفتگو کے دوران کلام نہ فرماتے اور اس کی بات کبھی نہ کاٹتے، ہاں اگر وہ حد سے بڑھنے لگتا تو اس کو منع فرما دیتے یا مجلس سے خود اٹھ جاتے اور اسی طرح اس کی بات قطع فرما دیتے۔

آپ ﷺ سب سے زیادہ فراخ دل، کشادہ قلب، راست گفتار، نرم طبیعت اور معاشرت و معاملات میں نہایت درجہ کریم تھے، جو پہلی بار آپ ﷺ کو دیکھتا وہ مرعوب ہو جاتا، آپ ﷺ کی صحبت میں رہتا اور جان پہچان حاصل ہوتی تو آپ ﷺ کا فریفتہ اور دلدادہ ہو جاتا، آپ ﷺ کا ذکر خیر کرنے والا کہتا ہے کہ نہ آپ ﷺ سے قبل میں نے آپ ﷺ جیسا کوئی شخص دیکھا نہ آپ ﷺ کے بعد "صلی اللہ علیٰ نبینا وسلم"۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو لباس جمال وکمال سے آراستہ فرمایا تھا، اور آپ ﷺ کو محبت ودلکشی اور رعب وہیبت کا حسین وجمیل پیکر بنایا تھا، ہند بن ابی ہالہؓ بیان کرتے ہیں:۔

''آپ بہت خوددار اور باوقار اور شان وشوکت کے حامل تھے، اور دوسروں کی نگاہ میں بھی نہایت پرشکوہ، آپ کا روئے انور چودھویں رات کے چاند کی طرح دمکتا تھا''(۱)۔

کامل بشریت اور اعتدال وتوازن

آپ ﷺ کے ایک نواسے (حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے بیٹے) کا انتقال ہونے لگا تو آپ ﷺ کی صاحبزادی نے آپ ﷺ کو بلوایا کہ بچہ کا آخری وقت ہے، ذرا آجایئے، آپ ﷺ تشریف لائے، آپ کے ساتھ آپ کے صحابہ حضرت سعد بن عبادہ، معاذ بن جبل، ابی بن کعب اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم بھی تھے، بچہ گود میں لیا، اس کی جانکنی کی حالت تھی، شفقت بھرے نانا کی آنکھوں میں آنسو آگئے، ایک صحابی (حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ) موجود تھے، کہنے لگے: آپ ﷺ بھی ایسے متاثر ہوتے ہیں، فرمایا کہ میں انسان ہوں، میرے دل میں بھی محبت ہے اور اتنا بھی نہ ہو تو وہ انسان کیا۔ یہ اللہ کی رحمت ہے، اپنے بندوں میں سے جس بندہ کے دل میں چاہتا ہے رکھتا ہے، اللہ رحم کرنے والے بندوں پر رحم کرتا ہے(۲)۔

اس طرح آپ ﷺ کے خوردسال صاحبزادے حضرت ابراہیم کی وفات ہوئی، آپ ﷺ تشریف لے گئے اور دیکھ کر فرمایا: میری آنکھیں نم ہورہی ہیں، دل غمزدہ ہے، لیکن اپنی زبان سے صرف وہی کہوں گا جس سے میرا رب راضی ہو، اے

---

(۱) اقتباس از شمائل ترمذی۔ (۲) بخاری، باب الجنائز، رقم: ۱۲۸۴۔

ابراہیم! تیری جدائی پر ہم غمزدہ ہیں۔(إن العين تدمع، والقلب يحزن، ولا نقول إلا ما يرضي ربنا، وإنا بفراقك يا إبراهيم لمحزونون)(۱)۔

اس موقع پر سورج گرہن ہوا، لوگ کہنے لگے کہ عظیم القدر نبی کے بیٹے کے انتقال کا یہ اثر معلوم ہوتا ہے، حضور ﷺ نے سنا تو فرمایا کہ دیکھو! یہ سورج، چاند اللہ کے حکم کے تابع ہیں، یہ اپنے نظام کے مطابق چلتے ہیں، کسی کے مرنے جینے سے ان پر اثر نہیں پڑتا(۲)۔

غور کیجئے! کس قدر پر عظمت بات ہے، کہ ایسے موقع پر آدمی خوش ہوتا ہے کہ ہماری اور ہمارے بیٹے کی اہمیت سمجھی جارہی ہے، ہمارے کچھ کہے بغیر خودبخود لوگ اہمیت دے رہے ہیں، اچھا ہے کہنے دیا جائے، نہیں، آپ ﷺ نے اس کو برداشت نہیں کیا، کہ کسی کے عقیدہ میں بال برابر فرق آئے اور وہ خدا کے سوا کسی اور کو آسمان وزمین، سورج چاند پر اثر ڈالنے والا سمجھے۔

یہ غم کے موقع کی مثال تھی، مسرت کے موقع کی بھی مثال دیکھئے، آپ ﷺ کے محبوب چچازاد بھائی حضرت جعفر رضی اللہ عنہ حبشہ کی ہجرت سے منتقل ہوکر مدینہ پہونچے، آپ ﷺ ان سے مل کر بہت خوش ہوئے، اسی دوران میں مسلمانوں کی فتح کی خوش خبری پہونچی، تو ایک طرف مسلمانوں کی خوشی سے دوسری طرف اپنے محبوب اور اللہ کے لئے قربانی دینے والے مومن بھائی کی آمد کی مسرت تھی، آپ ﷺ نے فرمایا: میں بتا نہیں سکتا کہ دونوں مسرتوں میں کون مسرت زیادہ ہے(۳)۔

آپ ﷺ کی اسی جامعیت کو دیکھئے کہ آپ انسان تھے، انسانیت کا تقاضہ اپنے محبت کے لائق عزیز کی عرصہ دراز کی جلاوطنی کے بعد واپسی سے خوشی محسوس کی جو ان کے کمال انسانیت کی دلیل تھی، اسی کے ساتھ نبی ہونے اور مسلمانوں کے سربراہ

---

(۱) بخاری: باب الجنائز، رقم: ۱۳۰۳۔ (۲) صحیح بخاری، کتاب الکسوف، رقم: ۱۰۴۳۔
(۳) سیرت ابن ہشام: ۳۵۹/۲

ہونے کے تعلق سے مسلمانوں کی فتح سے بھی اس طرح مسرت محسوس کی اور حقیقت پسندی کی یہ بات تھی کہ دونوں مسرتوں کا اعتبار کیا، اس طرح بحیثیت قائد وامیر مسرت کا جو موقع تھا اس کا حق ادا کیا اور اسی کے ساتھ عزیزدارانہ وبرادارانہ محبت کا جو تقاضہ تھا اس کا حق بھی ادا کیا۔

کرم گستری اور تحمل وبردوباری

حضور ﷺ مکارم اخلاق، نوازش وکرم گستری اور تواضع میں ساری انسانیت کے امام ومقتدا اوپیشوا تھے، ارشاد باری تعالی ہے: "إنك لعلى خلق عظيم " بے شک آپ بہت عظیم اخلاق کے حامل ہیں، حضور ﷺ نے خود ارشاد فرمایا ہے:" أدبني ربي فأحسن تأديبي " میری تربیت اللہ تعالی نے فرمائی ہے اور بہترین فرمائی ہے، حضرت جابر سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "إن الله بعثني لتمام مكارم الأخلاق و كمال محاسن الأفعال" اللہ تعالی نے مجھے مکارم اخلاق اور محاسن اعمال کی تکمیل کے لئے مبعوث فرمایا ہے، جب حضرت عائشہؓ سے آپ ﷺ کے اخلاق کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: " كان خلقه القرآن " آپ (ﷺ) اخلاق میں قرآن کا مجسم نمونہ تھے، عفوودرگذر، تحمل و بردباری، کشادہ قلبی اور قوت برداشت میں آپ ﷺ کا جو مقام تھا وہاں تک اہل ذہانت کی ذہانت، اور شعراء کے خیال وتصور کی بھی رسائی نہیں ہوسکتی، ذیل میں چند مزید مثالیں پیش کی جاتی ہیں:۔

حضور ﷺ کی نوازش وکرم اور بڑے سے بڑے دشمن کے ساتھ دلداری اور احسان کا ایک نمونہ وہ تھا جو منافقین کے سردار عبداللہ بن ابی بن سلول کے معاملہ میں اختیار کیا، یہ شخص وہ تھا جس نے آپ ﷺ کے خلاف کھلی دشمنی کے الفاظ استعمال کئے تھے اور آپ ﷺ کے خلاف خفیہ سازشوں میں شریک رہا تھا اور سب مسلمان اس کے اس رویہ سے واقف تھے، اس کو مرنے کے بعد جب قبر میں اتارا گیا، تو ان کے

صاحبزادے عبداللہ بن عبداللہ جو پورے مؤمن اور رسول اللہ ﷺ کے کامل وفادار اور محبت کرنے والے تھے، خواہش مند ہوئے کہ آپ ﷺ ان کے باپ کے ساتھ کچھ توجہ فرمادیں، تو ان کے مؤمن کامل ہونے کی قدر میں اور ان کے اکرام میں آپ ﷺ نے اس قدر رواداری فرمائی کہ آپ ﷺ وہاں تشریف لائے، اور حکم دیا کہ اس کو قبر سے نکالا جائے، اس کے بعد آپ ﷺ نے اس کو اپنے گھٹنوں پر رکھا اور اپنا لعاب دہن اس پر ڈالا اور اپنی قمیص مبارک اس کو پہنائی (۱)۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چل رہا تھا، آپ ﷺ اس وقت نجران کی چادر زیب تن کئے ہوئے تھے، جس کے کنارے موٹے تھے، راستہ میں ایک اعرابی آپ ﷺ سے ملا، اور آپ ﷺ کی چادر مبارک پکڑ کر زور سے کھینچی، میں نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ آپ ﷺ کی گردن پر اس کے کھینچنے کی وجہ سے نشان تک پڑ گئے ہیں، پھر اس اعرابی نے کہا: یا محمد! اللہ کا جو مال آپ ﷺ کے پاس ہے وہ مجھے بھی دینے کا حکم دیجئے، آپ ﷺ نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا اور ہنسے اور ہدایت کی کہ اس کو دیا جائے (۲)۔

حضور ﷺ نے زید بن سعنہ یہودی سے ایک موقع پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے توسط سے قرض لیا تھا، جو آپ ﷺ حاجتمندوں کی مدد کے لئے اپنے پاس کچھ نہ ہونے کی صورت میں لیتے تھے، یہ بھی ایک ضرورت مند کے لئے تھا، اور اس کی مدت بھی طے ہوگئی تھی، لیکن وہ مدت آنے سے قبل ہی وہ شخص آپ کے پاس آیا اور قرض کا مطالبہ کیا اور آپ کا کپڑا اپنی مٹھی میں پکڑ کر آپ ﷺ کے شانۂ مبارک سے زور سے کھینچا، اور اپنی مٹھی میں کپڑے کو لے لیا، اور سخت الفاظ استعمال کرتے ہوئے یہ تک کہا کہ: تم عبدالمطلب کی اولاد! بڑے ٹال مٹول کرنے والے ہو، اس طرح

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الجنائز۔ (۲) صحیح بخاری، کتاب الجہاد۔

صرف آپ ہی پر نہیں، آپ کے دادا عبد المطلب پر بھی طنز کیا، حالانکہ آپ تو بڑی صفت والے تو تھے ہی، آپ کے دادا بھی اپنے ہم چشموں میں اچھی صفات کے تھے، اس سے آپ کو کیسی تکلیف ہوئی ہوگی، حضرت عمرؓ نے اس کو جھڑکا، اور سخت لہجہ میں بات کی، لیکن رسول اللہ ﷺ کا رویہ مسکراہٹ کا رہا، آپ ﷺ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا: عمر ہم اور یہ شخص تمہاری طرف سے دوسرے رویہ کے مستحق تھے، مجھے تم قرض جلد ادا کرنے کا مشورہ دیتے اور اس کو نرم طریقہ سے تقاضہ کرنے کو کہتے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اس کی مدت ادائیگی میں ابھی تین دن باقی ہیں، بہر حال آپ ﷺ نے حضرت عمرؓ کو اس کے قرض کی ادائیگی کا حکم دیتے ہوئے بیس صاع اس کو مزید دینے کو فرمایا کہ مزید مال اس بات کا معاوضہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے تنبیہی جواب سے اس کو خوفزدہ کر دیا تھا، آپ کے اس رویہ کا یہ اثر پڑا کہ وہ یہودی متاثر ہو کر اسلام لے آیا (۱)۔

جانوروں کے ساتھ نرمی

حضور ﷺ بے زبان جانوروں کے ساتھ بھی نرمی کا حکم فرماتے تھے، شداد بن اوس کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالی نے ہر چیز کے ساتھ اچھا معاملہ کرنے اور نرم برتاؤ کرنے کا حکم دیا ہے، اس لئے اگر جانور کو ذبح بھی کرو تو اچھی طرح کرو، تم میں جو ذبح کرنے جا رہا ہو وہ اپنی چھری پہلے سے تیار کر لے (یعنی چھری تیز کر لے اور اسکو اس کے منہ کے سامنے نہ کرے تاکہ جانور یہ دیکھ کر پہلے سے پریشان نہ ہو) اور اپنے ذبیحہ کو آرام دے (۲)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ایک شخص نے ایک بکری زمین میں ذبح کرنے کے لئے لٹائی، اس کے بعد چھری تیز کرنا شروع کیا، رسول اللہ ﷺ

---

(۱) مسند احمد، ترجمہ مع وضاحت۔ (۲) صحیح مسلم، کتاب الذبح۔

نے یہ دیکھ کر فرمایا کہ کیا تم اس کو دو بار مارنا چاہتے ہو؟ اس کو لٹانے سے پہلے تم نے چھری تیز کیوں نہ کرلی؟(۱)۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ رسول ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھے، آپ ﷺ ایک ضرورت کے لئے وہاں سے تھوڑی دیر کے لئے تشریف لے گئے، اس درمیان ہم نے ایک چھوٹی چڑیا دیکھی، اس کے ساتھ اس کے دو بچے تھے، ہم نے دونوں بچے پکڑ لئے، وہ یہ دیکھ کر اپنے پروں کو پھڑ پھڑانے لگی، آپ ﷺ تشریف لائے اور پوچھا: کس نے اس کے بچے چھین کر اس کو تکلیف پہونچائی ہے؟ پھر آپ ﷺ نے حکم دیا کہ اس کے بچے واپس کردو، اور وہاں ہم نے چیونٹیوں کی ایک آبادی دیکھی، اور اس کو جلادیا، آپ نے ناپسند کیا اور فرمایا: اس کو کس نے جلایا ہے؟ عرض کیا ہم لوگوں نے، آپ ﷺ نے فرمایا: آگ سے عذاب دینے کا حق صرف آگ کے رب کو ہے۔

حضور ﷺ صحابۂ کرام کو جانوروں کو چارہ پانی دینے کی ہدایت فرماتے، اور ان کو پریشان کرنے اور ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ لادنے کی ممانعت کرتے، آپ نے جانوروں کی تکلیف دور کرنے اور ان کو آرام پہونچانے کو باعث اجر و ثواب اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ قرار دیا، اور اس کے فضائل بیان فرمائے، حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص کہیں کے سفر پر تھا، راستہ میں اس کو سخت پیاس لگی، سامنے ایک کنواں نظر پڑا، وہ اس میں اتر گیا، جب باہر آیا تو دیکھا کہ ایک کتا پیاس کی شدت کی وجہ سے کیچڑ چاٹ رہا ہے، اس نے اپنے دل میں کہا کہ پیاس سے جو میرا حال ہو رہا تھا، یہی اس کا بھی ہے، وہ پھر کنویں میں اترا، اپنے چمڑے کے موزے پانی سے بھرے، پھر ان کو اپنے دانتوں سے دبایا، اور اوپر آکر کتے کو پلایا، اللہ تعالی نے اس

---

(۱) طبرانی۔

کے اس عمل کو قبول فرمایا، اور اس کی مغفرت فرمادی، لوگوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ: بہائم اور جانوروں کے معاملہ میں بھی اجر ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہر اس مخلوق میں جو تر وتازہ جگر رکھتی ہے، اجر ہے(۱)۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا: ایک عورت کو صرف اس بات پر عذاب دیا گیا کہ اس نے اپنی بلی کو کھانا پانی نہیں دیا، اور نہ اس کو چھوڑا کہ وہ حشرات الارض ہی سے اپنا پیٹ بھر لے(۲)۔

سہیل بن عمرو روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ کا گذر ایک ایسے اونٹ پر ہوا جس کی پیٹھ لاغری کی وجہ سے اس کے پیٹ سے لگ گئی تھی، آپ ﷺ نے فرمایا: ان بے زبان جانوروں کے معاملہ میں اللہ سے خوف کرو، ان پر سواری کرو تو نرم طریقہ سے، ان کا گوشت استعمال کرنے کے لئے ان کو ذبح کرو تو اس حالت میں کہ وہ صحتمند ہوں (۳)۔

حضرت ابو ہریرہ راوی ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم کسی سرسبز جگہ جاؤ تو اونٹوں کو زمین پر ان کے حق سے محروم نہ کرو، اور اگر خشک زمین پر جاؤ تو وہاں تیز چلو، رات کو پڑاؤ ڈالنا ہو تو راستہ پر نہ ڈالو، اس لئے کہ وہاں جانوروں کی آمد ورفت رہتی ہے، اور کیڑے مکوڑے وہاں پناہ لیتے ہیں (۴)۔

دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک

فتح مکہ کے موقع پر جہاں سے آپ ﷺ کو اور آپ کے اصحاب کو دعوت دین دینے پر ۱۳ سال مسلسل وہاں کے لوگوں کی طرف سے سخت اذیت رسانی اور دشمنی کی گئی تھی اور بالآخر وہاں سے آپ سب کو نکلنا پڑا تھا، اب وہاں فاتحانہ داخلہ کے موقع پر جب ان کا سامنا ہوا تو حضور ﷺ نے فرمایا: اے قریشیو! تمہیں کیا توقع ہے کہ اس

(۱) صحیح بخاری، کتاب المساقاۃ، باب فضل سقی الماء۔ (۲) امام نووی بروایت مسلم۔
(۳) سنن ابوداود۔ (۴) صحیح مسلم۔

وقت میں تمہارے ساتھ کیا کروں گا؟ انہوں نے جواب دیا: ہم اچھی ہی امید رکھتے ہیں، آپ ﷺ کریم النفس اور شریف بھائی ہیں، اور کریم وشریف بھائی کے بیٹے ہیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں تم سے وہی کہتا ہوں جو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا: " لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فأنتم الطلقاء " آج تم پر کوئی الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔

جب فتح مکمل ہوگئی اور سب لوگوں کو حضور ﷺ نے امان عطا فرمائی سوائے نوانتہائی مجرم آدمیوں کے، جن کو ان کے سنگین جرموں کی وجہ سے قتل کردئے جانے کی اجازت دی، خواہ وہ کعبہ کے پردوں کے اندر ملیں، ان میں کوئی وہ تھا جو اسلام لانے کے بعد مرتد یا وباغی ہوگیا تھا، کسی نے فریب دیکر کسی مسلمان کو قتل کیا تھا، کسی نے اپنی شاعری کے ذریعہ آپ ﷺ کی توہین وملامت کو تفریح طبع کا سامان بنالیا تھا، اور اس کو لوگوں میں پھیلاتا تھا، ان میں عبداللہ بن سعد بن ابی سرح بھی تھا، جو مرتد وباغی ہوگیا تھا، عکرمہ بن ابی جہل تھا جو اسلام کے غلبہ اور اس کی کامیابی سے نفرت کی بنا پر اور جان کے خوف سے اپنا وطن چھوڑ کر یمن چلا گیا تھا، لیکن اس کی بیوی نے اس کے فرار ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ سے اس کے لئے امان طلب کی، آپ ﷺ نے یہ جانتے ہوئے کہ وہ روئے زمین پر آپ ﷺ کے بدترین دشمن کا لڑکا ہے اس کو امان دی، اور خوشی اور استقبال میں اس طرح اس کی طرف لپکے کہ چادر بھی جسم اطہر سے ہٹ گئی تھی (۱)۔

ان میں حضور ﷺ کے محبوب چچا حضرت حمزہ کا قاتل (جبیر بن مطعم کا غلام) وحشی بھی تھا، جس نے ان کو قتل کرکے ان کا کلیجہ چبوانے میں مدد کی تھی اور قصاص کے طور پر رسول اللہ ﷺ نے اس کو قتل کرنے کی اجازت دیدی تھی لیکن وہ جب اسلام لایا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کا اسلام قبول فرمایا (۲)، ان میں ہبار بن

---

(۱) زادالمعاد: ۳/ ۴۱۱-۴۲۲۔

(۲) صحیح بخاری، باب قتل حمزۃ، سیرت ابن ہشام: ۲/ ۷۲، دلائل النبوۃ للبیہقی: ۵/ ۹۵

الاسود بھی تھا، جس نے حضور ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کے پہلو پر نیزہ سے حملہ کیا یہاں تک کہ وہ اونٹ سے ایک چٹان پر گر پڑیں، اور اسقاط حمل کا واقعہ پیش آیا اس کے بعد وہ بھاگ گیا، بعد میں اس نے اسلام قبول کرلیا، اور سارہ اور دو ایک اور گانے والیوں (جو آپ ﷺ کی ہجو میں کہے گئے اشعار گاتی تھیں) کے سلسلہ میں بھی آپ ﷺ سے امان چاہی گئی، آپ ﷺ نے ان دونوں کو امان دے دی، پھر وہ دونوں مسلمان بھی ہوگئیں (۱)۔

عمیر بن وہب ایک منصوبہ کے تحت محمد ﷺ کو قتل کرنے کے ارادہ سے مدینہ پہونچا، حضرت عمر نے ان کے تیور دیکھ لئے، گلا دبائے ہوئے اس کو حضور ﷺ کے پاس لائے، آپ ﷺ نے فرمایا: عمر چھوڑ دو، عمیر قریب آجاؤ، پوچھا کس ارادہ سے آئے ہو؟ جواب دیا: بیٹے کو چھڑانے آیا ہوں، فرمایا: پھر تلوار کیوں حمائل ہے؟ عمیر نے کہا: آخر تلواریں بدر میں کس کام آئیں؟ فرمایا: کیوں نہیں، تم نے اور صفوان نے حجر میں بیٹھ کر میرے قتل کی سازش نہیں کی تھی؟ عمیر یہ بات سن کر سناٹے میں آگیا، بے اختیار بولے: محمد ﷺ بیشک تم پیغمبر ہو، بخدا میرے اور صفوان کے سوا اس معاملہ کی کسی کو خبر نہ تھی، چنانچہ وہ مسلمان ہوگیا، آپ ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا: اپنے بھائی کو دین سکھاؤ، قرآن یاد کراؤ، اور اس کے فرزند کو آزاد کردو، قریش جو اس کے ہاتھ سے حضور ﷺ کے قتل کرنے کی خبر سننے کے منتظر تھے، انہوں نے عمیر کے مسلمان ہوجانے کی خبر سنی (۲)۔

صفوان بن امیہ فتح مکہ کے موقع پر جدہ کی طرف بھاگ گئے، تاکہ وہاں سے کشتی کے ذریعہ یمن پہونچ جائیں، چنانچہ عمیر بن وہیب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! صفوان بن امیہ اپنی قوم کے سردار ہیں، وہ آپ سے ڈر کر سمندر کی طرف بھاگ گئے ہیں، جب آپ ﷺ کو یہ خبر ملی تو آپ نے

---

(۱) زاد المعاد: ۳/ ۴۱۱۔ (۲) دلائل النبوۃ للبیہقی: ۳/ ۱۴۷-۱۴۹، سیرت ابن ہشام: ۱/ ۶۶۱

انہیں بھی امان دیدی، حضرت عمیر نے عرض کیا: کہ اللہ کے رسول اطمینان کے لئے تحریر عنایت کردیجئے، تو آپ ﷺ نے ان کو بطور علامت اپنا عمامہ دیکر صفوان کے پیچھے روانہ کردیا، انہوں نے صفوان کو سمندر کے کنارے جالیا اور کہا کہ اللہ کے رسول نے تمہیں امان دی ہے، اپنے آپ کو ہلاکت سے بچاؤ، صفوان نے کہا کہ مجھے اپنی جان کا خوف ہے، تو انہوں نے کہا کہ نبی کریم ﷺ بڑے حلیم اور بردبار ہیں، چنانچہ حضرت عمیر انہیں واپس لیکر مکہ آئے، جب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پہونچے تو صفوان نے کہا کہ اس شخص کا خیال ہے کہ آپ نے مجھے امان دی ہے تو آپ ﷺ نے اس خبر کی تصدیق کی، صفوان نے دو مہینے کی مہلت طلب کی، آپ ﷺ نے انہیں چار مہینے کی مہلت دی (۱)۔

اس وقت تمہیں کون بچا سکتا ہے؟

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ ذات الرقاع سے واپس ہوئے تو دوپہر کو آپ ﷺ نے ایسی جگہ آرام فرمایا جہاں ببول کے بہت سے درخت تھے، اور لوگ ان درختوں کی طرف چلے گئے اور خود آپ ﷺ ببول کے ایک پیڑ کے نیچے آرام فرمانے لگے اور اپنی تلوار اسی درخت پر لٹکا دی۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اسی درمیان میں ہماری آنکھ لگ گئی اور ہم تھوڑا سوئے تھے کہ محسوس ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں آواز دے رہے ہیں، ہم نے دیکھا کہ ایک اعرابی آپ ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں سو رہا تھا کہ اس نے یہ تلوار اٹھائی، میری آنکھ کھلی تو یہ تلوار میرے سر پر کھینچے ہوئے تھا، اس نے مجھ سے کہا کہ اس وقت تمہیں کون بچا سکتا ہے؟ میں نے کہا: اللہ! لو یہ بیٹھا ہوا ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کوئی سزا نہیں دی۔ (۲)

---

(۱) زاد المعاد: ۳/۴۱۳، محمد ﷺ الإنسان الكامل، از: محمد بن علوی مالکی حسینی، ص: ۱۵۹
(۲) صحیح بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ ذات الرقاع۔

رحمۃ للعالمین

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں محبت اور سب کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ غیر معمولی سطح کا تھا اور اس جذبہ کا اثر مسلمانوں پر جو پڑا اور مسلمانوں کے ذہنوں کی جو تربیت ہوئی وہ آپ ﷺ کے زمانہ میں اور آپ ﷺ کے بعد آنے والے مسلمانوں کی زندگیوں میں برابر محسوس کی جاتی رہی اور اس کا اثر یہ ظاہر ہوا کہ آپ ﷺ کے بعد مسلمانوں کی حکومت جہاں جہاں پھیلی اور جہاں جہاں مسلمان آباد ہوئے وہاں ان لوگوں کی رحمدلی اور رعایتیں دیکھ دیکھ کر علاقے کے علاقے خود سے اسلام میں داخل ہو گئے، ان پر کسی نے ایسا کرنے کے لئے کوئی جبر نہیں کیا، اس لیے کہ اسلامی تعلیمات میں اپنا مذہب بدل کر اسلام لانے کے لئے کسی پر جبر کرنے کی ممانعت ہے اور یہ یہاں تک ہے کہ مسلمانوں کے اقتدار میں جو غیر مسلم آباد ہوں ان پر وہ ذمہ داریاں بھی نہیں ڈالی جائیں جو مسلمانوں پر ڈالی جاتی ہیں اور ان کو اپنے اپنے مذہب پر اپنی مذہبی تعلیمات کے مطابق عمل کرنے کی اجازت ان معاملات میں دی جاتی رہی ہے کہ جن کی ممانعت مسلمانوں کے لیے ہوتی ہے، اسی کا اثر تھا کہ اسلام کی یہ خوبیاں جن جن غیر مسلموں کو دیکھنے کا موقع ملا، انہوں نے اسلام کو قبول کیا۔

اسلام کو قبول کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اللہ کو اپنا رب واحد اور مالک مانا جائے اور اس کے حکموں پر جو نبی کے ذریعہ ملے ہیں ان پر عمل کرے اور اسلام سے پہلے کی زندگی میں جو ظلم اور اخلاقی اور جنسی بے راہ روی تھی وہ ختم ہو، چنانچہ اسی پر عمل ہوتا رہا اور انسانی معاشرہ میں بہت درستگی پیدا ہوئی اور بہت ایسی خوبیاں آگئیں جن میں اعلی انسانی صفات وکردار نمایاں طریقہ سے ظاہر ہوا، اس کا اندازہ اسلام سے پہلے کی سوسائٹی میں جو طبقاتی ظلم اور صاحب اقتدار کی طرف سے جو کشت وخون ہوتا تھا اور جس کو تاریخ کے صفحات میں دیکھ کر آدمی کانپ جاتا ہے، اسلام کے تحت بننے والی حکومتوں میں لڑائی

اور ٹکراؤ ہونے کی صورت میں بھی اس کا ارفیصد بھی پیش نہیں آیا، بیت المقدس پر جب رومیوں نے لڑ کر قبضہ کیا تو اس کے مسلمان حکمرانوں کو اور ان کے ہم قوم لوگوں کو مسلمانوں کو قتل کرنے میں اتنا خون بہایا کہ گھوڑوں کے گھٹنوں تک خون پہونچا، لیکن مسلمانوں نے جب اسے بعد میں واپس لیا تو مسلمانوں نے اس پر قابض عیسائی حاکموں کو معاف کر دیا جس کا اعتراف خود انگریز مؤرخ سٹینلے لین پول نے کیا ہے(۱)۔

اسلام سے پہلے کی ہر سوسائٹی میں خواہ رومی مملکت کی سوسائٹی ہو، یا ایرانی مملکت کی سوسائٹی ہو، یا ہندوستانی برصغیر یا آس پاس کی سوسائٹی ہو، عورتوں کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک کیا جاتا تھا کہ جو جانوروں کے ساتھ کیا جاتا ہے، ان کو نہ وراثت میں حق ملتا تھا، نہ وہ بھائیوں کی طرح حقوق حاصل کر سکتی تھیں اور اس کی عفت وعصمت کا بھی کوئی تحفظ نہ تھا اور ان سے خدمت خود اس کے گھر میں نوکروں اور غلاموں کی طرح لی جاتی تھی اور بیوہ ہونے پر تو انہیں منحوس سمجھا جاتا تھا اور ان کی پیدائش پر گھر والے غمزدہ ہو جاتے تھے اور بہت سے لوگ ان کو بڑی ہونے سے پہلے ہی ختم کر دیا کرتے تھے اور جن کو ختم نہیں کیا جاتا تھا ان کے ساتھ مذکورہ بالا سلوک کیا جاتا تھا۔

اسلام نے آنے کے بعد عورت کو عزت کا مستحق قرار دیا، وراثت میں اس کو حصہ دار بنایا کہ اپنے باپ ماں کے انتقال پر وہ بھی وراثت کے مال میں حصہ دار ہوں، عورت کے ساتھ عورت ہونے کی وجہ سے بدسلوکی کو حرام قرار دیا، جاہلیت میں جب عورت کو حیض آتا تو سوسائٹی میں اس کو اچھوت بنا دیا جاتا، اس کے کوئی قریب نہیں آتا، کوئی قریب بیٹھتا نہیں، اسلام نے اس بات کو بھی ختم کیا اور اس سے صحبت کا عمل کرنے کے علاوہ قربت کی دیگر باتوں کی اجازت دی، اسلام سے پہلے عورت کو شوپیس بنا کر رکھا جاتا تھا کہ وہ اپنے جسم اور لباس کے ذریعہ دوسروں کو لبھائے اور اپنی

(۱) انسائیکلو پیڈیا برنائیکا ج ۶ ص: ۶۲۷، مضمون Crusades، و "صلاح الدین الأیوبی، از: محمد فرید ابو جدید، بحوالہ: تاریخ دعوت وعزیمت حصہ اول، از مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

زیب وزینت سے لوگوں کی نظروں کے لئے لطف کا ذریعہ بنے اور مردوں کی محفلوں میں مردوں کے لیے تفریح کا سامان بنے، اسلام نے آکر اس بات کو سختی سے منع کیا اور حکم دیا کہ عورت کو غیر مردوں کے درمیان آنے کی ضرورت پڑے تو وہ اپنے جسم کو ڈھیلے ڈھالے لباس میں رکھے تاکہ اس پر للچائی نظریں نہ پڑیں۔

اسی طرح مختلف معاملات میں اور عبادات کے موقعوں کے لئے جو احکام دیے گئے ان میں مردوں کے ساتھ عورتوں کا بھی تذکرہ کیا گیا اور موقع دیا گیا، البتہ دونوں کے درمیان جو جسمانی اور قدرتی فرق ہے اس کے لحاظ سے جتنا فرق ضروری تھا وہ فرق رکھا گیا، قرآن مجید میں فرمایا گیا:

﴿والمؤمنون و المؤمنات بعضهم أولياء بعض، يأمرون بالمعروف، وينهون عن المنكر، ويقيمون الصلوة، ويؤتون الزكوة، ويطيعون الله ورسوله، أولئك سيرحمهم الله إن الله عزيز حكيم﴾ [سورہ توبہ:۷۱]

اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے تعلق والے ہیں، اچھے کام کرنے کو کہتے اور بری باتوں سے منع کرتے اور نماز پڑھتے اور زکوۃ دیتے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن پر خدا رحم کرے گا، بے شک خدا غالب حکمت والا۔

اور فرمایا

﴿من عمل صالحاً من ذكر أو أنثىٰ وهو مؤمن فلنحيينه حيوٰة طيبة ولنجزينهم أجرهم بأحسن ما كانوا يعملون﴾ [سورہ نحل:۹۷]

جو شخص نیک کام کرے گا مرد ہو یا عورت اور وہ مؤمن بھی ہوگا تو ہم اس کو (دنیا میں) پاک اور (آرام کی) زندگی سے زندہ رکھیں گے اور (آخرت میں) ان کے اعمال کا نہایت اچھا صلہ دیں گے

اور فرمایا

﴿أنی لا اضیع عمل عامل منکم من ذکر أو انثیٰ بعضکم من بعض﴾ [سورۂ آل عمران: ۱۹۵]

میں کسی عمل کرنے والے کے عمل کو مرد ہو یا عورت ضائع نہیں کرتا، تم ایک دوسرے کی جنس ہو۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: "استوصوا بالنساء خیراً فإنکم أخذتموھن بأمان اللّٰہ واستحللتم فروجھن بکلمۃ اللّٰہ.. الخ" عورتوں کے معاملہ میں اچھا رویہ اختیار کرو، تم نے ان کو اپنے تعلق میں اللہ کی امان کے ساتھ لیا ہے اور ان سے صحبت کرنے کا حق اللہ کے حکم کے ذریعہ حاصل کیا ہے۔

اس طرح عورت کی خلقت میں مردوں کے مقابلہ میں تھوڑا فرق ہے جو مرد کے مقابلہ میں کمزوری کا باعث ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے مرد کا اس سے غلط فائدہ اٹھانے سے بچانے کے لیے کچھ طریقے بھی مقرر فرمائے گئے، مثلاً وہ تنہا سفر نہ کرے، اس کے ساتھ اس کا شوہر یا اور کوئی سگا عزیز بھی رہے، اس کو بیوی بنا کر اس پر اپنا اختیار حاصل کرنے کے عوض میں اس کو مہر کا ہدیہ بصورت رقم یا مال دیا جانا ضروری قرار پایا اور اس کی ملکیت میں جو مال وسامان ہو اس میں تصرف کرنے کی اجازت نہیں دی، اس مال پر حق صرف اسی کو دیا شوہر کو نہیں دیا، زوجیت سے قبل اس کے اخراجات کی ذمہ داری اس کے والدین پر، وہ نہ ہوں تو قریب ترین عزیزوں پر تھی اور عقد زوجیت کے بعد یہ ذمہ داری اس کے شوہر کے ذمہ کی گئی، اسی طرح بیوی اپنے خرچ کی خود ذمہ دار نہیں رکھی گئی، البتہ وہ اس کے مقابلہ میں گھر کی مالکہ اور اپنے شوہر کی معاون ہوگی، گھر کے معاملات اور بچوں کے دیکھ بھال کی ذمہ دار ہوگی، فرمایا گیا "المرأۃ راعیۃ فی بیت زوجھا" عورت اپنے شوہر کے گھر کی دیکھ بھال کی ذمہ دار ہے، اور شوہر سے بصورت طلاق جدا ہونے پر وہ پھر اپنے والدین کی کفالت اور

ذمہ داری میں واپس ہوجاتی ہے۔

اسلام نے رحم دلی، ہمدردی اور انسانیت نوازی کی جو قدریں لازم کی اور پھیلائی ان کا یہ اثر پڑا کہ جہاں جہاں مسلمان ان قدروں کے ساتھ گئے وہاں کی دنیا بالکل بدل گئی اور وہ ظلم وزیادتی جو آپس میں طبقاتی فرق کی وجہ سے یا عورت ومرد کے فرق کے لحاظ سے یا حاکم ورعایا کے فرق کے لحاظ سے یا آپس میں جنگی ٹکراؤ کے موقع پر یا محض لطف وعیش پسندی کے مقصد سے جو ظلم کیا جاتا تھا، وہ موقوف ہوگیا اور اسلام کو قبول نہ کرنے والوں پر بھی ان باتوں کو دیکھ کر کچھ نہ کچھ اثر پڑا اور ان کی باتوں کی نقل کسی حد تک غیر مسلم معاشروں میں بھی کی جانے لگی اور انسان کے علاوہ دوسری مخلوقات کے ساتھ ظلم کے جو طریقے اختیار کئے جاتے تھے محض تفریح طبع اور کھیل کے طور پر، انسان اور جانور کو کنویں جیسی جگہ پر بند کرکے لڑایا جاتا تھا اور اس سے تماشہ بیں لطف لیتے تھے، جانوروں کے ساتھ کسی بھی طرح کی رحم دلی کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی، ان سب میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد اور آپ کی تعلیمات واخلاق سے غیر معمولی تبدیلی آگئی، اس طرح آپ کی آمد، صرف مسلمانوں کے لیے ہی رحمت نہیں بنی بلکہ انسانوں کے ساتھ ساتھ ساری مخلوقات کے لیے رحمت بنی، اور اسی کی طرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن مجید میں اظہار بھی کیا گیا کہ:۔ ﴿وما أرسلناك إلا رحمة للعالمين﴾ کہ ہم نے آپ کو سارے عالموں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

☆☆☆

اصلاح ودعوت کا نبوی طریقہ

رب العالمین کی طرف سے حضور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی کا مقام عطا کئے جانے پر آپ کو پوری انسانیت کے لیے عظیم رہبر کی اور وسیع ترین دائرہ میں عظیم ترین رہنما کی حیثیت عطا کردی گئی اور اس کا دائرہ قیامت تک وسیع کر دیا گیا، اس طرح آپ کو جو مقام ملا، وہ تو ملا، لیکن مزید یہ ہوا کہ انسانوں کو اس پستی اور گمراہی سے نکالنے کا کام بھی انجام پایا جس کی شدید ضرورت سامنے آچکی تھی، آپ کی پیدائش کے وقت سارے عرب اور سارے عجم ایسی اخلاقی پراگندگی اور ظلم وچیرہ دستی کے حالات تک پہونچ گئے تھے کہ انسانوں کا بحیثیت انسان کے تشخص ختم ہوتا جارہا تھا، اور گویا انسان اپنے انسانی تشخص سے محروم ہونے کے دہانے پر پہونچ گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئی اور اس نے آپ کی شکل اور شخصیت میں مصلح پیدا کیا، اور اس کو وحی الٰہی کے ذریعہ سے انسانوں کو انسانیت کے مقام پر لانے کی ذمہ داری سپرد کی، جس کو آپ نے بصورت اکمل پورا کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک عظیم پیغمبر (Prophet) ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم معلم ومربی بھی تھے۔ اور آپ کا طرز تعلیم وتربیت اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق تھا:

"ادع إلى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة، وجادلهم بالتي هي أحسن" [سورۃ النحل، آیت ۱۲۵]	اپنے رب کی راہ کی طرف لوگوں کو حکمت اور بہترین نصیحت کے ساتھ بلائیے اور ان سے بہترین طریقے سے گفتگو کیجئے۔

اور

" و من أحسن قولاً ممن دعا إلى اللّٰه و عمل صالحاً و قال إنني من المسلمين"

اور اس سے زیادہ اچھی بات والا کون ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک کام کرے اور کہے کہ میں یقیناً مسلمانوں میں سے ہوں۔

[سورۃ حم السجدہ، آیت ۳۳]

چنانچہ اس کے اثر سے آپ کو یہ خصوصیت حاصل ہوئی تھی، جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اسطرح کیا ہے:

"فإذا الذی بینك و بینه عداوة كأنه ولي حميم، وما يُلقاها إلا الذين صبروا وما يلقاها إلا ذو حظ عظيم"۔[سورہ حم السجدہ، آیت ۳۴-۳۵]

(پھر وہی جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی ہے ایسا ہو جائے گا جیسے دلی دوست، اور یہ انہیں کو نصیب ہوتی ہے جو صبر کریں، اور اسے سوائے بڑے نصیبے والوں کے کوئی نہیں پا سکتا)۔

اس طرح آپ کی حکیمانہ دعوت ، ہمدردانہ نصیحت کا نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن دوست بن گئے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس طرز عمل کو اختیار کرنے میں آپ کو جس تحمل اور صبر سے کام لینا پڑا وہ بھی غیر معمولی تھا، اور وہ اللہ تعالیٰ کی عنایت خاصہ کی بدولت آپ ہی کے بس کی بات تھی، چنانچہ اصلاح و نصیحت کے متعلق واقعات آپ کی سیرت میں خوب ملتے ہیں، اس میں محبت اور اپنائیت کی پوری روح کارفرما نظر آتی ہے، اس سلسلہ کا ایک واقعہ حدیث کی کتابوں میں بھی ہے کہ ایک دیہاتی مسجد میں کچی زمین دیکھ کر پیشاب کرنے لگا تو مسلمان اس کی طرف جھپٹ پڑے تا کہ اس کی خبر لیں، آپ ﷺ نے دیکھا تو روکا اور اس کو بلا کر نرمی سے سمجھایا کہ یہ اللہ کی عبادت کی جگہ ہے، یہاں پیشاب نہیں کرنا چاہئے، آپ ﷺ غصہ ہوئے نہ ہی جھنجھلائے بلکہ نرمی اور سلوک سے سمجھایا اور کہا کہ پانی بہا کر گندگی کو دور کر دو(۱)۔

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الوضوء

ایسے ہی سکھانے اور سمجھانے کا ایک واقعہ اور ہے، وہ یہ کہ ایک شخص نے مالی مدد کے لیے آپ ﷺ سے سوال کیا، آپ ﷺ کے پاس دینے کو کچھ نہ تھا، آپ ﷺ نے اس سے معذرت کی، لیکن وہ نہ مانا اور مانگتا چلا گیا، اور آپ ﷺ کی چادر مبارک کو ایسا کھینچا کہ اس کی وجہ سے آپ ﷺ کی گردن پر نشان پڑ گیا، اور وہ کھینچتا گیا یہاں تک کہ کانٹوں میں الجھا دیا، آپ ﷺ کی حیثیت اس وقت حاکم قوم کی بھی تھی، آپ سخت سزا دے سکتے تھے، لیکن آپ ﷺ نرمی سے ہی کہتے رہے، ہمارے پاس اس وقت کچھ نہیں ہے، ورنہ میں ضرور دیتا (۱)، اور مالی لحاظ سے شخصی طور پر آپ ﷺ کی یہی صورت حال تھی کہ ضرورت رفع کرنے کے لیے بعض وقت کچھ بھی نہ ہوتا تھا، فاقہ بھی کرنا پڑتا تھا، اور کبھی کبھی صرف چند کھجور پر اکتفا کرنا ہوتا تھا۔

اس طرح کے ایک موقع پر آپ ﷺ سے مدد چاہنے والے نے آپ ﷺ سے کہا کہ تم لوگ بخیل ہو، آپ ﷺ نے نرم لہجہ میں کہا میں بخیل نہیں ہوں، مگر دینے کے لیے کچھ ہے نہیں، آپ ﷺ اس وقت ناراض نہیں ہوئے اور بہت نرمی سے جواب دیا، یوں آپ ﷺ کی سخاوت کا یہ حال تھا کہ مہمانوں کا سلسلہ رہتا اور آپ ﷺ کے مکان کے باہر چبوترے پر اصحاب صفہ جمع رہتے تھے، اور ان کے کھانے کا نظم آپ ﷺ ہی کو کرنا ہوتا تھا، وقتاً فوقتاً فاقہ کی نوبت بھی آتی رہتی (۲)۔

آپ ﷺ جب وعظ کہتے اور کسی کو غلطی پر تنبیہ کرنی ہوتی، تو اس کا نام لے کر اسے مخاطب کر کے تنبیہ نہ کرتے، بلکہ کہتے: "مابال أقوام یفعلون کذا" کہ لوگوں کی ایک تعداد ایسی کیوں ہے کہ فلاں عمل کرتی ہے؟۔

تزکیہ واصلاح باطن

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اہم ترین کام تعلیم وتزکیہ کے

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب کان النبی ﷺ یعطی المؤلفۃ قلوبھم، ومسند امام احمد: ۱۵۳/۳

(۲) صحیح بخاری، وصحیح مسلم کتاب الزہد

لیے مقرر کیا تھا چنانچہ فرمایا:

﴿هو الذي بعث في الأميين رسولاً منهم يتلو عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة وإن كانوا من قبل لفي ضلال مبين﴾ [سورۂ جمعہ:۲]

(وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا، جو انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے ان کو پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت سکھاتا ہے، یقیناً یہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات میں تزکیہ یعنی انسانوں کے اخلاق و عادات کی اصلاح کرنا اور ان کو اچھا بنانا خاص صفت تھی، اس کے متعلق علامہ سید سلیمان ندوی سیرت النبی جلد ششم (ص ۵-۶) میں لکھتے ہیں:

''قرآن مجید نے جابجا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں یہ کہا ہے کہ ''ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة'' (جمعہ۔۲) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ان عرب اَن پڑھ جاہلوں کو پاک وصاف کرتا ہے، ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔

اس آیت میں یہ دو لفظ توجہ کے لائق ہیں ایک پاک وصاف کرنا، جس کو قرآن پاک نے تزکیہ کہا ہے اور دوسرا حکمت۔

ا۔ تزکیہ کے لفظی معنی پاک وصاف کرنا، نکھارنا، میل کچیل دور کرنا ہیں، قرآن پاک نے اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کیا ہے کہ نفس انسانی کو ہر قسم کی نجاستوں اور آلودگیوں سے نکھار کر صاف ستھرا کیا جائے، یعنی اس آئینہ کے زنگ کو دور کر کے اس میں صیقل اور جلا پیدا کر دی جائے، سورۂ والشّمس میں ہے:۔

﴿ونفس وما سوّٰها، فألهمها فجورها وتقوٰها قد أفلح من زكّٰها وقد خاب من دسّٰها﴾ (الشمس:۱۰)

قسم ہے نفس کی اور جیسا اس کو ٹھیک کیا، پھر اس میں اس کی بدی اور نیکی الہام کر دی، بے شبہ جس نے اس نفس کو صاف ستھرا بنایا وہ کامیاب ہوا، اور جس نے اس کو مٹی میں ملایا وہ ناکام ہوا۔

۲۔حکمت: اس کے بعد دوسرا لفظ حکمت کا ہے، حکمت کا لفظ قرآن پاک میں جہاں اس علم وعرفان کے معنی میں ہے جونور الٰہی کی صورت میں نبی کے سینہ میں ودیعت رکھا جاتا ہے، اور جس کے آثار ومظاہر ہر رسول کی زبان سے کبھی مصالح و اسرار اور کبھی سنن واحکام کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، وہیں اس کا دوسرا اطلاق اس علم وعرفان کے ان عملی آثار ونتائج پر بھی ہوتا ہے جن میں بڑا حصہ اخلاقی تعلیمات کا ہے، قرآن میں دو موقعوں پر یہ بتایا گیا ہے کہ اس دوسرے معنی کی حکمت میں کون کون باتیں داخل ہیں، سورہ بنی اسرائیل میں توحید، والدین کی اطاعت، قرابتداروں اورمحتاجوں کی امداد کی نصیحت اور فضول خرچی، بخل، اولاد کشی، بدکاری، کسی بے گناہ کی جان لینے اور یتیموں کو ستانے کی ممانعت کے بعد ایفائے عہد کرنے، ٹھیک ناپنے اور تولنے، اور زمین پر اکڑ کر نہ چلنے کی تاکید کی گئی ہے، اس کے بعد ارشاد ہے:

﴿ذلك مما أوحى إليك ربك من الحكمة﴾ (الاسراء:۳۹) -	یہ حکمت کی ان باتوں میں ہے جن کو تیرے رب نے تجھ پر وحی کیا۔

سورہ لقمان میں ہے

﴿و لقد آتينا لقمان الحكمة أن اشكر لله﴾ (لقمان:۱۲)	اور ہم نے لقمان کو حکمت کی باتیں سکھائیں کہ خدا کا شکر ادا کرو۔

اس کے بعد حکمت کی ان باتوں کی مزید تشریح کی گئی ہے، کہ کسی کو خدا کا شریک نہ بنا، والدین کے ساتھ مہربانی سے پیش آ، نماز پڑھا کر، لوگوں کو بھلی بات کرنے کو کہہ، اور بری بات سے باز رکھ، مصیبتوں میں استواری اور مضبوطی دکھا، مغرور نہ بن، زمین پر اکڑ کر نہ چل، نیچی آواز میں باتیں کر، ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ قرآن کی اصطلاح میں ان فطری امور خیر کو بھی جن کا خیر ہونا فطرتاً تمام قوموں اور مذہبوں میں مسلم ہے اور جن کو دوسرے معنی میں اخلاق کہہ سکتے ہیں ''حکمت'' کہا گیا ہے''۔

اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''قرآن مجید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تین اوصاف بیان کئے ہیں۔

۱۔ تلاوت آیات۔ ۲۔ تزکیہ۔ ۳۔ تعلیم کتاب وحکمت۔

ان اوصاف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخصوص صفت آپ ﷺ کی صفت تزکیہ ہے، تزکیہ کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ صرف پڑھ کر سُنا دینے اور سمجھا دینے پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ اس تلاوت وتعلیم کا رنگ ان پر چڑھا دیتے ہیں، اس کتاب وتعلیم کو ان کے کانوں اور دماغوں سے گزار کر ان کے قلوب وارواح کو رنگین کرتے ہوئے ان کے اعضاء وجوارح سے جاری کر دیتے ہیں، یہی صفت آپ ﷺ کو دنیا کے تمام واعظین ومعلمین سے ممتاز کرتی ہے، کہ آپ ﷺ واعظ ومعلم کے علاوہ ''مزکی'' بھی تھے، اور اسی لیے آپ ﷺ دنیا کے سب سے کامیاب مرشد وہادی تھے، صحابہ کی حیرت انگیز روحانی اخلاقی، ذہنی، عملی تبدیلی اور اسلام کی ابتدائی کامیابی کا راز یہی تھا، اور آج کی اسلامی زندگی کے ہر گوشے میں سب سے زیادہ نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔

دوست دشمن سب تسلیم کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کی صحبت میں پارس کی تاثیر تھی جس کو میسر آئی، وہ کندن نہیں بلکہ خود پارس بن گیا، بہائم انسان بن گئے، اور انسان فرشتے، ان کی اعتقادی، اخلاقی، روحانی تربیت اتنی اعلیٰ اور مکمل ہوئی جس سے زیادہ تصور میں نہیں آسکتی، جو آپ ﷺ کے پاس بیٹھا آپ ﷺ کے رنگ میں رنگ گیا، شریعت کے سانچے میں ڈھل گیا، اتباع شریعت بلا ارادہ ہونے لگا، طاعات آسان اور طبعاً مرغوب ہوگئیں، معاصی مکروہ اور طبعاً مبغوض ہوگئے، یہاں تک کہ امت کا صحابہ کے متعلق عقیدہ ہے کہ وہ سب کے سب عادل ہیں، اور ادنیٰ صحابی بھی بعد کے بڑے سے بڑے ولی اللہ سے افضل ہے۔

فوری تبدیلی اور باطنی تصرف کے واقعات سے بھی سیرت کی کتابیں بھری ہیں: فضالہ بن عمیر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ میں طواف فرما رہے تھے، میں برے ارادے سے آیا، جب قریب ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: فضالہ! کہو کیا سوچ رہے ہو؟، میں نے کہا: کچھ نہیں، اللہ کا ذکر کر رہا تھا، آپ ﷺ ہنسے اور کہا فضالہ! اللہ سے مغفرت چاہو، پھر آپ ﷺ نے دست مبارک میرے سینے پر رکھ دیا، میرا دل ٹھہر گیا، خدا کی قسم ابھی آپ ﷺ نے ہاتھ نہیں ہٹایا تھا، کہ اللہ کی مخلوقات میں آپ ﷺ سے زیادہ کوئی چیز میری نظر میں محبوب نہیں رہی، میں واپس گیا، تو وہ عورت ملی جس سے میں باتیں کیا کرتا تھا اس نے کہا: آؤ فضالہ، باتیں کریں، میں نے کہا: اسلام کے بعد یہ نہیں ہوسکتا (۱)۔

حضرت عمرو بن العاص کہتے ہیں کہ بیعت سے پہلے میری یہ حالت تھی کہ میری نظر میں آپ ﷺ سے زیادہ مبغوض ہستی دنیا میں کوئی نہیں تھی، اگر خدانخواستہ اس وقت مجھے موقع مل جاتا، تو اپنی عاقبت ضرور خراب کر لیتا، لیکن بیعت کے بعد میری نظر میں آپ ﷺ سے زیادہ محبوب و محترم ذات دنیا کے پردے میں کوئی نہ تھی، یہاں تک کہ میں نظر بھر کر آپ ﷺ کو دیکھ نہیں سکتا تھا، اگر مجھ سے کوئی آپ ﷺ کا حلیہ پوچھتا تو واللہ میں آپ ﷺ کا حلیہ مبارک نہیں بتلا سکتا تھا، اس لیے کہ آپ ﷺ کو نظر بھر کر دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہیں ہوئی تھی (۲)۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ان ہی خصوصیات اور ذمہ داریوں کی بناپر جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو سونپی گئی تھیں ایک طرف اللہ کے احکام لوگوں کو بتائے، دوسری طرف مزاج اور طبیعتوں کو دین کے سانچے میں ڈھالنے کا فریضہ بھی انجام دیا، اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کو جن سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے ان کو بیان کیا، لوگوں میں جو عیوب اور برائیاں پیدا ہوگئی تھیں ان کو درست

---

(۱) بحوالہ زاد المعاد لابن القیم۔ (۲) بحوالہ صحیح مسلم، کتاب الایمان (سیرت سید احمد شہید، مؤلفہ مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی، ۲/ ۵۴۵-۵۴۶

کیا، ان کی سیرت کو پاکبازی کی سیرت بنایا، تعلیم کتاب یعنی احکام الٰہی سے باخبر کیا، اچھے اخلاق اورزندگی کے صالح طریقۂ کار وصاف ستھرے طرز اور سیرت واخلاق کی پاکیزگی کی تلقین کی، آپ ﷺ نے قرآن مجید کی تعلیمات کی روشنی سے ان کی گمراہیوں کو دور کیا، اور پروردگار کی وحدانیت اور عظمت اور تنہا اس کی عظمت کا سبق دیا، اوران کے اخلاق کی طرف توجہ دی۔

آپ نے اپنی نبوت کی ذمہ داری کی ادائیگی کے ذریعہ انسانوں کی اصلاح کی سلسلہ میں کامیاب معلم اور باکمال مربی کا فرض ادا کیا، اورناخواندہ اور گمراہ قوم کی ایسی تعلیم وتربیت کی کہ وہ سارے عالم کے مصلح ومربی بن گئی، اوروہ آپ ﷺ کی تربیت یافتہ جماعت کے افراد جہاں گئے وہاں انہوں نے سیرت واخلاق میں انقلاب برپا کردیا، آپ ﷺ کی تعلیم وتربیت کا طریقہ ایسا دلنشیں اور تفہیم وتلقین کا طرز واسلوب ایسا مؤثر ہوتا تھا کہ پہلے ہی وہلہ میں انقلاب ہوجاتا، لیکن یہ بات اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع تھی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿إنك لا تهدي من أحببت ولكن اللّٰـه يهدي من يشاء وهو أعلم بالمهتدين﴾ (القصص:٥٦)

آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں کرسکتے، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی جسے چاہے ہدایت کرتا ہے، ہدایت والوں سے وہی خوب آگاہ ہے۔

توجس کی قسمت میں روز اول سے گمراہ رہنا ہی مقدر تھا، اس کی ہدایت کسی بھی معلم ومربی کے اختیار میں نہ تھی، وہ تو محروم رہا، ان چند بدقسمت لوگوں کے علاوہ جس کی طرف آپ کی توجہ ہوئی وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا، اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت تھی کہ ایسے شخص سے جو امّی تھا، اس نے تعلیم وتعلم کا کہیں سبق نہیں لیا تھا، اورکسی نے اس کو اس کا طریقہ بھی نہیں بتایا تھا، اللہ تعالیٰ نے یہ کام لیا جو دنیا کا بڑے سے بڑا معلم بھی نہیں کرسکتا تھا، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی آپ نے اصلاً علم کا درس توکسی سے

نہیں لیا تھا، لیکن آپ میں علم کی بنیاد بہت اعلیٰ تھی، اس بنیاد پر آپ کو آسمانی ذریعہ سے علم عطاء فرمایا گیا، آسمانی علم زندگیوں کو بنانے کی جو صلاحیت رکھتا ہے وہ زمینی ذریعہ سے حاصل ہونے والی صلاحیت سے بیحد فائق اور اثر رکھتی ہے، آپ کو اس آسمانی علم نے وہ صلاحیت عطا کی جس سے آپ نے انسانوں کی دنیا بدل دی اور آپ سے وہ فیض عام ہوا جس نے انسان کو پست سطح سے اٹھا کر بلند و بالا سطح کا انسان بنا دیا اور زندگی کے لئے ایسی شاہراہ بنا دی جو رہتی دنیا تک انسانوں کو انتہائی کامیابی کی منزل تک پہونچانے کی صلاحیت رکھتی ہے اور انسان کی ضرورت اور اس کے معیار اعلیٰ کے مطابق علم عطا کرتی ہے، قریش کے لوگ جو عام طور پر اُمی تھے، ان کے سامنے جب اعلیٰ معیار کی باتیں آپ ﷺ نے پیش کیں تو انہوں نے اہل کتاب کے عالموں سے معلوم کر کے آپ کو جانچنے کے لئے ایسے سوالات آپ ﷺ کے سامنے رکھے، جن کے متعلق ان کا خیال تھا کہ آپ ﷺ نہ بتا سکیں گے، کیونکہ ان کی معلومات عام انسانوں کو علم کے مروجہ طریقہ سے ہی حاصل ہو سکتی تھیں اور آپ ان مروجہ طریقہ سے نہیں گزرے لیکن آپ کو آسمانی معلم سے علم حاصل ہوا تھا، قریشیوں نے اصحاب کہف کا واقعہ اور ذوالقرنین کا واقعہ دریافت کیا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وحی کے ذریعہ معلومات حاصل ہو گئیں، اور آپ ﷺ نے ان سے قریش کو مطلع کیا، جس سے قریش کے سامنے یہ بات واضح ہو گئی کہ آپ ﷺ جو کچھ کہتے ہیں وہ خیالی باتیں نہیں ہیں، وہ اس علم سے ماخوذ ہیں جو آپ ﷺ کو خدا سے ملا ہے، اور یہ علم انسان کی سیرت و کردار کی صالح تعمیر و تشکیل کی صحیح راہ کا علم ہے جو انسانوں کو تباہی سے بچانے والی اور صحیح رُخ پر لے جانے والی راہ ہے۔

چنانچہ صرف نصف صدی میں دنیا نے دیکھ لیا کہ اس علم کی رہنمائی میں ایک عالمی انقلاب برپا ہو گیا اور انسانوں کی زندگیوں کا رخ یکسر بدل گیا، انسان مکمل تباہی کی

طرف جارہا تھا، نصف صدی میں وہ ترقی اور کامیابی کی شاہراہ پر چلنے لگا اور اس راہ پر چلنے سے دنیا کی اس وقت کی عظیم طاقتیں سرنگوں ہوگئیں اور وہاں بھی انقلاب آ گیا، یہ سب اللہ تعالیٰ کے اسی نبی آخر الزماں کی تعلیم وتربیت کا اثر تھا جس نے زندگی کے ہر رخ پر رہنمائی عطا کی اور زندگی کے ہر پہلو میں کامیابی وسرخروئی کا نمونہ بتایا اور رہبری کی۔

علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل، عالمگیر اور لافانی نقش حیات، آپ ﷺ کی جامعیت وکاملیت اور تمام طبقات انسانی نیز ہر ماحول، ہر زمانہ، ہر پیشہ اور ہر معاملہ، غرض ہر قسم کے حالات اور ہر سطح و معیار کے لئے آپ ﷺ کی کامل وجامع رہنمائی اور اسوۂ حسنہ کی نہایت مؤثر اور بلیغ انداز میں تشریح کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"ایک ایسی شخصی زندگی جو ہر طائفۂ انسانی اور ہر حالت انسانی کے مختلف مظاہر اور ہر قسم کے صحیح جذبات اور کامل اخلاق کا مجموعہ ہو، صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہے، اگر تم دولت مند ہو تو مکہ کے تاجر اور بحرین کے خزینہ دار کی تقلید کرو، اگر تم غریب ہو تو شعب ابی طالب کے قیدی اور مدینہ کے مہمان کی کیفیت سنو، اگر تم بادشاہ ہو تو سلطان عرب کا حال پڑھو، اگر تم رعایا ہو تو قریش کے محکوم کو ایک نظر دیکھو، اگر تم فاتح ہو تو بدر وحنین کے سپہ سالار پر نگاہ دوڑاؤ، اگر تم نے شکست کھائی ہے تو معرکۂ احد سے عبرت حاصل کرو، اگر تم استاد و معلم ہو تو صفہ کے درسگاہ کے معلم قدس کو دیکھو، اگر شاگرد ہو تو روح الأمین کے سامنے بیٹھنے والے پر نظر جماؤ، اگر تم واعظ و ناصح ہو تو مسجد مدینہ کے منبر پر کھڑے ہونے والے کی باتیں سنو، اگر تم تنہائی اور بے کسی کے عالم میں حق کے منادی کا فرض انجام دینا چاہتے ہو تو مکہ کے بے یار و مددگار نبی کا اسوۂ حسنہ تمہارے سامنے ہے، اگر تم حق کی نصرت کے بعد اپنے دشمنوں کو زیر اور اپنے مخالفوں کو کمزور بنا چکے ہو تو فاتح مکہ کا نظارہ کرو، اگر تم اپنے کاروبار اور دنیاوی

جدو جہد کا نظم ونسق درست کرنا چاہتے ہو تو بنی نضیر، خیبر اور فدک کی زمینوں کے مالک کے کاروبار اور نظم ونسق کو دیکھو، اگر یتیم ہو تو عبداللہ اور آمنہ کے جگر گوشہ کو نہ بھولو، اگر بچہ ہو تو حلیمہ سعدیہ کے لاڈلے کو دیکھو، اگر تم جوان ہو تو مکہ کے ایک چرواہے کی سیرت پڑھو، اگر تم سفری کاروبار میں ہو تو بصرہ کے کاروان سالار کی مثال ڈھونڈو، اگر تم عدالت کے قاضی ہو اور پنچایتوں کے ثالث ہو تو کعبہ میں نور آفتاب سے پہلے داخل ہونے والے ثالث کو دیکھو جو حجر اسود کو کعبہ کے ایک گوشہ میں کھڑا کر رہا ہے، مدینہ کی کچی مسجد کے صحن میں بیٹھنے والے منصف کو دیکھو، جس کی نظر انصاف میں شاہ و گدا اور امیر وغریب سب برابر تھے، اگر تم بیویوں کے شوہر ہو تو خدیجہؓ اور عائشہؓ کے مقدس شوہر کی حیات پاک کا مطالعہ کرو، اور اگر تم اولاد والے ہو تو فاطمہؓ کے باپ اور حسنؓ وحسینؓ کے نانا کا حال پوچھو، غرض تم جو کچھ بھی ہو اور کسی حال میں بھی ہو تمہاری زندگی کے لئے نمونہ، تمہاری سیرت کی درستگی و اصلاح کے لئے سامان، تمہارے ظلمت خانہ کے لئے ہدایت کا چراغ اور رہنمائی کو نور محمد ﷺ کی جامعیت کبری کے خزانہ میں ہر وقت اور ہمہ دم مل سکتا ہے، اس لئے طبقات انسانی کے ہر طالب علم اور نور ایمانی کے ہر متلاشی کے لئے صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہدایت کا نمونہ اور نجات کا ذریعہ ہے، جس کی نگاہ کے سامنے محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہے، اس کے سامنے نوح وابراہیم، ایوب و یونس، موسی وعیسی علیہم السلام سب کی سیرتیں موجود ہیں، گویا تمام دوسرے انبیاء کرام کی سیرتیں، ایک ہی جنس کی اشیاء کی دوکانیں ہیں، اور محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت، اخلاق و اعمال کی دنیا کا سب سے بڑا بازار ہے، جہاں ہر جنس کے خریدار اور ہر شئے کے طلبگار کے لئے بہترین سامان موجود ہے'' (۱)۔

☆☆☆

---

(۱) خطبات مدراس، ص: ۹۶ - ۹۸

دسواں باب

اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید وایمان کی دعوت اس طریقہ سے دی کہ جس نے بھی توجہ سے سنا بات اس کے دل میں اتر گئی اور اس پر اس کا ایمان مستحکم ہو گیا اور آپ کا اخلاق، انسانی ہمدری اور محبت بھرا انداز بھی ایسا تھا کہ جس نے بھی قریب سے دیکھا اور سنا وہ صرف متاثر ہی نہیں ہوا بلکہ دل وجان سے آپ کا کہنا ماننے والا بن گیا اور آپ پر فدا ہونے کے لئے تیار ہو گیا اور یہ حالت صرف دو چار آدمیوں کی نہیں ہوئی بلکہ جس نے بھی آپ کو دیکھا سنا اور سمجھا اس کی یہی کیفیت ہو گئی، اس طرح آپ کی دعوتی زندگی کی ۲۳ سالہ مدت میں ایمان والوں کی ایسی جماعت تیار ہو گئی جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی، یہی جماعت آپ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد آپ کی پوری نیابت کرنے والی بن گئی اور آپ کے مشن کو اس نے پوری دیانت وامانت اور مکمل توجہ سے جاری رکھا اسی قدر موقع ملنے سے آپ ﷺ پر ایمان لانے اور آپ کا کہنا ماننے والی بن گئی، یہ حضرات مکہ مکرمہ کے قیام کی تیرہ سالہ مدت میں چونکہ کم تعداد میں تھے اور قریش کے مختلف خاندانوں میں بکھرے ہوئے تھے لہٰذا ہر ایک کو خود اس کے اعزہ پریشان کرتے تھے اور اس طرح وہ قریش کے سخت دل کافروں اور اسلام کی مخالفت کرنے والوں کے ظلم کا نشانہ بنتے تھے، لیکن اس کے باوجود یہ ایمان والے اپنے ایمان پر پوری طرح جمے رہے تھے، ان کے سامنے اللہ کی خوشنودی اور حضور کی محبت اور آخرت کا مسئلہ تھا جس کو انہوں نے دل وجان سے قبول

کیا تھا، جو بھی ایمان لاتا خواہ امیر ہوتا یا غریب، معزز خاندان کا ہوتا یا کمزور پوزیشن کا، اس میں ایسا ہی پختہ ایمان پیدا ہو جاتا۔

یہ ایمان زیادہ تر دو اسباب سے پیدا ہوتا تھا ایک سبب اللہ تعالی کا کلام معجز بیان تھا جس کو ایک بار بھی سن لینے سے آدمی کا دل بدل جاتا تھا دوسرا سبب آپ ﷺ کے اخلاق وشفقت کو قریب سے دیکھ لینا تھا، قرآن مجید سن کر ایمان لانے والوں کی تعداد بھی خاصی تھی اور آپ کے اخلاق وبات چیت سن کو متاثر ہونے والوں کی تعداد بھی خاصی تھی، آپ سے متاثر ہونے کی ایک مثال ثمامہ بن اثال کا واقعہ ہے وہ کہتے ہیں کہ وہ حضور ﷺ کے پاس دشمنی بلکہ آپ کو نقصان پہونچانے کی نیت سے آئے لیکن ملتے ہی بدل گئے اور کہنے لگے کہ یا رسول اللہ ﷺ! قسم ہے خدا کی کہ، سارے عالم میں مجھ کو آپ سے زیادہ اور کسی سے ایسی نفرت نہ تھی، لیکن اب تو آپ ﷺ ہی دنیا میں سب سے بڑھ کر پیارے معلوم ہوتے ہیں (۱)۔

آپ پر ایمان لانے والوں کا حال آپ کی محبت اور تربیت سے ایسا ہی بن گیا کہ انکے دلوں میں ایمان لاتے ہی اس طرح کی محبت اور فدائیت کی کیفیت پیدا ہو جاتی اور پھر آپ کی رہنمائی اور تعلیم وتلقین سے زندگی کے اعلی حقائق سے واقفیت اس درجہ پیدا ہو جاتی کہ ان کو اعلی مقصد کے لئے جاں نثار کر دینے میں ادنی تکلف نہ ہوتا، اور اپنے معلم اور قائد نبی مکرم کے حکم پر بے تکلف اپنی جان نثار کر دینے کے لئے تیار ہو جاتے، اپنی مرضی اور خواہش میں خواہ کتنا سخت ہوں آپ کی مرضی کے سامنے اس کو بالکل نظر انداز کر دیتے اور آپ کی مرضی کے مطابق عمل کرتے۔

چنانچہ جو بھی آپ ﷺ پر ایمان لایا اس نے اسی بات کا ثبوت دیا، اس کی ایک بڑی مثال صلح حدیبیہ میں صحابہ کرام کا قریش کی ظالمانہ شرائط کا قبول کر لینا اور

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر، باب ربط الأسیر وحبسہ

آپ کی مرضی کے سامنے جھک جانا ہے اور غزوۂ خندق میں ۳ ہفتوں سے زیادہ فقر و فاقہ اور سخت سردی کی حالت میں اپنی جان ہتیلی پر لئے جمے رہنا ہے اور غزوۂ احد میں جب براہ راست دشمن حملہ آور تھا تو دسیوں جاں نثار صحابہ آپ کے سامنے آ گئے اور دشمنوں کے وار اپنے سینوں پر لئے اور سارے زخم برداشت کئے، تا کہ حضور ﷺ محفوظ رہیں اور سب ایک ایک کر کے آپ پر قربان ہو گئے، حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ نے اپنا ہاتھ سامنے کر دیا اور تیروں کو روکنا شروع کیا یہاں تک ان کی سب انگلیاں زخموں سے لہولہان ہو گئیں اور ہاتھ مفلوج ہو گیا، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح نے خود کی ایک کڑی کو اپنے دانتوں سے پکڑ کر نکالا تو اسی کے ساتھ ان کا ایک دانت بھی گر پڑا، دوسری کڑی نکالی تو دوسرا دانت بھی اس کے ساتھ باہر آ گیا، حضرت ابودجانہ ڈھال بن کر آپ کے سامنے کھڑے ہو گئے تیر ان پر گرتے رہے، لیکن وہ اسی طرح آپ پر جھکے رہے یہاں تک ان کی پیٹھ تیروں سے چھلنی ہو گئی (۱)۔

غزوۂ احد کے بعد مسلمان مدینہ پہونچے تو راستہ میں بنی دینار کی ایک خاتون کے مکان پر ان کا گزر ہوا، جس کے باپ، بھائی اور شوہر سب اس معرکہ میں کام آ گئے تھے، باری باری تین حادثوں کی صدا ان کے کانوں میں پڑی تھی، لیکن وہ ہر بار صرف یہ پوچھتی تھیں کہ رسول اللہ ﷺ کیسے ہیں؟ لوگوں نے کہا: بخیر ہیں، انہوں نے پاس آ کر چہرۂ مبارک دیکھا اور بے اختیار پکار اٹھیں: "كل مصيبة بعدك جلل" (آپ کے ہوتے سب مصیبتیں ہیچ ہیں) (۲)۔

جب کفار قریش زید بن الدثنہ کو قتل کرنے کے لئے حرم سے باہر لائے تو ابوسفیان نے ان سے کہا: زید میں تم سے قسم دلا کر پوچھتا ہوں کیا تم یہ پسند کرو گے کہ تم آرام سے اپنے گھر والوں میں ہو اور تمہاری جگہ محمد (ﷺ) ہوں،؟ زید نے جواب

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۲/ ۱۲۷۔ (۲) سیرت ابن ہشام: ۲/ ۹۹

دیا کہ مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں کہ میں اپنے گھر میں آرام سے ہوں اور محمد ﷺ کو ایک کانٹا بھی چبھے!۔ ابوسفیان نے اس پر کہا میں نے کسی کو کسی سے اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا جتنی محبت محمد ﷺ کے ساتھی کرتے ہیں (۱)۔

جو شخص بھی چند منٹ کے لئے ایمان کے ساتھ حضور ﷺ سے مل جاتا وہ آپ پر سب کچھ قربان کر دینے کے لئے تیار ہو جاتا، سوائے ان بعض آدمیوں کے جو مدینہ میں یہودیوں کی صحبت میں رہکر ایمان ظاہر کرتے تھے لیکن اندر سے دشمن تھے، لیکن آپ ﷺ نے ان کے ساتھ بھی محبت اور رواداری کا سلوک کیا۔

چنانچہ آپ ﷺ کے صحابہ کرام کی جو جماعت بنی وہ ایمان اور محبت رسول اور آپ کے لائے ہوئے دین اسلام کی پیروی میں ناقابل تسخیر پہاڑ کی طرح تھی اور بتدریج اتنی بڑی تعداد میں یہ جماعت تیار ہوئی کہ تاریخ انسانی میں ایسی صالح اور پختہ ایمان اور دین میں پختگی کی کوئی مثال نہیں ملتی اور یہ دراصل اللہ تعالی کی طرف سے تھا، جس نے یہ فیصلہ کیا کہ آپ کے بعد کسی نبی کے آنے کی ضرورت نہیں، اور آپ کی صحبت اور رہنمائی حاصل کرنے والوں کی جماعت کو ایسے صفات اور کردار کا بنا دیا کہ وہ نبوت کی صحیح نیابت کرتے ہوئے اس دین کو اور اعلی انسانی صفات کو آگے بڑھائیں اس کے افراد میں سے ہر ایک اپنی جگہ آفتاب و ماہتاب تھا، اور آپ ﷺ نے ان کے بارے میں تصدیق بھی کی، فرمایا: ''أصحابی کالنجوم بأیھم اقتدیتم اھتدیتم ''۔ یعنی میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں، ان میں سے جس کی اتباع کروگے ہدایت پر رہوگے۔

آپ ﷺ سے جو جتنا زیادہ قریب رہا اس کو اتنی زیادہ اولیت حاصل ہوئی، آپ ﷺ سے سب سے زیادہ قریب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رہے، کہ جن سے آپ کی رفاقت اور دوستی نبوت سے پہلے سے تھی، وہ تقریبا آپ کے ہم عمر تھے،

---

(۱) سیرت ابن ہشام ۲/۱۷۴

صرف دو ڈھائی سال چھوٹے تھے، حضور ﷺ کی وفات کے بعد اس دین اسلام کو قائم رکھنے اور آگے بڑھانے کی ذمہ داری سب سے پہلے آپ کو ملی اور آپ خلیفۂ اول ہوئے، پھر اسی ترتیب سے آپ کے بعد تین دیگر خلفاء ہوئے جو آپ کے سچے جانشین ہوئے اور خلفائے راشدین کہلائے، ان سب کے ذریعہ خلافت راشدہ یعنی اعلیٰ معیار کی خلافت کا سلسلہ آپ ﷺ کی وفات کے بعد ۳۰ سال تک جاری رہا اور حضور ﷺ نے وحی کے ذریعہ جو اخلاق وصفات اور زندگی کی مختلف ذمہ داریوں میں جو طریقہ عمل اختیار کیا تھا اور اپنے صحابہ کو اس کی تربیت دی تھی اس کے مطابق اسلامی دستور حیات کو صحابہ کرام کے ذریعہ بے کم وکاست جاری کیا جاتا رہا جس کے ذریعہ آئندہ کے لئے ایک اعلیٰ نظیر بن گئی اور دین صحیح کا راستہ روز روشن کی طرح مقرر ہو گیا اور بعد میں آنے والوں کے لئے نمونہ بن گیا۔

حضور ﷺ کی ۲۳ سالہ تربیت وہدایات کے بعد آپ کے معتمد ترین اصحاب کے پاس ۳۰ سال تک اس ذمہ داری کے رہنے سے جس میں حضور ﷺ کے زمانہ میں اختیار کردہ طریقۂ عمل کے عین مطابق کام انجام پائے اور آئندہ کے لئے نمونہ بنا۔ حضور ﷺ کے معتمد ترین خلفاء کے نظام وانصرام کی یہ ۳۰ سال کی مدت ایسی مدت تھی کہ اس کے اختتام پر نظم وانتظام سنبھالنے کا کام نئی نسل تک بتدریج منتقل ہوا جس میں براہ راست حضور ﷺ کی سرپرستی نہیں تھی، لیکن عین حضور ﷺ کے زمانہ کی اختیار کردہ شے کی طرح تھی، اور یہ دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی انتظام تھا وہ یہ کہ دس سال وحی الٰہی کے تحت خود حضور ﷺ کے ذریعہ پھر تیس سال آپ ﷺ کے تربیت یافتہ حضرات کے تحت گزریں اور ان چالیس سال میں دین اسلام کے معیاری نظام کا نمونہ سامنے آجائے اور قیامت تک اسی کو سامنے رکھ کر عمل کی کوشش کی جائے کیونکہ دین مکمل کر دیا گیا تھا۔

لہٰذا اس کے مکمل ہونے کا نمونہ قیامت تک سامنے رہے، اب اس میں کسی

ترمیم کی ضرورت پیش نہیں آنا ہے قیامت تک انسانوں کی صلاح وفلاح کے لئے وہ بالکل کافی ہے، اس لئے کہ وہ اللہ رب العالمین کا دیا ہوا دین ہے، جو انسانوں کے مزاج اور ضرورتوں کو شروع سے آخر تک جاننے والا بلکہ بتانے والا ہے، اسی لحاظ سے اس کو مکمل فرما دیا گیا اور اللہ کی طرف سے اس کی حفاظت کا وعدہ بھی فرما دیا گیا:

﴿إنا نحن نزلنا الذكر وإنا له لحافظون﴾[سورہ حجر:۹]

بیشک یہ (کتاب) نصیحت ہم ہی نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿اليوم أكملت لكم دينكم وأتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الإسلام ديناً﴾[سورہ مائدۃ:۳]

آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کردیا اور اپنی نعمتیں تم پر مکمل کردیں اور تمہارے لئے اسلام کو دین پسند کیا۔

حضور ﷺ کے بعد جن حضرات کو یہ سلسلہ چلانا تھا یعنی آپ کے قریبی اصحاب کی جماعت دین اسلام کی وہ مثالی جماعت بنی جس نے نبی کے قول وفعل کو اچھی طرح سمجھا تھا، اور وہ اس کیلئے اپنی مرضی اور خواہشات کو مٹا چکے تھے اور اپنے نبی کا آئینہ بن چکے تھے، وہ کوئی ایسی بات نہیں کہہ سکتے اور نہ کرسکتے تھے جو اللہ کے رسول کی مرضی کے خلاف ہو، یہ جماعت جماعت صحابہ کہلائی جن کی تعداد ہزاروں سے زیادہ ہوئی۔

امریکی فوجی مورخ مسٹر رچرڈ جابیل نے جنہوں نے امریکا کے مختلف اہم سرکاری اداروں میں بشمول امریکن خفیہ ایجنسی سی آئی اے خدمات انجام دیں اور مختلف موضوعات پر ۴۰ کتابیں تصنیف کی ہیں، حال ہی میں ایک نئی تحقیق پیش کی ہے جس میں انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہر اعتبار سے مرد کامل اور جینیس انسان ہیں، خاص طور سے موصوف نے حضور ﷺ کی عسکری اور قائدانہ وتربیتی صلاحیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ ''محمد (ﷺ) پہلے اسلامی

قائد ہیں اور محمد (ﷺ) نے اپنے ماننے والوں کی ایک ایسی مثالی جماعت تیار کردی جس نے بیزنطینی اور ایرانی سلطنتیں فتح کرلیں، اور ایسی جماعت تیار کی جس کا اس بات پر پختہ اور کامل ایمان ویقین تھا کہ آپ (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں، اور اپنے نبی ورسول کی بتائی ہوئی ہر بات پر کاربند تھی اور دین اسلام اور اسلامی عقائد ومسلمات (اسلامی آئڈیالوجی) کی حفاظت کی خاطر ہر چیز قربان کردینے کے لئے تیار تھی''۔

رچرڈ جابیل مزید لکھتے ہیں: ''محمد (ﷺ) نے جو جماعت تیار کی وہ اصول وضوابط کی پابند جماعت تھی، اپنے مشن، پیغام اور اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ہر چیز قربان کردینے کے لئے ہمہ وقت تیار تھی، اگر ایسی منظم، جذبۂ فدائیت وایثار سے لبریز اور اپنے قائد ومرشد کے بتائے ہوئے ضابطۂ حیات اور نظام زندگی پر سختی سے کاربند جماعت نہ ہوتی تو محمد (ﷺ) کے انتقال کے بعد اسلام کو فروغ نہ ہوتا۔ محمد کے انتقال کے بعد محمد کے ساتھیوں کا فتنۂ ارتداد پر قابو پالینا اور مرتد قبائل کو دوبارہ اسلام پر جمادینا محمد کی تربیت اور قائدانہ صلاحیت کی بین دلیل ہے''۔

رچرڈ جابیل نے مزید لکھا ہے کہ محمد (ﷺ) نے اپنے ساتھیوں اور ایمان لانے والوں کے دل ودماغ میں یہ بات راسخ کردی اور بٹھادی تھی کہ وہ روئے زمین پر اللہ کے حکم کو نافذ کرنے والے ہیں، یہ تاریخ میں پہلا واقعہ ہے کہ کوئی جماعت یہ ایمان اور اعتقاد رکھتی ہو کہ وہ روئے زمین پر اللہ کے احکامات کو نافذ کررہی ہے۔ محمد نے جو جماعت تیار کی وہ خاندانی، قومی، نسلی، قبائلی، علاقائی اور رنگ وروپ کی بنیاد پر نہیں، بلکہ وہ خالص دین اسلام کی بنیاد پر متحد تھی'' (۱)۔

علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:۔

''اسلام کے معلم (حضرت محمد رسول اللہ ﷺ) کی نسبت صرف یہی دعویٰ نہیں

---

(۱)۔ مجلہ ''المجتمع'' الکویتیۃ، شمارہ نمبر: ۱۷۹۶، ۲۸ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۰۰۸/۴/۵ء۔

ہے کہ وہ لوگوں کو کتاب وحکمت کی باتیں سکھاتا اور اللہ کے احکام سناتا ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ ان کو اپنے فیض واثر سے پاک وصاف ومصفا بھی بنادیتا ہے، وہ ناقصوں کو کامل، گنہگاروں کو نیک، اندھوں کو بینا اور تاریک دل کو روشن دل بنادیتا ہے، چنانچہ جس وقت اس نے اپنی حیات کا کارنامہ ختم کیا، کم ازکم ایک لاکھ انسان اس کی تعلیم سے عملاً بہرہ مند ہوچکے تھے، اور وہ عرب جو اخلاق کے پست ترین نقطہ پر تھا تیئیس برس بعد وہ اخلاق کے اس اوجِ کمال پر پہنچا جس کی بلندی تک کوئی ستارہ آج تک نہ پہنچ سکا۔

اگر کسی معلم میں تکمیل کی یہ تاثیر بھی ہو، پھر یہ بھی دیکھنا ہے کہ اس عالم کی تکمیل اور نظم ونسق کے لیے ایک ہی قوت کے انسانوں کی نہیں بلکہ سینکڑوں مختلف قوتوں کے انسانوں کی ضرورت ہے، اخلاق کے دوسرے معلمین کی درسگاہوں پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ وہاں صرف ایک فن کے طالب علم تعلیم پاتے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تربیت گاہ میں فوجی تعلیم کے سوائی کوئی اور فن نمایاں نہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مکتب میں عفو ودرگزر کے سوا اور کوئی سبق نہیں، بودھ کے وہار اور خانقاہ میں دربدر بھیک مانگنے والے مرتاض فقیروں کے سوا کوئی اور موجود نہیں، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی درسگاہ اعظم میں آکر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک عمومی جامعہ ہے، جس میں انسانی ترقی کی ہر قوت نشونما پارہی ہے، خود معلم کی ذات ایک پوری یونیورسٹی ہے جس کے اندر علم وفن کا ہر شعبہ اپنی جگہ پر قائم ہے اور ہر جنس اور مذاق کے طالب علم آتے ہیں اور اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق کسبِ کمال کر رہے ہیں۔

آپ ﷺ کی حیثیت ایک انسان، ایک باپ، ایک شوہر، ایک دوست، ایک خانہ دار، ایک کاروباری تاجر، ایک افسر، ایک حاکم، ایک قاضی، ایک سپہ سالار، ایک بادشاہ، ایک استاد، ایک واعظ، ایک مرشد، ایک زاہد وعابد اور آخر ایک پیغمبر کی

نظر آتی ہے، یہ تمام انسانی طبقے آپ ﷺ کے سامنے آکر زانوئے ادب تہہ کرتے ہیں اور اپنے اپنے پیشہ وفن کے مطابق آپ ﷺ کی تعلیمات سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔

مدینۃ النبی کی اس درس گاہ اعظم کو غور سے دیکھو جس کی چھت کھجور کے پتوں سے اور ستون کھجور کے تنوں سے بنائے گئے تھے اور جس کا نام مسجد نبوی تھا۔ اس کے الگ الگ گوشوں میں ان انسانی جماعتوں کے الگ الگ درجے کھلے ہوئے تھے، کہیں ابوبکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ وعلیؓ جیسے فرمانروا زیرِ تعلیم ہیں، کہیں طلحہؓ وزبیرؓ ومعاویہؓ وسعد بن معاذ وسعید بن جبیرؓ جیسے اربابِ رائے وتدبیر ہیں، کہیں خالدؓ، ابوعبیدہؓ، سعدؓ بن ابی وقاص اور عمروؓ بن العاص جیسے سپہ سالار ہیں، کہیں وہ ہیں جو بعد کو صوبوں کے حکمراں، عدالتوں کے قاضی اور قانون کے مقنّن بنے، کہیں زہاد وعباد کا مجمع ہے جن کے دن روزوں میں اور راتیں نمازوں میں کٹتی تھیں، کہیں ابوذرؓ وسلمانؓ وابودرداءؓ جیسے وہ خرقہ پوش ہیں جو ''مسیح اسلام'' کہلاتے تھے، کہیں وہ صفہ والے طالب العلم تھے جو جنگل سے لکڑی لاکر بیچتے تھے اور گزارا کرتے اور دن رات علم کی طلب میں مصروف رہتے تھے، کہیں حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت جیسے فقیہ ومحدث تھے، جن کا کام علم کی خدمت اور اشاعت تھا، ایک جگہ غلاموں کی بھیڑ ہے، تو دوسری جگہ آقاؤں کی مجلس ہے، مگر ان میں ظاہری عزت اور دنیاوی اعزاز کی کوئی تفریق نہیں پائی جاتی، سب مساوات کی ایک ہی سطح پر اور صداقت کی ایک ہی شمع کے گرد پروانہ وار جمع ہیں، سب پر توحید کا یکساں نشہ چھایا اور سینوں میں حق پرستی کا ایک ہی ولولہ موجیں لے رہا ہے، اور سب اخلاق کے ایک ہی آئینہ قدس کا عکس بننے کی کوشش میں لگے ہیں'' (۱)۔

---

(۱) سیرت النبی، از: علامہ شبلی نعمانی وسید سلیمان ندوی: ۶/۲۴-۲۵، الفیصل ناشران وتاجران کتب، اردو بازار لاہور، مارچ ۱۹۹۱ء

سابقین اولین اور عشرۂ مبشرہ

شروع میں جو لوگ ایمان لائے ان کو اپنے ایمان لانے پر جو ظلم اور دشمنی جھیلنی پڑی وہ غیر معمولی حدتک زیادہ تھی اور برسوں جاری رہی اور اس سے سابقہ ایسے لوگوں کو پڑ رہا تھا جو اپنے خاندان کے معزز لوگ تھے اور اس سے قبل تک وہ معمولی اہانت یا زیادتی کسی قیمت پر برداشت نہیں کرسکتے تھے، خواہ اس سے جنگ کی نوبت آجائے، لیکن ان ایمان لانے والوں کو حکم یہی تھا کہ برداشت کرو اور ان کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ کب تک برداشت کرنا ہے اور یہ کبھی ختم بھی ہوگی یا نہیں، ایسی صورت میں ضبط نفس اور برداشت پتھر جیسے دل رکھنے والے ہی کرسکتے ہیں یا ایسے کمزور اور بے وقعت لوگ جو کسی بھی ظلم کا مقابلہ نہیں کرسکتے، لیکن یہ ایمان لانے والے قریشی انتقام لینے کی صلاحیت رکھتے تھے لیکن حکم خداوندی کی وجہ سے برداشت کررہے تھے، چنانچہ اسی لحاظ ومقام سے ان کا رتبہ بڑھا اور سابقین اولین کہکر ان کا رتبہ بلند قرار دیا گیا، قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿والسابقون الأولون من المهاجرين و الأنصار والذين اتبعوهم بإحسان رضى الله عنهم ورضوا عنه وأعدّ لهم جنات تجرى تحتها الأنهار خالدين فيها أبداً، ذلك الفوز العظيم﴾

[سورہ توبہ، آیت ۱۰۰]

جن لوگوں نے سبقت کی (یعنی سب سے پہلے (ایمان لائے) مہاجرین میں سے بھی اور انصار میں سے بھی اور جنھوں نے نیکوکاری کے ساتھ ان کی پیروی کی خدا ان سے خوش ہے اور وہ خدا سے خوش ہیں اور اس نے ان کے لئے باغات تیار کئے ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں اور ہمیشہ ان میں رہیں گے، یہ بڑی کامیابی ہے۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿لایستوی منکم من أنفق من قبل الفتح وقاتل أولئك أعظم درجة من الذین أنفقوا من بعد وقاتلوا وکلا وعد الله الحسنیٰ والله بما تعملون خبیر﴾ [الحدید، آیت۱۰]

جس شخص نے تم میں سے فتح (مکہ) سے پہلے خرچ کیا اور لڑائی کی وہ (اور جس نے یہ کام بعد میں کئے وہ) برابر نہیں، ان لوگوں کا درجہ ان لوگوں سے سے کہیں بڑھ کر ہے جنھوں نے بعد میں خرچ کیا اور کفار سے جہاد اور قتال بعد میں کیا البتہ خدا نے (ثواب اور جزاء (کا) وعدہ دونوں سے کیا ہے۔

یہ بات اپنی جگہ حقیقت ہے کہ شروع میں جو لوگ ایمان لائے، ان کو زیادہ سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا اور انہوں نے پوری اطاعت وفدائیت کا جو ثبوت دیا اور قربانیاں پیش کیں، وہ بھی اعلی ترین معیار کی تھیں، یہ عموماً مدنی زندگی سے پہلے کا زمانہ تھا، جس میں ان کو اپنے ہی عزیزوں سے بائیکاٹ کا سامنا کرنا پڑا اور ان کی طرف سے طرح طرح کی اذیتیں برداشت کرنا پڑیں، پھر دین کی خاطر اپنا سب مال ومتاع اور اہل وعیال چھوڑ کر ترک وطن برداشت کرنا پڑا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر ان کی اس فدائیت وتعلق کا بڑا اثر تھا، آپ ﷺ نے اللہ کے حکم سے ان میں سے بہت سے لوگوں کے ایمان ویقین کی پختگی کے قبول کئے جانے اور بہترین کامیابی ہونے کا اظہار فرمایا۔

ان میں درجہ اول کے حضرات عشرۂ مبشرہ کہلائے، یہ دس حضرات ہیں جن کو ایک ساتھ جنتی ہونے کی بشارت سنائی گئی، فرمایا: "أبوبکر في الجنة، و عمر في الجنة، و عثمان في الجنة، و علي في الجنة، وطلحة في الجنة، والزبیر في الجنة، و عبد الرحمن بن عوف في الجنة، وسعد في الجنة، وسعید في الجنة، وأبوعبیدة بن الجراح في الجنة" (۱)۔

(۱) سنن ترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب عبدالرحمٰن بن عوف الزهري، حضرت سعید بن زید سے بھی یہ روایت مروی ہے اور اس میں عشرة في الجنة کا بھی اضافہ ہے، اسے بھی امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی دیگر متعدد صحابہ کے متعلق انفرادی طور پر بشارت کے جملے ارشاد فرمائے ہیں، غزوہ بدر میں شریک ہونے والوں اور بیعت رضوان میں شریک ہونے والوں کے لئے بھی بشارت دی، اسی طرح بعض صحابیات کے بارے میں بھی بشارت دی اور حضور ﷺ کا اس دین کے سلسلہ میں کچھ بھی فرمانا اللہ تعالی کے حکم سے ہی ہوتا تھا، ان اہم حضرات کے متعلق یہ بشارتیں موقع موقع سے نام لیکر دی گئیں، عمومی بشارت دیگر لوگوں کو بھی دی گئی، قرآن مجید میں فرمایا ﴿رضی اللّٰہ عنہم ورضوا عنہ﴾ اللہ تعالی ان سب سے راضی وخوش ہے، اور یہ بھی اپنے خدا سے راضی وخوش ہیں اور خود آپ ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے بشارت دی، قرآن مجید میں آپ کی ہر کہی بات کے متعلق یہ فرمایا گیا کہ آپ اپنی طرف سے نہیں کہتے، وحی کی بنا پر کہتے ہیں جو آپ پر بھیجی جاتی ہے:

﴿وما ينطق عن الهوى، إن هو إلا وحي يوحى﴾ [سورہ نجم: ۴]	اور نہ خواہش نفس سے منہ سے بات نکالتے ہیں یہ تو حکم خدا ہے جو ان کی طرف بھیجا جاتا ہے۔

تو یہ بشارتیں بھی وحی الہی کے مطابق ہوتی تھیں، اس طرح اللہ تعالی نے ان کی زندگی کے دوران ہی ان کے جنتی ہونے کی اطلاع فرمادی۔

خلفاء راشدین

عشرۂ مبشرہ حضرات میں سب سے اول چار حضرات مزید فائق قرار پائے، ان حضرات کو حضور ﷺ کی وفات کے بعد آپ ﷺ کی اصل نیابت خلافت راشدہ کی صورت میں عطا ہوئی، یہ خلفاء راشدین کہلائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی تھا "عليكم بسنتي و سنة الخلفاء الراشدين المهديين" کہ میری اور خلفائے راشدین کی سنت کو لازم پکڑو (۱)۔

---

(۱) ابوداؤد وترمذی

یہ چار حضرات یکے بعد دیگرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضور ﷺ کے طریقہ کو پورے اخلاص وامانتداری کے ساتھ انجام دیتے رہے، اوراسطرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے بعد کے لئے یہ پیشین گوئی بھی پوری ہوئی کہ خلافتِ نبوت ۳۰ سال رہے گی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پہلے خلیفہ ہیں، دوسرے حضرت عمرؓ، تیسرے حضرت عثمانؓ، چوتھے حضرت علیؓ، حضرت علی کی شہادت کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے چھ ماہ نظام سنبھالا، بس پر تیس سال پورے ہوئے، انکی خلافت تک کے عہد کو خلافت راشدہ کا عہد قرار دیا گیا، اس پر ہجری تاریخ کے چالیس سال پورے ہوئے، شروع کے دس سال خود حضور ﷺ کے مدنی قیام میں نظام اسلام کے قیام اور تشکیل کے اور پھر تیس سال اس کی تابعداری میں اور نمایندگی میں گزرے، اس تیس سالہ مدت میں اسلام کا حلقہ عرب علاقہ سے نکل کر قرب وجوار کے ممالک میں پھیلتا اور وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا، حضور ﷺ کی وفات کے فوراً بعد مدینہ کے بعض قبائل عرب نے یہ سمجھ کر کہ حضور ﷺ کے نہ رہنے پر اب ان پر پابندی نہیں رہی روگردانی کرنا چاہی تو ان کو اسلام کے عقیدہ ونظام کی طرف واپس لایا گیا، اس بغاوت کا جو شر سامنے آیا تھا وہ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہدایت پر فوجی مہم کے ذریعہ ختم کر دیا گیا اور اسلام کا معیاری نظام بحسن وخوبی جاری رہا اور خلافت راشدہ کی اس تیس سالہ مدت میں اسلام کا حلقہ وسط ایشیا سے افریقہ تک پہونچ گیا۔

خلفاء راشدین کا یہ تیس سالہ دور وہ مثالی دور ہے جو ہر زمانہ میں صحیح اسلامی نظام کے لئے نمونہ اور رہنما دور ہے جس سے ہر اسلامی نظام کو رہنمائی لینا ہی اس کے اسلامی نظام ہونے کی تصدیق کی جا سکتی ہے(۱)۔

---

(۱) یہ تیس سالہ دور ماہ ربیع الاول ۱۱ھ سے شروع ہو کر ربیع الاول ۴۱ھ پر مکمل ہوا

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

یہ خلیفۂ اول ہیں اور یہ گھر کے باہر کے لوگوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے صحابی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت معتمد اور جان نثار صحابی ہیں، جب آپ ﷺ نے مدینہ منورہ ہجرت کا فیصلہ کیا تو رفاقت کے لیے انہی کا انتخاب کیا، منشائے نبوی ومزاج نبوی کو سمجھنے میں یہ سب سے ممتاز تھے، اپنی وفات سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی امامت ان سے کرائی، ساری زندگی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے اور ہر کام میں شریک، اسی لیے انھیں صحابہ کرام میں پہلے نمبر کا شخص سمجھا جاتا ہے، حضور ﷺ کی وفات کے بعد آپ کے قائم مقام اور خلیفہ ہوئے اور آئندہ کے لئے اسلام کی مضبوطی کا ذریعہ بنے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی ایک صاحبزادی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اپنے نکاح میں داخل فرمایا تھا اس طریقہ سے ان کی رفاقت اور تعاون کی قدر کا اظہار فرمایا، حضرت عائشہؓ چونکہ بہت کم سنی میں آپ کی رفاقت میں آگئیں اس لیے ان کا نشو ونما بھی آپ کی سرپرستی میں ہوا اور اہلیہ ہونے کی بنا پر آپ کے اندرون خانہ معاملات کی جاننے والی ہوئیں، جس سے بعد میں لوگوں کو بہت فیض حاصل ہوا۔

خلیفہ اول کی خلافت دو سال رہی، اس مدت میں آپ نے حضور ﷺ کے مزاج اور ہدایت کے عین مطابق نظامِ اجتماعی اور فرائض حکومت کو جمایا اور مضبوط کیا اور اس طریقہ سے اسلام کا یہ نظام اپنی بالکل صحیح پٹڑی پر جاری وساری رہا پھر اپنے انتقال کے آثار شروع ہو جانے کے وقت اپنے بعد کے لئے بہت سوچ سمجھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ طے کر دیا، جن کے نمبر دو ہونے کا ثبوت بعد میں پوری طرح ثابت ہوا اور انہوں نے اسلامی نظام کو اسی پٹڑی پر عظیم کارناموں کے ساتھ جاری وساری رکھا، اس کا سہرا بھی انہی کے انتخاب کی طرف جاتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد دوسرے درجہ پر حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا نام ہے، وہ شروع میں جب تک اسلام کو نہیں سمجھ پائے تھے اس کے سخت دشمن تھے اور سمجھنے کے بعد اس کے زبردست فدائی بن گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اور تعاون میں پوری طرح لگ گئے اور اسلام کے بڑے جانباز ووفادار سپاہی کی حیثیت سے لگے رہے، حتی کہ یہ حقیقت ظاہر ہوگئی کہ حضرت ابوبکرؓ کے بعد انہی کا مرتبہ ہے، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کے بعد خلیفہ ہوئے اور دس سال انہوں نے اسلام کی نمائندگی اور اسلامی نظام کو پھیلانے کی خدمت انجام دی، انہی کے دور میں عرب کے قرب وجوار کے کئی اہم ترین ممالک اسلامی نظام کے تابعدار بنے اور اسلام کا جھنڈا قریب کے کئی ملکوں میں لہرایا اور بیت المقدس جیسا متبرک شہر جہاں کے لوگ اسلام کے تابعدار اب تک نہیں ہوئے تھے، ان کے سامنے بخوشی تابعدار بنے اور شہر مسلمانوں کی حکومت کے حوالہ کر دیا، ان کی بھی ایک صاحبزادی کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے نکاح میں داخل کیا اور اس طریقہ سے ان کی خدمات کی قدر دانی کا اظہار کیا اور اسلام کے صحیح مزاج سے ان کی مطابقت کئی معاملات میں کھل کر سامنے آئی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں عظیم ترین فتوحات ہوئیں اور اعلیٰ نظم وضبط قائم ہوا اور نئے حالات کے سامنے آنے پر حضور ﷺ کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق آپ نے ان کو حل کیا، اس طریقہ سے انتشار کی صورت پیدا نہیں ہوئی اور اسلامی احکام اور حضور ﷺ کے قائم کئے ہوئے نظام کی مضبوطی کا ذریعہ بنے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ

تیسرے خلیفہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہوئے جو قدرے دولتمند

آدمی تھے، ایمان لانے کے بعد اپنی دولت کو زیادہ سے زیادہ اسلامی مقاصد میں صرف کرنے لگے اور اسلام کی تقویت کے لیے تن من دھن سے لگ گئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک صاجبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کو ان کی زوجیت میں دیا، ان کے انتقال کے بعد دوسری صاجبزادی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کو دیا، اس طرح ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دوہرا رشتہ حاصل ہوا اور ذوالنورین کا خطاب ملا، یعنی دو نورانیت حاصل کرنے والے، وہ حضور ﷺ کی ایک دادیہالی شاخ امیہ بن عبدشمس کی اولاد میں تھے، اور اپنے خاندان میں عالی مرتبت تھے، ان کے اسلام لانے سے اسلام کو تقویت ملی تھی، لیکن ان کے خاندان والوں نے اسلام لانے پر ان کو پریشان کیا، اور اتنا پریشان کیا کہ ان کو مکہ چھوڑ کر حبشہ دو بار ہجرت کرنی پڑی اور جب اسلام کو مضبوطی حاصل ہوگئی تو وہ حبشہ سے واپس آئے۔

اللہ تعالی نے ان کو بڑی خصوصیات اور خوبیاں عطا فرمائیں تھیں، غزوۂ تبوک میں غزوہ کے مصارف کے لئے بہت بھاری رقم کا تعاون دیا، ان کی صفات وخصوصیات میں شرم وحیا خاص طور پر بڑھی ہوئی تھی، جس کی خاص طور پر اظہار قدردانی حضور ﷺ نے فرمائی، ان کو اپنے زمانۂ خلافت میں بعض معترضین کی طرف سے بڑی اذیت پہونچی اور ان کے مخالفوں نے ان پر حملہ کر کے شہید بھی کر دیا، یہ سنگین واقعہ ۳۵ھ کا ہے، ۸۲ سال عمر ہوئی، یہ شہید کئے جانے والے دوسرے خلیفہ ہیں، ان کی شہادت کے واقعہ سے اسلامی حکومت میں بڑا اضطراب پیدا ہوا، جو مختلف پریشانیوں کا سبب بنا، ان کی خصوصیت میں حضور ﷺ نے فرمایا: "لكل نبي رفيق ورفيقي عثمان" یعنی ہر نبی کا ایک ساتھی ہوتا ہے اور میرے ساتھی عثمان ہوں گے (۱)۔

---

(۱) سنن ترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب عثمان رضی اللہ عنہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت علی بن اَبی طالب رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے، جو ابوطالب کے بیٹے ہونے کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی بھی تھے اور حضور ﷺ کو نبوت ملنے سے پہلے ہی ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا سے لے کر اپنے ساتھ کرلیا تھا، اس طرح وہ بچپن سے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے، ان کی عمر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تیس سال کم تھی، لہٰذا عمر کے لحاظ سے آپ ﷺ کے لڑکے کی طرح تھے، آپ ﷺ نے ان کے جوان ہونے پر اپنی صاحبزادی کو ان کے نکاح میں دے دیا، یہ صاحبزادی حضرت فاطمہ زہراؓ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بہت محبوب صاحبزادی تھیں اور زندگی بھر آپ ﷺ کے ہمراہ اور قریب رہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد نواسے اور نواسیوں کی صورت میں انہی سے چلی، حضرت حسن اور حضرت حسین ان کے بیٹے تھے جو گھر سے گھر ملا ہونے کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیٹے اور پوتوں کی طرح رہے، اس طرح ان کو آپ ﷺ کی بڑی شفقت ملی، حضرت علی رضی اللہ عنہ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے بچپنے ہی سے تا حیات رہے اس لیے انہوں نے آپ ﷺ سے بہت کچھ بلکہ سب سے زیادہ سیکھا اور آپ کی تربیت پائی جس سے دوسروں کو فیض پہونچا۔

حضور ﷺ کی وفات کے بعد آپ سے قریب تر رہنے اور آپ کی خصوصی تربیت پانے کی وجہ سے بعض لوگوں کا خیال ہوا کہ آپ کے بعد یہی خلیفہ ہوں گے، لیکن حضور ﷺ کے دوسرے قریب ترین رفیق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ۲۸ سال چھوٹے ہونے کی بنا پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ زیادہ ترجیح رکھتے تھے اور حضور ﷺ کی خصوصی رفاقت کی وجہ سے زیادہ مزاجی توافق رکھنے والے تھے، لہٰذا پہلی خلافت

کے لئے ان کا انتخاب ہوا اور خلیفۂ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہوئے، وہ بھی حضرت علی سے ۱۷ سال بڑے تھے، اسلام کے تیسرے خلیفہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہوئے، وہ بھی حضرت علی سے عمر میں بڑے تھے، ان کی شہادت کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خلافت کے لئے انتخاب ہوا، حضور ﷺ سے قریب تر زندگی گزارنے کی وجہ سے علم وحکمت، شجاعت اور دینی خصوصیات میں بڑے ممتاز تھے، جہاد میں اپنے کو آگے رکھنے کی کوشش کرنے والے تھے اور کئی بار غیر معمولی بہادری کا ثبوت دیا، حضرت عثمان کے بعد مملکت اسلامی میں جو اضطرابی حالات پیش آئے وہ ان کے خلیفہ ہونے کے زمانہ میں پیش آنے پر ان کو ان حالات کا سخت مقابلہ کرنا پڑا اور آخر میں ان کو اپنے سابق خلیفہ کی طرح شہید کر دیا گیا، یہ رمضان ۴۰ ھ کا سانحہ ہے۔

حضرت عبد الرحمٰن بن عوف

شروع سے اسلام میں داخل ہوئے، اور وہ کامیاب تاجر تھے، اس لیے وہ دولت مند تھے، انہوں نے اپنی دولت کے ذریعہ اور تن من دھن سے اسلام کی تقویت کا کام کیا، وہ ان دس صحابہ میں ہیں جن کو جنت کی بشارت ملی اور ان کو صحابۂ کرام کی ممتاز شخصیتوں میں مقام ملا، حبشہ کی طرف دوبار ہجرت کی، بدر واحد اور دیگر غزوات میں دلیرانہ شرکت کی، غزوۂ تبوک میں ایک نماز حضور ﷺ نے ان کے پیچھے ادا کی، ۳۲ ھ میں مدینہ طیبہ میں وفات پائی اور بقیع میں مدفون ہوئے۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ

حضرت طلحہ بن عبید اللہ بن عثمان التیمی نام ہے، بدر واحد اور دوسرے غزوات ومعرکوں میں شریک ہوئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اور حضرت ابوایوب انصاری کے درمیان مواخات کرائی تھی۔ احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی

طرف مشرکین کو بڑھتے دیکھا تو خود آگے آگئے، جس کی وجہ سے ان کو ضربیں آئیں، ۳۶ھ میں شہادت پائی۔ زندگی اسلام کی وفاداری اور حضور علیہ کی اطاعت میں گزاری ایسی گزاری کہ ان کو بھی دس جنتیوں کی بشارت میں بشارت حاصل ہوئی۔

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ

حضرت زبیر بن العوام بن خویلد الأسدی عمائدین صحابہ میں تھے، اور حضور علیہ کی اولوالعز مانہ اوصاف کی حامل پھوپھی حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے تھے، حضرت اسماء بن أبی بکرالصدیق ان کی زوجیت میں تھیں، ان کے صاجبزادگان میں حضرت عبداللہ بن زبیر کو صحابیت کا شرف حاصل ہے، ۳۶ھ میں شہادت پائی۔ حضور علیہ نے حضرت زبیر کو اپنا حواری قرار دیا تھا اور جن دس صحابہ کے جنتی ہونے کی بشارت دی ان میں ان کا نام بھی لیا۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ

حضرت ابوعبیدہ بن الجراح کا نام عامر بن عبداللہ بن الجراح الفہری ہے، حضرت ابوبکر کی کوشش سے مشرف باسلام ہوئے، سبھی غزوات ومعرکوں میں شریک ہوئے، شام کا بڑا علاقہ ان کے ذریعہ فتح ہوا، شام میں ہی امیر تھے اسی زمانہ میں ۱۸ھ کو وفات پائی۔ یہ بھی دس بشارت یافتہ جنتیوں میں ہیں۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نانیہالی خاندان سے تعلق تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ کا بڑا خیال فرماتے تھے، ایران کے خلاف جنگ میں قائد بھی رہے اور یہ بھی دس بشارت یافتہ جنتیوں میں ہیں۔

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ

جلیل القدر صحابی ہیں، سابقین اولین میں ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بہنوئی تھے، ان سے ہی متاثر ہو کر حضرت عمر نے اسلام لانے کا ارادہ ظاہر کیا، ان کو بھی جنت کی بشارت ملی اور ان کے نام پر عشرہ مبشرہ جنتیوں کی تعداد پوری ہوتی ہے(۱)۔

دیگر چند اہم صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم

حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا کی اولاد میں دو حضرات کو اسلام لانے کا اعزاز حاصل ہوا، ان میں ایک حضرت حمزہ ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبوت ملنے کے وقت جوان اور صاحب عزیمت شخصیت کے مالک تھے اور ان کے خاندانی مرتبہ اور ان کے ہمت و عزیمت کا مکہ میں چرچا تھا اور یہ چیز ان کے رعب وداب کا باعث تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھتیجہ ہونے کے رشتہ سے ہمدردی رکھتے تھے، چنانچہ ایک موقع پر ابو جہل جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا مخالف شخص تھا اور اس کو خاندان قریش میں معزز اور با اثر مقام بھی حاصل تھا، اس نے آپ ﷺ کو بہت ایذاء پہونچائی اور تکلیف دی، حضرت حمزہؓ شکار سے واپس آ رہے تھے تو ان کو اس بات کا پتہ چلا ان کو غصہ آیا، انہوں نے ابو جہل کی خبر لی اور چیلنج کیا اور اسی جوش و ہمدردی میں اسلام بھی قبول کر لیا اور اپنے اسلام کا اعلان کر دیا، جن کے اثر سے حضور صلی اللہ

---

(۱) خلفاء راشدین اور عشرہ مبشرہ کے حالات وفضائل کے لئے ملاحظہ کریں: جامع ترمذی کتاب المناقب، طبقات ابن سعد، اُسد الغابہ، تذکرۃ الحفاظ، سیر اعلام النبلاء، کتاب الریاض النضرۃ، سبل الھدی والرشاد فی سیرۃ خیر العباد جلد ۱۱، حیاۃ الصحابہ، تاریخ طبری جلد سوم، البدایۃ والنھایۃ، الکامل فی التاریخ۔

علیہ وسلم کوتقویت حاصل ہوئی، اس کے بعد سے حضرت حمزہؓ برابر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک رہے، اور مدد وتعاون کرتے رہے، غزوۂ احد میں دھوکہ دے کر ان کوشہید کیا گیا جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑے رنج وخسارہ کا احساس ہوا، اور اپنے محبت اور ہمدردی کرنے والے عزیز وقریب شخصیت کی کمی محسوس کی۔

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ ایک عظیم المرتبت صحابی الرسول ﷺ تھے، وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لائے اور اس کے نتیجہ میں ان کو اپنی پرعیش زندگی کو خیر باد کہنا پڑا اور اپنا وہ اعلی لباس اور اعلی طعام جوان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ ہونے کی صورت میں حاصل تھا، ایمان اختیار کر لینے پر اپنے ماں باپ سے جدا ہونا پڑا اور جدائی کی صورت میں اپنی راحت کا سب سامان چھوڑنا پڑا، اور سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ساتھ پوری محبت اور فدائیت کے ساتھ ہو گئے اور جب مدینہ میں ایمان کی فضاء قائم ہونے لگی اور وہاں دینی تعلیم کی ضرورت محسوس کی گئی تو حضور ﷺ نے آپ ہی کو وہاں معلم اور داعی بنا کر بھیجا، انہوں نے تعمیل حکم کی اور وہاں جا کر حکمت ومحنت کے ساتھ دعوتی کام انجام دیا حتی کہ سال بھر کے اندر اکثر اہل مدینہ جوق در جوق اسلام میں داخل ہو گئے اور وہ اپنے اس کارنامہ اور ایمان وزہد کے ساتھ اپنے اوقات گزارتے ہوئے غزوۂ احد میں مجاہد کی حیثیت سے شریک ہوئے اور اس میں شہید ہوئے، اس وقت بھی ان کی دنیاوی بے بضاعتی کا یہ حال تھا کہ کفن تک کے لئے ان کے پاس پورا کپڑا نہ تھا، صرف ایک کمبل تھا کہ سر چھپایا جاتا تو پیر کھل جاتے، پیر چھپائے جاتے تو سر کھل جاتا، حضور ﷺ نے فرمایا کہ سر ڈھکو اور پیروں کو درخت کے پتوں سے چھپاؤ اور بہت تاثر اور تعلق خاطر سے ان کے ایمان اور فدائیت پر بڑے قدر کے الفاظ کہے۔

حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ

چچاؤں میں دوسرے چچا تھے جنہوں نے اسلام قبول کیا، البتہ ایک عرصہ تک اسلام قبول نہیں کیا تھا، لیکن مخفی طریقہ سے ہمدردی اور تعاون برابر کرتے رہے، اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف دشمنوں کی جو کارروائیاں ہوتی تھیں ان کا غیر جانبدارانہ انداز سے تدارک کرتے تھے، آخر میں جب مکہ کے ماحول سے ان کو جو خطرات محسوس ہوتے رہے تھے ان خطرات کے کمزور ہو جانے پر اپنے اسلام کا کھل کر اظہار کر دیا، ان سے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تقویت پہونچی، آپ کے بیٹوں کو بھی اسلام کی دولت نصیب ہوئی جن میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو اونچا مقام حاصل ہوا، جن کو قرابت خاندانی کے ذریعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا قرب رہا جو ایک خاندانی خورد کو اپنے بڑے عزیز سے ہوتا ہے، ان کی نسل میں اللہ تعالی نے بڑی برکت دی، جن میں بعض سے علم و دین کی بڑی اشاعت ہوئی اور طویل المدتی اقتدار ان کی نسل کو حاصل ہوا، ۳۲ھ میں وفات پائی۔

حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

حضور ﷺ کے چچا ابو طالب جو اپنی زندگی بھر باوجود اسلام نہ لانے کے آپ کی بھرپور حمایت کرتے رہے تھے اور مکہ میں آپ کی ایک طرح سے حفاظت کا ذریعہ تھے، ان کی وجہ سے آپ کو نبوت ملنے کے دس سال تک بڑی مدد ملتی رہی اور وہ دشمنوں کی ایذاءرسانی میں اپنی حد تک حائل ہوتے رہے، وہ اگرچہ اسلام نہیں لائے، لیکن ان کے کئی صاحبزادگان اسلام لائے جن میں خاص طور پر حضرت علی اور حضرت جعفرؓ اور حضرت عقیلؓ قابل ذکر ہیں۔

حضرت جعفر بن ابی طالب نے ان مسلمانوں کی نمائندگی اور قیادت کی تھی

جو حبشہ ہجرت کر کے گئے تھے اور وہاں کے بادشاہ نجاشی سے بہت مؤثر گفتگو کر کے وہاں کے بادشاہ کی حمایت حاصل کی تھی، حضرت جعفر کی تقریر بڑی مؤثر اور اسلام کی بہترین ترجمانی کرنے والی تقریر تھی، دین کے لئے بڑی قربانیاں دیں، غزوۂ موتہ (۸ھ) میں مسلمانوں کی قیادت کرتے ہوئے شہادت پائی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت عزیز تھے، ان کی وفات کا بھی آپؐ پر بڑا اثر پڑا اور آپؐ نے انہیں طیار خطاب دیا اور ان کے لیے ایک موقع پر فرمایا "أشبهت خَلقي و خُلقي"۔ یعنی صورت وسیرت میں تم مجھ سے مشابہ ہو، عمر میں حضرت علی سے بڑے تھے، چالیس سال سے زیادہ عمر پائی، ان کی غریب پروری کی وجہ سے انہیں "ابوالمساکین" خطاب دیا گیا اور معرکہ میں دونوں ہاتھ کٹ جانے کی وجہ سے "ذوالجناحین" کا خطاب ملا، حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں نے جعفر کو فرشتوں کے ساتھ جنت میں پرواز کرتے دیکھا ہے(۱)۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اسلام لانے والوں میں حضرت سلمان فارسی کے اسلام لانے کا واقعہ بڑا اہم ہے، وہ ایرانی تھے، لیکن ان میں صحیح مذہبی شخصیت کی تلاش تھی، اس تلاش میں وہ کئی عیسائی علماء اور بزرگوں کے یہاں یکے بعد دیگرے رہے، لیکن ان کو اچھا تجربہ نہیں ہوا اور آخر میں مکہ میں پہنچ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور اسلام لائے اور پھر برابر اسلام کی تقویت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعاون میں شریک رہے اور اسلام کے دفاع میں بعض بہترین تجاویز پیش کیں جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا۔ غزوہ خندق میں خندق کھودنے کی تجویز بھی انہی کی تھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی بڑی قدر فرمائی اور فرمایا: "سلمان منا أهل البيت"۔ مدائن میں ۳۶ھ میں انتقال فرمایا۔

---

(۱) ترمذی، کتاب المناقب

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ

اسلام کی دعوت جب مدینہ طیبہ پہونچی اور وہاں کے کئی ذمہ دار اسلام میں داخل ہوئے، ان میں مدینہ کے دو اہم قبیلوں کے سردار حضرت سعد بن معاذ جو قبیلہ اوس کے سردار تھے اور قبیلہ کے بڑے ذمہ دار و با اثر تھے، اسلام میں داخل ہوئے، اسی طرح حضرت سعد بن عبادۃ جو قبیلہ خزرج کے سردار اور باثر ذمہ دار تھے، اسلام میں داخل ہوئے، ان دونوں کے اثر سے دونوں قبیلہ کے اکثر لوگ اسلام میں داخل ہوگئے، اس طرح گویا مدینے کی اکثر آبادی اسلام کی فرمانبردار ہوگئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وہاں منتقل ہونے کی دعوت دی اور اسی دعوت پر آپ ﷺ نے مدینہ طیبہ کو اپنا مرکز بنایا اور ان دونوں قبیلوں کے افراد نے مکمل وفاداری اور مکمل تابعداری کا ثبوت دیا اور مکہ سے آنے والے مسلمانوں کو اپنے حقیقی بھائیوں کی طرح مہمان بنالیا ان حضرات نے اسلام میں داخل ہونے کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے ایک صحابی کو مدینہ بلوایا، وہ حضرت مصعب بن عمیر تھے، جن کا اسلام کے وسیع طریقہ سے پھیلنے میں بڑا دخل تھا، مدینہ کے اُسید بن حضیر، اسد بن زرارہ نے بڑی مدد دی، اور حکمت اختیار کر کے حضرت مصعب بن عمیر کی کامیابی میں مدد دی، جس کے نتیجہ میں تقریباً پورا مدینہ اسلام کا حامی اور محافظ بن گیا، اور حضرت سعد بن معاذ اور حضرت سعد بن عبادہ نے اپنے اپنے سربراہِ قبیلہ ہونے کی بنیاد پر اسلام اور مسلمانوں کو پورا تعاون دیا۔ حضرت سعد بن معاذ حضور ﷺ پر ایمان لانے کے بعد پوری فدائیت کے ساتھ اسلام کی نصرت اور رسول اللہ ﷺ کی محبت کا حق ادا کرتے رہے۔

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ

قبیلۂ اوس اور قبیلۂ خزرج مدینہ منورہ کے بڑے قبیلے تھے، ان میں قبیلۂ

خزرج زیادہ بڑا قبیلہ تھا، قبیلۂ اوس اگرچہ قبیلۂ خزرج سے چھوٹا تھا، لیکن تقریباً اسی کی ٹکر کا قبیلہ تھا، یہ دونوں ملکر مدینہ کے اصل اور بڑی تعداد کے باشندے تھے، حضرت سعد بن عبادہ قبیلۂ خزرج کے سردار تھے، اس قبیلہ کے ایک بڑے سردار عبداللہ بن ابی بن سلول تھے، اسلام کے مدینہ پہونچنے کے وقت ان کی بڑی اہمیت تھی اور وہ حضور ﷺ پر دل سے ایمان نہیں لائے تھے، ان کی طرف سے حضور ﷺ سے دوری اور اندر سے مخالفت اور خفیہ ریشہ دوانی کے باوجود حضرت سعد بن عبادہ نے حضور ﷺ سے گہرا تعلق رکھا اور اپنے بڑے سردار سے متاثر نہیں ہوئے اور اسلام سے پوری وفاداری کا ثبوت دیا۔

حضرت اُسید بن حضیر رضی اللہ عنہ

اسید بن حضیر قبیلہ اوس کے سردار تھے، جس کے بڑے سردار حضرت سعد بن معاذ تھے، حضرت سعد بن معاذ کے اسلام لانے میں ان کی کوشش کا بڑا حصہ ہے، حضرت اسعد بن زرارہ کا بھی بڑا تعاون رہا اور یہ سب حضرات اسلام کے ایسے حامی بنے کہ مسلمانوں کو مدینہ میں اپنا کامیاب محاذ بنانے میں بڑی مدد ملی۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ

جندب بن جنادہ نام تھا اور قبیلۂ غفار کے فرد تھے، رسالت مآب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر سن کر مکہ مکرمہ آئے اور آپ ﷺ سے مل کر مطمئن ہوئے اور ایمان لائے، پھر اپنے قبیلہ میں اور اپنے پڑوس کے قبیلہ اسلم میں کوشش کر کے ان کو اسلام کی دعوت دی اور ان کو اسلام میں داخل کیا اور برابر اسلام کی دعوت کا کام کرتے رہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تعاون دیتے رہے، انہوں نے زہد وتقشّف کی زندگی کو ترجیح دی اور ہمیشہ دولت سے گریز کرتے رہے، قناعت اور بقدر کفاف پر

گزارا کیا اور زاہدانہ زندگی کی ایسی اعلیٰ مثال پیش کی جو آپ کی پہچان بن گئی، آخر میں گوشہ نشین ہو گئے تھے۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ

عویمر بن ساعدہ نام ہے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اختیار کی اور دین کا بڑا علم حاصل کیا، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دین کے معلم، محدث، فقیہ کی حیثیت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں شام بھیج دیا تھا، وہاں انہوں نے دین کا علم خوب پھیلایا۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ

مشہور صحابہ میں ہوئے، ابوعبدالرحمٰن کنیت ہے، خزرجی ہیں، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے ہوئے دین کا بہت علم حاصل کیا، یہاں تک کہ حرام وحلال کے سلسلہ میں صحابہ میں سب سے بڑے عالم کہے گئے اور اس سلسلہ میں ان کو مرجعیت ملی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف موقعوں پر انہیں دینی مسائل سے واقف کرایا، جس کو انہوں نے بعد کے لوگوں کو اس سے روشناس کیا اور علم پھیلایا، ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ''مجھے تم سے محبت ہے''۔ انہیں تعلیم دین اور ہدایت کے کام کے لئے یمن بھیجا تھا، جہاں سے وہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد مدینہ آئے اور پھر شام جا کر تعلیم ودعوت کا کام کیا اور وہیں ۱۵ھ میں وفات پائی۔

حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو صحابہ بہت قریب تر تھے اور جن سے آپ ﷺ راز کی باتیں بھی فرمایا کرتے، ان میں حضرت حذیفہ کو امتیازی مقام حاصل رہا، اسی لیے آپ کو ''صاحب سر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' کا خطاب ملا،

منافقین کی نشاندہی اور قیامت تک پیش آنے والے مصائب اور پیشین گوئیوں کا علم خصوصیت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا۔ حضرت عثمان کی شہادت کے واقعہ کے کچھ ہی دنوں بعد وفات پا گئے۔

حضرت خباب رضی اللہ عنہ

حضرت خباب بن الأرت بھی مشہور صحابہ میں تھے اور شروع ہی سے اسلام میں داخل ہوئے اور کفار کی طرف سے بہت ایذا رسانی برداشت کی، دہکتے انگاروں پر لٹائے گئے اور سینہ پر پتھر رکھا گیا تاکہ ہل نہ سکیں، مگر سب کچھ سہا اور اپنے عقیدہ و دین پر مضبوطی سے قائم رہے اور اللہ کے لیے دین کے لیے بڑی عزیمت کا ثبوت دیا۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ

حضرت بلال بن رباح نے بھی دین کے خاطر بڑی اذیتیں اٹھائیں، حبشہ کے رہنے والے تھے اور مکہ کے ایک سردار کے غلام تھے، شروع میں اسلام لائے، اس پر ان کو ان کے سردار نے بڑی اذیت دی، زمین پر انہیں لٹا کر گرم پتھر ان پر رکھتا اور ان سے پھرنے کو کہتا، وہ احد احد کہے جاتے، یہاں تک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں اس سے خرید لیا پھر آزاد کر دیا، یہ برابر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لگے رہے اور جب نماز کے لیے اذان مقرر کی گئی تو وہی اذان دیتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو موذن بنایا اور آخر تک وہ موذن رہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت انجام دیتے رہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مدینہ میں رہنے کی انہیں ہمت نہ ہوئی اور وہ دوسری جگہ نکل گئے۔

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ

جلیل القدر صحابی ہیں، بنی اسرائیل کے فرد ہیں، یہودی المذہب تھے اور

بڑے علمائے یہود میں شمار کئے جاتے تھے، ایمان لائے تو اسلام میں بھی ان کا درجہ بلند ہوا اور یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وشهد شاهد من بني إسرائيل علی مثله فآمن﴾ [سورہ احقاف:۱۰]

اور بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ اسی طرح کی ایک (کتاب) کی گواہی دے چکا اور ایمان لے آیا۔

چنانچہ یہ بڑے علمائے اسلام میں بھی ہوئے، جنت کی بشارت حضور ﷺ نے دی، قوم یہود ان کی بڑی قائل اور ان کے فضل وکمال کی بڑی معترف تھی، لیکن ان کے ایمان لاتے ہی ان کی دشمن ہوگئی، البتہ ان کا اپنا گھر ایمان لے آیا۔

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ

حضرت صہیب بن سنان بھی مشہور صحابی ہیں، روم کے علاقہ کے تھے، دار ارقم میں حاضر ہو کر ایمان لے آئے اور انہوں نے اسلام لانے کے بعد اسلام کو اپنی بہادری اور سپاہیانہ صلاحیت سے فائدہ پہونچایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخلص اور مطیع اور کارگزار صحابی رہے، مشرکین مکہ نے انہیں بڑی اذیتیں دیں، ہجرت کرنے لگے تو وہ لوگ آڑے آئے، مگر یہ کہا کہ اگر تم اپنا سارا مال ومتاع چھوڑ دو تو جا سکتے ہو، انہوں نے سب کچھ قربان کر دیا اور ہجرت کر گئے، اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: ''ربح صہیب، ربح صہیب'' کہ صہیب خوب نفع میں رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کی خوبیوں کے بڑے قائل تھے اور نماز جنازہ کے لیے انہی کے لیے وصیت فرمائی تھی۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ

حضرت زید بن حارثہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آزاد کردہ غلام اور مشہور صحابی گزرے ہیں، وہ غلام کی حیثیت سے آپ ﷺ کی اہلیہ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے پاس تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زوجیت کا تعلق

ہونے کے بعدانہوں نے آپ کو دے دیا تھا،آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کوآزاد کرکے بیٹے کی طرح قرار دیا،ان کے باپ عرصہ سے ان کی تلاش میں تھے،انہوں نے چاہا کہ ان کا یہ بیٹا ان کو مل جائے،حضورﷺ تیار ہو گئے،مگر حضرت زید باپ کے ساتھ جانے پر تیار نہ ہوئے اور آپ کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی،آپ بھی ان سے بیٹے کی طرح پیش آتے،اس کی وجہ سے ان کو زید بن محمد بھی کہا جانے لگا تھا،مگر وحی کے ذریعہ حکم ملا کہ کسی کو بیٹا بنا لینے سے بیٹا نہیں بنتا،لہٰذا وہ زید بن حارثہ کہے جانے لگے۔

آپﷺ نے ان کا بڑا خیال رکھا اور بعد میں اپنی پھوپھی کی لڑکی سے ان کی شادی کردی جو نبھ نہ سکی اور دونوں میں علیٰحدگی ہوگئی،تو آپﷺ نے اپنی پھوپھی کی صاحبزادی کی دلداری کے لیے اپنی زوجیت میں لے لیا،لیکن حضرت زید کے ساتھ اچھا برتاؤ ہی کرتے رہے،ان کے بیٹے حضرت اُسامہ تھے،حضورﷺ ان کے ساتھ اولاد کی طرح محبت وشفقت کا معاملہ کرتے تھے اور ان کو ایک غزوہ میں بڑے بڑے صحابہ کے باوجود فوج کا سربراہ بنایا۔

حضرت ارقم بن اَبی الارقم رضی اللہ عنہ

حضرت ارقم بن ابی الارقم قریش کے مشہور قبیلہ بنی مخزوم کے فرد تھے،اس شاخ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شدید مخالفین تھے،لیکن حضرت ارقم اسلام لے آئے اور پھر اپنے گھر کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے صحابہ سے ملنے اور دینی رہنمائی کے لیے ایک پوشیدہ مقام کی حیثیت سے سپرد کردیا تھا،اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ سے ملتے اور مذاکرہ کرتے،حضرت عمر بھی وہیں جاکر اسلام لائے،حضرت ارقم بن ابی الارقم نے اس طرح اسلام کی تقویت اور مدد کا ثبوت دیا اور ان کے گھر کا نام دارارقم کے نام سے آج بھی معروف ہے۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ

حضرت عمرو بن العاص بڑی سوجھ بوجھ حکمت عملی میں ممتاز سمجھے جاتے تھے، قریش کی طرف سے اسلام کی مخالفت میں لگے رہے اور جب مسلمان حبشہ ہجرت کرنے لگے تو ان کو پکڑ کر لانے کے لیے بھیجے گئے تھے کہ حبشہ کے بادشاہ سے بات کر کے پکڑ کے لائیں، وہ اسلام کی مخالفت میں رہے، لیکن صلح حدیبیہ کے بعد ان کو اسلام کے متعلق اطمینان حاصل ہوا اور حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر ایمان لے آئے اور پھر اپنی صلاحیتیں اسلام کی خدمت میں لگا دیں اور بڑی مفید خدمات انجام دیں، حضرت عمر کے دور میں مصر کی فتح کا کارنامہ انجام دیا۔ اور مصر میں ۵۰ھ کے آس پاس وفات پائی۔

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ

سابقین اولین میں ہیں، قحطانی الاصل ہیں، انہیں بھی مشرکین مکہ نے بڑی اذیتیں دیں، جس سے ان کی پشت پر سیاہ داغ پڑ گئے تھے، جو آخر تک رہے، اسی طرح آپ کے والد حضرت یاسر اور والدہ حضرت سمیہ تو اسلام کی پہلی شہید خاتون تھیں، حضور ﷺ ان کی تکلیفوں کو دیکھ کر فرمایا کرتے: ''اے اہل یاسر صبر کرو'' اور کبھی فرماتے ''تم کو بشارت ہو جنت تمہاری مشتاق ہے''، حضرت عمار کو شہادت کی بشارت حضور ﷺ نے سنائی تھی، جنگ صفین میں شہادت پائی۔

حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ

حضرت خالد بن الولید قریش کے شہسواروں میں تھے اور فوجی قیادت کا کام بھی ان کے سپرد کیا جاتا تھا اور مسلمانوں کی جو جنگیں کافروں سے ہوئیں ان میں وہ

مسلمانوں کے خلاف شریک رہے، انہوں نے خاص طور پر غزوۂ احد میں اپنی مخالفانہ حکمت عملی سے بہت نقصان پہونچایا، لیکن صلح حدیبیہ کے بعد حضرت عمرو بن العاص کے ساتھ وہ بھی اسلام سے مطمئن ہوکر مدینہ آکر مسلمان ہوگئے اور پھر اپنی سپہ سالاری اور فوجی قیادت پوری بہادری کے ساتھ صرف کرتے رہے، یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی کارگزاری سے خوش ہوکر سیف اللہ کا خطاب دیا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی ان کو جنگی مہمات میں خصوصی امتیاز حاصل رہا اور بڑی کامیابیاں حاصل کیں، ان کی قیادت میں شام بھی فتح ہوا، یہ بھی قبیلۂ مخزوم کے فرد تھے، جس کے کئی لوگوں کی اسلام سے عداوت مشہور رہی۔ حضرت عمر کے زمانہ خلافت میں حمص میں (شام) میں ۲۱ھ میں وفات پائی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ان جلیل القدر صحابہ میں ہیں جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کی سعادت ملی، اس لیے سب سے زیادہ حدیثیں بھی انہی سے مروی ہیں، اللہ نے ان کو حفظ وبیان کی اعلیٰ درجہ کی صلاحیت عطا فرمائی تھی، ان کی یہ صلاحیت دین وشریعت کے تحفظ میں بڑی کام آئی۔ اچھی عمر پائی، زمانہ کے بڑے نشیب وفراز دیکھے اور امت کی رہنمائی کا کام انجام دیا۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ ان چار مشہور صحابہ میں سے ہیں جن کو قرآن مجید کا علم خصوصی طور پر عطا ہوا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حضرات سے قرآن مجید سیکھنے کو فرمایا تھا، انصار کے قبیلۂ خزرج سے ہیں، حضور ﷺ نے ان سے فرمایا تھا کہ اللہ تعالی نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں قرآن مجید سناؤں، حضور ﷺ نے

ان کو سید الانصار کا خطاب دیا تھا، مدینہ طیبہ میں ۱۹ھ میں وفات پائی۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ

حضرت ابوموسیٰ اشعری کا نام عبداللہ بن قیس ہے، قبیلہٗ اشعر کے فرد تھے، مکہ میں اسلام لائے اور اسلام قبول کرنے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا ساتھ دیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اعتماد حاصل کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت اسلامیہ کی طرف سے دی گئی ذمہ داریوں کو بخوبی انجام دیا اور وہ معروف صحابہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ حبشہ ہجرت کی تھی، پھر وہاں سے مدینہ حاضر ہوئے تھے، مکہ معظمہ میں ۵۲ھ میں وفات پائی۔

حضرت ابوسفیان ومعاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما

صخر بن حرب بن امیہ نام ہے، قریش کے ان سرداروں میں تھے جن کے ذمہ جنگوں میں قیادت سپرد کی جاتی تھی، چنانچہ مسلمانوں سے قریش کی جنگوں میں انہوں نے بڑی قیادت کی، وہ قریش کی شاخ بنی امیہ میں تھے، جس میں تیسرے خلیفہٗ راشد حضرت عثمان بن عفان بھی تھے اور بنی امیہ کی شاخ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا کی چچازاد شاخ تھی اس طریقہ سے مزید قریبی قرابت بھی تھی، لیکن قریش کے جنگی قائد ہونے کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے خلاف قیادت کرتے رہے، اور فتح مکہ کے موقع پر مسلمانوں کے مکہ پہونچنے سے پہلے وہ اسلام لے آئے، اور پھر اسلام کے وفادار رہے، اور مخلص صحابی کی حیثیت سے زندگی گزاری، ان کے صاجبزادے حضرت معاویہ بن ابی سفیان تھے۔

حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما خلافت راشدہ کے بعد خلیفہ ہوئے اور بنی امیہ کا دور حکومت وخلافت ان سے شروع ہوا، انہوں نے بہت حکمت عملی اور سیاسی

سوجھ بوجھ کے ساتھ حکومت کی اور اسلامی عظمت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی، ان کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں شام کا گورنر بنایا تھا جہاں انہوں نے اپنی ذمہ داری اچھے انداز سے پوری کی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان میں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں اختلاف ہوا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات تک قائم رہا۔

چند کم عمر صحابہ

کم عمر صحابہ میں جن کو بچپن سے اسلام میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی حاصل ہوئی، ان کی بھی ایک اچھی تعداد ہے، ان میں جن کو بعد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی رہنمائی اور تربیت کے نتیجہ میں دین کا جو فہم حاصل ہوا اس میں انہوں نے دوسروں کو بہت فائدہ پہونچایا اور اس وقت جو دین کی معلومات کا جو سرمایہ ہے ان کے حصول میں خاص طور پر ذریعہ بنے، ان میں خاص طور پر حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت انس بن مالک اور حضرت اُسامہ بن زید اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلق رہا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ

ان میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما گرچہ چچازاد بھائی تھے، مگر ایک طرح سے اولاد کے مثل تھے، ان کی خالہ ام المؤمنین حضرت میمونہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں تھیں اور انہیں اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بار بار حاضر ہونے کا موقع ملتا رہتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر خوش ہوکر یہ دعا دی تھی کہ " اللّٰهُمَّ عَلِّمه الحِكمَة " (۱) چنانچہ وہ جماعت صحابہ میں اس

---

(۱) سنن ترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب عبداللہ بن عباس۔

وصف میں ممتاز ہوئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے مشورہ لیتے اور ان کو بعض اکابر صحابہ پر اس سلسلہ میں فوقیت دیتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ان صحابہ کرام میں سے ایک ہیں جنہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قرب واعتماد حاصل ہوا، ان کی بہن ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا تھیں، ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ان بھائی کی تعریف بھی فرمائی تھی اور صالح فرد کہا تھا، وہ علم وتفقہ میں بھی ایک مقام رکھتے تھے، اس میں ان سے بعض صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت نے استفادہ بھی کیا، حضرت نافع استاد امام مالک ان کے خاص شاگرد ہیں۔ مکہ معظمہ میں ۷۳ھ کو ۸۶ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

کم عمری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول کر کے آپ پر مر مٹے، طرز عمل، طور وطریق، اخلاق وکردار میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑے قریب تر تھے اور علم وتفقہ میں بھی بہت بڑھے ہوئے تھے، فقہ حنفی کا بڑا مرجع ان کا علم وفقہ ہے۔ ۳۲ھ میں جبکہ آپ کی عمر ۶۰ سال سے زائد تھی وفات پائی، سابقین اولین میں ہیں۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ

انس بن مالک بن النضر نام ہے، حضور ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو یہ اس وقت دس سال کے تھے، خدمت گزاری کے لئے پیش کئے گئے، چنانچہ دس سال حضور ﷺ کی خدمت کی اور اس پوری مدت میں حضور ﷺ نے انہیں کبھی سخت سست نہیں کہا، بلکہ اخلاق وسلوک ہی برتا اور بڑی دعائیں دیں، جس کے اثرات وہ پوری

عمر محسوس کرتے رہے، سوسال سے زائد عمر پائی، بصرہ میں ۹۱ھ میں انتقال کیا۔

حضرت حسن وحضرت حسین رضی اللہ عنہما

یہ دونوں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بڑے چہیتے نواسے ہیں، جن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ صرف اونچی توقعات تھیں بلکہ ان کے سلسلہ میں بشارت کے جملے بھی سنائے اور فرمایا کہ " الحسن والحسین سیدا شباب أهل الجنة" کہ یہ نوجوانان جنت کے سردار ہوں گے، ان دونوں کو آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مشابہت بھی تھی اور حضور ﷺ سے یہ فرماتے ہوئے بھی سنا گیا کہ " هذان أبنائي وابنا ابنتي اللّهم إني أحبّهما فأَحِبّهما وأَحِبَّ من يُحِبُّهما" کہ یہ دونوں میرے بیٹے ہیں اور میری بیٹی کے بیٹے ہیں اے اللہ میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں، آپ بھی ان دونوں سے محبت فرمایئے، اور جوان دونوں کو چاہے آپ بھی چاہیئے (۱)۔

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ چہیتے غلام حضرت زید بن حارثہ کے صاحبزادہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب ہیں، ان کو "حِبّ رسول اللہ" کہا جاتا تھا، وفات سے پہلے ایک لشکر کی قیادت انہی نے کی تھی۔ مدینہ طیبہ میں ۵۴ھ میں وفات پائی۔

یہ تھے مسلمانوں کے اسلاف جن کو دیکھ کر ایمان تازہ ہوتا ہے اور عمل صالح کی رغبت ہوتی ہے، ان کی سیرتیں، ان کے حالات ہماری نئی نسلوں کے سامنے آتے رہنا چاہیئے، تاکہ ان سے استفادہ ہو سکے۔ مثال کے طور پر چند صحابہ کے مختصر حالات

---

(۱) سنن ترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب الحسن والحسین رضی اللہ عنہما۔

ذکر کیے گئے، صحابہ کی جماعت کا ہر فرد اپنی جگہ ایک امت تھا، حضرت ابودجانہ، حضرت خبیب، حضرت عثمان بن مظعون، حضرت کعب بن مالک، حضرت حسان بن ثابت، حضرت زید بن ثابت، حضرت عمار بن یاسر، حضرت مغیرہ بن شعبہ، حضرت ابوایوب انصاری، حضرت انس بن النضر (رضی اللہ عنہم جمیعاً) ان سب کے عظیم کارنامے اور قربانیاں کسی سے مخفی نہیں۔

اور اسی طرح صحابیات میں امہات المؤمنین یعنی ازواج مطہرات کو اور بنات طاہرات کو چھوڑ کر کہ جنہوں نے دین کو تقویت پہونچانے اور حضور ﷺ کو راحت دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور حوصلہ مندی وعالی ہمتی سے کام لیا، صحابیات میں اور بھی ایسے نام ملتے ہیں، جیسے حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا جو اسلام کی پہلی شہید خاتون ہیں، ضعیف بوڑھی تھیں، مگر ابوجہل نے اسلام کی دشمنی میں ان کی شرمگاہ پر برچھی مار کے شہید کردیا، پھر حضرت خنساء کی بہادری کی مثال دی جاتی ہے کہ جن کے چار جوان بیٹے شہید ہوگئے اور وہ صبر واستقامت کا پہاڑ بنی رہیں، اسی طرح حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا جو کہ حضور ﷺ کی پھوپھی تھیں، حضرت اسماء بنت ابوبکر صدیق جو کہ حضرت عبداللہ بن زبیر کی والدہ ہیں، ان کے علاوہ حضرت ام ہانی، حضرت ام ایمن کی خدمات کے ذکر سے کتب سیرت خالی نہیں، اللہ تعالی ان سب کو جزائے خیر عطا کرے اور خوب خوب رحمتیں ان پر نازل فرمائے، رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ۔

☆☆☆

مراجع ومصادر

۱۔ الجامع الصحیح للامام بخاری
۲۔ الجامع الصحیح للامام مسلم
۳۔ جامع ترمذی
۴۔ مسند امام احمد بن حنبل
۵۔ مستدرک للحاکم
۶۔ سیرت ابن ہشام، تحقیق: مصطفی سقا، ابراہیم ابیاری، عبدالحفیظ شلبی، دار الوفاق، بیروت لبنان، دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۴ء
۷۔ إنسان العیون في سیرۃ الأمین المأمون (سیرت حلبیہ) علی برہان الدین، شرکۃ مکتبۃ ومطبعۃ مصطفی البابی الحلبی واولادہ مصر، محمود نصار الحلبی وشرکاؤہ، حلفاء، پہلا ایڈیشن ۱۹۶۴ء
۸۔ الروض الأنف/ عبدالرحمن بن عبداللہ بن احمد بن ابی الحسن سہیلی، مطبعۂ جمالیہ مصر، ۱۹۱۴ء
۹۔ المواہب اللدنیۃ بالمنح المحمدیۃ/ احمد بن محمد ابی بکر خطیب عسقلانی، مطبعۂ شرفیہ طنطا، ۱۹۰۷ء
۱۰۔ سیرت ابن اسحاق، تحقیق: طہ عبدالرؤوف سعد، بدوی طہ بدوی، دار الأخبار الیوم، قاہرہ مصر، پہلا ایڈیشن، ۱۹۹۸ء
۱۱۔ السیرۃ النبویۃ في فتح الباری/ حافظ ابن حجر عسقلانی، جمع وتوثیق: ڈاکٹر محمد امین بن محمود، محمود بن احمد مولود جکنی شنقیطی
۱۲۔ السیرۃ النبویۃ للحافظ محمد بن احمد بن عثمان الذھبی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت لبنان، ۱۹۲۷ء، ودار الکتاب العربی، بیروت، ۱۹۸۷ء
۱۳۔ زاد المعاد/ علامہ ابن قیم الجوزیہ، تحقیق: شعیب ارناؤوط، عبدالقادر ارناؤوط، مؤسسۃ الرسالۃ ومکتبۃ المنار الاسلامیہ ستائیسواں ایڈیشن ۱۹۹۴ء
۱۴۔ التراتیب الإداریۃ/ علامہ شیخ عبدالحیئ کتانی، دار الکتاب العربی، بیروت لبنان
۱۵۔ انساب الأشراف/ احمد یحی بلاذری، تحقیق: ڈاکٹر محمد حمید اللہ، دار المعارف مصر
۱۶۔ طبقات ابن سعد، دار صادر بیروت
۱۷۔ سبل الھدی والرشاد في سیرۃ خیر العباد/ امام محمد بن یوسف صالحی شامی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت لبنان
۱۸۔ السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ / ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری، مکتبۃ العلوم والحکم، المدینۃ المنورۃ

۱۹۔ خلاصۃ سیر سید البشر /محب الدین احمد بن عبد اللہ طبری، وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیۃ وادارۃ الشئون الاسلامیۃ، دولۃ القطر، ۱۴۲۱ھ
۲۰۔ نور الیقین فی سیرۃ سید المرسلین/ علامہ محمد خضری دار الخیر ۲۰۰۳ء
۲۱۔ الوفاء باحوال المصطفی / علامہ عبد الرحمٰن جوزی دار الکتب الحدیثۃ مصر، ۱۹۶۶ء
۲۲۔ خاتم النبیین / محمد ابو زہرہ دار الفکر العربی ۱۹۷۳ء
۲۳۔ اسد الغابۃ / ابن الاثیر، دار احیاء التراث العربی، بیروت لبنان،
۲۴۔ البدایۃ والنھایۃ/ حافظ ابن کثیر، مکتبۃ المعارف، بیروت
۲۵۔ تاریخ طبری/ ابوجعفر محمد بن جریر طبری، تحقیق: محمد ابو الفضل ابراھیم، بیروت لبنان
۲۶۔ الکامل فی التاریخ / ابن الاثیر، دار صادر بیروت، ۱۹۸۲ء
۲۷۔ جمھرۃ أنساب العرب/ ابو محمد علی بن احمد بن سعید بن حزم اندلسی، تحقیق: عبد السلام ہارون، چوتھا ایڈیشن، دار المعارف قاھرہ
۲۸۔ ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین/ حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی، دار الغد الجدید، منصورہ مصر، ۲۰۰۵ء
۲۹۔ سیرۃ رسول اللہ ﷺ/ محمد الحبش، دار النور دمشق، چھٹا ایڈیشن ۱۹۹۶ء
۳۰۔ جامع السیر / امام ابن حزم، تحقیق: ڈاکٹر احسان عباس وڈاکٹر ناصر الدین اسد، مراجعت: احمد محمد شاکر، ادارہ احیاء السنۃ گوجرانوالہ، پاکستان
۳۱۔ عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر / محمد بن عبد اللہ بن یحی ابن سید الناس، مؤسسۃ عز الدین للطباعۃ والنشر بیروت لبنان، ۱۹۸۶ء۔
۳۲۔ مروج الذھب ومعادن الجوھر/ ابو الحسن علی بن الحسین المسعودی، دار المعرفۃ بیروت، لبنان، ۲۰۰۵ء
۳۳۔ سیرت النبی، / علامہ شبلی نعمانی وسید سلیمان ندوی، الفیصل ناشران وتاجران کتب غزنی اسٹریٹ اردو بازار لاہور، ۱۹۹۱ء
۳۴۔ رحمۃ للعالمین، / قاضی محمد سلیمان منصور پوری، ناشر: شیخ غلام علی اینڈ سنز تاجران کتب، کشمیری بازار لاہور، ۱۹۶۲ء
۳۵۔ اصح السیر فی ھدی خیر البشر ﷺ/ مولانا ابو البرکات عبد الرؤوف دانا پوری، المکتبۃ النوریۃ، دلھی الھند
۳۶۔ نبی رحمت/ حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، بار ہشتم، ۲۰۰۵ء

☆☆☆